اُرْدُو

جنوری سنہ ۱۹۴۱ ع

فہرستِ مضامین

اُردُو

نمبر ۸۲	اپریل سنہ ۱۹۴۱ع	جلد ۲۱

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت:۔ دہلی

رشیداحمد ایم۔اے نے لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں چھپوا کر
انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی سے شایع کیا ۔

اُردو

اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

فہرستِ مضامین

اُردُو

نمبر ۸۳	جولائی سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۲۲

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت:— دہلی

منیجر انجمن نے لطیفی پریس لمیٹڈ دھلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقیٔ اردو (ھند) دھلی سے شایع کیا ۔

اُردو

جولائی سنه ۱۹۴۱ع

فہرستِ مضامین

اُردُو

جلد ۲۱	اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ع	نمبر ۸۴

انجمن ترقیٔ اردو (ہند)

کا

سہ ماہی رسالہ

مقام اشاعت:— دہلی

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے لطیفی پریس لمیٹڈ دھلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقیٔ اردو (ھند) دھلی سے شایع کیا ۔

اُردو

اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ع

فہرستِ مضامین

بنیادی لفظوں کی مکمل فہرست

از

محمد اجمل خان - ایم - اے

بنیادی لفظوں کی ایک نامکمل فہرست ' اردو' اکتوبر سنہ ۳۹ ع میں پیش کی جاچکی ہے - تقریباً ایک سال کے عرصہ سے اس فہرست پر مسلسل نظرثانی ہو رہی ہے - اور میں ان احباب کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنی تنقیدوں اور قیمتی مشوروں سے سرفراز فرمایا - ہماری زبان کے ایک مخلص ہمدرد نے یہ مشورہ دیا کہ بنیادی لفظوں کا ہندستان کی مختلف ہندیوں سے مقابلہ کیا جائے اور اس میں فارسی اور سنسکرت کو بھی شامل کرلیا جائے - یہ کام بہت دشوار تھا' لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور تھا کہ ہم پورے طور پر ہندستانی زبان کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھ سکتے تھے - بہر حال یہ کام شروع کردیا گیا اور جتنی زبانوں سے مقابلہ کیا گیا' براہ راست اسی مقام کے باشندوں سے خود اس صوبے میں جاکر کیا گیا - مثلاً پنجابی بولی لاہور میں' مرہٹی واردھا میں' گجراتی بمبئی اور سورت میں اور بنگالی شانتی نکیتن اور کلکتہ میں رہ کر لکھی گئی -

جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اسے میرے ایک کرم فرما نے جن کی مادری زبان فارسی ہے' ترجمہ کیا ہے - افسوس ہے فارسی زبان روز بہ روز ترقی کررہی ہے اور ہمیں اَوِستا یا اس کے بعد کے خالص ایرانی (پہلوی) لفظ مشکل سے ملتے ہیں - موجودہ فارسی بہت کچھ قدیم زبان سے مختلف ہے اور قدیم زبان (اوستا) کا تو یہ حال ہے کہ وہ بالکل سنسکرت معلوم ہوتی ہے - لیکن اصل زبان سیکڑوں سال سے مٹ چکی ہے -

وینڈیداد وغیرہ اگرچہ یزداں پرستوں کی مذہبی کتابیں ہیں لیکن کوئی دستور یا موبد انھیں نہیں سمجھتا ' صرف دعاؤں کے جملے ہیں جو مسخ‌شدہ صورت میں بمبئی کے پارسی دھرا لیتے ہیں -

سنسکرت کا ترجمہ بھی اس زبان کے ایک فاضل نے کیا ہے - ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جب کہ تمدن کی ابتدا تھی اور مسلسل راکھشسوں سے جنگ اور سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے علمی کوششیں صرف یادداشت تک محدود تھیں ' بعد کے متمدن زمانے کے الفاظ اور خیالات کے لیے کہاں سے گنجائش نکلتی - توریت اور ایران کی مقدس کتابیں جانوروں کے چمڑوں (پوست) پر لکھی جاتی تھیں - برھمنوں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ سنت دیرینہ قائم رہتی اور علم کا دریا عوام کو سیراب کرتا - انھوں نے سنسکرت کو دیوبانی قرار دے‌کر ایک ذہنی و علمی ٹھیکہ داری شروع کردی جو مالی یا معاشی سرمایہ داری سے کسی طرح کم خطرناک اور تنگ خیال نہ تھی - موجودہ زمانے میں صرف لفظ پستک (کتاب) اس چیز کی یاد دلانے کے لیے باقی ہے کہ کسی زمانے میں آریوں میں پوست پر لکھی ہوئی چیزوں کا کافی رواج تھا - یہ چیز غالباً اس وقت کی یادگار ہے جب ایرانی اور وسط ایشیا کے آریہ ایک ہی قسم کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ایک ساتھ ' ایک ہی تمدن کے ماتحت زندگی بسر کرتے تھے -

ہم اگر موجودہ زمانے کی کسی سنسکرت کی لغت کو دیکھیں تو یہ صاف صاف معلوم ہوجائے گا کہ اب تک اصلی ویدک سنسکرت کو سمجھنے والا ہی کوئی پیدا نہیں ہوا - جو چیز بھی سنسکرت کے نام سے ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے وہ بہت بعد کی چیز ہے اور ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ لفظوں کے جو معنی اس میں متعین کیے گئے ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں - نیچے لکھی ہوئی ایک فاضل سنسکرت کی رائے ملاحظہ فرمائیے :-

«سنسکرت انگریزی لغت» کے مصنف پنڈت ایل - آر - نوید اس لغت کے دیباچہ

The author of the Standard Sanskrit English Dictionary (Bom-

bay) Mr. L. R. Vaidya says in the preface of his dictionary as follows :—

میں لکھتے ہیں :—

"Sanskrit literature embraces two distinct periods—Vedic and post—Vedic. The first comprises the four Vedas and their auxiliaries, Viz, the Brahmanas, the Upanishads, and the Sutras. The second comprises metrical law-books, the great epics, the several systems of philosophy, grammatical literature, legal digests and commentaries, rhetoric, poetry in its various branches, the dramas, the Puranas and Upapuranas and treatises on mathematics, astrology, music, medicine, and other branches of knowledge.

The Vedas, being the earliest record of human progress yet known to man, unquestionably afford much food for reflection and speculation ; and it is the duty of every son of India to study these sacred writings on other grounds also. But I think separate appliances ought to be in existence for the use of the Vedic student. The meanings of Vedic terms are not yet settled. Sayana's renderings are not in harmony with the opinions of modern scholars, and the latter again differ as much from one another as they do from the great Indian scholiast. In such a state of Vedic scholarship an independent lexicon of purely Vedic terms explained in the light of modern philological researches would be highly useful to those engaged on a study of the Vedic literature. But this task being very arduous and beside my purpose, I have strictly confined myself to the post-Vedic literature. However, it must not at all be supposed that the present Dictionary embraces the whole post-Vedic literature in all its branches. Even after the exclusion of Vedic literature the field of Sanskrit learning remains so vast that, in order to produce a lexicon which would cover the whole of its ground and do full justice to all its branches, many years of patient and incessant labour are necessary ; and the fruit of such labour it will be impossible to give in a single volume, however large. To explain and define the innumerable terms of logic, law, rhetoric, mathematics, philosophy, grammar, music, medicine and other branches of learning with accuracy and precision is a task not yet attempted by any Sanskrit English lexicon

except, perhaps, that of the late Prof. Goldstucker, which, as I have already intimated, did not reach the end of even the first vowel.

In this connection I may be allowed to observe that it is a matter for regret that, in spite of the so-called spread of Sanskrit learning, we do not yet possess accurate and trustworthy editions of some of the classical works usually read at colleges. The Mrichchhakatika and the Uttararamacharita, for instance, are undoubtedly two of our best Sanskrit plays; but unfortunately their texts are yet in a most unsatisfactory condition, and authors have no option but to use such material as may be within their reach.

ان حالات میں جو لوگ ہماری زندہ بولیوں کو سنسکرت کے قریب لانا چاہتے ہیں وہ خود ایک ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جو اول تو فطرت انسانی کے خلاف ہے اور اگر بہ فرض محال ہم مان بھی لیں کہ مذہبی جذبات پر رجعت پسندی کا نام زندہ رکھا جاسکتا ہے تو کیا یہ زبان اور ملک کی خدمت کہی جاسکتی ہے؟ کیا اس طرح ہماری زندہ بولیوں کو موت کے قریب نہیں لایا جا رہا؟ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس طرح پانی نی نے سنسکرت کے لیے گرامر کے جامد اور ٹھوس قواعد بنا کر اسے مردہ کردیا اسی طرح ہماری ہندستانی زبان کو سنسکرت کے ذریعہ سے ترقی دینے کے خیال والے بھی ایک ایسی گرامر عائد کرنا چاہتے ہیں جو ہندستانی بولنے والوں کی سماجی اور ادبی زندہ کا جنازہ نکال دے گی۔

لفظوں کے پسند کرنے میں ہمیشہ رواج پر نظر ہونا چاہیے۔ یہ خیال ہی تنگ نظری پر مبنی ہے کہ فلاں لفظ دیسی ہے اور فلاں بدیسی۔ اگر ان "زبانی" سورماؤں کو چیلنج دیا جائے کہ وہ اپنے دعووں میں سچے ہیں تو موجودہ بدیسی تمدن اور سائنس کی پیداوار سے بھی احتراز کریں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی تگ و دو کی وجہ کچھ اور ہی بتائیں گے اور کسی طرح ان بدیسی چیزوں کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوں گے۔ غور کیا جائے گا تو ہمیں کثرت سے ایسے "ہمدرد" نظر آئیں گے جو زبان کے پردے میں اپنی مالی منفعت، مذہبی تقدس، سیاسی اقتدار، یا کتابوں کی دکان کی ترقی کی فکر میں ہوں گے۔

بہر حال ہم نے جو فہرست دی ہے اس میں وہی لفظ دیے ہیں جو ہندستانی زبان میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر شہر اور قصبہ میں رائج ہیں اور لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں - ہندستانی زبان کے متعلق ہمارا یہ نظریہ ہے جو واقعہ کے بالکل مطابق ہے کہ یہ شمالی ہندستان کے شہروں اور قصبات کی زبان ہے - یہ زبان قدیم زمانے میں فوجی اور تمدنی ضرورتوں نے پیدا کی - اس میں ہر صوبے کے رائج الوقت لفظ اس لیے داخل ہوگئے کہ فوج میں ہندو مسلمان سب یکساں طور پر شریک ہوتے تھے اور کسی راجہ یا نواب ' بادشاہ یا شہنشاہ کو یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ اس کے سپاہی ہندو ہیں یا مسلمان - جس سیواجی کے نام پر مذہبی منافرت کا ہندستان کی تاریخ میں نقارہ پیٹا گیا اسی کے جانشینوں نے تخت دھلی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ پر دست درازی کرنے کو جرم سمجھا اور ان ہی مرھٹوں کے ساتھ ابراھیم خاں گاردی کے بارہ ہزار توپچیوں نے احمد شاہ ابدالی کے حلیفوں (یعنی روھیلوں) کی آدھی فوج کا صفایا کردیا ' یعنی کفر و اسلام کے نام پر ہندستان میں کبھی خانہ جنگی نہیں ہوئی اور اگر ہوتی تو آج مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی - جہاں کہیں بھی مقامی بولیوں کو ترقی دی وہ ہندستانی مسلمانوں ہی نے اپنے ہندو ہمسایوں سے مل کر دی اور مسلمان بادشاہوں اور صوبہ‌داروں نے ان جذبات کے احترام اور ارتقا سے کسی کو نہیں روکا - بلکہ بنگال کے پٹھان بادشاہوں نے بنگالی کو ' گجرات و احمدآباد کے والیوں نے گجراتی کو اور جنوبی ہند کے نوابوں نے دکھنی بولی کو زبانوں کے درجہ تک پہنچا دیا -

لیکن وہ زبان جس نے پہلے لاہور پھر آگرہ اور دھلی سے ترقی پائی ' وہ ہندوستان کی مشترک زبان محض اس لیے بنی کہ مرکز سلطنت میں آنے جانے والوں نے ضروریات تمدن کے لفظوں سے اپنی بولیوں کو خالی پایا - بعد میں رام و لچھمن کی راجدھانی فیض‌آباد پھر لکھنؤ اور مرشدآباد نے اسی زبان کو صیقل دی - اودھ اور پریاگ (الہ‌آباد) میں اودھی اور پوربی رائج تھی اور اب تک وہاں کے دیہاتوں میں رائج ہے - اسی طرح آگرہ و دھلی کے قرب و جوار میں برج بھاشا کا اب تک راج ہے -

لیکن باوجود ملک محمد جائسی کی کوششوں کے اودھی نے ملکی زبان بننے سے انکار کردیا - یہی حال پوربی اور برج کا ہوا - صرف وہی زبان پروان چڑھی جسے نہ صرف مرشد آباد سے لاہور تک کے باشندوں نے پسند کیا بلکہ احمدآباد سے سریرنگاپٹم تک کے جاتریوں اور زائروں نے فراخ دلی سے قبول کیا - اس وقت ہندستان میں جو مذہب تھا وہ مذہب محبت تھا - اس وقت برھمنوں کی تنگ نظری اور مذہبی ٹھیکہ‌داری ختم ہوچکی تھی - یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان بزرگوں کی مجلسوں میں ہندی گیت گائے جاتے تھے اور ہندو میلوں اور زیارت‌گاہوں میں وحدت وجود کا سبق فارسی غزلوں اور تصوف کی انسانیت نوازیوں سے دیا جاتا تھا - ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ چھوت چھات (جو ہندو دھرم کا طرۂ امتیاز ہے) مٹ چکی تھی اور ہندو مسلمان ایک ذہنی اور بین‌الملّی موانست میں برابر کے حصہ‌دار تھے - جمہوریت اور مساوات کا حقیقی سبق یہی تھا جسے ہماری بد نصیبی سے چند تنگ نظر انسان اب مٹانے کے درپے ہیں -

ہم محض موازنہ کے لیے ایک فہرست دیتے ہیں جس کو آپ غور سے ملاحظہ فرمائیں - آپ دیکھیں گے کہ ہندستان کی خاص خاص بولیوں کو جو زبان ہم‌آہنگ کرچکی ہے وہ صرف ہندستانی زبان ہے - اس زبان نے امیر خسرو کے وقت سے سیکڑوں سال پہلے سے پنجابی اور فارسی لفظوں کو ہندستانی بنانا شروع کردیا تھا - اس سلسلہ میں آج سے سات سو سال پہلے کی تصنیف 'خالق باری' مؤلفہ حضرت امیر خسرو کافی سے زیادہ شہادت مہیا کرسکتی ہے - گجراتی زبان بھی کافی سے زیادہ ہندستانی لفظوں کو جذب کرچکی ہے - صرف مرہٹی کسی‌قدر دور ہے لیکن اس میں آپ جتنے سنسکرت الفاظ پاتے ہیں وہ موجودہ زمانے میں ٹھونسے گئے ہیں ورنہ مرہٹوں کا تمدن اب تک ابتدائی دور کی منزل سے بھی نہیں گزرا - صرف بنگالی سنسکرت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اصل سنسکرت تو مفقود ہوچکی ہے، موجودہ عہد کے پنڈتوں نے بنگالی ہی سے سنسکرت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی ہے گویا بنگالی نہیں بلکہ سنسکرت خود بنگالی کے قریب آ گئی ہے - اس کے علاوہ

تمدن و تہذیب کے خیالات و لوازم کے لیے بنگالی زبان تک میں کوئی لفظ نہیں
اس میں پندرہ سو لفظوں سے زیادہ فارسی اور هندستانی سے لیے گئے هیں:-

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
		(أ - ء	- ع) A			
آدمی	مرد - منش	منش	آدمی	آدمی-منکھ	منس	آدم
آئین	کائدا - آئین	کائدا	کانون	کنون	ودهان	قانون
آگ	اگن	اگنی	اگ	اگ	اگنی	آتش
اگے	اگاڑی	سمور	اگاڑ	اگے	اگر	پیش
آهسته	آستے	هالو	آستے	هولی	مند، منتھر	آهسته
آج	آج	آج	آج	اج	اد	امروز
آله	جنتر	اوجار	اجار	سند - هتھیار	ینترا	اوزار، آله
آلو	آلو	بٹاٹا	آلو	آلو	..	سیب زمینی
عام	سادهرن	سرب سادهارن	سادهارن	عام	سادهارن	عام
آم	آم	امبا	آم	امب	آمر، رسال	آم
آنا	آشا	یےنے	اون	آؤنا	آگچھی	آمدن

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
آنکھ	چوک	ڈورا	انکھ	اکھ	نتر، چکشو	چشم
آپ	آپنی	می	آپ	آپ	آلپ	شما
خود	امی ـ نیجه	"	"	آپے	آتما	خود
آرام	ارام	آرام	ارام	ارام	سکھ	آرام آسائش
آسمان	آکاش	آکاش	آسمان	اسمان	آکاش	آسمان
کھانا	کھابر	بھوجن	کھاون	ڈُکّر۔روٹی	بھوجن	طعام
آٹا		کنک	"	آٹا		آرد
آواز	شبد۔آواج	بھنی	آواز	آواز	سور	آواز
آزاد	شادھین	موکڑا	آزاد	آزاد	سوتنترا	آزاد
اب	اے کھن	آتا	ھیوے	ھُن	ادانیم ادھونا	حاله
اب ہی	اپتھت	ھیمتا	اب ھی	ھُن	ابھار	موجوده
اچھا	بھالو	چانگلا سانگلا	سارو	چنگا۔اچھا	اُتّم، کوپ	خوب درست

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
اچانک یکایک	تڑانڑی	اکاکی	اچانک	اکّودم اکو واری	اکشمات	دفعتاً
ادب	شنمان	آدر	عزت کروی	ادب	آدر ۔ سرّدھا	عزت ۔ احترام
عزت کرنا		,,	,,	عزت کرنا		
عضلہ (اذلہ)	پیشی	آوایو	اسنایو	پٹّھا	پیش ھی	پئے
افسوس	دوکھتو	دکھ	افسوس	افسوس	انوتاب	افسوس
اگر	جُدی	انکھی	جو	جد	یدی	اگر
جب				جے		
عجب	اوباک	اپرےتم	عجب	عجب		عجیب
انتہا	شیس	آخری	انت	حد	انتم ، انت	آخر ، ختم
علیحدہ	الادہ	الگ ۔ دور	الگ	الگ	بھنتا	مختلف
الگ جدا		,,	,,	وکھرے		دور ۔ جدا
		,,	,,			

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ضرور (البتہ)	نشچئے	لوکر	ضرور	ضِرور	نِسچے	یقیناً
امن	شانتی	شانت	شانتی	امن چین	سنتی	امن
شانتی		"	"			
اندر	بھیتر	اَتْ ۔ مدّھے	اندر	اندر	انتھ	اندرون درون
اندھیرا	اندھکار	اندھار	اندھیرا	انھیرا	سیام	تاریک
کالا	کالو	کالا	"	کالا		سیاہ
انڈا	ڈیم	انڈو	انڈو	آنڈا	انڈ	تخم
انجن	انجن	انجن	انجن	انجن	واشپینترا	......
انگوٹھا	بردھانگول	انگٹھا	انگوٹھو	انگوٹھا	انگوشٹھا	انگشت
اور	ار	انی	ویدھارے	ہور	تتھا	و
زیادہ	اُنِیک	جیاست	"	زیادہ	اِدِک	زیاد
دوسرا	آباز	دوسرا	"	دوجا	انی	دیگر

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
عورت	میامانش جنانہ	ستری	عورت	زنانی عورت-زن	ستری	زن
عقل	بدّھی۔ اَکّل	اُکّل	اکل	مت	بدھی	دانش
عقل والا	گیانی	اَکّل والا	اکل والو	مت والا	ویوکن	دانشمند
بے عقل	مورکھ۔ بونا	بے کوف لچا	بے اکّل	مورکھ	مورکھ	احمق
عرض	انورودھ	ارض	عرضی	عرض	انورودھ	التجا
اثر	پھل	اثر	اثر	اثر	پربھاو	اثر
اصلی	اشل	اسل	اسل	اصلی	سادھارن	اوسط
اسپتال	اسپتال	دواخانہ	اسپتال	ہسپتال	چیکتسال	بیمارستان
ایسا	ای رکم	آسا	ایون	ایہی	ادرشم ۔ اتھ	چنین
,,				ایہوجیہا		چناں
			B (ب)			
بادل	میگھ	ابھار	بادل	بدّل	میگھ	ابر
باغ	بگان	واکھ۔بکیچہ	باک	باغ	واٹیکا	باغ

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
بال	چول	کیس	بال	بال	بال۔ کیس	مو
بالٹی	بالٹی	باٹلی	بالٹی	بالٹی		سَطَل
باپ	پِتا	پتا	باپ	پیو	پتا	پدر
باقی	باکی	باکی	باکی	باکی		بقایا
بات	کھٹونا واقعہ	گوشت	وات	گل	واچ	حقیقت واقعہ
بات چیت	کتّھا	گوشت کرنے	وات جیت	گل بات	وارتا	حرف زدن
بایاں	بام	داوا	الٹو	کھبّا۔ پٹّھا	وام	چَپ
الٹا		,,	,,			
بازار	بازار	بازار	بازار	بزار	پن	بازار
مارکٹ	مارکٹ	,,	,,	مارکیٹ		
بدن	شریر	شریر	بدن	بدن	شریر ودن	جسم
بد برا	کھراب	وائٹ	برو	بھیڑا	بھور۔ انوتم	بد

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
بچہ	کھوکا	مولگا	بچّو	بچہ	شیشو۔ بالک	بچہ
بہن	بھگنی۔ بون	بہینا	بہن	بھین	بھگنی	خواہر
بحث	الوچنا	وادوِواد	بحث	گل	وادوِواد	مباحثہ
بہت دفعہ		بارانے بار	باربار	کِئّی واری کئی واری	بہودھا	بسیار
باربار	باربار	,,	,,	مُڑمُڑ		,,
اکثر		,,	,,	کئی واری		,,
بکرا	چھاگل	بکرا	بکرو	بکرا	اَج	بُز
بکس	باکس	پیٹی صندوک	باکس	ڈبّہ		بکس
بنانا	بناؤ	بناوی نے	بناؤں	بنانا	نرمان	ساختن
بند	بند	بند کرنے	بند	بند	وارِت	بند
بندر	بانر	وانر	وندرو	باندر	وانر	بوزینہ
بندرگاہ	بندر	پٹ بندر				بندرگاہ

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
بندوق	بَندُک	بندوک	بندوک	بندوک	(سنگھنی)	تفنگ
بہت	اَنیک	جیاست	بہت	بہت	انینتم ۔ اُنیک	بسیار ۔ زیاد
بناوٹ	نمونہ	طرح	بناوٹی	نمونہ	پَرکار	ساخت
بڑا	بڑو	موٹا	موٹو	بڑا ۔ وڈّا	دیرگھ مہان	کلاں
برابر	شمان	برابر	برابر	ایکو جیہا	سمتل سمان	برابر ۔ ہموار
برس ۔ سال	برش	ورش	سال	برس ۔ سال ورہ	ورش ۔ ابد	سال
بُرش	بروش	کُنچا	برش	بُرش		برش
برف	برف	برف	برف	برف	ہم	برف ۔ یخ
بڑھان	بیڑے جائے	واڑھنے	ترکی	بڑھان	وردھی	نمو
ترقی	,,	,,	,,	ترقی	پرسار	زیاد
بڑھاؤ	,,	واڑھنے	ترکی	بڑھاؤ		ترقی

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
بٹن	بوتام	گنڈی	بٹن	بٹن گُکیام بیڑا		تکمہ
بتی	بات تی	بلب	بتی	بتّی		فانوس
بیوپار	کاربار	دھندا	ویپار	بپار	ویاوسائے	کاروبار
بیان	بیبریتی	جبانی	بیان	بیان	کتھن	بیان
بیچ	مودھے	مَدّھ	درمیان	وِچ	مدھیا	وسط
درمیان	,,	,,	,,	وِچکار	,,	,,
بیچ میں	مُدھے	مَدّھ	ویچ میں	بچانے - وِچکار	مَدھے	درمیان
بیج	بی چی	بیہ	ویج	بی	بیج	تخم
بیمار	آشک	آزاری	بیمار	بمار	رُوگی	بیمار
بیر	بیری	بور	بیر	بیر	بدریکا	بیر
بیاج	سود	ویاج	ویاج	بیاج	منورنجن	دلچسپی

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
بیٹی	مے اے	مولگی	ڈکری	کُڑی	دیوھیتا پتری	دختر
بیٹا	چھیلے	مولگا	ڈکرو	پُت ویٹر پتّر	پتر	پسر
بیاہا	بیاھیتا	لگنا	پارنل	بیاہا ویاھیا	ویواھت	عروسی کردہ شدہ
بھائی	بھائی	بھاؤ	بھائی	بھائی	بھراتا	برادر
برادر		بندھو			,,	,,
بھاپ	دھوم	واپ	بھاپ	بھاپ بھاپھ ہواڑہ	وشپ	بخار
بھی	او	جن	بھی	وی	اپیتو	ہم
تک				تک	,,	
بھیڑ	بھیڑا	بکری مینڈی	گھنٹو	بھیڈ	میش	گوسفند
بھیجنا	پاٹھاؤ	پاٹھ وینے	مکل ووں	بھیجنا	پریشنم	فرستادن
روانہ کرنا		,,	,,	گھلنا		,,
بجلی الکٹرک	بیجلی	ویجیستا ,,	وجلی الکٹرک	بجلی	ودیوت	برق

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
بلّی	بڑال	مانجر	بلاڑی	بلّی	مارجار	گربہ
بندی (نقطہ)	نوخ-چینّو	بندو	اشارو	بندی	وندو	نوک - نقطہ
بستر	بچھانا	سانری	بستر	بسترا	سیّسہ	بستر
بوند	پھوٹا	بندو	بوند	ٹپکا کنیں	وندو	قطرہ
بونگ ہڈی	ہاڑ ،،	ہاڑ ،،	ہڑکو ،،	ہڈ ہڈی ،،	استھی	استخوان ،،
بوتل	بوتل	ششی	بوتل	بوتل		بوتل
بُوجھ سمجھ		من ،،	بوجھ سمجھ	بُجھ سمجھ		ضمیر
ہوش		،،	،،	ہوش		ہوش
بڈھا	بردھ	مہاتارا	بُڈّھو	بڈھا بڑھا بڈڑھا	ورڈّھا	پیر
پرانا				پرانا	پورانن	کہنہ
بنیاد	جُر	پایا - نیو	بنیاد	نینھ	نیچ	بنیاد

C. CH (چ-چھ)

هندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
چاہنا	چاوا	ایچّھا	چاہنا	چاہنا	ایچّھا	خواستن
خواہش	اِچھا	,,	,,	چاہ	پریرنا	خواہش
چاندی	روپا	چاندی	چاندی	چاندی	رَجَت	نقرہ
چاول	چال	تاندُل	چاول	چول	تندول	برنج
چلن	چال چلن	ورتنک	چلن	چلن	ویاوھار اچار	عمل
چلنے کی جگہ		گمتی	چل ونی جگہ	,,	پرارمبھ	شروع آغاز
چمکیلا چمکدار روشن	اُجل	چمکدار	چمکدار	چمکدار ,,	نیجس وی	روشن ,, ,,
چمچہ کاسک (قاشق)	چامچ	چمچہ ,,	چمچہ ,,	چمچ چمچہ کاشک		قاشق
چوڑا	چوڑا	رندا۔ رندی	پھیلو	کھُلا	وشترت وشد	فراخ

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
چپٹا	چپٹا	چاپٹ	چپٹو	چوڑا	سمتل	هموار
چرخه	چُرخه	چرخا	چرخه	چرخه		..
چشمه	فواره		چشمه	پھوهاره		چشمه
بهار کمانی	بهار	وَسَنْت	بسنتو	بهار	وسنت	بهار
چٹنی	چاٹ نی	چٹنی	چٹنی	چٹنی	•	..
جیلی		,,	جیلی	جیْلی		..
چیز	جِنس	وستو - چز	چیز	چیز چیج	وستو	چیز
چکنا		کُرکُرنْت	چکنو	چِکنا	چِکّن	هموار - یَشم
چپکنا	آٹا	جوڑنے		چمبڑ نا		چسپیدن
لکڑی	چھڑی	کاٹھی	لکڑی	لکڑی	ڈنڈ	چوب‌دست
لیسدار		چووٹ		لیس دار		چسپنده
چھلا حلقه	انگٹی	مُدِی ,,	چھلا ,,	چھلّا انگوٹھی	انگوشتیکا	انگشتر

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
چھاپ	چھاپ	چھاپ	چھاپ	چھاپ	مودرن	چاپ
چھتری	چھاتا	چھتری	چھتری	چھتری چھتڑی	چھتر	چتری
چھینک	چھنک ھیچ چو	شن کے	چھینک	نچھ		عطسہ
چھوٹا : تنگ	شِرو	اُرند	تنگ	چھوٹا۔ نکّا	سنکیرن	تنگ
چھونا	اسپرشہ	سپرش	چھوون	چھونا	سپرش	مس
چونکہ	کارن	کارن	کارن کے		یتہ	چراکہ
چلم	پائپ	چلم	چلم	چلم		نل
نل	,,	نل	نل	نل		,,
پائپ	,,	,,	پائپ	پائپ		,,
		D.DH (د۔ دھ)				
دانہ (غلہ۔ اناج)	دانہ	دھّن	دانو	اناج۔ ان دانہ	آن	دانہ
دلیل	دلیل	بیان	دلیل	دلیل	ترک	دلیل
دم (سانس)	دم	شواس	دم	ساہ	سواش	دم

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ڈنڈا (لکڑی)	لاٹھی	کاٹھی	لکڑی	ڈنڈا		چوب
دماغ	مگج	مگج - مندو	دماغ	دماغ	مَستِشک	دماغ
ڈر	بھآئے	بھے	ڈر	ڈر	آپد	خوف
خطرہ	،،	،،	،،	خطرہ	بھآئے	بیم
دراز		کھَن - دراز	دراز	دراز		......
درجہ		پدوی	درجہ	درجہ	اپادھی	درجہ
دروازہ	دوار	دروازہ	دروازہ	دروازہ	کپات	دَر
دوا	اوشد	اوشدہ	دوا	دوا	اوشدھ	دوا
دوات (سیاہی روشنائی)	دوات	شاہی	دوات	دوات	مسی	سیاہی
دیکھنا	دیکھو	پہا	دیکھوَن	دیکھنا	درش	دیدن
دینا	داؤ	دیئے	آپون	دینا	دیہی	دادن
دیر	دیری	اُشر	دیر	چر - دیر		دیر

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ڈھال (اُترائی)	ڈھالو	اترنا	ڈھال	ڈھال	ادھوستار	نشیب
دھات	شار۔ دھاتو	دھات	دھات	دھانت	وَستو	معدن
ڈھانچہ (پنجر)	پنجر	اشکتا	ڈھانچہ	ڈھانچہ	استھی پنجر	کالبد
ڈھیلا	ڈھیلا	ڈھیلا	ڈھیلا	ڈِھلّا		کشادہ
دل (من)	دل	مَن	دل	دل		دل
دن	دن	دیواس	دن	دن	دن	روز
روز			روز	روز دھاڑا		
دوآب	دویپ	بیٹ	ٹاپو	ٹاپو	دویپ	جزیرہ
دویپ	,,			,,		,,
جزیرہ	,,			جزیرہ		,,
دور (الگ)	دور	دور	دور۔ الگ	دور	دور	دور
دوست	بندو	مترا	دوست	دوست بیلی	مِتر	دوست

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
دُبلا پتلا	پتلا	بارک	دبلو	ماڑا	کشین	لاغر
دکھ درد	درد	دکھ درد	دکھ درد	دُکھ درد	پیدا	درد
E (ای)						
ایجاد	آوِشکار	ایجاد	شودہ	ایجاد	نرمان	ایجاد
اینٹ	ایٹ	ویٹ	اینٹ	اِٹ	اِشٹکا	خشت
ایمان دھرم	بشواش	وشواش	ایمان دھرم	ایمان دھرم	وشواس	یقین
احساس	بھاب	واٹنے	احساس	سُجھ	بھاونا	احساس
F (ف)						
فیصلہ	رائے	نکال	فینصلو	فیصلا	نرنے	طے۔فیصلہ
فن	کلا	کلا	فن	پھند	کلا	فن
فوج	فوج	لشکر۔فوج	فوج	پھوج۔فوج	سینا	فوج

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
فوجی	فوجی	لشکر	فوجی	بھوجی فوجی	سِینِیا	فوجی
فولاد	لوہا	پولاد	فولاد	فولاد	لوہ ( )	فولاد

G. GH. GH. (گ - گھ - غ)

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
گا	بے	ایل	سے	گا	ایچّھا	خواہد
گائے	گائے	گائے	گائے	گاں	گو - دھینو	گاؤ
گانا	گان	گانا	گاون	گون	سنگیت گیت	ساز سرود
گاؤں		شہر - کھیڑا	گاؤں	پنڈ	نگر - گرام	شہر
گاڑھا	گاڑو - گھنو	جاڑ	گڑھو	گوڑھا	ستھول	لُک
گہرا	گبیر	کھول	گہرو	ڈونگا	اگادھ	عمیق
گدّا	گوشن	گادی	گدلو	گدیلہ		مُخدّہ
گلا	گلا	گڑا	گالو	سنگھ	کنتھ	حلق
گندہ میلا	ننگرا ،	خراب	گندو	گندہ میلا		چتل

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
گانٹھ / گرہ	گانٹھ / گرہ	گانٹھ	گانٹھ	گنڈھ	گرنتھی	گرہ
کرج	بجرو	کڑکڑات	کرج	کج	تَدِتْ	رعد
گرمی	گرم	اون	گرمی	گرمی	گِریشم	گرما
گروہ	دَل	گردی	گروہ	گروہ ۔ ٹولی	دَل	گروہ
گیا	اُتیت	گیِلا	گےیا	گیا	بھوت.ویکت	رفتہ
گزرا		بھوت	,,	گیا ۔ لنگھیا	گَتَہْ	گزشتہ
گھاس	گھاش	گوت	گھاس	گھا	دوروا	گیاہ
گھانگرا / لہنگا	انچل	ساری / لُگڑا	لنگھو	گھگھرا	بَرِدْھان	دامن
گھنٹہ	گھنٹہ	گھنٹہ	گھنٹو	ٹلّی ۔ ٹلّ	گھنٹ	ساعت / زنگ
گھوڑا	گھوڑا	گھوڑا	گھوڑو	گھوڑا	اشو	اسپ

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
گهر	گهر	گهر	گهر	گهر	گِرِہ	خانہ
مکان	باڑی	جگہ	,,	مکان	بَهوَن	عمارت
جگہ	جائےگہ	,,	,,	جگہ	ستهان	جا
گهڑی	گهڑی	گهڑیال	گهڑی	گهڑی	گهٹی	ساعت
گهنٹہ	گهنٹہ	تاس	,,	گهنٹا گهینٹا	گهٹیکا	وقت
غریب	غریب	غریب	غریب	کریب غریب	نِردهن	غریب
غلط	آشودہ	چُوک	غلط	کلط غلط	اشودّها	غلط
گهڑیال (کلاک)	گهڑی	گهڑیال	گهڑیال	گهڑی	مها گهٹیکا	ساعت دیوار گیر
غلطی	بهول	چوک	غلطی	بهُل-کلتی غلتی	ڈرونی	غلطی
غصّہ	راگ	راگ	غُصّو	گُسّہ	کُرودہ	خشم

H (ه-ح)

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
حال	ابستها	استتهی	حال	حال	دَشا	حالت
هے-(هونا)	هوئے	آهے	چهے	هے	استی	است

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ہانکنا (چلانا)	چلان	ہاکالنے	چلاون	ہِکنا	وَہن	راندن
ہاتھ	ہاتھ	ہتھ	ہاتھ	ہتھ	کر	دست
ہاضمہ	ہجم	پچن	پچن	ہاجمہ ہازمہ	پچھن شکتی	ہاضمہ
ہل	ہل	ناگر	ہل	ہل	ہل	قولبہ
ہلکا	ہلکا	ہلکا	ہلک	ہولا		سُبک
روشنی	آلو	اجیڑ	روشنی	روشنی	جیوتی	روشنی
ہم کو ہمیں	امادیگو کے	ہمارا۔ ہم کو	امنی	سانوں	وِیم۔اسماں	ما
ہمارا	امادیر	اَمچا	امارو	ساڈا	اسماکم	ازما
ہمیشہ سدا	سدا	نےہامی	ہمیشہ	سدا۔ہرویلے	سدا	مدام
حملہ	اکرمن	حملہ	حِملو	چڑھائی حملہ	اِکرمن	حملہ
ہنسی	ہنسی	ہانسنے	ہنسی	ہاسا	ہاس	خندہ
ہنسیا (ہُنک)	ہک	ویلا	ہنیا	کُنڈی		چنگک

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ہرا	سر	ہیروا	سبز	ہرا	ہَرِت	سبز
سبز	شبوج			سَبز۔ ساوا		
ہرایک	پرتیک	پراتک	ہرایک	ہر اک	پرَتّیک	ہرایک
ہرکوئی	,,		ہرکوئی	ہرکوئی		,,
ہر	,,		ہر	ہر		,,
حرکت (ہلنا)	چلاپھرا	گتی	حرکت ۔ ہلنا	ہلنا	چال	حرکت
ہتوڑا	ہانوری	گھن۔ہتھوڑا	ہتھوڑو	ہتھوڑا		چَکُش
ہٹنا	چلا	ہلنے	حرکت کرون	ہَلنا	چلنم	حرکت
حرکت کرنا				حرکت کرنا ہلنا		
ہتیار (آلہ)	جنتر	ہتیار	ہتیار	ہتھیار	یَنتر	اوزار
حساب کتاب	حساب	حشوب	حساب کتاب	حساب	ورنتم	حساب
ہوجانا	ہوا	شوبھا	تھیےجاون	ہوجانا	بھونم	شدن

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ہونا	ہونا	ہونے	تھون	ہونا	آ-سِتھْوا	شدن
ہوں	ہوں	اہے	چھن	ہوں	اسمی	(ام)
حکم	حکم	حکم	حکم	حکم	آجنیا	حکم
تھے تھا	چیلو	ہونے ہُتا	ہیتان	ساں سی	آسَن اسیت	بودند بود
حکومت (گورنمنٹ)	گورنمنٹ	سرکار	حکومت	سرکار	شاسَن	حکومت
			(ا) ا			
اکائی	اکک		اکیتا	اک	اِکم	یکاّ
اِن یہ	یے شب	نے - تیا - تی	آ	اوہ ایہ	اِسے	اینہا
انعام	انعام	بخشش	اِنعام	انام		بخشش
انتہا آخر ختم	شیش	اکھیر ڈوک	اخر ختم	سِرا اخیر ختم	انت انتم ،،	انجام آخر

هندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
اشاره	اشاره	مت	اشارو	اشاره	اِنگیتم	تجویز
اشتہار	اشتہار	پرچار	اشتہار	اشتہار	وجنیاپن	اشتہار
اتفاق	راضی	سمجھوتا دستاویج	اتفاق	راضی نامه	متیکبم	معاهده

J.JH (ج-جھ)

هندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
جاگنا	جاگا	جاگا ہونے	جاگوون	جاگنا	جگرت	بیدار شدن
جال	جال	جالو	جال	جال	جال	جال
جان کار (ماہر)	شودکھو	ہوشار	جان کار	ماہر		ماہر
جانور	جانور	پرانی	جانور	جی جنور	جنتو	جانور
جاننا (علم)	گیان	گُن	علم	جاننا	جنیانه	علمیت
جیسا	جیےرکم	جسا	جیوون	جیسھا جیسا	یته	همچناں
ایسا	اِمون	آسا		ایسا ایہو جیہا	تتھا	
جگه	جگه	زاگا	جگه	جگه ـ تھان	ستھان	جا
,,	جائیے گه	چیٹی	,,	جگه	,,	,,

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
جہاں جدھر	جے کھانے کنھانے	کوٹھے	کیاں	کتھے جتھے جدھر	کتر - کو	کجا
جواہر	رتنو	منی	جواہر	جواہر	رتن	جواہر
جوان	جوان	ترُن	جوان	گبھرو	یووا	جوان
جواب	جواب	اُتر	جواب	جواب	اُتّر	جواب
جہاز	جہاز	جہاج	جہاز	جہاز	پوت	جہاز
جھنڈا (نشان)	نشان	نشان	جھنڈو	جھنڈا	پتاکا	بیرق
جھوٹ	متھیا	کھوٹا	جھوٹ	جھوٹھ	اَسَت	دروغ
جھکا ہوا ٹیڑھا	جھوکانا	جُھلنا	جھکل	ڈنگا - وِنگا ڈنگا	اَونَت	خم
جنس	لینگو	جاتی	جاتی	جِنس	یونی	جنس
جو	جے - کون	کون	کون	جیہڑا	کہ - کِم	کہ - کدام

هندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
جوڑ میل	شمندو	جوڑنا	جوڑ میل	جوڑھر میل	ملانم	تعلق
جوڑنا جمع کرنا	جوک	جوڑنے	جوڑون	جوڑنا اکٹھا کرنا	یوگ	جمع اضافه
جوتا بوٹ۔ شو سلیپر	جوتا	جوڑا ,,	جوٹا ,,	جُتّی بوٹ	اُپانَہ پدتران	پاپوش
جرم	اپراده	کانڈے بھانک	جرم	جُرم۔ جُلم	اَپرادھ	جرم
K.KH.KH.(ک-کھ-خ)						
کاک	کاک	کاک	کاک	کاک		
کال کوٹھری قیدخانه	جیل کھانه	بوچ ,,	کیدکھانو ,,	کال کوٹھری	کاراگرِہ ,,	قیدخانه
کالا سیاه	کالا	کالا ,,	کالو ,,	کالا سیاه	کرِشن	سیاه
کان	کان	کان	کان	کنّ	کَرن	گوش

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
کاٹنا	کاٹا	چاوٗنے	کپون	وڈھنا	دنت کشت	دندان کندن گزیدن
,,		کاپنے	,,	,,	کرتن	قطع
کا	رو	چا۔چی۔چے	او	کا	....	از
کب (کس وقت)	کلھون	کدھی	کیارے	کدوں		کئے
کہنا	بلا	مہانے	کہون	آکھنا	کتھیا	گفتن
کیسا	کیمون	کسا	کاویرتی	کیہوجیہا	کتھم	چگونہ
کیسے (کس طرح)				کویں		
کف	کھانی	کھوکلا	کھانسی	کھنگ	....	سرفہ
کھانسی		,,	,,	,,	,,	,,
کہاں (کس جگہ)	کونہائے	کہاں کوٹھے	کیاں	کتھے	کترا ۔ کوا	کجا
کہانی	گوپو	گوشت	کہانی	کہانی	کتھا	افسانہ
قصہ		,,	قصہ	گل	کلپ	,,

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
کل		اُودیا	کال	بھلکے	شُواہ	فردا
,,		کال	کال		ہیاہ	
کچھ	الپو	تھوڑا	ذرا	کُجھ	الکھو	اندک
ذرا		,,	,,	زرا	کتپیا	چند
تھوڑا (سا)		,,	,,	تھوڑا	,,	بعضے
کمانی	سپرنگ	اتو	کمانی	کمانی	—	
کیمرا	کیمرا	کیمرا	کیمرا	کیمرا	—	
کمرہ	کمرہ	کھولی	کوٹھری	کمرہ کوٹھڑی	مندر	اطاق
کوٹھری						
دالان		,,	,,			
کنارہ	کنارہ	کاٹ	کنارو	کنڈھا	انتم بھاگ	کنارہ
کام	کاج	کام	کام	کم	کرم	کار
کار		ایبوکی	,,	کار	اُپیوگ	استعمال
کام		دھندا	,,	کم کرنا	کاریہ	کار کردن
کاروبار	کاربار		,,	کاربار	ویاوسایہ	کاروبار

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
کارخانه	کارخانه	کارخانه	کارکھانو	کارخانه	ینترالہ	کارخانه
کنگھی	چیرونی	کنگوا	کنگھی	کنگھی	....	شانه
کون	کے	کون - جو	کون	کون	کہ	کدام کس
کاریگری	شاپ			کاریگری	کوشل	حرفت
کپڑا (لباس) کپڑا	کاپڑ ,, ,,	تاک پوشاک کپڑا	کپڑو ,, ,,	کپڑا دیس لباس کپڑا	کرپٹ وستر کرپٹ	تکه جات لباس تکه
کرنا	کرا	کرنے	کرون	کرنا	کرو	کردن
کڑوا (زهر)		کڑو	کڑون	کوڑا	کٹو	تلخ
کشش کھینچنا	اکرشن	اوڑنے	کھینچون	کھچ	آکرشن	کشش
که وه	کے	نو - نی - نے	نے	که اوه	تد	که ان
کیڑا	کریڑا	کیڑا	کیڑو	مکوڑا کیڑا	کیٹ	کرم

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
کیڑی (چیونٹی)	پپڑا	مُنگی	کیڑی چیونٹی	کیڑی	کِرمی	مور
کیتلی	کیتلی	کیتلی	کیتلی	پتیلی	....	چاجوش
کھانا (خوراک)	کھابر	کھان - ان	کھاون	روٹی	بھوجن کھادیہ	غذا - طعام
خراب (برا)	خراب	کھراب	خراب	بھیڑا	اَبھدر	خراب
کھریا (چاک)	چاک	کھڑو	چاک	چونا	کھڑردر	چونہ
کھتّا	اسٹور	کوٹھی	سٹور	گودام	بھنڈار	زخیرہ
خم	بنکا	تروا	گولائی	ڈِنگا	بنکِم	خم
گولائی		,,	,,	گولائی		
کھیل	کھیل	کھےنے	کھیل	کھیڈ	آمود کریدا	بازی
تماشہ	تماشہ	مگّت	,,	تماشا	ونود	ساعت تری
کھیت	کھیت	شےتی	کھیتر	پیلی	چھیتر	کاشت
کھڑکی	کھڑکی	کھڑکی	کھڑکی	باری	واتاین	دریچہ

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
کُھردرا	کھردرا	کھراب	کھردرا	کُھروا	اچکّن	درشت ناهموار
خوشی	خوشی	انندی	خوشی	خوشی	هرش	خوشی
کنوس	کنوس	کنوس	کنوس	کنوس	....	کِرمچ
کِرن	کرن	کَرن	کرن	کرن	کرن اَنشُو	شعاع
کتاب	کتاب	کتاب گرنتھ	کتاب	کتاب	پستک	کتاب
کتاب خانه	کتاب کهانه	لائبریری	پشت کالے	کتاب خانه	پست کالے	کتب خانه
کو	تے	تا - لا - لا	کو	کو	....	به
کوئی	کیهو	کون تے هی	کوئی	کوئی	کوپی - کمپی	هر کدام
(یقینی)	نشچائے	ایکھالا			نشچت	یقینی
کمیٹی	کمیٹی	کمیٹی	کمیٹی	کمیٹی	سبها	مجلس
کونه (زاویه)	کونه	کُون	کونو	نُکّر	کُون	زاویه
کوڑا	کوڑا	چابک	کوڑا	چھانٹا	....	تازیانه

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
کچلنا	پشن کرا	چیرڑنے	کچلون	ملنا	پَدَدَانَمْ	پائمال
کنبہ	پریبار ۔ کٹم	کُٹُم	خاندان	ٹبّر	کٹم	خاندان
خاندان	,,	,,	,,	خاندان خنواده	,,	,,
کُتّا	کوکور	کُترا	کُتّو	کتا	کُکُّر	سگ
کُنواں	کنواں	وِہِر	کنوں	کُھو		چاہ
کیا	جے	کون تا	شُن	کی	کِم	چہ
جو		کائے	,,		....	
کیوں	کنہ	کانہہ	شن کم	کیوں	کِم	چرا

L (ل)

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
لال سرخ	لال	لال	لال	لال	رَکْت	سرخ
لانا	پاوا	انانے	لاون	نا	پراپیہ	آوردن
(لب) ہونٹ	ٹھونٹ	اوٹ	ہونٹ	بُل	اوشٹھ	لب

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
لفظ۔ بول	شبدو	شبد	بول	گَلْ	شبد	لفظ
لہر۔ موج	ترنگ	لاٹا	موج	لہر	اُورمی	موج
لکڑی چھڑی	کاٹ	کاٹھی لاکڑ	لکڑی	لکڑی سوٹی	کاشٹھ	چوب دست
لمبا طویل	لمبا	لانب موٹھا۔ اونچا	لمبو ,,	لَمّا لما	لَمب اُوچھ	دراز بلندقامت
لو (لپٹ۔ شعلہ)	شبکو	جوالا	شعلہ	امب	اگنی شِکھا	شعلہ
لڑکی	بالیکا	مُلگی	چھوکری	کُڑی	کَنیا	دختر
لٹکنا	جھولانا	لومنے	لٹکون	لمکانا	اَولمبنم	اویختن
لٹی		چکّی	لٹی		....	
لے جانا	نئے جاوا	جنمابھر	لے جاون	دساور بھیجنا	وھنم	
لینا	لوا	گھےنے	لےون	لینا	گرِھنَم	گرفتن
لکھنا	لیکھا	لھیہت	لکھون	لِکھنا	لیکھنَم	نوشتن

هندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
لسٹ فہرست	لسٹ	یادی	لسٹ	فہرست	سُوچِکا	فہرست
لوہا	لوہا	اوکھنڈ	لوڑھو	لوہا	لوہ	آہن
لچک لوچ	روشارن	لونے	لچک۔لوچ	جھول		
			M (م)			
مادہ (ناری)	ناری	ناری	ناری	مادہ	اِستری	مادہ
مادّہ دھات	دھات	دھاتو ,,	دھاتو ,,	مادہ دھات	وستو ,,	دھات۔ معدن
مال مال وزر	مال	پیسہ دھن۔ مال	مال مال	دھن مایا	دھنم سم پتی	پول جائداد
مالک	مالک	مالک	مالک	سائیس	سوامی	مالک
معلوم ہونا	بوجھا	پہان	معلوم تھون	بوجھنا	بھانی	معلوم
ماں	ماں	آئی	ماں	ماں	ماتا	مادر
ماہر (جان کار)	شودکھو	چتُر	جان کار	استاد		ماہر

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
مچھلی	ماچ	ماسا	مچھلی	مچھی	مِین	ماہی
مدد	شاہجو	مدد	مدد	مدت	سہایتا	مدد
مغرب ۔ پچھم	پچھم	پچھم	پچھم	لیہندا	پَشچم	مغرب
ماہ ۔ مہینہ	ماش	مہینہ ۔ ماس	مہینو	مہینہ	ماس	ماہ
میں	میں	می	ہوں	میں	اَہم	من
مکھی	ماچھی	ماچھی	مکھی	مکھی	اُدنم	بیر
شہد کی مکھی	مو ماچھی	مدھ ماچھی	مدھو مکھی	مکھی شہد	مدھو مکشی کا	زنبور
ملنا	گھسنا	گھاسنے	ملوَن	ملنا	گھرشنَم	مالیدن
من (دل)	من	من	دل	من	میدَھا	ضمیر
مینجر	مینجر	مینجر	مینجر	مینجر	ویوس تھاک	ناظم
مندر	مندر	دِیوَل	مندر	مندر	مَندِر	معبد
منظوری	منظوری	منظور	منظوری	منظوری	شُوبکریتی	پسند

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
موجوده رائج	پرباهن	چالو	حال	اجکل	پَرَچَلِیتم	جاری
حال (ابهی)	حال	حلّی	حال	هُن	ورتمان	موجوده
موقع	شنوبدها	موکع	موکع	ویلا	اَوسر	اتفاق
موسم	موسم	هوا	موسم	رُت	پَرَکرتی	موسم
"		"	"	"	رِتو	برشگال
موت	مرتو	مَرَن	موت	موت	مِرتیو	موت
مرنا	مرے جاوا	مرنے	مرون	مرنا	مرنم	مردن
مشین	مشین	جنترو	مشین	مشین	یَنتر	ماشین
مشرق (پورب)	پربو	پورب	پُروا	چڑدها	پورَب	مشرق
مزه	مزه	رُچی - چو	مزه	سواد	سواد	ذایقه
مضبوط	مضبوط	مجبوت	مضبوط	پکّا	بَلی	مستحکم مضبوط
مزدور	مزدور	حمال	مزدور	مجور	واهک	مزدور - قلی

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
میٹھا	میٹھا	مدھور۔گوڑ	میٹھو	مٹھا	مدھور	شیریں
مہربان	مہربان	برکار	مہربان	مہربان	دیالو	مہربان
مہربانی کرکے	مہربانی کرے	کرپا کرن	مہربانی	مہربانی کرکے	کرپیا	برائے مہربانی
محراب	محراب	کمان	محراب	محراب	....	محراب
میں	ماجھے	مدّھی	درمیان	وچ	مَدھے	در
درمیان	مدھے					در
میل - جوڑ	میل	جوڑ	میل - جوڑ	گنڈھ		سلسلہ - تعلق
میز	میز	میز	میز	میز	....	میز
ملانا	مِلا	مسالنے	ملاوَن	پادینا	مِیلنَم	
منٹ	منٹ	منٹ	منٹ	منٹ	پل	دقیقہ
مثال	اوداہرن	ادہارن	مثال	اِخوت اخان	اداہرنم	مثال
موڑنا	موڑا	موڑنے	موڑون	موڑنا	....	گردیدن

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
موٹا	موٹا	جاڑ	موٹو	موٹا	ستھول	فربہ
ملک - دیس	دیس	دیس - شہر	ملک - دیس	دیس	دیش	ملک
ممکن	شمبھب	شکیّا	ممکن	شاید	سمبھو	ممکن
منہ چہرہ	منہ چہرہ	چہرہ ,,	منہ چہیرو	وَجہ(منہ) چہرا	آنن مکھ	دہن رو
مقابلہ	پریجوگیتا	تُلنا	مقابلہ	مقابلہ	پرَتی یوگیتا	مقابلہ
,,		,,	,,	,,	سمانتا	امتیاز
مربع	چتوسکون	چورس	چورس	مربع	....	مربع
مرغا(مرغی)	مرغے	کومڑا۔کبّڑ	مرغی	کُکڑ	کُکّٹ	خروس
مشکل	مشکل	کٹھن مشکل	مشکل	اوکھا	کٹھن	مشکل

N (ن)

ناک	ناک	ناک	ناک	نک	ناسِکا	بینی
ناخن	ناخن	نکھ	ناخن	نونھ	نکھ	ناخن

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
نالی	نردما	نالی	نالی	موری	....	آبرو
نام	نام	ناؤں	نام	ناں	نام	نام
ناپ	ماپ	ماپ	ماپ	منما		پیمانہ
نارنگی	نبو	نارنگ سنترہ	نارنگی	سنترہ	....	نارنج
ناری (مادہ)	ناری	ناری-بائی	ناری	مادہ		مادہ
نا - نہیں (مت)	نا	نا ہیں	نا - نہیں	ناںھ - نہیں	نہیں	نہ
نیچرل	شوابھاوک	سوابھاوک	نیچرل	قدرتی	پراکرتک	قدرتی
نفرت	ابرکتہ	ناکھشی	نفرت	نفرت	جگپسا	
نہانا	سنان	انگ دھونا	نہاوَن	نہاؤنا	شنانم	غسل
نمک	نون	میٹھ	نِمک	لُون	لَوَنَم	نمک
نمبر - (گنتی)	نمبر	سنکھیا	نمبر-گنتی	نمبر	سنکھیا	تعداد
نوجوانی	نوجوانی	جوان	نوجوانی	گبھرو	یوَن	جوان

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
نوکر	چاکر	نوکر	نوکر	نوکر	انوچر	ملازم
نقل	نقل	نکل	نکل	نقل	پرتی روپ	نقل
نقش۔علامت	چینہ	کھونڑ	نشان	نشان	چنہا	نشان
نقشہ	نقشہ	نکاشا	نقشو	نقشہ	بھومی چتر	نقشہ
نر ۔ مرد	نر	نر	نر ۔ مرد	نر	نر	نر
نرم	نرم	مئوں	نرم	کولا	مردو	نرم
نظر	نظر	درشا	نظر	نظر	درشیہ	منظر
نظریہ		بھاگ	نظریہ	نظریہ	....	قیاس
نل	پایپ			نالی		
نیچا (کمینہ)	نیچا	تھوڑا۔کھالی	نیچو	نیواں	نمن	پست
نیچے	نیچے	,,	نیچے	تھلے	ادھہ	پایاں
نیند	نیدرا	جھوپ	نیند	نیندر	ندرا	خواب

هندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
نشان	نشان	کھون	نشان	نشان	چِنْہ	علامت
نظام طریقہ (نیت)		ریت رچنا	طریکہ ,,	ڈھنگ طریقہ	پرتھا	طریقہ انتظام ۔ تربیت
نقصان	نشٹو	نکسان	نکسان	نقصان ۔ گھاٹا	ھانی کشتی	نقصان
			OO (او)			
اون پشم	اول ,,	لوکر	اون	اُن پشم	....	پشم
اوپر پر	اوپر ,,	ور ,,	اوپر ,,	اُتّے ,,	اُپری ,,	بالا بر
			P. PH. (پ - پھ)			
پاکٹ (جیب)	پاکٹ	کھیسہ	پاکٹ	بوجھا		جیب
پالش	پالش	چکاکی	پالش	پالش		روغن صیقل

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
پانی	جل - پانی	پانی	پانی	پانی	جل	آب
پاؤں	پا	پایو	پگ	پَیر	چرن	پا
پہلا	پرتھم	پہلا	پہلو	پہلا - مُہرلا	پرتھم	اول
پیدائش جنم	جنم	جنما	جنم	جمنا	جنْم	پیدایش
پکانے والا باورچی	پاچک بورچی	اچاری	باورچی	بورچی	پاچک	نان پز
پکڑ (گرفت)	کبل	دھرنا	پکڑ	پھڑنا	دھرنم	گرفت - قابو
پہاڑ	پربت	پروت - پہاڑ شیکھر	پہاڑ	پہاڑ	پروَت	کوہ
پہیہ - چکّر	چکا	چاک	پہیو - چکر	پہّیہ	چکْر	ارابہ
پنچ نمائندہ	پرتینیدھی	طرفے	پنچ	پنچ	سدسیہ	نمائندہ
پنیر	پنیر		پنیر	پنیر	....	پنیر
پڑھنا پڑھائی	پڑو	واچنا	پڑھون	پڑھنا پڑھائی	پاٹھ	خواندن

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
پردہ	پردہ	پردا	پردو	پڑدہ	....	پردہ
پڑھنا تعلیم	تعلیم سِکّھا	سکوت "	پڑھون تعلیم	پڑھنا تعلیم	سِکھشا	آموختن
پروا	پروا۔جانن	کاڑجی	پروا	پروا	چنتا	پرواہ
پسند۔چُننا	پسند	نیوڑون	پسند	پسند۔چُننا	نِروَچن	انتخاب
پتھر	پتھر	دگڑ۔پتر۔گوٹا	پتھر	پتھر	پرستر	سنگ
پیچھے پیٹھ	پیچھے پیٹھ	نتر	پاچھڑ	پچھا پیٹھ	آنتر پشچات	بعد پشت
پیلا۔زرد	ہلدے	پیولا	پیلو	کھٹا	پیت	زرد
پینا	پان کرا کھاوا	پینا	پیسون	پینا	پان	نوشیدن خوردن
پنسل	پنسل	پنسل	پنسل	پنسل	....	
پریم پیار محبت	پریم	پریتی	پریم	پریم پیار محبت	پریم	محبت " "

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
پیارا عزیز	عزیز	جیولگ	پیارو	پیارا عزیز	پریا ,,	عزیز ,,
پیچ دار	کٹھین	پیچ دار	پیچ دار	پیچ دار	جٹل	پیچیدہ
پیچ	اسکرو	پیچ	پیچ	پیچ	,,	پیچ
پیڑ	کاچھ	جھاڑ	جاڑ	رکھ	ورکش	درخت
پیٹ	پیٹ	پٹ	پوٹا	ڈھڈ	اُدر	شکم
پھاوڑا	کودال	پھاوڑا	پاؤرو	پھاوڑا		بیلچہ
پھل	پھل	فل	پھل	پھل	پھل	میوہ
پھیلنا پھیلاؤ	بیڑے جاوا	پسر	پھیلاون	کھولنا	پرسار وردھی	وسعت نمودہ
پھٹنا شگاف	پھاٹل	کھراب	پھٹون	پاٹنا	ورن	
پن - سوئی	پن	ٹاکنی	پن - سوئی	سوئی	سوچکا	سنجاق

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
پلیٹ (رکابی)	پلیٹ	ڈاٹ	پلیٹ۔رکابی	تھالی	....	ظرف پیشقاب
پرانا، بڈھا	پُرانا	پرانا، جُنا	پرانو، بڈھو	پُرانا، بُڈھا	پیراتن، ورڈّھا	کہنہ، پیر
پھول	پھول			پُھل	پُشپ	

Q (ق)

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
قاعدہ	قاعدہ	کائدہ	کائدو	قاعدہ	نیم	قاعدہ
طریقہ		ریت	طریکو	طریقہ	کیتی	ترتیب
قابل		سمارتھ	کابل	لائق	یوگیہ	قابل
قبضہ، قابو	قبضہ	تابہ (تابع)	کابو	قبضہ	اَدِھکار ,,	قابو
قدم	قدم	پائرڑی	کدم	قدم	پد	قدم
قلم	قلم	لیکھنی	کلم	قلم	لیکھنی	قلم۔خامہ
قینچی	کانچی	قینچی	کینچی	قینچی	کرتنریکا	قینچی

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
قمیص	قمیص	کرتا۔ صدرا	کمیص	کرتہ۔ کمیز	....	پیراہن
قصبہ	شہر	گاؤں۔ شہر	کصبو	پِنڈ	نگر	قصبہ
قرض۔ادھار	قرض	کرجاؤ	کرض۔ادھار	ادھار	رِن	وام
			R (ر)			
رائے	رائے	مت	رائے	صلاح	سَمّتی	رای
راہ۔ راستہ	راستہ	رستا	راستو	راہ	رج پتھ	راہ
رہبر	راہبر	سون رکھشنر	رہبر	راہبر	نایک	بدرقہ
راج	راج	سرکار	راج	راج	شاسن	حکومت
حکومت سلطنت		,,	حکومت	حکومت	راشٹر	,,
رانگ۔رانگا	ٹین	کتھر	رنگو	قلعی	....	ٹین
رات	رات	راتر	رات	رات	نشا۔ راتری	شب
رہنا	تھاکا	رہنے	رہوْں	رہنا	آوَششتا	باقی

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
رکھنا	راکھا	ٹھیونے	رکھون	رکھنا	پالنم	نگاہ داشتن
رگ	رگ	شیر	رگ	ناڑ	سنابو	رگ
رنگ	رنگ	رنگ	رنگ	رنگ	ورن	رنگ
,,	,,	,,	,,	,,	رنجنم	,,
رقم کل جمع	رقم	رکم	رکم	رقم	سنکھیا	مقدار
رسّی	رسّی	ڈوری	رسّی	رسّی	رجّو	نخ
ریل	ریل	اگ گاڑی	ریل	ریل	....	واپور
ریشم	ریشم	ریشم	ریشم	ریشم	....	ریشم
ریت - بالو	بالو	ریتی - والو	ریت - بالو	ریت	بلوکا	ریگ
رشتہ	شمبندو	نات لگ	رشتو	ساک	سمبندھی	رشتہ
روشنی اجالا	الو	روشنی	اجالو	چانن	جیوتی	روشنی
روٹی	روٹی	روٹی	روٹی	ڈُگر	....	نان

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
رونا چلانا	چیتکار	رونا	رُوَّن	رونا	رودن	چیخ زدن
روک رکاوٹ	بندو 	 تھامنے	 رکاوٹ	روک رکنا	اَوَرودھ 	 ایستادہ
روئی	تولا	کاپس	رُو	روں	....	پنبہ

S. SH (س-ص-ش)

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
صابون	شابان	صابن	صابن	صابون صبون	....	صابون
سادہ	سہج	سادہ	سادو	سادہ	سادھارن	سادہ
صاف ستھرا	صاف پرشکار	سواچیا	صاف	صاف ستھرا	سواچھ سپشٹ	صاف صاف
سائنس	بیگّان	باسون	سائنس	سائنس	وِن بان	
سانپ	شاپ	سرپ	سانپ	سپ	سرْپ	مار
ساتھ سے مع	ساتھ	سماج اکڑا نے	ساتھ ,, ,,	نال	ساہ چریہ سَہ ,,	ہمراہ ,, ,,

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
سایہ۔چھاؤں	سایہ	چھایا	چھاؤں	چھاں	چھایا	سایہ
سب	شب	سَرْو	سب	سارے	سْروِ	ہمہ
سبب	کارن	کارن	سبب	وجہ	کارن	سبب
سبھا ۔ جلسہ میٹنگ	شبھا	سبھا۔میٹنگ	سبھا		سمّیلن	مجلس
سچ، سچا	شتو	سانچو	سچ	سچ سچا	ستیہ شدھ	صحیح راست
صفحہ	پرشٹا	پنوں	پنو	صفحہ	پرشتھا	صفحہ
سخت ,, ,,	شکتو ,,	کاڈک کٹھن ,,	سخت ,, ,,	سخت	کٹھور کٹھنم	سخت
سکنا	پارا	شکنا	سکوَن	سکنا	....	توان
سلامت	نیراپد	خوش حال	سلامت	سلامت	سُرکْشِتم	سلامت
سوسائٹی سماج	سماج	سوسائٹی ,,	سوسائٹی ,,	سوسائٹی	سماج	مجلس

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
سمندر	شمودرو	سمُدر	سمندر	سمندر	سمُدر	بحر
سر	ماتھا	ڈوک	سر	سِر	شِر	سر
سرکنا	شرے جاوا	سرکونے	سرکون	تِلکنا		لغزش
سردار	سردار	مُکھ	سردار	چودھری	پردھان	خاص
سردی	ٹھانڈا	ھی واڑ	سردی	سیال	شیت	سرما
سڑک	راستہ	رستہ	سڑک	راہ	راج پتھ	کوچہ۔ راہ
سوال	سوال	پرشھن	سوال	سوال	پرَشن	سوال
سیدھا	شوجا	سرال	سیدھو	سِدّھا	سم	راست
,,		بروبر	سیدھو		دکشِن	درست
سیکھنا	سِکّھالورا	سیکھون	سیکھون	سیکھنا	وِدوتا	آموزیدن
علم	گیان	,,	علم	علم	شِکشا	علم
سینی	کِستی	پرویانما	سینی	سینی	,,	سینی

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
سیٹی	سیٹی	شیٹی	سیٹی	سیٹی	....	اشیلک
سکریٹری	سکریٹری	منتری	سکریٹری	سکریٹری	منتری	سکرتیر
سے	تے	بجون	تھی	کولوں-تھی	....	نزد - از
"		پسون	"	ولّوں	تہ	ازطرف
"		نے	"	نال	سَہ	همراه - به
"		سا - لا - تے	"	نو	....	به
سیاست	راج نیتی	راج کیا	سیاست	سیاست	راج نیتی	سیاست
شبیہ - تصویر	چھوبی	چتر	تصویر	مُورت	چِتر	تصویر
شکّر	چینی	شکّھر	شکر	کھنڈ - شکر	شَرکرا	شکر
شخص	مانُش	بورُش	شخص	بندہ	وِیکتی	شخص
شراب	شراب	وارو	شراب	شراب	سورا	خمر - شراب
شرم	شرم	مُرکھ	شرم	شرم	لجّا	شرم
شلف الماری	شلف		الماری	شلف الماری	....	

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ستارہ	تارا		تارو	ستارہ	نکشتر	ستارہ
سونا	سونا	نیجانے	سونو	سونا	ندرا	خوابیدن
,,		سونا	,,	,,	سُورن	زر
سوکھا خشک	سوکھا	سوکانے	سوکھو	سُکا	شُشک	خشک
سورج	شورجے	سوریا	سورج	سورج	سوریہ	خورشید
صُورت	صورت	پاسون	صورت	شکل	آدِن پتر	شکل
سٹیشن	سٹیشن	سٹیشن	سٹیشن	پڑاؤ سٹیشن	....	جائے قیام مقام ستاسیون
صبح۔ سویرا	شکال	سکاڑ	سیوار	سویرا	پربھات	صبح
سننا	شونا	آئی کنے	سنوَن	سُننا	شروِتام	شنیدن
,,		,,	,,		شرونم	
سوئی	سوئی	سوئی	سوئی	سوئی	سوچی	سوزن

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
		(ت - تھ	ٹ - ٹھ)	T. TH		
تالا - قفل	تالا	کلُپھ	تالو	جندرا	....	قفل
تانبا	تانبا	تانبا	تنبو	تانبا	تامرُا	مس
تار	تار	تار	تار	تار	....	تارسیمی
تاریخ	تاریخ	تاریخ	اتہاس	تریک	اتہاس	تواریخ
,,					تی تھی	تاریخ
تب	تاکھُن	تنتر	تیارے	پھر	تد	باز
تباھی	برباد	خرابی	تباھی	ناس	ناش	بربادی تباھی
تیرنا - پیرنا	شانتر	پوھوڑے	تیروَن	تیرنا	سنترنم	شناوری
ٹہلنا	چلا	چالنے	ٹہلوَن	ٹہلنا	چلنم	قدم زدہ
تیار	تیار	تیار	تیار	تیار	پرستت	تیار
تجربہ	ابھیگتا	ان بھَو	تجربہ	تجربہ	انُبھو	تجربہ

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
تک	تے	جر	تک	تک	تَہ	
بھی		لا	بھی	بھی		بہ
,,		پُری انت	,,		پری اَنت	تاوقتیکہ
تکلیف۔دکھ	دکھ	تکلیف	دکھ	تکلیف	وِپتی	تکلیف زحمت
تنا	بونٹا	کانڈی	تنا	پوری	شتھانو	
تنگ	شختو	مضبوط	تنگ	کھڈیاھویا	....	مضبوط مستحکم
ترازو	نیتی	ماپ	ترازو	ترکّڑی	پریمان	پیمانہ
طرف	طرف	بازو	طرف	پاسے	پارشو	پہلو۔طرف
,,	,,	دِشا	,,		دِشا	
,,	پارھوا	پار	,,		....	سربسر
طرح	مُتُن	سربکھا	طرح	طرح۔طراں	رُچی	مانند۔مثل
طریقہ		ریت۔طرح	طریکو	طریقہ	پَتھ	راہ۔طریقہ
راستہ	راستہ	,,	,,	راستہ		

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
تر - کیلا	بھیجا	اولا	کیلو	کلا	آردر	تر
تیل	تیل	تیل	تیل	تیل	تیلم	روغن
تیز	تیز	تیکش	تیز	تیر	پرکھر	تیز
,,		اوگر	,,		تیور	تیزرو
تھکا - ماندہ	کلنتو	تھکلے لا	تھکیل	تھکا ہویا	شرانت	ماند
ٹھنڈا	ٹھنڈا	ٹھنڈا	ٹھنڈو	ٹھنڈا	شیتم	سرد
ٹھیک	نیومیٹ	ٹھیک	ٹھیک	ٹھیک بقاعدہ	نیامت	متواتر
ٹھیک کرنا	ٹھیک کرا	ٹھیک کرنے	ٹھیک کروَن	بنانا	ویاوستھت	درست کردن
تھیلا (بیگ)	بیگ	جھورا	تھیلو	تھیلا	....	کیسہ
ٹھوکر (کک)	لاتھی	ٹھوکر	ٹھوکر	ٹھیڈا	پدا گھات	لگد
ٹھوس	نیریٹھ	جاڑ	ٹھوس	ٹھوس	....	
ٹھڈی	کال	داڑھی	ٹھڈی	ٹھوڈی	چبک	زنخ

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
ٹکٹ ,,	ٹکٹ	ٹکٹ ,,	ٹکٹ ,,	ٹکٹ	....	ٹکٹ پوستہ
تول - وزن	وزن	وزن	تول - وزن	بھار	گرتوم	وزن
ٹوپی	ٹوپی	ٹوپی	ٹوپی	ٹوپی	....	کلاہ
ٹوکری	ٹوکری	بادلی	ٹوکری	ٹوکری	....	
ٹرین	ٹرین	گاڑی	ٹرین	ٹرین	....	سلسلہ - ریل
ٹکڑا	انکشو	بھاگ - ٹکڑا	ٹکڑو	ٹوٹا	بھاگم	حصہ
تم - آپ جناب	تمی	توں	آپ - تمے	توں , تسی	توم	تو

U (ا)

اچھلنا کودنا	لاف دیوا	اڑی مارنا ,,	اچھلوَن کودوَن	چھال مارنا کُدنا	جھمپ	چست
اٹھانا	اٹھا	اونچا لانے	اٹھاون	چُکنا	اٹھاپنم	بالا کردن

هندستانی	بنگالی	مرهٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
اداس	اداس	اداس	اداس	اداس	چنتت	مغموم
اُجلا۔ سفید	سادا	پانڈر	سفید	چٹّا	اجول	سفید
اتر۔ شمال	اتر	اتر	اتر	پہاڑ	اتر	شمال
			(و)	V.W.		
والا کرنے والا،	کرتا	ارا۔ والا	والو،	والا	کرتا	کارندہ
واقعہ۔ بات	گھٹونا	سندھی	بات	گل	گھٹنا	واقعہ
وعدہ۔ بچن	وعدہ	وچن	وعدو	وعدہ۔ قرار اقرار	پرن	وعدہ
وقت	شمئے	ویٹر	وقت	ویلا	سمئے	وقت
وہ	شے	تو	تے	او	سہ	آن مرد
"	اوڈا	تیں	"		تد	آن
"	تاھارا	تے	"		تے	آنہا
وہی (وہی)	شے رکم	تینچ	تمے	اوھوای	تدیو	همان

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
Y (ے)						
یا	اتھوبا	کڈّان	اتھوا	جاں	وا	یا
یاد	شرن	سمرتی	یاد	چیتا	سمرن	یادداشت
یہاں	اے کھانے	اتھے	آہن	ایتھے	اتر	اینجا
یار - دوست	دوست	دوست - متر	دوست	بیلی - یار	متر	رفیق
یہ	اے	ھے	آ	ایہ	ایدم	این
اس		ھیں	,,		اِمے	,,
یہ			,,		تد	,,
یہی	اے	ھیچ	اج	اے ھوای	ایدمیو	ھمیں چیز
Z (ذ-ز ض-ظ)						
ظالم	ظالم	ظلمی	ظالم	ظالم	نرنکش نردئے	ظالم
زبان	جبّھا	بھاشا	زبان	زبان	جیب	زبان
,,	بھاشا	بھاشا	,,		بھاشا	زبان

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
زہر	بیش	وِش	زہر	زہر	وِش	زہر
کڑوا				کوڑا		
زخم	زخم	جکھم	زخم	زخم	وَرن	زخم
زمین	زمین	زمین	زمین	زمین	ستھل	زمین
,,	پِرتھی بی	,,	,,	دھرتی	بھومی	خاک
فرش	میجھے	,,	,,		....	فرش
میدان	ماٹی	میدان	,,		دھرتری	میدان
زنجیر	شکھل	ساکھومی	کڑی	جنجیری	شِرن کھلا	زنجیر
کڑی	شنکجکتو	,,	,,		مِلنم	تعلق
ذرا	اکتوک	تھوڑے	تھوڑو	جرا	کتپیا	چیزے
تھوڑا	الپو	,,	,,		الپ	کم
کچھ	شامانو	کاھین	کچھ	کُجھ	کِنچِن ماترم	بسیار کم

ہندستانی	بنگالی	مرہٹی	گجراتی	پنجابی	سنسکرت	فارسی
زیور ۔ گہنا	الونکار	داگی نا	زیور	گہنا	آبھوشنم	زیور
ذمہ وار	دائی	جواب دار	ذمہ وار	ذمہ وار	اُتّردائی	زمہ وار
زندہ	زندہ	جیونتا	زندو	جیوندا	جیون	زندہ
زور	زور	شکتی	زور	زور	بَل	زور
کم زور	کم زور	دُربَل	کم زور	کم زور	نِربَل	نہیف
ظلم	زبردستی	ظلم	ظلم	ظلم	نِرن کُشتہ	ظالمانہ
ضرور	نیشچے	کھچت	ضرور	ضرور	نیشچئے	یقیناً
ضروری }	جروری	مہتواچی	ضروری	ضروری	مہتواپُورن	ضروری لازمی
ضرور }	درکاری	,,	,,	,,	اوش باکیّم	ضرور
ضرورت	درکار	ضرور	ضرورت	اوڑ	آوَشیکتا	ضرورت

بنیادی لفظوں کے انتخاب پر ایک نظر

ہم نے لفظوں کے انتخاب میں انگریزی یا دیگر یورپین لفظوں سے جو ہماری گرامر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اجتناب نہیں کیا۔ اسی طرح بیسک انگلش کی پیروی میں ہم نے یہ نہیں کیا کہ مصادر کو اپنی زبان سے خارج کردیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ خود بنیادی انگریزی میں حاصل مصدر کی صورت میں مصادر و افعال کی کثیر تعداد لے لی گئی ہے اور اس سے (Ed) اور (Ing) لگا کر بہت سے افعال بنا لیے گئے ہیں۔

بنیادی مصدر

بعض ماہرین گرامر کا خیال ہے کہ فعل امر اصل ہے، اور مصدر فرع ہے۔ ہندستانی مصدروں کی شناخت یہ ہے کہ اس کے اخر میں (نا) ہوتا ہے اور اس کے گرادینے سے امر بن جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں بہت سے مصدر اس طرح بنے ہیں کہ پہلے کسی چیز کا نام بنا، پھر اس سے کام کرنے کے خیال کو مصدر کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا۔ مثلاً سنسکرت میں (کر) کے معنی ہاتھ یا بازو کے ہیں۔ اس سے کرنا بنا لیا۔ اسی طرح (بول) بہ‌معنی بات یا لفظ کے استعمال ہوتا ہوگا۔ اس سے (بولنا) بن گیا۔

انگریزی میں مصدروں کی شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ عموماً (To) لگاکر مصدر سمجھتے ہیں۔ خود لفظ سے نہیں معلوم ہوسکتا۔ پھر لاطینی۔ یونانی لفظوں سے ہزارہا مصادر بنالیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیدھے سادے انگلوسیکسن لفظ فنا ہوچلے۔ اور لمبے لمبے مشکل لفظوں نے ان کی جگہ لےلی۔ اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ اس تکلیف‌دہ بلاغت کو ختم کیا جائے اور اسما کے ذریعہ سے افعال کا کام نکالا جائے چونکہ ہندستانی زبان میں یہ خوبی پہلے سے موجود ہے اس لیے سوائے چند ضروری مصدروں کے ہم نے زبان کی ساخت کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ مصادر سب برج یا اودھی زبان سے لیے گئے ہیں اور ہندستانی کے علاوہ ہندستان کی مختلف ہندیوں میں بھی رائج ہیں۔ البتہ ان میں سے چند ایسے ہیں جو فارسی زبان سے

آ گئے ہیں اور کوئی ہندستانی دشمن انہیں خارج کرکے دوسرا مصدر نہیں لاسکتا مثلاً :

آمدن	سے	آنا	بدل کردن	سے	بدلنا
آزمودن	سے	آزمانا	چیخ	سے	چیخنا
فرمودن	سے	فرمانا	گفتن	سے	گانا (غنا)
گزشتن	سے	گزرنا	دانستن	سے	جاننا (دانا)
کردن	سے	کرنا	قطع کردن	سے	کاٹنا
خوردن	سے	کھانا	مردن	سے	مرنا
کشیدن	سے	کھینچنا	خریدن	سے	خریدنا
مالیدن	سے	ملنا	شرم	سے	شرمانا
پختن	سے	پکنا (پختہ)	شنیدن	سے	سننا وغیرہ۔

چونکہ فارسی بھی ایک قسم کی ترقی یافتہ سنسکرت ہے اس لیے جن ہندستانی مصدروں سے حاصل مصدر یا دوسرے روزمرہ کے استعمال کے لفظ نہیں بنائے گئے، ان کے لیے ہم نے فارسی لفظوں کو قائم رکھا ہے۔ حقیقت میں یہ فارسی کیا ہیں، ایک طرح کے خالص ہندستانی لفظ ہیں اور ان کے بغیر ہماری زبان سونی ہوجاتی ہے۔ اسما (ناموں) کی فہرست میں جو لفظ ہیں ان سے بھی بہت سے افعال بنائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری زبان کی ایک مستقل خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح انگریزی میں حروف (Prepositions) سے کام لےکر مختلف معنی پیدا کیے جاتے ہیں، اسی طرح ہندستانی میں افعال ناقصہ کے بغیر کام نہیں چلتا مثلاً ہوگیا۔ کھاچکا۔ کرسکا وغیرہ۔ اور افعال امدادی سے طرح طرح کے نازک معنی پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے لےبھاگا، ہنس پڑا، دےمارا وغیرہ۔

پھر ایک چیز اور ہے جو سوائے فارسی اور ہندستانی زبان کے کسی اور زبان میں نہیں پائی جاتی۔ یعنی اس میں دو دو مصدر بھی محاورے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے چلنا پھرنا۔ رونا دھونا وغیرہ۔ بنیادی زبان جاننے کے لیے کم از کم بنیادی مصادر اور ان کی پوری گردانیں جاننا ضروری ہے۔

حروف۔ متعلقات فعل اور ضمیریں

بنیادی زبان کی گرامر کا دارومدار زیادہ‌تر ان حروف پر ہے جنھیں انگریزی میں Preposition یا حروف جر کہتے ہیں۔ ان حروف میں اسمائے موصولہ اور ایسے اسموں کو بھی داخل کرنا ضروری ہے جنھیں زمان و مکان اور ربط یا وصل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اکثر ضمیریں بھی اس فہرست میں درج کردی گئی ہیں۔

ان لفظوں کا صحیح استعمال جاننا ہندستانی زبان جاننے کے لیے بہت ضروری ہے۔ تذکیر و تانیث میں بعض صوبوں کے لوگوں کو دقت ہوتی ہے۔ لیکن حروف کا صحیح استعمال ہی ہندستانی زبان کی جان ہے۔ ان کی کثرت سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ ہندستانی زبان کی گرامر ہندستان کی مختلف ہندیوں سے بہت کچھ ملتی ہے اس لیے ہندستان والے چند روز میں ان کو سیکھ سکتے ہیں۔ غیرہندستانیوں کے لیے ان کی تدریجی تعلیم کی خاص طور پر ضرورت ہوگی۔ جو گرامر سے نہیں بلکہ درسی کتابوں سے پوری ہوسکتی ہے اور ہر زبان کی گرامر کی مطابقت سے ایسی کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔

بنیادی اسموں یا ناموں کا انتخاب

بنیادی اسموں یا ناموں کا انتخاب بیسک انگریزی کی پیروی میں کیا گیا ہے۔ وہ اسم (نام) جو ایسی چیزوں کے ہیں جو خاص (Particular) چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی فہرست الگ درج کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے "وہ لفظ جن کی تصویریں کھنچ سکتی ہیں"۔ دوسری فہرست ان اسموں کی ہے جو مشکل سے مصور کے قبضے میں آسکتے ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو مادی چیزوں کا تعیّن کرتے ہیں، لیکن ان میں کچھ ایسی عمومیت پائی جاتی ہے کہ وہ زیادہ‌تر ہمارے افکار و خیالات کی طرح ہمارے ذہنوں ہی تک محدود ہیں۔ گو ان کا وجود خارج میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً اسکول ایک اسم ہے۔ یہ عمارت

ہے ۔ لیکن اس عام خیال کی تصویر صفحہ کاغذ پر نہایت مشکل سے آئے گی ۔ ایسے ناموں کی فہرست علیحدہ درج کی گئی ہے ۔

اس سلسلے میں دو چیزیں خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہیں: (۱) اول یہ کہ ان ناموں میں سے اکثر ایسے ہیں جو افعال ناقصہ سے مل کر بیسک انگریزی کی طرح فعلوں کا کام دیتے ہیں، (۲) دوسرے یہ کہ دو دو اسم مل کر ایک لفظ کے طور پر استعمال کرنا صرف ہندستانی اور فارسی کا خاصہ ہے ۔ دنیا کی کسی اور ایرین زبان میں یہ بات نہیں ہے اور یہ محض فارسی کا اثر ہے جو ہندستانی زبان کی وساطت سے ہندستان کی دوسری ہندیوں میں بھی سرایت کرگئی ہے ۔ مثلاً زد و کوب سے مار پیٹ ۔ کشت و خون سے لڑائی جھگڑا ۔ وغیرہ ۔ اہل زبان کو اسے خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے ۔

کل قومی لفظ

آخر میں ایک فہرست کل‌قومی (International) لفظوں کی درج کردی گئی ہے ۔ یہ فہرست وہی ہے جو بیسک انگریزی والوں نے انٹرنیشنل قرار دی ہے ۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً اس فہرست کے ۷۵ فی‌صدی لفظ بالکل انگریزی ہیں گو دوسری یوروپین قوموں میں انھیں بہت کم لوگ سمجھتے ہیں ۔ یہاں انٹرنیشنل سے مراد وہ قومیں لی گئی ہیں جو انگریزی بولتی ہیں اور برٹش شہنشاہیت (Br. Common wealth) سے تعلق رکھتی ہیں ۔

اگر کل قومی کے ہم بھی یہی معنی سمجھیں تو ہماری فہرست کے ۹۹ فی‌صدی لفظ ایسے ہیں جو نہ صرف ہندستان کی مختلف قومیں سمجھتی ہیں، بلکہ صرف تھوڑے سے تلفظ کے فرق سے انھیں بولتی بھی ہیں ۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ ہماری فہرست انٹرنیشنل ہے تو گویا مؤلفین بیسک انگلش کی پوری نقل ہوجائے گی ۔

بہرحال اس انگریزی فہرست میں ضرور چند لفظ کل قومی بن رہے ہیں ۔ ان پر ہم نے ستارے کا نشان (*) بنا دیا ہے ۔

بنیادی صفتیں

بےسک انگریزی میں صفتوں کی تعداد ڈیڑھ سو مقرر کی گئی ہے - ان میں سے سو صفتیں "عام" ہیں - اور پچاس صفتیں ایسی ہیں جو عام صفتوں کی مخالف (اضداد) صفتوں کو ظاہر کرتی ہیں -

ہندستانی زبان میں مشرق کی اتنی زبانوں نے پناہ لی ہے کہ صرف ڈیڑھ سو صفات بہت کم ہیں - اس میں سرد و گرم، تر و خشک ہر موسم کے رہنے والے نے اپنے اپنے جذبات کا صفات کے ذریعہ سے اظہار کیا ہے - تورانی و ترکی، عربی و شامی، ایرانی و عراقی موسموں اور مزاجوں کی نیرنگی نے ہندستان میں جب اپنا وطن بنایا تو موسمی تغیر نے نفسیاتی کیفیتوں میں ایک جنون‌انگیزی شروع کردی - جذبات کا اظہار ہوا- لیکن "بہار" اور "نوروز" نے "بسنت" اور "ہولی" کے دامن میں پناہ نہیں لی - بلکہ دل کی امنگوں نے "برسات" کو "بہار" کا نعم‌البدل سمجھا - اور آموں کے بےخار "مور" اور کوئل کی بےقرار کوک کو گاوں کی دامن‌گیریوں، اور بابلوں کے صبرآزما نغموں کا سچا جان‌نشیں بنادیا - طبعی ماحول کی تبدیلیوں نے جذبات حسن و عشق اور احساسات رنگ و بو میں چار چاند لگادیے - نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی و عربی "صفات" نے ہندستان کی سنسکرت اور قدیم ہندستانی زبانوں کی صفات میں ایک نیا اور دلچسپ اضافہ کردیا -

چونکہ قدیم ایرانی زبان (جو اوستا سے بھی پہلے رائج تھی) اور سنسکرت دونوں سگی بہنیں ہیں - اس لیے ان دونوں میں، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ تمام انڈوجرمنک زبانوں میں یہ خصوصیت ہے کہ صفات کی ضد بعض "سابقے" (Prefix) لگاکر بنا لیتے ہیں - مثلاً :-

ا = اکاج - امٹ - الگ - اٹل - اہنسا

ن = نچنت - نڈر - نکما

نر = نربل - نرآس - نرمل

کب = کڈھب - کپوت

ان = ان‌نیائے - ان‌جان - ان‌بن - ان‌کہی - ان‌مِل - ان‌مول

بے = بےڈھب - بےکل - بےدم - بےعقل - بےھوش - بے فکرا

بلا = بلاشک - بلاشبہ

بن = بن‌بلائے - بن‌دیکھا - بن کہے

نا = ناچیز - ناشکرا - نامعقول - نامہربان - ناسمجھ - ناخوش

غیر = غیرمعمولی - غیرمعقول - غیرضروری - غیریقینی

بد = بدصورت - بدکار - بدطینت - بدلگام

خوش = خوش‌کلام - خوش‌منظر - خوش‌رو

با = باکار - باھوش

خوب = خوب‌صورت - خوب‌رو

لا = لاخیرا - لاریب - لازوال - لامتناھی

اسی طرح لیٹن۔ جرمن اور اینگلوسیکسن زبانوں میں مختلف سابقے لگاکر منفی صفات کا اظہار کیا جاتا ھے مثلاً : ' ان ' سے Un-common, un-kind یا لیٹن سابقہ ' نے ' لگاکر Neuter, ne-farious وغیرہ یا ' ا (a) ' اور ' ان (an) ' جرمن سابقوں سے Anarchy, Apathy وغیرہ بنا لیتے ھیں ۔

جن زبانوں میں اضداد کو لاحقوں کے ذریعہ سے ظاھر کیا جاتا ھے وہ ایرین اور انڈو جرمنک سٹاک سے تعلق رکھتی ھیں ۔ بہ‌خلاف عربی زبان کے جس میں اضداد کے لیے مستقل لفظ موجود ھیں ۔ اسی لیے ھم یہ کہنے پر مجبور ھیں کہ عربی زبان کو سنسکرت، فارسی اور یورپ کی انڈو جرمنک زبانوں پر فوقیت حاصل ھے اور اگرچہ اسما کے انتخاب میں ھم نے خالص ھندستانی اور ایسے فارسی لفظوں کو ترجیح دی ھے جو ھندستانی ھوگئے ھیں لیکن جہاں تک صفتوں کا تعلق ھے ھم ایسی صفتوں کو ضرور شامل کریں گے جو اگرچہ ایرین زبان سے تعلق نہیں رکھتیں (یعنی عربی ھیں) لیکن ان سے ھمارا مفہوم زیادہ واضح اور بہتر اسلوب سے ادا ھوسکتا

هے - اس پر بھی هم یه احتیاط رکھیں گے که صرف ایسی عربی صفتوں کو چنیں جو نہایت قدیم تعلقات کی بنا پر هندستانی هوگئی هیں اور هندستانی گرامر سے اثر لیتی هیں -

ممکن هے که بعض زبان‌دانوں کا یه خیال هو که مثبت صفات سے منفی بنانے کی بہترین اور فطری صورت بھی هوسکتی هے که کوئی سابقه مثل «اَن» یا «نر» کے لگاکر اضداد کو ظاهر کیا جائے - اس طرح زبان میں لفظوں کی کثرت بھی نه هوگی اور جو شخص ایک لفظ جانتا هوگا وہ آسانی سے اس کی ضد بھی بنا سکےگا - لیکن حقیقت اس سے بہت دور هے - اب ذرا آپ 'بہادر' کے لیے منفی طریقه کی صفت تلاش کیجیے تو سنسکرت میں 'نڈر'، فارسی میں بےباک اور انگریزی میں فیّراس (Fearless) کے لفظ ملیں‌گے - کیا آپ سمجھتے هیں اگر کسی شخص میں خوف کا وجود نه هو تو وہ بہادر هوگا - کسی چیز کے عدم سے اس کی ضد کا وجود نه تو منطقی طور پر لازم آتا هے اور نه نفسیاتی تجزیه کی روشنی میں - ایک بچه هے جس میں ابھی خوف و جرأت کے جذبات پیدا هی نہیں هوئے وہ سیر اور سانپ تو کیا آگ کے شعلوں سے کھیلنے کو تیار هے - آپ اسے کیا کہیں گے ؟ یقیناً اس میں نه تو ڈر هے نه خوف نه فیّر (Fear)، لیکن وہ باوجود بےباک و بےخوف هونے کے شجاع و جری، بہادر اور همتی بھی نہیں هے - اسی طرح اگر کوئی چیز سیاہ نه هو تو اس کا سفید هونا ضروری نہیں - منفی صفات کی یہی کمزوری هے جس کی وجه سے فارسی، انگریزی اور سنسکرت والوں نے بھی بہت سے محاسن کے اضداد کے لیے مستقل لفظ بنالیے هیں، لیکن وہ قطعی طور پر ناکافی هیں - ان هی لفظوں میں سے هماری هندستانی سیاسیات پر ایک ایسا لفظ بیس سال سے مسلّط هے، جس نے نه صرف هندستان کو بلکه دنیا کے اکثر مفکرین کو چکر میں ڈال رکھا هے - بدھ اور خصوصیت سے جَین دھرم میں یه لفظ غالباً اپنے صحیح معنوں میں استعمال هوتا هے - یعنی کسی جان‌دار (جیو) کو نه مارنے کا نام اَهنسا هے - بدھمت والے منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچے که مارو نہیں، مرجائے، سڑجائے تو کھا جاؤ - جین‌مت والوں نے گوشت کھانے سے تو انکار کردیا لیکن

احتیاطاً منہ پر پردہ ڈال لیا کہ کہیں کوئی کیڑا سانس کے ذریعہ سے پیٹ میں نہ چلاجائے اور مفت میں جیو ہتّیا (ھنسا) ھوجائے۔ لیکن مجبوری ہے۔ مذھب جو عموماً قدامت‌پرستی سکھاتا ہے وہ سنسکرت کو خدا کی زبان مان کر عامۃالناس کو بےمعنی اصطلاحات میں پھنسائے ھوئے ہے۔ اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک یہی حالت یورپ کی تھی اور مقتدایان نصرانیت آکسفورڈ اور کیمبرج پر ھی نہیں بلکہ پورے یورپ کی درسگاھوں پر چھائے ھوئے تھے اور مفت میں غریب طالب‌علموں کے بیس ابتدائی سال لاطینی گرامر کی مشق میں ضائع کرائے رھتے تھے۔

بہر حال اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جہاں جہاں مذھبی عصبیت کار فرما رھی وھاں زبان پر قدامت پرستی کا غلبہ ھوگیا۔ اور جتنا قدیم کوئی مذھب ہے اتنی ھی قدیم اصطلاحات دنیا میں باقی رہ گئی ھیں۔ ان لفظوں کو فطری طور پر بڑھنے اور ترقی کرکے سڈول بننے کا موقع نہیں ملا۔ اس میں سنسکرت کا سب سے زیادہ گھاٹا رھا۔ وہ دنیا کی ابتدائی سادگی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یورپین زبانیں اسی پھندے سے کچھ ھی دن ھوئے نکلی ھیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاطینی لفظوں کو نکال کر خالص انگلوسیکسن (Anglo-Saxon) لفظوں کے ذریعہ سے انگلستان نے بےسک انگلش کو جاری کرنا چاہا ہے۔ ایران و ٹرکی بھی عوام کی بول چال کو رائج کررھی ھیں۔ اور عربی زبان بھی کئی ادوار سے گزر کر جدید عربی بن چکی ہے۔ لیکن جہاں تک صفات کا تعلق ہے، دنیا میں صرف عربی زبان ھی شاید ایسی زبان ہے جس میں سیکڑوں سال سے مستقل طور پر محاسن و اضداد قائم ھوچکے ھیں۔ اور چونکہ اسلام نے اعراب (دیہاتیوں) کی زبان کو خالص علمی زبان قرار دیا، اس لیے وہ لوچدار بھی ہے اور برابر ترقی کر رھی ہے۔ مثال کے طور محاسن و اضداد کے متعلق مندرجہ ذیل لفظوں کو ملاحظہ فرمائیے:—

English	فارسی	سنسکرت	عربی
Justice In justice	داد بےداد (جور)	نیائے اَنیائے	عدل ظلم
Truth Un-truth	راستی ناراستی (دروغ)	سَت اَست	(حق) صدق (باطل) کذب
Violence Non-Violence	درشتی نرمی	ھنسا اَھنسا	(جہل) شدّت (حلم) لینت

بےسک انگلش میں بہ کثرت (Un) اَن لگا کر لفظوں کی ضد بنائی گئی ھے۔ اس نے زبان کے دائرہ کو تنگ کردیا ھے۔ اوپر لکھی ھوئی مثالوں سے صاف ظاھر ھے کہ اگر کوئی شخص عدل یا نیائے نہ کرے تو یہ لازمی نہیں کہ وہ ظالم ھو۔ بہت ممکن ھے کہ وہ رحم کے تقاضے سے انصاف تو نہ کرے لیکن مظلوم کو سمجھا بجھا کر عفو پر تیار کردے۔ اسی طرح اگر تشدد نہ کیا جائے اور اھنسا پر عمل ھو تو ایسا شخص نرمی اور حلم و محبت کا مجسمہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بہت ممکن ھے کہ وہ کسی کی جان نہ لے یا ایذا نہ پہنچائے، لیکن یہ کہاں لازم آتا ھے کہ وہ دوسروں کو آرام پہنچانے لگے اور مرتے ھوئے بےکسوں کا حامی اور معاون بن جائے۔ یعنی اس میں بجائے سلبی صفت کے ایک ایجابی کیفیت پیدا ھوجائے۔ ایسے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے عربی زبان میں اتنا ذخیرہ ھے کہ ھماری پوری نفسیاتی اور طبعی اصطلاحات کے لیے کافی ھے۔ اس میں محاسن و اضداد کے لیے الگ الگ مستقل لفظ ھیں اور ھندستانی زبان میں مل کر انھوں نے ھماری زبان کو مالامال کردیا ھے۔ اسی لیے مندرجہ ذیل فہرست میں خصوصیت سے ان لفظوں کو شامل کرلیا گیا ھے۔

کسی شخص یا چیز کی بھلائی برائی، وصف یا عیب کو ھم ایجابی (مثبت) یا

سلبی (منفی) طریقہ پر ظاہر کرسکتے ہیں۔ حسن اور قبح دونوں مثبت بھی ہوتے ہیں جیسے سچا، اچھا، لنگڑا، کانا وغیرہ اور منفی بھی ہوتے ہیں جیسے بےباک، بےلاگ اور اَن‌جان، نکمّا وغیرہ۔ نیچے جو فہرست دی گئی ہے اس میں اضداد کے بیان کرنے میں فہرست طویل ہوگئی ہے۔ لیکن اگر صرف محاسن کی جدول ہی محفوظ رکھی جائے تو کافی ہے۔

لفظوں کی ترتیب

ہم نے جو فہرستیں دی ہیں ان کی ترتیب لفظوں کے فطری ارتقا پر درج کی جاتی ہے۔

(۱) سب سے پہلے انسانوں نے ایسے لفظ بنائے جن کو انھوں نے دیکھا اور ان کی تصویر بھی بنا کر اپنے ساتھیوں کو بتاسکے۔ اسی بنا پر سب سے پہلے جو خط مصر وغیرہ میں ایجاد ہوا وہ "ہیرو غلیفی" یا تصویری ہے۔ اور موجودہ عہد میں بھی ابتدائی تعلیم کا بہترین نفسیاتی طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ تصویروں کے ذریعے بچوں کو تعلیم دی جائے۔

(۲) پھر رفتہ رفتہ خیالات عامہ پیدا ہوئے۔ یہ خیالات ان جزئی یا خاص چیزوں کے مشاہدہ پر مبنی تھے۔ اس لیے ہم نے دوسرا درجہ ان اسما کو دیا ہے جن کی تصویر محض ذہنی طور پر بن سکتی ہے، کاغذ پر نہیں بن سکتی۔

(۳) اسما سے ان کے تعلقات کو ظاہر کرنے کے لیے افعال بنائے گئے، یعنی وہ لفظ جن سے کام کا کرنا یا ہونا کسی زمانے سے متعلق ہونا ظاہر ہو۔ ارتقائے زبان میں تیسرا درجہ افعال کا ہے۔ ہم نے فعلوں کو مصدری صورت میں دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کن اسما سے یہ مصدر بنے ہیں۔

(۴) چوتھا درجہ صفات کا ہے۔ صفات اسما کی بھی ہوسکتی ہیں اور افعال کی بھی۔

(۵) افعال کی صفات کو متعلقات فعل کہہ سکتے ہیں۔ اور حروف و اسمائے موصولہ بھی اسی زمرے میں پانچویں نمبر پر ہیں۔

وہ لفظ جن کی تصویریں بن سکتی ہیں

الف - A

اخروٹ
اسکول
اسپتال
آفس
آلو
آم
امرود
انڈا
انجن
انگوٹھی
انگوٹھا
انگور
انگلی
آنکھ
آئینہ
اینٹ

ب - B

بال
باغ
بازو
باجہ
باسن
بادل
بتی
بطخ
بچہ
بادام
بالٹی
برتن
بستر
بستہ (پارسل)
بھیڑ
بٹن
بکس
بکرا
بندوق
بندر
بوند
بوٹ
بوتل
(بونگ)
بیر
بیل
بھینس
بیگ
بلی
بیچ

C. Ch

چاند
چھاتی
چاقو
چڑیا
چراغ
چھڑی
چھت
چھتری
چہرہ
چمچہ
چنا
چوکور
چوہا
چولہا
چیونٹی

D

دانت
دروازہ
دراز
درخت (پیڑ)
دماغ
دستانہ
ڈنڈا
دل
دم
ڈول
دیاسلائی
دیوار

F

فوج
فرش

G. Gh

گاڑی
گائے
گانٹھ
گٹھری (پارسل)

کھڑی
کھڑا
کھیرا
کھوڑا
کھر
کھنا
کھٹنا
غسل خانہ
گرجا
گدا
گردن
گلاس
گلّہ
گیند (گولا)
گیہوں

H

ھاتھ
ھتھوڑا
ھڈی
ھل
ھنسیا
ھوائی جہاز

J

جال
جھاڑو
جڑ
جزیرہ
جہاز
جھنڈا
جوتا
جَو
جیب

K

کان
کانٹا
کارڈ
کالر
کبوتر
کتّا
کتاب خانہ
کپڑا
کپڑے
کٹھلی
کھیت
کھال
کدو
کھڑکی
کرتا
کشتی
کمانی
کمان
کنجی
کنگھی
کوٹ
کوّا
کیتلی
کیک
کیمرا
کیلا
کونہ

KH-خ

خربوزہ
خوبانی

L

لباس
لب (ھونٹ)
لڑکا }
لڑکی }
لفافہ
لکیر
لیموں

م - M

مچھلی
مربع
مرغی
مسجد
مکھی
مکھی شہد کی
مندر
منہ
موزہ
مُیچ
میز

N

نالی
نل
ناخن
ناک
نارنگی
نقشہ

P

پائجامہ
پائپ
پارسل

پاؤں
پال
پردہ
پر
پھل
پھاوڑا
پتّی }
پتّا }
پستہ
پلیٹ
پُل
پمپ
پنیر
پنسل
پن
پیٹ
پیڑ
پیچ
پیالہ (کٹورا)
پیمانہ

Q

قفل
قلم
قمیص
قمقمہ (بَلْب)
قیدخانہ (جیل)
قینچی

R

رسّی
رسید
رگ
ریل

S - س

سانپ
سپنج
ستارہ
سٹامپ
سٹیشن
سٹور
صراحی
سر }
سردار }
سڑک
سورج
سوئی
سیٹی
سیڑھی
سینگ

Sh - ش

شاخ
شہر
شلف
شیشی

T - ت ٹ

تالا
تار
تارا
تاگا
تختہ
ترازو
ٹرین
ٹھُڈی
تصویر
ٹکٹ
تنور
تمغا
تھیلا
ٹوپی
ٹوکری

W و

ورق

Z

زبان (جیبھ)
زیرا
زنجیر
زیور

وہ لفظ جن کی تصویریں نہیں بن سکتیں

A - الف

آئین
آبرو
آپ
آٹا
آپریشن
آدمی
آرام

آڑ
آس
آسرا
آسمان
آگ
آلہ
آندھی
آواز
اتفاق
اثر
اچمبھا
احساس
احتجاج
اخبار
ادب
عدم
عزت
عزیز
اشتہار
استعمال
افسوس
اعتراض
اقرار
عقل

اکائی
علم
عمارت
عمل
امن
امید
انصاف
انتظار
انتہا
انعام
عورت
اون
ایجاد
ایمان }
عقیدہ }

B - ب

بات
باپ
بھاپ
بارش
باری
بازار
باورچی
بھائی

بھید
بحث
بخیہ
بدن
بڈھا
برابر
برس
برف
کٹھری
بکرا
بل
بندرگاہ
بنیاد
بو
بوسہ
بہن
بہادری
بھروسہ
بیاج
بیان
بیٹا }
بیٹی }
بیج
بیمہ
بیماری

Ch - چ

چاک (خاک)
چاندی
چٹنی
چٹھی
چرم }
چمڑہ }
چڑیا
چوٹی
چھلکا
چھلا
چیز

D - د

دال
دام
دھات
دانہ
دائرہ
درد }
دُکھ }
دفتر
دریا
دریافت

درخواست
درجہ
دھرم
دھکّا
دَھن
دُھن
دھندا
دھول
دھواں
ڈھیر
دشمن
دل (خیال)
دلچسپی
دل لگی
دلیل
دوا
دوات
دور
ڈور
ڈوری
دوست
دودھ
دھی
دیس
(بدیس)

(پردیس)
دیہات

F - ف

فاصلہ
فائدہ
فسانہ
فکر
فن
فہرست
فیصلہ

G - گ

گھاس
گاؤں
غریب
گرمی
غور
گھر
گروہ
گرفت
گھن
گلاس
گھنٹہ
غلطی
گھی

گورنمنٹ
گوشت
گولائی
غصہ

H - ح - ہ

ہاضمہ
حال
حجم
حد
حرف
حرکت
حس
ہوش
حضور
حالت
حاضر
حواس
حساب
ہستی
حصہ
ہفتہ
حفاظت
حکم
حکومت

ہلکا
حملہ
ہمت
ہوا
حیران

J - ج

جا (جگہ)
جاڑا
جان
جانور
جرم
جسم
جلسہ
جمع
جنگ
جنس
جواب
جوڑ
جیب
جیلی

K - ک

کاپی
کاروبار
٭ کاریگری

کان (کہان)
کاک
کاغذ
کھال
کام
کپڑا
کرایہ
کِرن
کھریا
کشتی
کمپنی
کمرہ
کمیٹی
کنارہ
کنوس
کوڑا
کُوڑا
کولہا
کوشش
کونہ
کہانی
کھیت
کیڑا

خ - Kh

خاندان
خاص
خاصہ
خاک
خاکی
خاکستری
خانہ
خاندان
خبر
خود
خوشی
خلاصہ
خم
خط
خون
ختم (خاتمہ)
خیر
خیال

ق - Q

قابو
قاعدہ
قبضہ
قدم
قرض
قِسم
قَسم
قوت
قول
قوم
قیمت

ل - L

لائن
لٹی
لسٹ
لفظ
لکڑی
لوہا
لہر
لَو (لپٹ)

م - M

مادہ (ناری)
مادّہ
معلوم
معمولی
مال
مالک
ماں
ماہر
مٹی
مثال
مجمع
محبت
محنت
مہینہ
محرر
مدد
مزدور
مزہ
مذاق
مزاج
مزاح
مذہب
مکھن
ملک
ملکیت
مشین
منیجر
محصول
مروت
منٹ

منزل
منہ
منظر
منظور
مقابلہ
مقام
مقدار
مقصد
ممکن
موج
موجود
موجودہ
موسم
موقع
موم
میدان

ن - N

نالا
نام
نامور
نامی
نشر
ندی
نشان
نفع
نفرت
نقصان
نقل
نقطہ
نمائندہ
نمک
نمونہ
نظام
نظم
نوبت
نوٹ
نوک
نوکر

پ - P

پال
پالش
پان
پتھر
پٹّھا
پرواہ
پردہ
پریم
پسند
پھول
پودہ
پہاڑ
پہلو
پیٹھ
پیار
پیتل
پیدا
پیداوار
پیدائش
پیمانہ

ر - R

رات
راج
راز
راگ
رانگا
راہ
راستہ
راہبر
رائے
رائج
رواج
رجحان
رخ
رسی
رشتہ
رقم
رنج
روح
روٹی
روئی
ریت
ریشم

س - S

صابن
سانس
سائنس
سایہ
سبب
صبح
ستارہ
سطح
سر
سزا
سویرا
سویرے
صفت

صفحہ
سفر
سکریٹری
سلامتی
سلسلہ
سمندر
سوار
صورت
سوسائٹی }
سماج }
سونا
سہارا

سیسہ

ش - SH

شادی
شبہ
شخص
شرارت (شریر)
شروع
شرم
شکل
شک

شکایت
شگاف
شعلہ
شور
شیشہ
شعر
(شاعر)

ت - ٹ - ط - T

تاریخ
تال (لے)
تعلیم
ٹانکا (بخیہ)
تانبا
تبادلہ
تباہی
طبیعت (طبعی)
تجارت
تجربہ
تجویز
تختہ
تربیت
ترقی
ترکیب

طور }
طریقہ }
تفصیل
تفریح
تقسیم
ٹکڑا
ٹکس
تکلیف
ٹھوکر
تماشہ
توجہ
تہ
تیل

و - W

واسطہ
واقعہ
وطن
وجہ
وجود
وزن
وقت

ی - ے - Y

یاد
یار
یقین

ز - ض - ظ - Z

ضائع
زبان
زخم
زر
ذریعہ
ضرورت
ذکر
ظلم
ذلت
زمانہ
ذمہ }
ذمہ وار }
زمین
زن
ذہن
زور
زہر

بنیادی فعلوں کی فہرست

نوٹ — اس فہرست میں صرف ایک قسم کے فعل درج کئے ہیں - ان میں سے اکثر متعدی بنائے جا سکتے ہیں -

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں -
الف - A	
اچھلنا	اچھال - اچھل - اچھل کود
اڑنا	اڑان
آنا	آمد - خوشامد - آنے والا آئندہ - آمدنی - برآمد - درآمد
اٹھنا	اٹھان
ابلنا	ابال - جوش
آزمانا	آزمائش - جانچ
ب - B	
بننا (بن جانا)	بناوٹ - ساخت - ان بن بن سنور - بن ٹھن
بولنا	بلاوا - بول - بولی - دعوت بات
بجنا	باجا
بانٹنا	بٹائی - بانٹ - تقسیم
بچنا	بچاؤ
بھیجنا	روانگی

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں -
بیچنا	فروخت
بھاگنا	بھاگ (دوڑ)
بھیگنا	گیلا - تر
بڑھنا	بڑھان - بڑھتی - ترقی بڑھوتری (بوڑھا - بوڑھی)
بدلنا	تبدیلی - تبادلہ - ادل بدل - بدلی
بھرنا	بھرپور
بہنا	بہیّا (سیلاب) سیّال - سیلان
بونا	بوائی
بیاہنا	بیاہ - شادی بیاہ - بیاہتا - بیوی بائی - بی بی - بیاہا - بیاہی
بیٹھنا	بیٹھک - نشست
چ - CH	
چھاپنا	چھاپا - چھپائی - چھاپہ خانہ (پریس) - چھاپ (مہر) چھپیا
چاہنا	چاہ - چاؤ - پریم - خواہش پیار - محبت

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
چلنا	چال۔ چلن۔ رفتار۔ چلائی چل دور۔ چل ہٹ۔ چل چلاؤ چالیّا۔ (نیک چلن۔ بد چلن) چالباز (چالاک؟)
چننا	چناؤ۔ انتخاب (پسند)
چھوڑنا	چھوٹ۔ رخصت۔ وداع
چُکنا	
چمکنا	چمک۔ روشنی۔ نور۔ چمکیلا روشن۔ نورانی
چومنا	پیار۔ بوسہ
چُمکارنا	
چھونا	چھوت۔ اچھوت۔ مس مساس
چڑھنا	چڑھائی۔ حملہ۔ چڑھاوا نذر۔ چڑھ بازی
چھیدنا	چھید۔ سوراخ
چیخنا	چیخ۔ پکار۔ دہائی۔ پکار
چھپنا	پوشیدہ۔ بند
چھینکنا	چھینک۔ زکام
چھیلنا	چھلکا۔ چھال۔ کھال
چھیننا	

د ـ ڈ ـ D

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
ڈرنا	ڈر۔ خوف۔ خطرہ۔ ہول
دوڑنا	دوڑ۔ دوڑ دھوپ۔ کوشش سعی
دوہنا	دودھ
دبنا	
ڈھکنا	
ڈالنا	
دھونا	دھوون۔ دھلائی۔ دھوبی
ڈھلنا	ڈھال۔ ڈھلوان
دیکھنا	دکھاوا۔ جھلک۔ نظر۔ نگاہ۔ نظارہ۔ نظریہ۔ نگران نگرانی۔ نگہداشت۔ حفاظت دیکھ بھال۔ دیدے
دینا	دین۔ داد۔ دہش

ف - F

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
فرمانا	نطق۔ گفتار۔ فرمائش

گ - G

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
گانا	گیت۔ غنا۔ گویا
گاڑنا	

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
گھٹنا	گھاٹا - گھٹی - کمی - قصور
گرنا	افتادہ - افتادگی
گزرنا	گزر - گزارا - گزشتہ
	گیا گزرا - گزرگاہ
گرجنا	گرج
گننا	گنتی - شمار - ان گنت
گھیرنا	گھیر - حلقہ - گھیرا
گھومنا	چکر - گولائی

ہ - H

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
ہانکنا	
ہٹنا	
ہلنا	جنبش
ہنسنا	ہنسی - مذاق (دل لگی)
ہونا }	ہونہار - ہستی - وجود
ہوجانا }	ہے - ہو - ہوں - تھا

ج - J

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
جانچنا	جانچ - جج - آزمائش
	امتحان - جنچائی - جنچاتلا
جاننا	معلوم - جان کار - جانابوجھا
	معلومات - انجان - دانا
	نادان - گیان - علم
جانا	رفتار
جلنا	جلن - سوزش - سوختہ - جلاپا
جمنا	منجمد - ٹھوس - جمود
جوڑنا	جوڑ
جوتنا	جوت - جتائی
جھاڑنا	جھاڑو (جاروب)
	پت جھڑ (خزاں)
جھولنا	جھولا
جھکنا	خم - خمیدہ
جینا	جی - جان
	(زیستن - زی) زندہ - زندگی - جانہار

ک - خ - K

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں۔
کاتنا	کتائی
کاٹنا	کاٹ - کٹائی - قطع
کرنا	کار - کام - کارن - کاریگر
(کردن)	کرتادھرتا - کارندہ - کارستانی
	بےکار - کردگار - کارخانہ
کچلنا	کچلن
کودنا	کود - جست
کھودنا	کھدائی - کھدان (کان)

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں ۔
کھانا	کھلائی ۔ خوراک ۔ خورش
کھانسا	کھانسی ۔ کف
کھیلنا	کھیل ۔ تماشہ
کھولنا	
کھینچنا	کشش ۔ کھنچنا
کہنا	کہانی ۔ کہاوت
خریدنا	خرید ۔ خریداری ۔ خریدار

L - ل

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں ۔
لانا	برآمدہ ۔ برآورد ۔ برآمد
لگنا	لگن
لینا	لین
لپٹنا	لپٹ چھپٹ ۔ لپٹن ۔ لپیٹ
لڑنا	لڑائی ۔ لڑنت ۔ لڑاکا (جنگ)
لچکنا	لچک
لکھنا	لکھائی ۔ لکھا (قسمت) لیکھ ۔ لکیر
لٹکنا	لٹکن ۔ لٹکا

M - م

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں ۔
مرنا	مرن ۔ موت ۔ مار ۔ مردہ
ملنا	مالش
ملنا	میل ۔ ملاوٹ
ماننا	من ۔ من مانا ۔ منانا ۔ منت

N - ن

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں ۔
ناپنا	ناپ ۔ پیمانہ
ناچنا	ناچ ۔ رقص
نکلنا	نکاس ۔ خروج
نچوڑنا	نچوڑ ۔ عطر ۔ جوہر
نہانا	غسل ۔ غسلخانہ ۔ نہان حمام
نوچنا	

P - پ

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں ۔
پانا	پائندہ
پھٹنا	شگاف
پھاڑنا	پھوٹن ۔ پھوڑا
پھوڑنا	
پھسلنا	پھسلن
پھرنا	پھیر ۔ چکر
پلٹنا	واپس پلٹا
پڑنا	پڑی (آواز) ۔ پڑاؤ (منزل)
پڑھنا	پڑھائی ۔ پڑھنت

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں -
پکڑنا	پکڑ - گرفت
پکنا	پکا - پختہ
پکارنا	پکار - آواز - صدا
پگھلنا	رقت
پھلنا	پھل - پھول
پیرنا	پیراک
پھیلنا	پھیلاؤ - وسعت - کشادگی

ر - R

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں -
رکھنا	رکھ رکھاؤ
رہنا	رہن سہن - گھر
رونا	رلائی - آنسو
روکنا	روک - رکاوٹ

س - S

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں -
سکنا	سکت - توانائی - قوت
شرمانا	شرم - شرمندگی
سمجھنا	سمجھدار - عاقل
	ناسمجھ (بچہ)
سنبھلنا	سنبھالا
سننا	سنی سنائی - شنوائی - شنو
	سماعت
سونا	نیند
سوچنا	سوچ بچار
سہنا	سہارا
سینا	سوئی - ٹانکا - بخیہ

ت - ٹ - T

فعل	وہ لفظ جو ان فعلوں سے بن سکتے ہیں -
تاکنا	تاک
توڑنا } ٹوٹنا	ٹوٹن - ٹکڑا
	شکست - شکستہ
تھکنا	تھکن - تھکاوٹ

بنیادی صفتیں

محاسن	اضداد
الف - A	
اجالا	اندھیرا
اداس	خوش
آزاد	بندہ - غلام
عام	خاص
آگاہ	بےخبر
اچھا	برا
عقلمند } عاقل	احمق
	بےعقل
	بےوقوف

محاسن	اضداد
اونچا	نیچا
احمق	عاقل
الکٹرک	
اصلی	نقلی
	فرعی
	غیر حقیقی
اوسط	
اجلا	کالا - میلا
الگ / علیحدہ	
انجان	واقف
	چالاک
اودا	
آسمانی	
الٹا	سیدھا
علانیہ	خفیہ
	پوشیدہ
انوکھا	
اجنبی	
عجیب	
آسان	مشکل
آخری	ابتدائی
اول	آخر
اگلا	پچھلا

ب - B

محاسن	اضداد
باطن	ظاہر
بایاں	دایاں
باقاعدہ	بے قاعدہ
بھاری	ہلکا
بعد	قبل
بجلی	
برابر	
بڑا	چھوٹا
بلند	پست
بد	خوب
برا	اچھا
بھورا	
بہت	کم - تھوڑا
بند	کھلا
بیدار	خفتہ
بیمار	تندرست
بھیگا	سوکھا
بیاہا	کنوارا
بوڑھا	جوان

چ - C

محاسن	اضداد
چھوٹا	بڑا
چپٹا	
چکنا	کھردرا
	کھرا
چمکیلا / چمکدار	دھندلا
	تاریک
چوڑا	لمبا - پتلا
	تنگ

د - ڈ - D

محاسن	اضداد
دبلا	موٹا
ڈھیلا	تنگ
دوسرا	پہلا
درست	
دولت مند	مفلس
	غریب
دیر	جلدی

ف - F

محاسن	اضداد
فوجی	ملکی - شہری
فوری	
فانی	باقی
فائدہ مند	مضر
	نقصان دہ

غ - گ - G

محاسن	اضداد
گاڑھا	پتلا
	رقیق
گرم	سرد
	ٹھنڈا
غریب	امیر
	دولت مند
غالب	
غلط	صحیح
گندہ	صاف
	ستھرا
گہرا	اُتھلا
گول	لمبا
گورا	کالا

ہ - ح - H

محاسن	اضداد
ہرا	لال
حق	باطل
	ناحق
حسین	قبیح
ہوشیار	بے ہوش - غافل

ج - J

محاسن	اضداد
جلدی	دیر - آہستہ
جوان	پیر - بوڑھا
جدا	قریب

ک - خ - K

محاسن	اضداد
کالا	اُجلا - سفید
	گورا
خاص	عام
خاکی	
خاکستری	
کافی	ناکافی
خاموش	گویا - طرّار
خالص }	مخلوط
کھرا }	کھوٹا
خراب	اچھا
خالی	بھرا - پُر
	بھرا پُرا
کھلا	بند
خشک	تر
کڑوا	میٹھا
کھٹا	میٹھا
کھردرا	چکنا
خفیہ	علانیہ
کمزور	زورآور - تگڑا
	مضبوط
کھوٹا	کھرا
خوب رو }	بدرو
خوب صورت }	بدصورت
خوش	ناخوش
	رنجیدہ
	غمگین (بد)
کھوکھلا	ٹھوس
کیمیائی	

ل - L

محاسن	اضداد
اچکن دار	
لوچ دار	
لیس دار	
لائق	نالائق
لال	ہرا
لمبا	چھوٹا - چوڑا

م - M

محاسن	اضداد
مادہ	نر
معمولی	غیر معمولی
مردہ	زندہ
مشکل	آسان
مضبوط	کمزور

محاسن	اضداد
معقول	نامعقول
	غیرمعقول
مقابل } مخالف }	موافق
موافق	
موجوده	
ممکن	محال ۔ ناممکن
مختلف	
مہربان	نامہربان ۔ خفا
مہنگا	سستا
مزیدار	بےمزہ ۔ پھیکا
مریض	صحیح
	تندرست
میٹھا	پھیکا
معروف	مجہول
موزوں	

N - ن

محاسن	اضداد
نازک	سخت
ناری	نر
نر	ناری ۔ ماده
نارنجی	
نو } نیا }	کہنہ / پارینہ ۔ پرانا

محاسن	اضداد
نشیب } نیچا }	فراز / بلند ۔ اونچا
نرم	سخت
نیلا	
نجی	(سرکاری)

P - پ

محاسن	اضداد
پتلا	موٹا ۔ سنگین
پچھلا } پہلا }	اگلا / پچھلا
پہلے	پیچھے
پیچیده	ساده
	سیدھاسادا
پرانا	نیا
پرایا	اپنا
پورا	ادھورا
پیلا	
پاس } (نزدیک) }	دور
پھیکا	مزیدار
پار	وار
پرے	ورے
پوشیده	علانیہ

Q - ق

محاسن	اضداد
قریب	بعید ۔ دور
قابل	
قدرتی	
قوی	ضعیف

R - ر

محاسن	اضداد
روشن	تاریک
رنجیده	خوش
راستی } راست }	کجی / کج ۔ سیدھا

S - ص - س

محاسن	اضداد
ساده	پیچیده
	مشکل
صاف } ستھرا }	میلا / گنده
سارا	تھوڑا
سامنے	پیچھے
سچ	جھوٹ
صحیح۔ تندرست	غلط ۔ بیمار
سمجھدار	بےسمجھ
سنجیده	
سخت	نرم

محاسن	اضداد
سستا	مہنگا
سرخ	سبز
سبز	سرخ
سرد	گرم
سب	کچھ
سلامت	
سست	چست - تیز
سفید	سیاہ - کالا
سیاہ	سفید - اُجلا
سیدھا	ٹیڑھا
	ترچھا - الٹا
سنگین	کمزور - پتلا
سیٹھا	مزیدار
سویرے	دیر

ت - ط - ٹ - T

محاسن	اضداد
تاریک	روشن
طبعی	روحانی
طبی	عطائی
تر	خشک
ترچھا / ٹیڑھا	سیدھا / کھڑا - راست
تھکا ماندہ	تازہ دم
تنگ	فراخ - ڈھیلا
تیز	کند - سست / آہستہ
(تیزاب کھٹا)	
تیار	
ٹھنڈا	گرم
تندرست	بیمار
تھوڑا	بہت - زیادہ / سب - سارا
ٹوٹا (پھوٹا)	سابوت / صحیح - سالم
ٹھوس	کھوکھلا

ی - Y

محاسن	اضداد
یقین	شبہ
یاری	دشمنی

ز - ض - ظ - Z

محاسن	اضداد
ذاتی	غیر - صفاتی / سرکاری
ظالم	عادل
زوردار / زورآور / توانا	کمزور / ضعیف / ناتواں
ضعیف	قوی
زرد	
زردار	مفلس / نادار
زرخیز	بنجر / اوسر
ظاہری	باطنی
زیادہ	کم
ضروری	معمولی / غیر ضروری
ذمہ دار	غیر ذمہ دار
زندہ	مردہ

حروف، متعلقات فعل اور ضمیریں

الف - A

اب
اب تک (ابھی)
اپنا
آپ
اندر (اندر اندر)
اچانک
اکثر
آگے (سامنے)
اوپر - پر - پہ
اس لیے (اسی لیے
اس واسطے)

اگر (اگرچہ)
اور
ایسا - ایسے
ایک (ایک ساتھ)
(اکٹھا)
ائے دن
اکیلے (صرف)
(بس)
البتّہ
اتنا (اتنا سا)
ارے
اِدھر - اُدھر
اس - اسی
اس طرف
اس طرح
اُن - انھیں
اِن - اِنھیں
علاوہ
الٹا
آہستہ
آہستہ آہستہ

ب - B

بار (دفعہ)
بار بار
رے
بارے میں
باہر باہر
باوجود
باوجودیکہ
بالکل
برابر
برائے
بعد
بہت
بہت سا
بہت کچھ
بس
بہر
بھی
بھلا
بہ نسبت
بے (بے شک) (بلا)
(بغیر)
بن
بلکہ
بمقابلہ
بہر حال
بیچ

چ - CH

چاہے (چاہو)
چنانچہ
چونکہ

د

درمیان
دکھن (دکن - جنوب)
دفعہ
دور
دراصل
دن (روز)
دو
دوپہر

ف - F

فوراً

G

گا - گے - گی
گویا (گویا کہ)
گھنٹہ

H

ہاں
ہرگز (کبھی)
ہی
ہمیشہ (سدا)
ہر (ہر ایک)

ج - J

جب
جب تک
جب ہی
جب کہ
جہاں
جس
جس جس
جس کسی
جس جگہ
جس وقت
جھٹ پٹ (فوراً)
جلد
جلدی
جنوب
جو ہیں
جوں
جوں ہی
جوں جوں
جون
جون سا
جنھیں
جتنا - جتنی
جو

جوجو
جو کوئی
جو کچھ
جدھر
جی
جی ہاں
جیسا
جیسے

ک

کاہے کو
کا
کا - کی - کے
کافی
کو
کتنا
کتنی ہی بار
کہ
کب
کبھی
کب تک
کوئی
کبھی نہ کبھی
کبھی کبھی
کون
کل
کچھ
کچھ کچھ
کدھر
کم
کہاں
کہیں
کہیں نہ کہیں
کیا
کیسا
کیسے
کیسی
کئی
کئی بار
کر
کیوں
کیوں کر
کو
کس
کس وقت
کس جگہ
کس لیے
کس طرح
کس واسطے
کس قدر
کسی
کسی جگہ
کسی وقت

KH - خ

خوب
خوشی
خوشی خوشی
خود
خلاف

L

لگاتار
لیے
لیکن
لہذا

M

مارے (لیے - واسطے)
متعلق
مشرق
مسلسل
مغرب
مگر
میں

N

نہیں
نہ
نا
نہایت

P

پر
پہ
پاس

Q

قریب قریب

S س

سامنے
صرف
شمال
سا
ساتھ
سے
سوائے

T

تاہم (پھر بھی)
تب
تم

تک
تھوڑا
تھوڑا سا
تھوڑا ہی
تھوڑے
تھوڑے ہی
طرف
طرح
تو
ٹھیک

تیز
تیزی

W

و
واسطے
واہ واہ
واقعی
ورنہ
وقت
وہ

وہاں
وہیں
ویسا
ویسے

Y

یا
یا تو
یکایک
یہ
یہاں

یوں
یوں ہی
یعنی

Z

ذرا
ضرور
زمانہ
زیادہ
زیادہ تر

INTERNATIONAL WORDS

(یعنی وہ لفظ جو یورپ اور امریکہ کی کل قومیں سمجھتی ہیں)

*Arithmetic
*Alcohol
*Algebra
Autobus
Automobile
Bagpipe
Ballet
Bar
*Bank
*Base ball
Beef
Beer
*Box
*Cafe
*Camera

*Cake
*Canvas
*Card
Catarrh
*Chalk
Champagne
*Chauffeur
*Chemist
*Chemistry
*Cheque
*Chocolate
Chorous
Church
*Cigarette
*Circus

Citron
*Club
*Coat
Cocktail
*Coffee
Cognac
*Collar
*College
Colony
*Committee
Company
*Cork
Copyright
Dance
Degree

Shirt قمیص
Society
Soup
Sponge
Stage
Stamp
*Taxi
*Tax
*Tea چاء
*Telegram تار
*Telephone
Terrace
*Theatre
Tin
Toast
*Tobacco تمباکو
Toothpaste
Torpedo
University
Vanilla
*Violin سارنگی
Visa
Vodka
Volt
*Whisky
Zebra
Zinc
Zoology

*Paradise فردوس
Parrafin
*Park
*Parcel
Passport
Patent
*Pencil
Physics
*Pin آلپن
*Pipe
*Plate
*Polish
*Potash
*Powder
Prince
Princess
Psychology
*Public
Pump
Queen
*Quinine
Radio
Radium
*Railway ریل
Record
*School
*Science
*Secretary

Design
*Engine (Engineer)
Glycerine
*Hospital
*Hotel
Hyena
Hygiene
Hysteria
Insurance
Jazz
Jelly
King
Madam
*Malaria
*Manager
Mania
Market
Mathematics
*Minute
*Miss
*Money Order
*Mr. جناب
*Mrs. بیگم
Museum
*Note
*Number
Olive
Omelette

گریہ و تبسم

(۲)

از جناب محمد رضا صاحب انصاری، فرنگی محل، لکھنؤ

[رسالۂ اردو بابت ماہ اپریل ۴۷ء میں مرحوم جبران خلیل جبران کی کتاب «دمعة و ابتسامة» کے ایک جز کا ترجمہ ھدیۂ ناظرین کیا جاچکا ھے - اسی سلسلے کی یہ دوسری کڑی ھے - زیر نظر مضمون «دمعة و ابتسامة» کے بعض اھم اور بنیادی شاھکاروں کا اقتباس ھے -

ذیل کے ترجمے، خلیل جبران کی شدت احساس اور دقت نظر کے آئینہ دار ھیں، وہ ھر چیز کو ایک اور صرف ایک ھی پہلو سے دیکھتا ھے - اس کے نزدیک کائنات کا ھر ذرہ خالق کائنات کی ھستی کا پتہ دیتا ھے، ھر ذرے میں اس کی ھستی کار فرما ھے جس کا اثر یہ ھے کہ دنیا محبت، شفقت اور مہربانی سے بھری ھوئی ھے- ھر طرف نرمی ھے، ملاطفت ھے اور بے پناہ محبت کا دریا موجیں مار رھا ھے،

اگر کہیں اس حقیقت سے ھٹ کر اسے کوئی ایسی چیز نظر آجاتی ھے جو اس کے اس مشاھدے کو، اس عقیدے کو جھٹلادے تو چیختا ھے چلاتا ھے اور فوراً اصلاح کی طرف متوجہ ھوجاتا ھے -

اے کاش، اسے معلوم ھوتا کہ زندگی کا موجودہ ڈھانچہ اس تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کر ایک نیا قالب اختیار کرلے گا جہاں انسان انسان سے، بھائی بھائی سے، دوست دوست سے محبت کرنا گناہ سمجھیں گے، جہاں چرند و پرند، پالتو اور گھریلو جانور، ایک طرف خود انسانی زندگی اس قدر بے قیمت اور بے سہارا ھوجائے گی کہ دیکھنے والے اور محسوس کرنے والے دم بخود رہ جائیں گے، جہاں مشین کی حکومت اس طرح رائج ھوجائے گی کہ اس کے چکر میں مروت و محبت کے احساسات کچل کر رہ جائیں گے تو یقین ھے کہ اس کا قلم دوسرا رخ بدلتا اور انسانی زندگی کی حقیقی قدر و قیمت اس طرح ظاھر کرتا کہ پھر «چڑیا» اور «کتاب» ھمارے مطمح نظر سے بہت دور ھوجائے - مترجم]

سورج نے اپنے دامنوں—کرنوں—کو شاداب باغوں سے سمیٹ لیا، چاند نے افق کے پیچھے سے طلوع ھوکر ان باغوں پر ھلکا ھلکا نور برسانا شروع کیا،

میں وہاں—درختوں کے نیچے بیٹھا ہوا—فضا کی—ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف—پیہم تبدیلی پر غور کررہا تھا، شاخوں کے بیچ سے، ہر طرف بکھرے ہوئے ستارے ایسے معلوم ہورہے تھے جیسے نیلگوں فرش پر چاندی کے سکے پھیلے ہوئے ہوں، دور سے، وادی کی نہروں کی خرخراہٹ سنائی دیتی تھی -

جب—پتوں سے لدی ہوئی شاخوں پر پرندے خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے شگوفوں نے اپنی آنکھیں سونے کے لیے بند کرلیں تھیں اور ہر طرف خاموشی کا دور دورہ تھا—اس وقت، میں نے سبزے پر دھیمے دھیمے قدموں کی چاپ سنی - میں نے پیچھے مڑکر دیکھا، ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ میری طرف آتے معلوم ہوئے -

وہ دونوں ایک گھنے درخت کے نیچے، اس طرح بیٹھ گئے کہ میں انھیں دیکھ سکتا تھا مگر خود دکھائی نہیں دیتا تھا نوجوان نے—ادھر ادھر دیکھ بھال کر—کہنا شروع کیا :—

"میرے پہلو میں بیٹھ جا، اے میری محبوبہ! اور میری باتیں سن!!

مسکرا دے! تیرا تبسم ہمارے مستقبل کا آئینہ دار ہے -

خوش ہوجا! زمانہ ہماری وجہ سے مسرور ہے -

میرا دل ان شبہوں کو جانتا ہے جو تیرے دل میں پھانس کی طرح کھٹک رہے ہیں!

محبت کے معاملے میں شک کرنا گناہ ہے اے محبوبہ!

دیکھ! عنقریب تو اس ساری جائداد کی تنہا مالک ہوجائے گی جس کو یہ روپہلا چاند مستور کررہا ہے تو اس محل کی "رانی" کہلائے گی جو بادشاہوں کی محل‌سرا کا سا ہے -

تجھے میرے مضبوط اور تندرست گھوڑے مشہور سیرگاہوں تک لے جایا کریں گے -

میری خوبصورت گاڑیاں تجھے تھیٹر و سنیما لے جایا کریں گے -

مسکرادے، اے محبوبہ! اسی طرح جیسے "سونا" ہمارے خزانے میں ہنسا کرتا ہے میری طرف دیکھ! اسی طرح، جیسے میرے والد کے جواہرات مجھے دیکھا کرتے ہیں، "

میرا دل، تجھ سے کسی بھید کو چھپانا نہیں چاہتا۔

ہمارے سامنے ایک شہد کا سا شیریں دور آرہا ہے —

ایسا دور آرہا ہے جب کہ ہم سوئٹزر کے چشموں، اٹلی کی سیرگاہوں، دریائے نیل کے ساحلی مقاموں اور لبنان کے شاداب درختوں کے سایہ میں ریاست کے ساتھ، ٹھاٹھ سے زندگی بسر کریں گے، عنقریب شہر کی معزز اور دولت‌مند عورتیں تیری ملاقات کو آیا کریں گی اور تیرے لباس و زیور پر دل ہی دل میں کڑھیں گی۔

اتنا سب کچھ میری طرف سے تیرے لیے ہے، کیا اب بھی تو خوش نہیں ہے؟

آہ! تیرا تبسم کتنا لطیف ہے،

تیرا تبسم میری زندگی کی لطافت کا ترجمان ہے!"

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ دونوں بےنیازی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔

—اپنے قدموں سے شگوفوں کو اس طرح روند رہے تھے جیسے سرمایہ‌دار غریبوں کے دل کو —

وہ دونوں تو میری نظروں سے اوجھل ہوگئے مگر میں "محبت اور دولت" کے باہمی تعلقات کو سونچتا رہا:

دولت انسانی خباثتوں کی اصل! اور —

— محبت، روحانیت اور سعادت کا سرچشمہ!!

میں اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھا کہ دفعۃً میرے سامنے سے دو پرچھائیاں سی گزر کر سامنے گھاس پر ایک جگہ بیٹھ گئیں،

نوجوان اور دوشیزہ، جو کھیتوں کی اس سمت سے آئے تھے جدھر کسانوں کے جھونپڑے تھے!

تھوڑی دیر کی پُر اثر خاموشی کے بعد، گہری اور ٹھنڈی آہوں کے درمیان، ایک غمزدہ دل سے نکلتے ہوئے یہ الفاظ میں نے سنے:۔

"رو نہیں اے محبوبہ! محبت — جس نے اپنی ہی مرضی سے ہماری

آنکھوں کو بینائی عطا فرمائی' جس نے خود ہمیں اپنی خدمت گزاری کے لیے منتخب کرلیا ہے وہی — ہمیں صبر و استقلال کی دولت سے بھی مالامال کردے گی۔ رو نہیں' صبر سے کام لو' ہم دونوں نے تو محبت کے مقدس مذہب کی قسم کھائی ہے

اور اسی خوش گوار محبت کے برتے پر ہم مفلس کی تکلیف' بدبختی کی تلخی اور جدائی کی سوزش کو برداشت کریں گے' مجھے زمانہ — روزگار — سے ایک سخت "جنگ" کرکے اتنا "مال غنیمت" لےکر تیرے سامنے پیش کرنا ہے جو ہماری زندگی بھر کے لیے کافی ہو'

محبت' اے محبوبہ! — جس کا دوسرا نام "پرماتما" ہے — ہماری یہ آہیں اور یہ پاک و صاف آنسو ضرور قبول کرے گی۔ ہمیں وہ کسی برداشت سے باہر' زحمت میں مبتلا نہیں کرے گی۔

میں تمھیں رخصت کرتا ہوں اے محبوبہ!

چاند کے چھپنے سے پہلے مجھے روانہ ہوجانا چاہیے'

پھر میرے کانوں میں ایک نرم سی آواز آئی جو سانس کے ساتھ ہچکیوں کی آمدورفت سے بار بار ٹوٹ جاتی تھی یہ ایک دوشیزہ کی لطیف آواز تھی جس میں اس نے اپنے دل کی تمام کیفیتوں کا اظہار کردیا تھا'

— محبت کی گرمی' فراق کی تلخی اور استقلال کی چاشنی کے ساتھ اس نے کہا: —

الوداع اے دوست! الوداع

دونوں الگ الگ چلے گئے اور میں شاخوں کے سایہ میں بدستور بیٹھا رہا۔ "شفقت" کے ہاتھ مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور میں اس عجیب و غریب دنیا کے بھیدوں میں بھٹک رہا تھا۔

میں نے اس وقت "فطرت خوابیدہ" پر نظر کی اور غور کرنے لگا

مجھے ایک ایسی چیز ملی جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی تھاہ' —

— ایسی چیز جو دولت کے ذریعہ خریدی نہیں جاسکتی ہے

——ایسی چیز جس کو نہ خزاں کے آنسو مٹاسکتے ہیں اور نہ جاڑے کی غمگینی اسے ہلاک کرسکتی ہے

——ایسی چیز جو نہ سوئٹزرلینڈ کے چشموں کو نصیب ہے اور نہ اٹلی کی سیرگاہوں کو

مجھے ایک ایسی چیز ملی جو قائم رہتی ہے' جو بہار میں زندہ ہوجاتی ہے اور گرمی میں پھل دیتی ہے

——"مجھے وہاں محبت ہی محبت نظر آئی"

خواب و خیال

کھیت کے درمیان نہر کے کنارے ایک پنجرا پڑا ہوا تھا جس کی تیلیوں کو کسی ماہر کاریگر کے ہاتھ نے مضبوطی سے جمایا تھا'

پنجرے میں ایک طرف مری ہوئی چڑیا پڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف کونے میں ایک کلھیا تھی جس کا پانی سوکھ چکا تھا اور ایک دوسری کلھیا تھی جس میں دانہ ختم ہوگیا تھا'

میں ٹھہرگیا' میرے اوپر سنجیدگی و خاموشی نے قبضہ جمالیا تھا' میں اس کی طرف عقیدت سے جھک گیا——اس طرح گویا "بےجان پرندے" میں عبرت کا سبق ہے جسے دل معلوم کرنا اور سمجھنا چاہتا ہے'

میں نے سونچا کہ "یہ بیچاری چڑیا پیاس کی حالت میں موت سے لڑی' حالانکہ پانی کے چشمہ کے پاس ہی تھی اور موت نے اسے بھوک کی حالت میں آدبوچا' حالانکہ وہ کھیتوں——زندگی کی پرورش‌گاہ——کے درمیان موجود تھی۔ یہ ویسے ہی ہے کہ ایک امیر آدمی کو اس کے خزانے میں بند کردیا گیا ہو اور وہ بھوکا پیاسا اپنے "سیم و زر" کے ڈھیروں کے درمیان دم توڑے"۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ پنجرا دفعۃً بدل گیا اور اس نے گورے چٹے انسان کی شکل اختیار کرلی اور "مردہ چڑیا" انسانی قلب کی صورت میں بدل گئی جس میں ایک گہرا زخم ہے اور اس سے برابر سرخ خون ٹپک رہا ہے——زخم کے کنارے' غمگین عورت کے دونوں ہونٹوں کے مشابہ تھے۔

میں نے، خون کے قطروں سے ایک آواز نکلتی ہوئی محسوس کی جیسے کوئی کہہ رہا ہے:—

" میں ہی وہ قلب انسانی ہوں جو مادہ کا اسیر اور " خاکی " انسانوں کے قانون کا مقتول ہے حسن و جمال کی کھیتی کے درمیان، زندگی کے چشموں کے کنارے پر، مجھے ان قوانین کے پنجرے میں گرفتار کرلیا گیا ہے جن کو انسان نے محض اپنے جذبات کی تسکین کے لیے گھڑ لیا ہے'

لوگوں کے اخلاق اور اچھائیوں کی " پرورش‌گاہ " میں محبت کے سامنے میں بےقصور مرگیا، کیونکہ ان اچھائیوں کے نتیجے اور اس محبت کے پھل سے میں محروم کردیا گیا ہوں۔

جو کچھ مجھے اچھا لگتا ہے انسان اسے " رسوائی " خیال کرتا ہے، اور جو کچھ میں چاہتا ہوں اس کے قانون میں وہ عیب ہے' میں—قلب انسانی—قوانین اجتماع کی تاریکی میں قید کردیا تو میں کمزور ہوگیا۔ میں اوہام کی بیڑیوں میں جکڑ دیا گیا تو میں جاں بلب ہوگیا اور شہر کی گمراہی کے گوشوں میں ڈال دیا گیا تو مرگیا —باوجود اس کے انسانیت کی زبان گنگ اور آنکھ بے نم رہی—انسانیت تو مسرور تھی " ۔

میں نے یہ جملے سنے جو مجروح " قلب انسانی " کے خونی قطروں کے ساتھ نکل رہے تھے، اس کے بعد نہ میں نے کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا میں اپنی اصلیت کی طرف لوٹ آیا—

آتشیں حروف

میری قبر پر لکھدو:—

" یہاں اس شخص کی ہڈیاں ہیں جس کا پانی پر نام لکھا گیا تھا" (جان کیٹس)[۱]

Here Lies one whose life was writ on water (John Keats)

[۱] بائرن و شیلے کا ہم‌عصر مشہور شاعر جو اپنی جوانی میں مرگیا۔ یہ انگلینڈ کا بہت مشہور اور مایہ‌ناز شاعر تھا، گو عمر میں بائرن و شیلے سے چھوٹا تھا مگر اس نے اپنی مختصر عمر میں جو نام

کیا اسی طرح راتیں ہمیں لپیٹ لیں گی؟ کیا اسی طرح زمانے کے قدموں تلے ہمیں روندتی رہیں گی؟ کیا اسی طرح قومیں ہمیں لپیٹ کر رکھ دیں گی کہ ہمارا کوئی نشان باقی نہ رہے؟——

——سوائے ہمارے نام کے جو سیاہی کی بجائے پانی سے صفحات روزگار پر لکھا گیا ہے۔ کیا یہ روشنی اسی طرح بجھ جائے گی کہ نقوش محبت تو باقی رہیں مگر تمنائیں مایوس؟

کیا موت ہر اس چیز کو منہدم کردے گی جس کی ہم زندگی میں تعمیر کرتے ہیں؟

کیا ہوا، ہر اس چیز کو منتشر کر ڈالے گی جو ہماری زبان سے نکلتی ہے؟

اور—کیا تاریکی ہر اس چیز کو ڈھانپ لے گی جو ہمارے عمل کا نتیجہ ہے؟

کیا اسی کا نام «زندگی» ہے؟

——کیا وہ ایک «افسانہ ماضی» ہے جو اس طرح گزر گیا کہ اس کی نشانیاں تک مٹ گئی ہیں؟

——یا وہ «زمانہ حال» ہے جو تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے تاکہ ماضی سے مل جائے؟

——یا «زندگی» «مستقبل کا نام» ہے؟

مستقبل؟——جس کا کوئی وجود نہیں ہے جب تک کہ وہ گزر کر حال یا

پیدا کیا اور جتنی ترقی کی وہ ان دونوں شاعروں کو بھی نصیب نہیں ہوگی۔ اس کی شاعری میں جوش بے حد تھا، اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تصویرکشی کی حد کردی تھی، جس چیز کو یہ بتانا چاہتا، اس کا نہ صرف نقشہ کھینچتا بلکہ پانچوں حواس سے محسوس کرادیتا - ایسا معلوم ہونے لگتا کہ سننے والا چیز کو دیکھ بھی رہا ہے، چھو بھی رہا ہے، سونگھ بھی رہا ہے اور اس کے ذائقہ سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہے -

اس کی ایک دوشیزہ سے محبت بھی تھی لیکن اس سے شادی نہ کرسکا - محبت ہی کی وجہ سے آخر میں اسے دق ہوگئی جو بعد کو جان لیوا ثابت ہوئی -

کہا جاتا ہے کہ مدقوق آدمی جوشیلا ہوجاتا ہے شاید اس کی شاعری کا سارا جوش اس کے جان لیوا مرض دق کا مرہون احسان ہے -　　　رضا انصاری

ماضی نہ بن جائے۔

کیا ہماری تمام مسرتیں اور تکلیفیں اس طرح گزر جائیں گی کہ ہمیں ان کے نتیجوں کا علم تک نہ ہو؟

کیا انسان کی "زندگی" بس یہی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سمندر کے پھین کی طرح سطح آب پر نمودار ہو۔ پھر ہواؤں کی آمد و رفت سے غائب ہوجائے۔۔۔اس طرح گویا کبھی تھا ہی نہیں؟

نہیں! ہرگز نہیں!! اپنی "زندگی" کی قسم زندگی اس کا نام نہیں!!!

"زندگی"! نہ اس کی ابتدا رحم مادر سے ہوتی ہے اور نہ اس کی آخری منزل گور ہے!!

یہ زمان و مقام کا تصور، "ازلی اور ابدی حیات" کا ایک لمحہ ہے!

یہ "دنیاوی زندگی" اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ایک "خواب" ہے جس سے موت کی آواز جگائے گی۔

۔۔۔ایک خواب! لیکن اس خواب میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اور جو کرتے ہیں یہ سب باقی رہے گا۔

۔۔۔خدا کی بقا کے ساتھ۔

ایتھر، ہر تبسم اور ہر آہ کو جو ہمارے دل سے نکلے، ہاتھوں ہاتھ لے لیتی ہے اور ہر پیار کی صدا کو۔۔۔ جو ہوس سے نہ ہو بلکہ محبت جس کا مبدا ہو۔۔۔محفوظ کرلیتی ہے۔

ملائکہ، آنسو کے ہر اس قطرے کو شمار کرتے رہتے ہیں جو غم کی شدت سے ہماری آنکھوں سے ٹپکتا ہے اور ہر اس گیت کو فضائے لامحدود میں تیروں والی روحوں کو سناتے ہیں جو خوشی کے مارے ہمارے دل سے نکلتا ہے۔

وہاں۔۔۔ عالم ملکوت میں۔۔۔اپنے جذبات کی تمام حرکتیں اور اپنے دلوں کی تمام جنبش ہم دیکھ سکیں گے۔

وہاں۔۔۔اس روح کی حقیقت سمجھ سکیں گے جس کو آج مایوسی و ناکامی کے

بہ دولت ہم حقیر سمجھتے ہیں گمراہی — جسے آج ہم فضول اور بےکار سمجھتے ہیں کل اس طرح ظاہر ہوگی کہ گویا وہ حیات ابن آدم کے سلسلہ تکمیل کی اہم کڑی ہے مشقت — جو آج ہمارے برداشت سے باہر ہے کل ہماری بزرگی و فخر کا باعث ہوگی۔

تکلیف — جو آج ہمیں برداشت کرنا پڑتی ہے کل ہمارے سر کا تاج بن جائے گی۔

اگر شاعر — بلبل خوش‌نوا — جان کیٹس کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کے گائے ہوئے نغمے ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں محبت کی روح پھونکا کریں گے تو وہ یہ کہتا:

"میری قبر پر لکھ دو:—

یہاں اس شخص کی ہڈیاں ہیں جس کا نام بساط آسمانی پر آتشیں حروف میں لکھا ہوا ہے"

نالہ و فریاد — کھیتوں کے درمیان

منہ اندھیرے، شفق کے پیچھے سے سورج کے نکلنے سے قبل، میں کھیت کے بیچوں بیچ بیٹھا "فطرت" سے کانا پھوسی کررہا تھا۔

اس گھڑی — جب ہر طرف خوب‌صورتی اور ستھرے‌پن کا دوردورہ تھا۔ جب انسان "نیند" کے تہ بہ تہ لحاف میں چھپا ہوا کبھی خواب دیکھتا کبھی جاگ پڑتا — میں گھاس پھوس کی ٹیک لگاکر خود ہی حسن و جمال کی حقیقت کے ہر مشاہدے پر سوالات کررہا ہے اور آپ ہی آپ "حقیقت کی خوب‌صورتی" کی کہانی پوچھ رہا تھا،

اس وقت جب میں اپنے تصورات کے بہاؤ میں "بشریت" سے دور ہوگیا تھا اور میرے تخیلات نے حقیقت کے چہرے سے مادیت کی نقاب ہٹادی تھی — میں نے ایک روحانی بالیدگی محسوس کی جو مجھے "مظاہر فطرت" سے قریب کررہی تھی اور فطرت کے بھیدوں کو پروردگار فطرت کی زبان میں سمجھا رہی تھی۔

اسی اثنا میں نسیم سحری شاخوں کے درمیان آہیں بھرتی گزری جیسے لاچار یتیم

بچہ آہیں بھرتا ہے ۔ میں نے پوچھا :۔ آہیں کیوں بھرتی ہے ؟ اے خوشگوار نسیم ! اس نے مجھے جواب دیا :۔ اس لیے کہ میں " حرارت شمس " کی بھگائی ہوئی شہر کی طرف جارہی ہوں۔

شہر—جہاں میرے پاک‌دامن میں ہزاروں بیماری کے جراثیم چمٹ جائیں گے اور انسان کی زہریلی سانسیں میرے لگ جائیں گی ۔ اسی لیے تم مجھے رنجیدہ دیکھ رہے ہو

پھر میں شگوفوں کی طرف مڑا تو ان کی آنکھوں سے شبنم کے آنسو ٹپک رہے تھے ۔ میں نے پوچھا :۔ " یہ کیسا رونا ہے ؟ اے خوب‌صورت شگوفو ! "
ان میں سے ایک نے اپنا نازک سر اٹھاکر جواب دیا :—

"رو یوں رہے ہیں کہ تھوڑی دیر میں " انسان " آئےگا اور ہماری گردنیں کاٹ کر شہر لےجائےگا وہاں ہمیں غلاموں کی طرح بیچےگا حالانکہ ہم آزاد ہیں اور جب شام ہوجائےگی اور ہماری تازگی جاتی رہےگی تو ہمیں کوڑے پر پھینک دےگا۔

ہم کیسے نہ روئیں ' انسان کا ظالم ہاتھ عنقریب ہمیں اپنے وطن—کھیت—سے جدا کردےگا "

تھوڑی دیر کے بعد میں نے سنا کہ کھیت کی نہریں اس طرح بین کررہی ہیں جیسے کسی کا اکلوتا بچہ مرگیا ہو۔
میں نے پوچھا :۔ یہ بین آخر کس سے لیے ہورہا ہے ؟ اے شیریں نہرو !
ایک نہر نے جواب دیا " میں شہر جارہی ہوں ' جہاں انسان میری توہین کرتا ہے ' مجھ پر شراب کو ترجیح دیتا ہے اور مجھے صرف اپنی گندگی بہانے کی خدمت لیتا ہے '

میں کیوں نہ روؤں ' عنقریب میری پاکیزگی گندگی سے بدل جائےگی اور میری صفائی میل کچیل سے "
پھر میں نے کان لگائے تو کیا معلوم ہوا کہ جیسے پرندے رنجیدہ گیت گارہے ہیں مرثیہ کی طرح سے ' میں نے پوچھا " یہ مرثیہ خوانی کیسی ہورہی ہے ؟ اے خوب‌صورت چڑیو ! "

ایک چڑیا میرے پاس آئی اور ایک شاخ پر بیٹھ کر کہنے لگی :-
« ابھی ابھی « انسان » اپنا قاتل جہنمی اوزار لیتے ہوئے آئےگا اور ہمیں اس طرح کاٹ کر رکھ دےگا جیسے ہنسیا سے کھیتی کاٹی جاتی ہے' تو ہم ایک دوسرے کو رخصت کررہے ہیں' نہیں معلوم ہمیں سے کون اس اٹل قسمت سے بچ نکلے؟
ہم مرثیہ خوانی نہ کریں تو کیا کریں' ہم جہاں جاتے ہیں موت ہمارے پیچھے لگی رہتی ہے'
کوہ لبنان کے پیچھے سے سورج نکل آیا۔ اس نے درختوں کی چوٹیوں کو سنہرے تاج پہنا دیے اور میں اپنے ہی سے سوال کررہا تھا :-
« آخر انسان ہر اس چیز کے پیچھے کیوں پڑگیا ہے جسے فطرت پیدا کرتی ہے؟

جھونپڑا، ـــ اور ـــ محل'

شام ہوئی' بجلی کی روشنی سے سرمایہ‌دار کا محل جگمگا اٹھا'
ملازمین دروازوں پر مخملی وردیاں پہنے جن میں سنہرے بلے سینوں پر چمک رہے تھے' آنے والوں کا انتظار کررہے ہیں۔
پرلطف تانوں سے فضا گونجنے لگی'
معززین و معززات گروہ کے گروہ محل کے پھاٹک پر اپنے قدآور گھوڑے والی گاڑیوں سے ٹپکنا شروع ہوئے۔
زرق برق لباسوں میں اٹھلاتے لمبے لمبے فخر و اعزاز کے دامن کھینچتے محل میں داخل ہوئے۔
مرد کھڑے ہوئے اور انھوں نے عورتوں کو « ڈانس » کے لیے مدعو کیا۔
عورتیں کھڑی ہوگئیں' انھوں نے معززین کو اپنے لیے منتخب کرلیا۔
تھوڑی ہی دیر میں یہ سارا محل ایک باغ معلوم ہونے لگا جس میں موسیقی کی ہواؤں سے پھول غرور و تمکنت میں جھوم رہے ہوں'
رات آدھی ہونے لگی۔ ایک بڑا دسترخوان بچھایا گیا جس پر عمدہ عمدہ میوے اور رنگ رنگ کی نعمتیں چنی ہوئی تھیں'

پھر سب لوگوں کے سامنے پیمانوں نے گردش شروع کی، ان کی عقلوں سے دخت رز نے کھیلنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ لوگ خود کھیلنے لگے،

صبح ہوگئی۔ امرا و معززین کا یہ شیرازہ منتشر ہونا شروع ہوا۔

شب بیداری نے انھیں تھکادیا تھا، ان کی عقلوں کو شراب نے رفوچکر کردیا تھا، ڈانس کی وجہ سے وہ پست ہوگئے تھے اور بدنوں کے ٹوٹنے نے انھیں چور چور کردیا تھا۔

ہرایک اپنے گدگدے بستر پر چلا گیا۔

۲

سورج ڈوبنے کے تھوڑی دیر بعد ایک آدمی، کام کا جو لباس زیب تن کیے ایک جھونپڑے کے دروازے پر آ کر ٹھہر گیا، اس نے کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا اور وہ اندر ہوگیا، اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا اور بچوں میں گھس کر بیٹھ گیا جو بیٹھے آگ تاپ رہے تھے،

تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی نے رات کا کھانا لاکر رکھا۔ ان سب نے ایک لکڑی کے دسترخوان کے گرد جٹ کر روٹی نگلنا شروع کی، اس کے بعد وہ لوگ اٹھے اور ایک چراغ کے قریب بیٹھ گئے جو اپنی زرد زرد شعاعوں کے تیر تاریکی کے کلیجے پر پھینک رہا تھا۔

کچھ رات گزرنے کے بعد وہ سب مکمل خاموشی کے ساتھ اٹھ کر نیند کے متلاطم سمندر میں غرق ہوگئے۔

صبح ہوگئی۔ آدمی نیند سے بیدار ہوا، اس نے اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ تھوڑی سی باسی روٹی اور کچھ دودھ کھایا، پھر بچوں کو پیار کیا اور اپنا بھاری ہل کاندھے پر رکھ کر کھیت کی جانب روانہ ہوگیا تاکہ اپنی پیشانی کے پسینہ سے کھیت کو سیراب کرے، غلہ پیدا کرے اور ان تندرست و تنومند امیروں کے لیے جنھوں نے کل کی رات ناچ و رنگ میں بسر کی تھی،

پہاڑ کے پیچھے سے آفتاب نکلا، تپش کے بھاری بھاری قدم کسان کے سر کو

کچلنے لگے اور امرا اب تک اپنے عالیشان محلوں میں نیند میں مدھوش پڑے ہوئے تھے۔

گزرگاہ عالم میں انسان کی انسان کے ساتھ یہ بدسلوکیاں ہیں،

تماشہ دیکھنے والے بہت ہیں، غور و فکر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

رات کی خاموشی میں خدا کی بھیجی ہوئی "موت" سونے شہر کی جانب اتری اور ایک اونچے منارے پر رک کر اس نے اپنی روشن آنکھوں سے مکانوں کی دیواروں کو چیر کر دیکھا

——لوگوں کی روحیں خواب کے بازوؤں پر سوار اور جسم نیند کے اثر سے مغلوب تھے——

چاند شفق کے پیچھے چھپ گیا، شہر نے «خیال» کا نقاب اپنے اوپر ڈال لیا

——اوس وقت، «موت» دھیرے قدموں سے مکانوں کی طرف بڑھی

سامنے ایک رئیس و تندرست آدمی کا محل تھا،

وہ اندر داخل ہوگئی، اسے دربان روک نہ سکے۔

رئیس کی مسہری کے پاس کھڑے ہوکر اس کی پیشانی چھوئی، وہ نیند سے چونک پڑا، اپنے سامنے «موت کا تصور» دیکھ کر خوف اور غصہ کے ملےجلے خیالات کے ماتحت چیخنے چلانے لگا۔ اس نے کہنا شروع کیا، یہاں سے دور ہوجا، اے ڈراؤنی خواب!

نکل اے بدمعاش خیال! تو یہاں کیسے آیا چوٹے! تو کیا چاھتا ہے

اے اچکے بدمعاش! یہاں سے چلا جا، میں اس گھر کا مالک ہوں!

فوراً چلا جا، ورنہ میں اپنے غلاموں اور چوکیداروں کو پکارتا ہوں وہ تیری دھجیاں بکھیر دیں گے،

موت اور قریب ہوئی، اس نے کڑک‌دار آواز سے کہا:—

«میں ہی موت ہوں، ہوشیار ہو، اور سمجھو»

صحیح تندرست رئیس آدمی نے کہنا شروع کیا:—

تو مجھ سے تو کیا چاہتی ہے' تیرا کیا ارادہ ہے؟ تو یہاں کیوں آئی ہے حالانکہ ابھی تو میرے تمام کام ادھورے ہی ہیں؟ تو مجھ ایسے تندرست آدمی سے کیا لےگی؟

جا' بیماروں کے پاس جا! یہاں سے چلی جا' مجھے اپنے خونخوار پنجوں اور سانپ کے ایسے گیسوؤں سے کیوں ڈرا رہی ہے'

کچھ دیر کی وحشتناک خاموشی کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا:—

"نہیں نہیں! اے رحم دل موت!! میرے کہنے کا خیال نہ کرو' خوف کے مارے میں نے تمھیں برا بھلا کہا تھا' ڈر میں تو ناجائز باتیں بھی جائز ہوجاتی ہیں'

تم میرے سونے کے ڈھیروں سے ایک ڈھیر لے لو یا پھر میرے غلاموں میں سے چند کی جانیں لےکر چلی جاؤ' اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو'

میرا تو ابھی' اے موت' زندگی کا حساب پورا بھی نہیں ہوا ہے' لوگوں کے پاس میرا مال ہے وہ بھی ابھی واپس نہیں لے سکا ہوں'

سمندروں میں ابھی میرے بہت سے جہاز ہیں جو ساحل تک نہیں پہنچ سکے ہیں' میں نے زمین میں جو کچھ بویا تھا وہ بھی ابھی اگا نہیں ہے'

تمھارا جو جی چاہے ان چیزوں میں سے لے سکتی ہو' مگر مجھے چھوڑ دو'

میری بہت سی لونڈیاں ہیں' صبح روشن کی طرح حسین و جمیل' اس میں جس کو پسند کرو' لے سکتی ہو'

سنو تو' میرا ایک اکلوتا بچہ ہے۔ میں اسے بہت چاہتا ہوں وہ ہی میری تمناؤں کا مرکز ہے' اسی کو لے لو اور مجھے چھوڑ دو' جو جی چاہے لے لو' تم سب لے سکتی ہو مگر مجھے چھوڑ دو'

اب موت نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس بندۂ حیات کے منہ پر رکھ دیا' اس کی روح لے کر ہوا کے سپرد کردی'

"موت" غریبوں کے محلہ کی طرف بڑھی

سامنے ایک چھوٹا سا گھر تھا'

وہ اندر داخل ہوئی' تخت پر ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ ابھی کچھ عمر بھی

زیادہ نہیں ہے! اس کے پُر سکون چہرے پر تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد' موت نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا' وہ جاگ گیا' وہ موت کو اپنے پاس دیکھ کر گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جھک گیا' اپنے ہاتھ بڑھا کر اس نے کہنا شروع کیا۔ ایسی آواز سے جس میں محبت و اشتیاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا:—

"ہاں میں یہاں ہی ہوں اے حسین موت! مجھے قبول کر لے' اے میرے خوابوں کی تعبیر' اے میری آرزؤں کا مرکز! مجھے چمٹا لے اے میری محبوبہ! تو بہت رحم دل ہے' اب مجھے یہاں نہ چھوڑ' تو خدا کی فرستادہ ہے'

میں کتنی بار تجھے پکار چکا ہوں مگر تو نے سنا ہی نہیں' آج تو نے سن لی' اب میرے اصرار کا جواب انکار سے نہ دے' میری روح کو گلے لگا لے اے میری محبوب موت!"

موت نے اپنی نازک انگلیاں نوجوان کے ہونٹوں پر پھیریں اور اس کی روح کو لے کر اپنے پروں کے اندر رکھ لیا'

جب موت نے اوپر جاکر دنیا کی طرف دیکھا' اس نے یہ جملے ہوا میں پھیلا دیے:—

" ابدیت کی طرف صرف وہی لوٹ کر جا سکتا ہے جو ابدیت سے آیا ہے"

بےزبان مخلوق

فی نظرات الحیوان الابکم کلام تفھمہ نفس الحکیم (شاعر ھندی) "بےزبان جانور کی بھی نگاھوں میں اظہار خیال کا ایک انداز ھوتا ہے جسے "حکیم" ھی سمجھ سکتا ھے" (ٹیگور)

ایک شام کو جب کہ میری عقل جذبات و خیالات سے مغلوب تھی' میں شہر کے باھر ٹہلتا ھوا چلا گیا' ایک ویران گھر کے قریب جو بہت بوسیدہ تھا جس کے چاروں طرف وحشت برس رھی تھی' کھنبے آگے کی طرف جھک گئے تھے اور یہ صاف پتہ چلتا تھا کہ کبھی ضرور یہاں چہل پہل ھوگی مگر اب تو ھر طرف اداسی ھی اداسی تھی' میں ٹھہر گیا'

وھیں ایک بیمار کتا خاک پر پڑا ھوا تھا' سارا جسم زخموں سے چھلنی تھا اور

لاغر و کمزور بدن کا۔ بیماری کی تکلیف سے یہ حال تھا کہ ایک ایک پسلی دکھائی دیتی تھی ' کتا ڈوبتے ہوئے سورج سے آنکھیں ملائے خاموش پڑا ہوا تھا——

——وہ آنکھیں جو سراپا مایوسی تھیں ' جن میں بےبسی اور ناامیدی جھلک رہی تھی ' ایسا معلوم ہوتا تھا ' گویا کتے کو یہ محسوس ہورہا ہے کہ سورج اپنی شعاعوں کی گرمی کو اس ویران اور اجڑے ہوئے دیار سے واپس لیے جارہا ہے ' حالانکہ وہی گرم شعاعیں غریب بیمار جانور کی جان تھیں '

وہ حسرت بھری نظروں سے سورج کو رخصتی پیغام دے رہا ہے۔

میں یہ سوچتے ہوئے اس کی طرف بڑھا :۔ " کاش میں کتے کی بولی جانتا ہوتا تو میں اس کو دلاسا دیتا اور اس تکلیف میں اس سے ہمدردی ظاہر کرتا "

جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا اس نے اپنی "باقی ماندہ" قوت سے جو قریب الختم تھی ' اٹھنے کی کوشش کی اور اپنے شل اور مرض زدہ پیروں پر جو عنقریب بالکل ناکارہ ہوجائیں گے ' زوردیا تاکہ بھاگ کھڑا ہو '

وہ کھڑا بھی نہ ہوسکا ' اس نے میری طرف دیکھا ——

——ایسی نظروں سے دیکھا جس میں طلب رحم کی تلخی اور فریاد رسی کی چاشنی تھی

——ایسی نظروں سے جس میں فریاد کے اور نفرت کے آثار ایک ساتھ پائے جاتے تھے

——اس نے ایسی نظروں سے دیکھا جو گفتگو کے قائم مقام تھی '

یہ گفتگو انسان کی بات چیت سے زیادہ صاف اور عورت کے آنسو سے زیادہ موثر تھی ' اس سے آنکھیں چار کرتے ہی میرے رحم کے جذبات بیدار ہوگئے اور احساسات میں حرکت ہونے لگی۔ وہ نگاہیں ایسا معلوم ہوا گویا مجسم ہوکر میرے سامنے کھڑی ہوگئی ہیں ' انھوں نے انسانوں کی طرح روزمرہ کی بول چال میں کہنا شروع کیا '

اس کی نگاہوں نے یہ کہا :——

" مصیبتوں کی حد ہوچکی ' انسانوں کی سنگ دلی و ظلم جو میں بھگت رہا ہوں ' کافی ہے اور مرض کی تکلیفیں کیا کچھ میں نے نہیں جھیلی ہیں ' اب خدارا تم چلے جاؤ ' مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ' میں خاموشی سے پڑا ہوا سورج کی گرمی سے

زندگی کے لمحے بڑھا رہا ہوں، میں ابن‌آدم کی سنگدلی اور مظالم سے تنگ آ کر یہاں بھاگ آیا ہوں، میں نے خاک کو اپنا دوست و پشت‌پناہ بنا لیا ہے جو انسان کے دل سے کہیں زیادہ نرم و لطیف ہے،

میں نے ویرانوں میں آ کر اپنا سر چھپایا ہے جو خود انسان سے بہر حال کم وحشتناک ہیں

میرے پاس سے چلے جاؤ، کچھ بھی کیوں نہ ہو، ہو تو تم اسی زمین کے رہنے والے جس میں ہمیشہ جھوٹ فیصلے کیے جاتے ہیں، جہاں عدل و انصاف کا نام و نشان بھی نہیں ہے،

مجھے دیکھو! میں ایک ناچیز جانور ہوں، مگر میں نے ہمیشہ ابن‌آدم کی خدمت کی، میں اس کے گھر میں اس کا خیرخواہ و وفادار رہا۔ اس کے ساتھ سفر میں اس کا محافظ و نگہبان رہا، میں اس کے غم کا شریک اور خوشی کا ساتھی رہا۔

میں اس کی غیرموجودگی میں اس کو یاد کرتا اور ہمیشہ اس کے آنے پر زبردست استقبال کرتا۔ میں نے اس کے دسترخوان کے ذروں پر زندگی بسر کی اور اس کی چھچھوڑی ہوئی ہڈی کو نعمت سمجھتا رہا لیکن——جب میں بوڑھا ہوگیا، میرے اعضا بےکار ہوئے اور بیماریوں کے پنجوں نے میرے جسم کو کھروچنا شروع کیا تو اس نے مجھے دھتکار دیا، اپنے گھر سے نکال دیا اور میں گلی کوچے کے سنگ دل چھوکروں کا کھیل بن کر رہ گیا۔ بیماریوں کے بےخطا تیروں نے مجھے اپنا ہدف بنالیا اور اب میں غلاظتوں کے ٹھہرنے کا ٹھکانا ہوکر رہ گیا ہوں،

میں، اے ابن‌آدم! اگرچہ ایک حقیر جانور ہوں مگر مجھے بھی ایک گونہ نسبت تمہارے ان بہت سے بھائیوں سے ہے جن کے قویٰ آج کمزور ہوگئے تو ان کی روزی کے لالے پڑگئے اور جینا دوبھر ہوگیا،

میری مثال سپاہیوں کی سی ہے جو وطن کی خاطر نوجوانی میں اپنی جان لڑاتے ہیں اور جوانی میں زمین سے منافع حاصل کرتے ہیں، مگر جب زندگی کا موسم سرما آتا ہے اور ان کی ضرورت نہیں رہتی تو لوگ انہیں نکال دیتے ہیں

اور ان کی یاد تک دلوں سے محو ہوجاتی ہے۔ میں اس عورت کی طرح ہوں جو اپنی نوجوانی میں نوجوان دل کے خاطر خوب بناؤ سنگار کرتی ہے اور جب بیوی ہوجاتی ہے تو بچوں کی پرورش کے خیال سے رات رات بھر جاگا کرتی ہے اور جب وہ ادھیڑ عمر کی عورت ہوجاتی ہے تو مستقبل کے لیے مردوں کو تیار کرتی ہے مگر جب بوڑھی اور معذور ہوجاتی ہے تو حرف غلط کی طرح نسیاً منسیا کردی جاتی ہے——

——سوسائٹی کے دامن پر ایک بدنما دھبہ معلوم ہونے لگتی ہے'

آہ! اے ابن آدم!! کوئی ٹھکانا ہے تیرے ظلم کا؟ کوئی جواب ہے تیری سنگ دلی کا؟

اس جانور——کتے——کی نگاہیں کچھ رہی تھیں اور میرا دل سمجھ رہا تھا' کبھی اس پر ترس آتا تھا اور کبھی اپنے ہم جنسوں کا——ہیبت ناک——تصور'

اس نے آنکھیں بند کرلیں' میں پھر اسے چھیڑنا نہیں چاہتا تھا'
اس کے پاس سے چلا آیا........

آہ! اے ابن آدم!! کوئی ٹھکانا ہے تیرے ظلم کا؟ کوئی جواب ہے تیری سنگ دلی کا؟

دل کی باتیں

عالیشان محل میں——جو رات کے پروں کے سایہ میں اس انداز سے کھڑا ہے جیسے "زندگی"

موت کے پردوں کے درمیان——لڑکی' ہاتھی دانت کے میز کے پاس' اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے——جیسے چنبیلی کا سوکھا ہوا پھول اپنے پتوں پر اٹکا ہو——بیٹھی ہوئی ہے۔ اپنے گرد رہ رہ کر اس طرح نظر ڈالتی ہے گویا ایک حسرت زدہ قیدی اپنے چاروں طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا ہے کہ موقع پاکر قیدخانے کی دیواروں میں چھید کرکے "زندگی" کے اس رخ کو دیکھنا چاہتا ہے جب زندگی

آزادی کے مرکب پر سوار ہو ،

گھنٹے ـــــ اندھیرے کے سایوں کی طرح سے ـــ گزر رہے ہیں اور یہ لڑکی اپنے آنسوؤں کی روانی کے ساتھ تنہائی و اشتیاق کے عالم میں اسی طرح بیٹھی ہے جس طرح پہلے بیٹھی تھی ،

جب جذبات کا بوجھ اس کے دل پر زیادہ سے زیادہ ہونے لگا اور احساسات، جذبات کی تہ تک پہنچنے لگے ' اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ کے صفحوں پر روشنائی کے ساتھ آنسوؤں کی آمیزش شروع کردی ، قلمی گفتگو کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دل کی چھپی ہوئی باتیں بھی سپرد قلم کردیں '

اس نے یہ عبارت لکھی :-

اے عزیز بہن !

جس وقت دل اپنے بھیدوں سے تنگ آجاتا ہے ' جب پلکیں آنسوؤں کی سوزش سے زخمی ہونے لگتی ہیں اور جب دل کی باتیں بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ پسلیاں پھٹنے لگتی ہیں اس وقت ــــ انسان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا کہ خوب شکوہ و شکایت کرے اور دوسرے سے گفتگو کرکے اپنا بوجھ ہلکا کرے

اے دوست غمگین کو شکوہ و شکایت میں لذت ملتی ہے ،

مظلوم کو رحم کی درخواست کرنے ہی میں مزہ ملتا ہے '

عاشق کو گزری ہوئی شباب کی باتوں ہی سے تسکین ہوتی ہے

تو اسی وجہ سے میں اس وقت تم کو خط لکھ رہی ہوں ' میری مثال اس وقت ایک « شاعر » کی سی ہے جو اشیاء عالم کی خوبصورتی اور جمال کو دیکھتا ہے ؛ اس کے بعد اپنی قوت تخلیق سے مجبور ہوکر ان اثرات کو نظم کی صورت میں دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے '

یا میری حالت ایک بھوکے ' مفلس بچے کی سی ہے جو اپنی بھوک کی شدت سے تنگ آ کر فریاد کرتا ہے اور بھیک مانگتا ہے ' اس وقت اسے اپنی بھوکی ماں کی

تکلیف کا خیال بھی نہیں ہوتا '

اے بہن ! اب میرا دلگداز واقعہ سنو اور میری حالت پر آنسو بہاؤ ' میری تکلیف پر خوب رو لو ! کیوں کہ رونا ایک عبادت ہے اور مہربانی و محبت کے آنسو ـــــ احسان کی طرح ـــــ ضائع نہیں ہوئے ' وہ آنسو تو ایک حساس و زندہ دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں !

........میرے والد نے اپنی مرضی اور ارادے سے میرا رشتہ ایک شریف اور مال‌دار آدمی کے ساتھ جوڑدیا ـــــ اسی طرح جیسے ہر باپ جو ذرا سا بھی شریف اور مال‌دار ہو یہی چاہتا ہے کہ شرافت کا رشتہ شرافت سے جوڑا جائے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمانے کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو ، دولت کا ناتہ دولت سے ملایا جائے ورنہ ڈر ہے کہ ایک وقت کہیں مفلسی نہ اپنا اثر قائم کرے ' بہرحال میری شادی ایک دولت‌مند اور شریف خاندان میں ہوگئی

میں اپنے تمام جذبات اور تمناؤں کے ساتھ دولت کی قربان‌گاہ پر چڑھادی گئی جسے میں بہت ذلیل سمجھتی ہوں ' مجھے شرافت اور عزت کی بھینٹ کردیا گیا جس سے میں نفرت کرتی ہوں '

میں ایسا « شکار » ہوں جو « مادیت » کے چنگل میں کانپ رہا ہے

ـــــ « مادیت » ؟ ـــــ اگر روحانیت کی خادم اور اس کی مطیع نہیں ہے تو موت سے زیادہ تکلیف‌دہ اور جہنم سے ناگوار ہوجاتی ہے !

مجھے اپنے شوہر پر اعتماد ہے کیونکہ وہ اچھے اخلاق و صفات کے حامل ، نیک‌دل ہیں ' میری دلچسپی کے واسطے ہر امکانی کوشش کرتے ہیں ' میری خوشی کے لیے بے دریغ روپیہ صرف کرتے ہیں ـــــ لیکن میں کہتی ہوں کہ یہ تمام باتیں مل‌کر وہ اثر نہیں پیدا کرسکتی ہیں جو پاک اور سچی محبت کا ایک لمحہ پیدا کردیتا ہے '

« ـــــ وہ محبت جو ہر چیز کو پست اور کم‌تر سمجھنے کے بعد بھی خود معزز اور محترم ہے »

مذاق نہ سمجھو اے دوست ! میرا مضحکہ نہ اڑاؤ ۔ اس وقت میں سب سے زیادہ '

ہر شخص سے زیادہ ‹ عورت کی قلبی ضرورتوں › کو سمجھ رہی ہوں'
''ــــ عورت کا دل ‹ ؟ــ یہ دھڑکتا ہوا دل ! یہ محبت کی وسیع فضا میں پرواز کرنے والا پرند! ! یہ شراب دہر سے بھرا ہوا پیمانہ جو روحوں کے نوش کرنے کے لیے مہیا کیا گیا ہے !! یہ کتاب جس میں بدنصیبی و سعادت' لذت و تکلیف اور خوشی و غم کے ابواب و فصول علیحدہ علیحدہ چھپے ہوتے ہیں جسے صرف ایک سچا رفیق عورت کی زندگی کا وہ شریک جو ازل سے ابد تک کے لیے بنادیا گیا ہے' پڑھ سکتا ہے'ــــ

ہاں ! ہاں !! میں نے عورت کو اس کی دلی خواہش اور اس کے میلان قلب کے اعتبار سے اسی وقت سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا جب کہ میرے شوہر کے توانا وتندرست گھوڑے' اس کی خوبصورت گاڑیاں' اس کے کبھی ختم نہ ہونے والے خزانے اور اس کی شرافت نسبی یہ سب چیزیں میری نظر میں اس غریب شخص کی ایک نگاہ کے برابر بھی نہ ہوسکیں جو ازل سے میرا ہوکر آیا تھا اور میں اس کی وجہ سے اس دنیا میں آئی تھی'

ــــ وہ صابر و شاکر جو مصیبتوں کی شدت اور جدائی کی ذلت کو برداشت کررہا ہے وہ مظلوم جو میرے باپ کی مرضی و خواہش کا شکار ہوا'
وہ گرفتار محسن جو بلا کسی جرم کے ‹ زندگی کی تاریکی › میں پھنس گیاــــ
اے بہن ! تم مجھے تسکین دینے کی زحمت نہ کرو' ان مصائب ہی میں سے مجھے تسکین دینے والی بہت سی چیزیں ہیں' میں اپنی محبت کی طاقت کو خوب سمجھتی ہوں' میں اپنے شوق و اشتیاق کی اہمیت و بزرگی کو اچھی طرح پہچانتی ہوں'

میں جب آنسوؤں کے پردے سے جھانک کر دیکھتی ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ موت رفتہ رفتہ مجھ سے قریب ہو رہی ہے اور مجھے اس منزل سے قریب کرنا چاہتی ہے جہاں پہنچ کر میں اپنے ‹ سچے رفیق › کا انتظار کروں گی' اس سے ملوں گی' اس سے ایک طویل اور پاک معانقہ کروں گی'

مجھے ملامت نہ کرنا اے بہن ! میں نے ‹ بیوی ہونے کے فرائض › میں ذرا سی کوتاہی نہیں کی' میں اب تک ایک وفادار اور امانت‌دار بیوی کے فرائض ادا کررہی

هوں اور « انسانی شریعت کے احکام » پر بہادری اور سکون کے ساتھ عامل هوں '

میں اپنے شوھر کی عزت کرتی هوں ' هوش و حواس کے ساتھ ' میں ان پر بھروسہ کرتی هوں دل سے اور میں انھیں بزرگ اور محترم سمجھتی هوں اپنے سے ' ——مگر میرے لیے ناممکن هے کہ میں اپنے کو « بالکل » ان کے سپرد کردوں ' اس لیے کہ اللہ تعالی نے میرے جاننے سے پہلے هی مجھے میرے حبیب کے سپرد کردیا تھا ۔

فلک کی یہی مرضی هے——کسی پوشیدہ حکمت کی وجہ سے——کہ میں اپنی دنیاوی زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ بسر کروں جس کے لیے میں پیدا نہیں کی گئی هوں ' تو میں فلک کی مرضی کے ماتحت یہ زندگی بسر کررهی هوں سکون و اطمینان کے ساتھ ' ——

لیکن جس وقت ابدیت کے دروازے کھل جائیں گے ' میں شریک زندگی سے جا ملوں گی ' اور اس وقت میں « ماضی میں » —— وہ ماضی بھی آج کل کا زمانہ هے —— ایک نظر ڈالوں گی جیسے بہار کا موسم گزرے هوئے جاڑوں پر ایک نظر ڈالتا هے '

اس وقت میں اپنی اس زندگی پر سونچوں گی اور دیکھوں گی جس طرح وہ شخص جو پہاڑ کی بلندی پر پہنچ گیا هو نیچے گھاٹیوں کو دیکھتا هے »

وہ لکھتے لکھتے اٹھ کھڑی هوئی اور اپنے دونوں هاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر رونا شروع کردیا گویا اس کے دل نے انکار کردیا کہ اس کے سب سے مقدس بھید کاغذ تک منتقل هو تو اس نے اپنے مقدس بھید کو گرم آنسوؤں کے سپرد کردیا جو بہت تیزی سے خشک هوجاتے هیں اور ایتھر میں مل جاتے هیں جو عاشقوں کی سانسوں کا مسکن اور شگوفوں کی روحوں کا وطن هے ' ۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر قلم اٹھایا اور لکھنے لگی :—

« کیا تمھیں یاد هے اے میری عزیز بہن ! وہ نوجوان ؟

· کیا تمھیں یاد هیں وہ شعاعیں جو اس کی آنکھوں سے پھوٹ رهی تھیں اور غم

جو اس کی پیشانی پر لکھے ہوئے تھے ؟

کیا تمھیں یاد ہے، اس کی ہنسی جو اس عورت کے آنسوؤں سے بہت مشابہ تھی جس کا اکلوتا لڑکا مر گیا ؟

کیا تمھیں یاد ہے اس کی آواز جو دور دراز وادی کی صدائے بازگشت کی سی معلوم ہوتی تھی ؟

کیا تمھیں یاد ہے، جب وہ چیزوں کو غور سے دیکھتا تھا دیر تک خاموشی کے ساتھ، پھر ایک مجنونانہ انداز میں باتیں کرنے لگتا، پھر خود ہی اپنا سر جھکا لیتا اور اس طرح آہیں بھرنے لگتا گویا وہ ڈرتا ہے کہ اس کی گفتگو سے کہیں اس کے دل ---«بریے دل»--- کی چھپی ہوئی باتیں ظاہر نہ ہوجائیں ؟

کیا تم کو اس کی آرزوئیں اور عقیدے یاد ہیں ؟

کیا تمھیں یہ سب چیزیں یاد ہیں ایک ایسے نوجوان میں جو انسانوں کی نظر میں تو انسان ہے مگر میرے والد نے حقیر سمجھا اس لیے کہ وہ ذلیل خواہشوں اور لالچوں سے بہت اونچا ہے اور اس سے زیادہ شریف ہے کہ اپنے باپ دادا سے شرافت ورثہ میں پائے ؟

تم جانتی ہو نہ ؟ اے میری بہن ! کہ میں «جہالت» کی ماری ہوئی ہوں - میں اس دنیا کے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئی ہوں، تم رحم کھاؤگی ؟ اپنی اس بہن پر جو رات کی خوفناک خاموشی میں جاگ رہی ہے تاکہ تمھارے سامنے اپنے سینے کی چھپی باتوں پر سے حجابات دور کر دے،

تم رحم ضرور کھاؤگی کیونکہ تمھارا دل بھی محبت کی زیارت کر چکا ہے'

صبح ہوگئی، لڑکی اٹھی اور نیند کی پناہ میں چلی گئی، شاید نیند ہی میں اسے بیداری کے خوابوں سے اچھے خواب نظر آئیں، ....

اردو یا ہندستانی

(از جناب شاہ مقبول احمد صاحب ایم۔ اے)

موجودہ سیاسی فضا میں ہم زبان کے سوال کو بھی لسانیات کی بجائے سیاسیات ہی کا ایک مسئلہ سمجھ گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عجیب عجیب تحریکیں اور تجویزیں عمل میں آرہی ہیں۔ ایک طرف تو ایک طبقہ غیرہندستانی (زبان) احاطوں سے رشتہ اتحاد کی خاطر اپنی ہندستانی میں سنسکرتی اور پراکرتی اجزا کے غلبہ کا حامی ہے۔ دوسرا گروہ اس کی تائید اس لیے کررہا ہے کہ قدیم و جدید تہذیب کو ملائے رکھنے کے لیے یہ ایک مضبوط کڑی ہے اور تماشا یہ ہے کہ اس تحریک کو اس جماعت کی بھی حمایت حاصل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کی ہوئی تہذیب سے خود کو بیزار بتلاتی ہے اور جہاں اشتراکیت ہی کے نعرے گونجتے ہیں۔ عربی و فارسی عناصر چونکہ اسلامی اقتدار کی یادگاریں ہیں اس لیے ایک فرقہ سنسکرت کی طرف اس لیے بھی جھک رہا ہے۔ پھر اسی طبقہ میں ان کی بھی شمولیت ہے جن کے متحدہ قومیت کے نظریہ کی رو سے عربی و فارسی والے ایک الگ قوم نہیں بلکہ اسی ایک ہندستانی قوم کے رکن ہیں۔

دوسری جانب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک حلقہ میں اس منظم تحریک کے خلاف جدوجہد جاری ہے۔ یہاں ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ ہم دوسروں (غیرہندستانی احاطہ) سے روشناس کرنے کے لیے خود اپنے گھر میں اپنی زبان کو اجنبی نہیں بناسکتے۔ عربی و فارسی الفاظ ہمارے ساتھ آئے ہیں۔ اس سر زمین پر ہم جب تک موجود ہیں ان کے شہری حقوق اس وقت تک محفوظ رہیں گے۔ قدرتی طور پر عربی و فارسی کا دامن ہمارے ہاتھوں میں ضرور ہے مگر اب گرفت ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ بزرگوں

کے مٹے ہوئے نقش قدم ابھر ابھر کے آنکھوں کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں اور اب ہم اس راہ میں پھر بھٹک نہیں سکتے ۔ ہماری نگاہیں خزف ریزوں کے ڈھیروں میں بھی جواہر پارے ڈھونڈھنے میں کامیاب ہورہی ہیں ۔ فارسی عربی اثرات کو روز بہ روز کم ہوتے ہوئے بہ رضا دیکھنے والوں میں ایک بڑی تعداد ان خوف زدہ حضرات کی بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اگر ایسا نہیں کیا گیا تو خوف ہے کہ زبان بے پناہ ہوکر ایک فرقہ کی بولی ہوکر نہ رہ جائے ۔ کچھ ایسے لوگ بھی اس امر کے خواہاں ہیں جن کا خیال ہے کہ اس کے سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو تا کہ اس کے حامیوں کا ایک بڑا گروہ اس کو مٹائے جانے سے بچالے ۔ بعض بزرگوار دلی اور لکھنؤ کے محلات کی تربیت یافتہ ' شائستہ اور خواص پسند زبان میں (جو شرفا اور رؤسا کی محفلوں میں باریاب تھی) عوام کے غیرمہذبانہ غلبہ اور ہڑبونگ کو دیکھ کر انقلاب زمانہ اور گردش روزگار کی دہائی دے رہے ہیں ' آنکھیں سوئے چرخ ہیں اور زبان پر فریاد فریاد ہے ۔

ان مختلف خیالات اور بعض متضاد نظریوں کے مطالعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے اہم مسائل پر غور کرتے وقت موضوع سے کسی قدر دور بھٹک جاتے ہیں ۔ جذبات کی یہ سیلانی دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی دماغ پر ہم قابض نہیں ہیں بلکہ دل ہم سب پر حکمراں ہے ۔ قطع نظر اس سے کہ ان نظریوں کی صحت اور ان کے معقول ہونے کا کوئی قرینہ ہے بھی یا نہیں کم از کم یہاں پر یہ ایک صاف سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک لسانی مسئلے کا سیاسی پہلو اتنا غلبہ پا چکا ہے کہ بحث و نظر کے اور گوشے ہمیں دکھائی نہیں دیتے ۔

ایک طرف امیدوں کا وسیع میدان ہے ' جوش و خروش ' بڑھے ہوئے ولولے ' بلند حوصلے اور فلک شگاف نعرے ہیں ' دوسری طرف دلوں میں اندیشوں اور خطروں نے مستقبل کی طرف سے ایک یاس انگیزی سی پیدا کردی ہے ۔ دیکھیں آخر ان کی حقیقت کیا ہے ۔ اس خیال سے اس مسئلے پر لسانی نقطۂ نظر سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔

ہندستان کے جس علاقے میں مسلمان فاتحین پہلے پہل داخل ہوئے اور جس مقام میں ہندو مسلم اقوام کے میل جول کا سب سے پہلے موقع پیش آیا وہیں اردو پیدا ہوگئی۔ مسلمان مورخین کی اس رائے کی تائید مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ اسے مندرجہ ذیل طریقہ پر جانچا جائے۔

مغربی ہندی میں یہ بولیاں شامل ہیں: (۱) پنجابی (۲) ہریانی (۳) راجستانی (۴) برج (۵) قنوجی (٦) بندیلی۔ یہ بولیاں آج کے ہندستان کے نقشے کے لحاظ سے مغربی یوپی، مشرقی پنجاب اور متوسط ہند کے بعض شمال مغربی علاقے میں رائج ہیں۔ قدیم ہندو جغرافیہ کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ پورا علاقہ مدھ دیس (Midland) کے نام سے موسوم تھا اور اسی لیے ان بولیوں کو مدھ دیسی بولیاں بھی کہتے ہیں۔ اردو کا مولد و منشا یہی علاقہ ہے۔ مگر ان بولیوں میں سے کسی ایک اکیلی بولی کی ترقی یافتہ شکل کا نام "اردو" نہیں ہے۔ یعنی یہ کہنا صحیح نہیں کہ جب برج نے نشو و نما پائی اور ارتقائی منازل طے کرلیں تو اسی ساختہ پرداختہ بولی کو اردو کہنے لگے۔ اسی طرح بالکل یہی بات پنجابی یا ہریانی وغیرہ کی نسبت کہی جاسکتی ہے۔

بعض ہندو اہل علم حضرات کا دعویٰ ہے کہ اس کو اردو کے نام سے تو مسلمانوں کے وقت میں بھی بہت بعد کو پکارا گیا مگر زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی عالم وجود میں آچکی تھی اور اس کے ثبوت میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے کے چند تحریری نمونے پیش کرتے ہیں، جن کی زبان میں مغربی ہندی کی مختلف شاخوں کے اجزا مخلوط شکل میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب مغربی ہندی (پنجابی، ہریانی، برج، راجستانی، قنوجی، بندیلی) کے بولنے والوں نے نقل و حرکت شروع کی تو اس آپس کے میل جول نے باہمی مفاہمت کے لیے ایک عام بولی پیدا کی اور یہ بولی دہلی کے آس پاس کے خطے میں پیدا ہوئی جو آج کی طرح اس وقت بھی مرکزی مقام ہونے کے باعث مرجع عالم تھا۔ اور موجودہ اردو کا ڈول اسی وقت پڑچکا تھا البتہ تکوینی زمانہ میں ہونے کے باعث زبان ایک خام شکل میں تھی جس

کو موجودہ پختگی کی حالت کو پہنچنے کے لیے بعد کی عہد بہ عہد کی ارتقائی منزلیں درکار تھیں۔

قدیم دکنی اردو کے نمونے اس عہد کی یادگاریں ھیں جب آگرہ (علاقہ برج) دارالخلافہ نہیں بنا تھا۔ مگر پھر بھی اس وقت کی دھلی کی زبان میں برج کے اثرات و خصائص کا پایا جانا مندرجہ بالا خیال کی تائید کرتا ھے۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے اطراف دھلی میں ایک ایسی ملی‌جلی زبان (جس میں هریانی، راجستانی، برج اور پنجابی کے نسبتاً زیادہ عناصر پائے جاتے تھے) کے وجود کو دیکھتے ھوئے مدھ دیسی علاقے کی بجائے علاقہ پنجاب کو اردو کا مولد و منشا قرار دینا صحیح نہیں معلوم ھوتا۔

آگرہ (علاقہ برج) کو مسلمانوں نے جب تک اپنا مرکزی مقام قرار نہیں دیا، اردو میں دیگر عناصر کے مقابلے میں پنجابی عنصر زیادہ نمایاں رھا۔ اسی حالت میں یہ زبان خلجیوں کے لشکر کے ساتھ دکن و گجرات پہنچی۔ مرکز دھلی سے آگرہ تبدیل ھوا تو پنجابی اثرات رو بہ زوال ھوئے اور برج کا رنگ روز بہ روز زیادہ سے زیادہ گہرا ھوتا گیا۔ ایک رنگ دبتا گیا دوسرا رنگ کھلتا گیا۔ اس صورت حال نے زبان کے چہرے مہرے اور صورت شباہت پر گہرا اثر ڈالا۔ زبان کچھ سے کچھ ھوگئی۔ عالمگیر کی لشکرکشی کے ذریعہ سے اورنگ‌آباد میں جو زبان پہنچی اس کا مطالعہ اس امر کی وضاحت کرتا ھے کہ پنجابی اثرات کے کٹ‌چھٹ جانے کے بعد برج نے کیا کیا تبدیلیاں پیدا کیں اور کیسی کیسی تراش و خراش اور کتربیونت سے کام لیا۔

غرض دکنی اردو کا ذخیرۂ ادب ھماری زبان کے دو عہد کی لسانی تبدیلیوں کا آئینہ‌دار ھے۔ عہد اول تو وہ ھے جب زبان پر دھلی میں پنجابی اثرات غالب تھے۔ عہد دوم وہ ھے جس میں آگرہ کی مرکزیت کے باعث پنجابی عنصر زوال پذیر ھوا اور برج کا رنگ چوکھا ھوتا گیا۔ زبان ملک دکن میں اسی حالت میں رھی جس طرح یہ شمالی ھند سے موقع بہ موقع پہنچتی رھی۔ (پہلی بار پنجابی اثرات لیے ھوے خلجیوں کے ساتھ پہنچی۔ دوسری بار برج بھاشا کے گہنوں سے لدی ھوئی عالمگیر کے سپاھیوں کے زیرنگرانی پہنچائی گئی)۔ دکن میں جو بولیاں رائج ھیں وہ دراوڑی نسل

سے تعلق رکھتی ہیں۔ برخلاف اس کے اردو آریائی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ اردو جب وہاں گئی تو خاندانوں کے اس اختلاف نے دو مختلف النسل بولیوں کو ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا بلکہ ایک حد تک بیگانہ ہی رکھا۔ اس لیے دراوڑی زبانیں اردو کے اصول قواعد کو متاثر نہ کرسکیں۔ مگر ہم‌سایگی کے حق کے طور پر اردو نے کچھ الفاظ اپنے خزانہ میں داخل کرلیے۔ جغرافی حالات اور ملکی آب و ہوا نے اہل اردو کے لب و لہجہ اور تلفظ کو اپنے سانچے میں بہت کچھ ڈھالا۔ اب مختصر طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی کے عہد تک دکن میں زبان اردو پر تین حالتیں گزریں: (۱) پنجابی عنصر کا غلبہ (۲) پنجابی عنصر کا زوال اور برج کا زور (۳) ہم‌وطنی کی وجہ سے دراوڑی خصوصیات کا اثر۔

ادھر پورب (اودھ و بہار) میں اَردھ مگھدی (Ardh Maghadi) بولیوں (اودھی' باگھیلی' چھتیس گڑھی) کا سکہ رائج تھا۔ مشرقی یوپی سے مشرقی بہار تک مگھدی بولیوں (بھوجپوری مگھی' میتھلی) کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اولوالعزم سپہ سالاروں نے جب ادھر کا رخ کیا تو ان کے ساتھ یہ ان مقامات میں پہنچی۔ جب دراوڑی (Dravadian) بولیاں اس کے حق میں بے انس' بے مہر ہونے پر بھی اس کی خوش اخلاقی کے سامنے پسیج گئیں تو پھر یہاں کا کیا پوچھنا۔ تُزک و احتشام اور جاہ و جلال کے ساتھ ملنساری' خاکساری کا معجزہ دیکھ کر اَردھ مگھدی اور مگھدی بولیاں اسی کا کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے اپنے سنگھاسن چھوڑ اسی کے قدموں پر آگریں اور ہاتھ باندھ کر تخت‌گاہ کی طرف اشارہ کیا۔ سارا پورب مغربی اودھ سے مشرقی بہار تک اسی کے زیرنگیں ہوا۔ باوجودیکہ یہ علاقہ (اَردھ مگھدی اور مگھدی) اردو کا وطن (مدھ دیس) نہ تھا مگر یہاں اسے اتنا فروغ حاصل ہوا کہ اس اطراف کے ایک شہر لکھنؤ نے اہل زبان ہونے کا رتبہ پایا اور دوسرے شہر عظیم‌آباد پٹنہ کی زبان‌دانی کا لوہا سارے ملک نے مان لیا اور یہ بات سنجیدگی کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اودھ و بہار کو خود مدھ دیسی بولیوں کے بعض علاقوں (مثلاً راجستانی' بندیلی وغیرہ) پر فوقیت حاصل ہے حالانکہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ بہ‌مقابلہ اودھ و بہار ان علاقوں

(راجستانی، بندیلی) میں اصول قواعد، لب و لہجہ اور تلفظ کے اعتبار سے اردو کے زیادہ صحیح بولے جانے کے امکانات ہیں۔

پورب (اودھ و بہار) میں جب اردو پہنچی تو یہاں اس کو ایسی ہی زبانوں سے سابقہ پڑا جو محض دوری اور مدت کی علیحدگی کی وجہ سے مختلف معلوم ہوتی تھیں مگر ان کی رگوں میں وہی آریائی خون دوڑ رہا تھا۔ اس لیے شناسائی کے فوراً بعد ربط ضبط میل جول حد درجہ کو پہنچ گیا۔ ادھر کی زبانوں سے میل کھانے کے لیے اس نے پورب کی خوبی اپنے اندر پیدا کی۔ اصول قواعد میں پورب کی زبانیں جن امور میں اس کا ساتھ نہ دے سکیں اس نے ان کو ترک کیا۔ فطرت سے جنگ کرتی تو پنپ نہیں سکتی تھی اس لیے لب و لہجہ اور تلفظ مقامی خصوصیات سے متاثر ہوئے۔ ملکی آب و ہوا، جغرافی حالات جن خصوصیات کے متقاضی تھے ان سے اس نے خود کو بہرہ‌ور کیا۔

لکھنؤ کے ذریعے کافی پوری خصوصیات، الفاظ اور محاورے اردو میں رواج پائے۔ «اودھ پنچ» اور رتن ناتھ سرشار وغیرہ کے ناولوں نے جو زبان پیش کی اس میں پورب کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جن سے مدھ دیس (مغرب یوپی اور مشرقی پنجاب) والے مانوس نہ تھے، بعد کو انہیں واقف ہونا پڑا۔ اودھ میں تو اردو کو پھر بھی اردھ مگھدی یعنی ''نیم مگھدی'' بولی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ مگر بہار میں تو اس کو خالص مگھدی سے آشنا ہونا پڑا۔ اردھ مگھدی نیم مگھدی ہونے کے باعث پھر بھی کچھ مدھ دیسی خصوصیات کی حامل تھی بلکہ مدھ دیسی اور بہار کی خالص مگھدی بولیوں کے درمیان بچلی کڑی کا کام کر رہی تھی۔ مگر بہار کی خالص مگھدی بولیوں کا ساتھ دینا اردو کے لیے اپنے اندر بڑی بڑی تبدیلیوں کا سامنا تھا۔ جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے یہاں بھی بہ ضرورت کے مطابق نئے سانچے میں ڈھل گئی۔ عظیم‌آباد پٹنہ کی مرکزی سرپرستی نے مقامی خصوصیات کو اردو میں رواج دیا۔ مشہور اخبار ''الپنچ'' بانکی پور، سید علی محمد شاد اور سید علی سجاد کے ناولوں نے وہی زبان پیش کی جو بہاری خصوصیات سے بھرپور ہونے کی وجہ سے اہل بہار کی متاع

عزیز* تھی - غرض پچھاں کی رہنے والی اردو نے شیراز ہند پورب کے سبزہ زاروں کی خوب سیر کی - کانٹے بھی راہ میں آئے مگر دامن بھی رشک گلزار ہوگیا -

بنگال خاص ہندستان (مشرقی پنجاب تا مشرقی بہار اور متوسط ہند کے بعض شمالی مغربی علاقے) کا حصہ نہیں ہے - خاص ہندستان میں آریاؤں نے دراوڑی قوموں کے اجزا قبول کرکے ایک مخلوط نسل کی بنیاد ڈالی تھی جس کے نام لیوا ہندستانی کہلاتے ہیں - مگر بنگال کے باشندے دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں - منگولی اور دراوڑی نسلوں کی آمیزش سے ایک نسل کی بنیاد پڑی جس کی نشانی اہل بنگال ہیں - مگر آریاورت کی قربت اور قنوجی برہمنوں کے قدموں کی برکت تھی کہ یہ غیر آریائی علاقہ بھی آریاؤں کے رنگ میں رنگ گیا - اور یہ سارا قلمرو مگھی کی بیٹی بنگالی کے تابع فرماں ہوا -

مدھ دیسی اور بنگالہ بولیوں کے درمیان اردھ مگھدی اور مگھدی (اودھ و بہار) کی دو زبردست دیواریں حائل تھیں - یہ کچھ معمولی دوری نہ تھی - سگی بہنیں بھی ہوتیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیر لیتیں - چنانچہ اردھ مگھدی اور مگھدی نے جس طرح اپنا سب کچھ اس کے (اردو) حوالہ کردیا تھا اس طرح ادھر کی بولیوں نے اس دریادلی سے تو کام نہیں لیا مگر پیشوائی کے لیے بڑھیں اور اس کو اپنا ہم بزم بنایا - اردو نے یہاں بھی معجزہ دکھلایا - مرشدآباد (مغربی بنگال) اور ڈھاکہ (مشرقی بنگال) میں اپنے سنگین قلعے بنوائے اور یہاں سے بیٹھ کر جو سکے چلائے مدھ دیس کی

---

*انسوس کی بات ہے کہ بہار میں زبان و ادب کی خدمت کے سلسلہ میں ابھی تک دیگر صوبوں کی طرح دور جدید کا آغاز نہیں ہوا ہے - اس لیے یہاں کے اکثر حالات تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اور اس امر خاص میں مورخین اردو کی تحقیقات میں جو کوتاہی اور تشنگی نظر آتی ہے اس سے مذکورہ بالا خیال کی تائید ہوجاتی ہے - عبدالمالک آروی ' قبتی وصی احمد (صاحب سرش‌ص) ، قاضی عبدالودود ' پروفیسر نجیب اشرف ندوی ، پروفیسر محفوظ‌الحق ' حمید عظیم‌آبادی ' رخشاں ابدالی اور رضاقاسم مختار صاحبان نے اس سلسلہ میں جو کچھ کام کیا ہے یقیناً قابل قدر ہے - خصوصاً جناب عبدالمالک صاحب کی اکثر تحریریں اس موضوع پر وقف رہی ہیں - مقبول احمد

ٹکسال میں بھی بغیر پرکھے ھوئے اعتبار کی نظر سے دیکھے گئے ۔

اردو جب بنگال پہنچی تو یہاں کی آب و ھوا نے اس کے رنگ روپ پر اثر ڈالا۔ دوسرے اردو کو لانے والے قافلے میں مدھ دیسیوں کے علاوہ اردھ مگھدی اور مگھدی (اودھ و بہار) علاقہ کے باشندوں کا بھی گروہ شامل ہے ۔ عرض کیا جاچکا ھے کہ اردھ مگھدی اور مگھدی علاقے میں اردو مقامی خصوصیات سے متاثر ھوئی تھی اور یہاں اس کو اپنی بہت سی مدھ دیسی خصوصیات سے دست بردار ھونا پڑا تھا۔ اس لیے زبان کی صورت بہت کچھ متغیر ھوگئی ۔ کلکتہ اور مغربی بنگال کے تقریباً تمام شہر اسی زبان کے نمونے پیش کرتے ھیں جس کو آسانی کے ساتھ پوربی اردو کی ایک شاخ کہہ سکتے ھیں ۔

قدیم سے اھل اردو میں پچھاں (مدھ دیس) اور پورب (اودھ و بہار) کا فرق و امتیاز تسلیم کیا گیا ھے ۔ پوربی اردو بنگال ھی کے حدود تک نہیں گئی بلکہ اطراف اڑیسہ (Orissa) تک اس کے قدم پہنچ گئے ۔ یہاں تو شہروں کے علاوہ گاؤ گانؤ میں بھی اس کا خیر مقدم ھوا ۔ صوبہ متوسط و برار اور مدراس و دیگر اطراف ھند میں جو اردو بولی جاتی ھے وہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے اصول اور طریقے کے لحاظ سے گو پوربی اردو ھی سے زیادہ قریب معلوم ھوتی ھے مگر اس کے خد و خال اور ناک نقشے سے معلوم ھوجاتا ھے کہ یہ پچھاں والوں کی قلم کاری کا نمونہ ھے ۔ اب اسے یوں بھی کہہ سکتے ھیں کہ دائرہ عمل کے اعتبار سے پوربی اردو سے پچھاں کی اردو زیادہ وسیع اور پھیلی ھوئی ھے جو بلاشبہ اس کا حق بھی ھے ۔

جب سارے ھندستان جنت نشان کی سیر و سیاحت ھوچکی تو اردو نے پنجاب کی طرف رخ کیا ۔ یہاں اس کے پہچاننے میں دیر نہ ھوئی ۔ آخر یہ وھی زبان تھی جو دلی کے آس پاس میں جب تک محدود تھی اس پر برج اور دیگر مدھ دیسی بولیوں کا اتنا اثر نہ تھا جتنا کہ پنجابی کا زور تھا ۔ ھزار علاقہ برج اور پورب کے اطراف کے قیام نے اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور یہ بھی انھیں کے گن گارھی تھی مگر جس (پنجابی) نے سودا کے عہد تک اس کی مانگ پٹی سنواری تھی وہ بھلا کیوں کر

اس کو بھول جاتی۔ اس کے نئے ساز و سامان زیب و زینت اور سلیقہ و لیاقت کو دیکھ کر اپنے دارالخلافہ لاہور میں شاہانہ شان و شکوہ کے ساتھ استقبال کیا اور اس سرے سے اس سرے تک سارے دیار کی زبان پر اسی کا کلمہ جاری ہوا۔

خطۂ پنجاب میں زبان کو بڑی بڑی تبدیلیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیوں کہ پنجابی اثرات ہزار کم ہوگئے تھے مگر پھر بھی اس کے باقی ماندہ نقوش موجود تھے۔ اس کے علاوہ اصول قواعد کے بھی اکثر مشترک عناصر نے اس امر میں مدد کی۔ البتہ مدھ دیس کی 'کھڑی بولی' کو پورب نے جس قدر نرم اور رواں کیا تھا، پنجابی لب و لہجہ اس کو برت نہ سکا۔ سہارنپور ہی سے لاٹھیاں چلنی شروع ہوجاتی ہیں تو پھر وہاں کون روکتا ہے جہاں سکندر اعظم کو بھی صفیں آراستہ کرنی پڑی تھیں۔ چنانچہ وہ اردو جس کو لکھنؤ میں خس کی ٹٹیوں اور برف میں سینچی ہوئی مگھئی پان (بہار) کی گلوریوں کے رہتے کل نہیں پڑتا تھا، پیشانی عرق آلود ہوہی جاتی تھی پنجاب پہنچتے ہی کس بل دکھانے لگی۔ غرض لب و لہجہ اور تلفظ پر آب و ہوا کا زبردست اثر پڑا۔ بیسویں صدی کی اردو پر پنجابی طرز کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ مشکل سے کوئی تحریر اس سے خالی نظر آتی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردھ مگھدی اور مگھدی علاقہ والوں کو تو چھوڑیے خود مدھدیس والے اپنی زبان انہیں سے پڑھنے لگے۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف طریقہ سے واضح ہوگئی کہ اردو ہندستان کے گوشے گوشے میں گئی اور جس سمت بڑھی اس کا شایان شان استقبال ہوا۔ اسی لیے ہر خطہ کی خوبو اور ہر مقام کی خاصیت اور تاثیر اس کے اندر موجود ہے جس کی وجہ سے سب اس کو اپنی زبان کہتے ہیں۔

لاہور، دھلی، آگرہ، لکھنؤ، عظیم آباد، پٹنہ، مرشدآباد اور حیدرآباد ہندستان کے ایسے شہروں میں ہیں جن کے نام اردو زبان کا تذکرہ کرتے ہوئے زبان پر آتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جو اسلامی عہد حکومت میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں شہروں کی گلیوں میں ہندستانی مسلمانوں کے علوم و فنون کے خزانے گڑے ہوئے ہیں۔ اردو کو

ان شہروں سے منسوب کرنے کی وجہ سے بعض خوددار قومیت پرست دوستوں کو اس شکایت کا موقع مل گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور اس کا چلن مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کے دربار تک تھا۔

مندرجہ بالا خیال کی حمایت اور تائید میں چاہے سارے ہندستان کی ایک رائے ہو مگر مدھ دیس (مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب) کے ہندو باشندے اپنی مادری زبان کی اس نئی تحقیق کی ہم‌نوائی نہیں کرسکتے۔ اس کو ڈول اور گھڑ کے انھیں نے رکھا تھا البتہ مسلمانوں نے اسے اختیار کرکے اپنی فارسی اور عربی سے خراد کر چمک اور صفائی پیدا کی اگرچہ اس کام میں بھی ان (ہندوؤں) کی شرکت ہمیشہ تقویت کا باعث بنی رہی۔ اب صورت حال یوں ہوجاتی ہے کہ مدھ دیس کے ہندو باشندوں کی تو یہ مادری زبان ہے اور ان کا یہ حق مسلمانوں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ مدھ دیس کی سرحدوں سے باہر یہ جہاں اور جس سمت میں بھی گئی اس کے لے جانے والے زیادہ تر مسلمان (فوج، لشکر، صوفی، فقیر) تھے اور اس کو اختیار کرنے والے ادھر کے قدیم باشندے یعنی ہندو تھے۔ یہ پہلے پہل تو اسے بدیسی ہی سمجھتے رہے اور چونکہ مسلمانوں کے ساتھ تھی اور فارسی رسم‌الخط کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی اس لیے ناواقفیت کی وجہ سے بعض علاقوں میں اس کو "ترک بولی" یعنی مسلمانوں کی زبان تک کہنے سے پرہیز نہیں کیا۔ لہذا مدھ دیس کے باہر اس کے تعلقات کی صورت یہ ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں (جو اسے اطراف ہند میں لے گئے تھے) کی تو یہ مادری زبان تھی مگر ہندوؤں کے لیے اختیار کی ہوئی زبان تھی، جنھوں نے اپنی مادری زبان کو پس پشت ڈال کر اس کو نووارد مسلمانوں سے رشتہ قائم رکھنے کے لیے قبول کیا تھا۔ چنانچہ آج بھی مدھ دیس کے باہر یہ حال ہے کہ وہ ہندو حضرات جنھیں مسلمانوں سے زیادہ رسم و راہ ہے ان کی زبان ان ہندوؤں سے زیادہ صاف ہے جنھیں مسلمانوں کے ہم بزم ہونے کا موقع نہیں یا کم ملا ہے۔

زیادہ وضاحت کے لیے یہ کہنا بے محل نہیں کہ اگر انتہائی قومیت پرستی کے زمانے میں اپنی اپنی غیرترقی‌یافتہ زبانوں کی طرف لوگ متوجہ ہوجائیں اور انھیں کی

ترقی اور ترویج کی طرف ان کا رجحان ہوجائے تو اردھ مگھدی (اودھی، باگھیلی، چھتیس گڑھی) اور مگدھی (بھوجپوری، مگھئی، میتھلی) بولنے والے اس اختیار کی ہوئی مدھ دیسی بولی سے کنارہ کش ہوسکتے ہیں مگر انہیں علاقوں کے مسلمان باشندے مدھ دیس کے ہندو اور مسلمان باشندوں کی طرح اردو کو کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتے* اس سے معلوم ہوگیا کہ مدھ دیس سے باہر ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اس زبان سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ، عظیم آباد، پٹنہ، مرشدآباد، ڈھاکہ اور حیدرآباد وغیرہ مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ اس زبان کے بھی مرکز تھے، جس کو یہ مغربی ہند کے ہندوؤں کے تحفے کے طور پر دیگر اطراف ہند کے ہندوؤں کے پاس لائے تھے۔ ان بڑے بڑے مرکزوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ قصبے اور گانؤ والوں میں بھی اس کا پیغام لے لیےکر گئے اور سارے ملک کو اس بولی سے آشنا کرکے ہندستان کو ایک قومی زبان عطا کی جس کی ضرورت اس وقت کے بٹے ہوئے ہندستان کو تھی اور آج کے متحدہ ہندستان کو اس سے بھی زیادہ ہے۔ مدھ دیس کی طرح اگر اَردھ مگھدی یا مگھدی علاقوں میں بھی مسلمان مقامی بولیاں قبول کرلیتے اور اس مدھ دیسی بولی کی پابندی نہ کرتے تو آج مدھ دیس (مغربی یوپی، مشرقی پنجاب) کے باہر اردو، ہندی ہندستانی یا «اُنھوا ہندستانی» کے بولنے والوں کو تو چھوڑیے اس کا سمجھنے والا بھی مشکل سے نظر آتا اور یہ زبان بھی دیگر زبانوں (بنگلہ، مرہٹی، گجراتی وغیرہ) کی طرح اپنے ہی وطن کی سرحدوں تک محدود ہوتی۔ حالات کی صحیح تصویر دیکھ لینے کے بعد اعتراض قائم نہیں رہ سکتا۔ بدگمانی اور تعصب کے بادل جب چھنٹ جائیں گے تو یہ خیال بھی مٹ جائےگا۔ بلکہ رواداری کے زمانے میں دیگر امور کی طرح زبان کے معاملے میں بھی مسلمانوں کے اس احسان

---

*ابھی حال میں صوبہ بہار کے میتھلی بولنے والے علاقہ میں اپنی زبان کی حمایت اور مغربی ہندی (ہندستانی) کے خلاف تحریک اُٹھی تھی اور اسی بنیاد پر اپنے علاقہ کو صوبہ بہار سے الگ کرنے کے لیے میتھلا کانفرنس میں تجویزیں پیش کی گئی تھیں جو بالاتفاق منظور ہوئی تھیں مگر اسی علاقہ کے مسلمانوں کو اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ مقبول احمد

کے آگے سر جھکادینا ہی پڑے گا جس کی مثالیں آج بھی بہت سے سنجیدہ برادران وطن کی تحریروں اور تقریروں سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

مدھ دیسی بولی اردو کو ملک کی اکثر قوموں نے اپنے ہر طرح کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ مگر عربی اور فارسی کو چھوڑ دینے کے بعد تو مسلمانوں نے اسی کو اپنا تنہا وسیلہ قرار دیا اور اپنے مذہبی' تمدنی اور تاریخی خیالات کا بیشتر سرمایہ اسی میں منتقل کیا۔ آج یہ اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اس زبان کے ذریعے اسلامی علوم و فنون میں کافی دستگاہ حاصل ہوسکتی ہے۔ اردو کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو "آئے ہوئے مسلمانوں" کے علاوہ ہندستان کے "نو مسلموں" میں بھی اس کو مقبول بنائے ہوئے ہے۔ ان نو مسلموں کے تمدن (جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے) نے ایک ایسی زمین تیار کردی ہے جس میں اردو کی تخم ریزی اس (اردو) کے سرسبز اور بارآور ہونے کے تمام آثار بتلاتی ہے۔

ایک صاحب نے (مدینہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء) شکایت کی تھی کہ "رفتہ رفتہ اردو ادیبوں نے قصداً اور مخاصمتاً اردو ادب کی کتابوں سے اس قسم کے (ہندی اور پراکرتی) الفاظ کو نکالنا شروع کیا اور بجائے اس کے عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ داخل کرتے گئے" اور اس کو حسب ذیل نقشہ میں ظاہر کیا تھا:—

ہندی	اردو
اکاش	آسمان
سنسار	گیتی
انند	شادی
نین	چشم
جیو	روح

[1]

مگر اس کو کیا کہیں کے اور اس تبدیلی میں کون سے "قصد" اور "مخاصمت" کا پته چلتا هے ۔ (بحوالۂ شعر الهند)

[ii]

لفظ وقت سودا	تبدیلی وقت ناسخ
پھر	پھن
نپٹ	بہت
برے	الگ
اکو	اگے
پھرے هے	پھرتا هے
کریو	کیجیو

لفظ وقت سودا	تبدیلی وقت ناسخ
لاگا	لگا
ستی	سے
سمیت	ساتھ
ربٹے هے	پھسلتا هے
کبھی کو	کبھی کی

اور لسانی اعتبار سے اهل اردو کی یه "خود کشی" کیسی، ذرا یه "ناعاقبت اندیشی" بھی ملاحظه هو :—

[iii]

لفظ وقت مصحفی	تبدیلی وقت ناسخ
نئیں	کو
رُو رکھنا	منه رکھنا
کب رُو هے	کب منه هے
همسائگاں	همسایوں
اے صبح تا شام	صبح سے شام تک
جاگه	جگه
دوستاں	دوستوں

مندرجہ بالا نقشوں (ii) اور (iii) سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرتی اور پراکرتی عناصر کی بعض دوستوں کو دھک پڑگئی ہو مگر عربی و فارسی اجزا کے رواج پر[۶] اہل اردو مصر نہیں۔ یہ کاٹ چھانٹ، حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ زبان کی فطری ضرورتیں تھیں جن کی بہم رسانی کے بغیر اس (اردو) کے لیے ارتقائی منزلوں کا طے کرنا دشوار تھا۔ جس طرح ایک کاری‌گر کام کرتے وقت اوزار کے انتخاب میں دیسی اور بدیسی کی قید سے آزاد ہوتا ہے بالکل اسی طرح اہل زبان بھی الفاظ کے استعمال میں کارآمد، معنی‌خیز اور مناسب الفاظ کے خیال کے سوا ہر طرح کے خیال سے آزاد ہوتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں ارادے کام نہیں کرتے۔ ارادہ فطرت کے ساتھ جنگ کا دوسرا نام ہے اور زبان فطرت کی ہم‌نوائی کے بغیر پنپ نہیں سکتی۔ دکنی اردو (جو بھاشا اور ہندی کے اجزا سے پُر ہے) کے مقابلے میں شمالی اردو میں فارسی عربی عناصر کی زیادتی کسی خاص ارادہ 'قصد' یا 'مخاصمت' کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ یہ صورت حال دکن اور شمالی ہند کے مختلف اور الگ الگ ماحول کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگر شمالی اردو میں عربی ایرانی خد و خال زیادہ نمایاں ہیں تو اس کا سبب عربی ایرانی اثرات ہیں جو دکن کے مقابلہ میں شمال میں ہمیشہ زیادہ وسیع اور ہمہ‌گیر رہے۔ خالص لسانی مسئلوں کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنا خود اپنی نظر کا قصور اور دل کا کھوٹ ظاہر کرتا ہے۔

اب میں زبان کے متعلق چند ایسے ترقی پسند خیالات پیش کرتا ہوں جو اردو کی قدرتی رو، فطری رجحان اور طبیعی میلان کو سامنے رکھ کر ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان خیالات کو سطور ذیل میں پیش کرتے وقت خوشی معلوم ہوتی ہے کہ یہ خیالات ان بزرگواروں کے ہیں جو اردو دنیا کے ادبی رہنما ہیں اور جن کے خیالات ملک کے سنجیدہ ذوق حلقہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

(۱) انشا، مصحفی اور راسخ کے دور میں جو اصلاح ہوئی تو اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کیے گئے بدنما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک ان کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی مگر ان کے یک قلم نکال دیے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت

اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اردو کے قبضے میں ایک عرصہ دراز سے چلے آتے تھے فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہوگئے ہیں -

(تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری لکھنوی)

(۲) "نہ لفظ کی صرفی ماہیت پر نظر کی گئی' نہ اس کی معنوی اہمیت کا لحاظ ہوا اور خرج بخرج ترک بترک کی گردان شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوتا ہے کہ اس اچھوت سدھار' دلت ادھار' تبلیغ اور مساوات کے زمانے میں جب ہر ایک دوسرے کو اپنے میں لینے کو لپکتا ہے اردو میں 'نکالو! باہر کرو' کے سوا اور کوئی صدا سننے میں نہیں آتی۔ یہ بےوقت کا راگ ہے' اردو والے یاد رکھیں اور خوب یاد رکھیں کہ اگر ان کے متروک‌الاستعمال کی لے اسی طرح بڑھتی گئی تو ان کی وہی گت ہوگی جو 'خارج از برادری' کی لے نے ہندوؤں کی بنائی۔ خوف ہے کہ کہیں اردو ادب کو 'تارکان ادب' کے ہاتھوں وہی دن دیکھنا نصیب نہ ہو جو چھوت چھات اور سوچم کی مریضانہ حساسی نے ہندوؤں کے قومی ادبار کا منتہا ثابت کیا۔"

("منشورات" از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی)

(۳) مولانا عبدالماجد دریابادی نے 'پطرس کے مضامین' پر ریویو کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ "زبان ہر جگہ لکھنؤ کے معیار کے مطابق نہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ سارے ہندستان کی اردو لکھنؤ ہی کے تابع فرمان رہے"

('صدق' یکم فروری سنہ ۴۰ع)

(۴) "ہم کو معلوم ہے کہ بنگال کے اندرونی حصوں تک میں ہزاروں مسلمان اس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں لیکن اردو قواعد کی بعض مشکلوں اور تذکیر و تانیث کے جھگڑوں کے سبب سے ان کو الجھن ہوتی ہے لیکن اگر اہل بنگال جرأت کرتے تو اپنی ضرورت کے مطابق وہ لاہور اور پٹنہ کی طرح اپنی اردو آپ بنالیتے اور دلی اور لکھنؤ والوں کو اس کے ماننے پر مجبور کردیتے"

(از خطبہ صدارت مسلم تعلیمی کانفرنس کلکتہ' مولانا سید سلیمان ندوی)

مشہور سوشلسٹ اخبار 'ہند جدید' کلکتہ کے ذریعے جناب عبدالرزاق ملیح آبادی

کی حسب ذیل تحریر دیکھنے میں آئی ۔

"پنجاب میں اردو کی خدمت پر زور دیا جارہا ہے لیکن مجھے معاف کیا جائے اگر میں اپنے دل کی یہ بات ظاہر کردوں کہ پنجاب نے اردو کے نام سے بہت لٹریچر پیدا کردیا مگر یہ لٹریچر اردو کا نہیں ہے کسی ایسی زبان کا لٹریچر ہے جسے اردو کہا نہیں جاسکتا ۔ خود انجمن ترقی اردو کے پیدا کیے ہوئے لٹریچر میں بھی اردو کم دکھائی دیتی ہے ۔"

ابتدا میں یہ بات ظاہر کردی گئی ہے کہ اردو جہاں کہیں گئی وہاں اس کی صورت اور ہیئت میں تبدیلی پیدا ہوگئی ۔ اگر یہ اپنی مدھ دیسی خصوصیات کی سختی کے ساتھ پابند ہوتی تو مدھ دیس سے باہر اس کشش اور جاذبیت کی مالک نہ ہوتی جو اسے آج حاصل ہے ۔ دیگر اطراف ہند کی خوبو اگر اردو میں پائی جاتی ہے تو یہ کوئی قابل احتراز امر بھی نہیں ۔ اس زبان کی نشو و نما کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ یہ خو اس کی گھٹی میں پڑی ہے ۔ اسی پر اس کی بنیاد قائم ہے ۔ خود مدھ مدیس میں جہاں یہ پیدا ہوئی ہے کئی بولیوں نے مل کر اس پتلے کو تیار کیا ہے ۔ کسی نے اینٹیں جمع کیں، کسی نے چونا دیا، کسی نے سرخی فراہم کی، کسی نے گٹی کی ڈھیری لگائی اور کسی نے ریختہ کا کام کیا تب کہیں یہ عمارت کھڑی ہوئی ۔

اردو سگھڑ بی کا پاندان نہیں ہے جس کی ترتیب کسی اور کے عمل دخل کی متحمل نہیں ہوسکتی ۔ اس کی عالم‌پناہی کا شہرہ جس‌قدر دور دور ہو اچھا ہے ۔ مدھ دیس (مغربی یوپی، مشرقی پنجاب) والوں کی دو طرح کی آرزوئیں جو بہ‌ذات خود ایک دوسرے کی ضد ہوں پوری نہیں ہوسکتیں ۔ پہلی آرزو یہ کہ ہماری زبان ہندستان کے گوشے گوشے میں بولی جائے پھر اسی کے ساتھ دوسری یہ آرزو کہ عام استعمال میں آنے کے بعد مانی ہوئی متوقع تبدیلیوں کا اثر ہماری زبان پر نہ ہو ۔ یہ عملی دنیا میں ممکن نہیں ۔

ہمارا ملک روز بہ روز عوام پسند ہوتا جارہا ہے ۔ اگر ادب زندگی کا آئینہ بردار ہے تو ہمارا ادب بھی ہماری زندگی کے موجودہ رجحانات کا حامل ہوگا ۔ جس درجہ

کے لوگ آج کی سوسائٹی کے بزم نشین ہوں گے انہیں کی ترجمانی موجودہ ادب کا فرض ہوگا۔ آج سے پہلے دنیا امرا' روسا اور شرفا کے ہاتھوں ایک گڑیا بنی ہوئی تھی۔ انھوں نے جس طرح چاہا اس کو اپنے شعور اور مذاق کے مطابق سنوارا۔ اگلے زمانے کی یہ تصویر گزشتہ ادب میں صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جدھر نظر اٹھائیے سرکار دربار ہے آداب و تسلیمات کا عالم ہے عربی فارسی کے عالموں کی ریل پیل ہے۔ اس وقت قصبات کے الفاظ اور محاورے بزم خواص میں باریاب ہونا کجا "قصباتی" اور "گنواری" کہہ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیے جاتے تھے۔ ایسے دور کے ادب پر موجودہ سوشلسٹ حضرات کا غم و غصہ اور لعن طعن بے محل معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح آج کے کسی حد تک جمہوریت پسند زمانے میں زبان میں عوام کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر "یاران کہن" کا چیں بہ جبیں ہونا زمانہ شناسی کے منافی ہے۔ ہماری زبان میں اگر آج بھی موٹے موٹے الفاظ پائے جاتے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ ابھی تک پرانے اثرات موجود ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر آج عوام اور قصبات کے الفاظ و اصطلاحات کے رواج کا بھی مطالبہ ہورہا ہے تو کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ہم اب زیادہ مدت تک اس دو راہے پر کھڑے نہیں رہ سکتے بلکہ جدید راہ متعین ہوچکی ہے اور قافلہ کوچ کا سامان کررہا ہے۔

تبصرے

نام کتاب — صفحہ

ادب

اردو کے نئے رسالے

نام کتاب — صفحہ

خاص نمبر

متفرق

تبصرے

ادب

اردو شاعری پر ایک نظر:-

از مسٹر کلیم الدین احمد بی-اے (کیمبرج) - پروفیسر شعبۂ انگریزی - پٹنہ کالج - صفحات ۴۲۴ - قیمت ڈھائی روپے - ناشر عظیم پبلشنگ ہاؤس بانکی پور- پٹنہ - و - کتابستان الہ آباد-

اردو شاعری پر جتنے تبصرے اب تک ہوئے ان سب سے یہ ایک نظر نہایت اہم ہے - اہم اس لیے کہا کہ کتاب کی ابتدا اور انتہا کچھ عجیب و غریب واقع ہوئی ہے - اول صفحہ پر یہ الفاظ فاضل مصنف کے قلم سے نکلتے ہیں :-

"شاعری کی ہندستان میں قدر و منزلت نہیں" (صفحہ ۱)

اور یہ تصنیف منیف ان الفاظ کے ساتھ تمت کو پہنچتی ہے:-

"اردو شاعری کا مستقبل امید افزا نظر نہیں آتا"

سرسری طور پر ان اقتباسوں سے استفادہ کرتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری سے متعلق مصنف کے خیالات کیا ہیں اور کیسے ؟ اس سے آگے بحث ہوگی- جو نقایص تمہید میں اردو شاعری میں نکالے گئے ہیں اور جو اعتراض اس ساری کتاب میں متقدمین سے لےکر عہد حاضر کے شعرا تک کے کلام پر وارد کیے گئے ہیں ان

پر اجمالی نظر بعد میں ڈالی جائے گی۔ پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اصولی غلطی کا ذکر کردیا جائے جس کا فاضل مصنف شکار معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل اکثر انگریزی داں حضرات اس کسوٹی پر دیسی ادب کے کارناموں کو کستے ہیں جو اہل مغرب نے اپنے ادب کی جانچ کے لیے منتخب کی تھی۔ نقد و نظر کے وقت وہی معیار ذہن پر مسلط ہوتا ہے جو کسی مغربی نقاد نے اپنی زبان اور ادب کے لیے مقرر کیا تھا۔ ہم اس کو غلط‌بینی اور کج‌نظری سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ جن چیزوں کا ذکر ابھی ہوا ان کو حرف غلط سمجھ کر رد کردیا جائے۔ جہاں تک ہماری زبان کے ادبی اور لسانیاتی عوارض اجازت دیں ان سے استفادہ کیا جائے لیکن ان کو ناقص و کامل، مستحسن و شنیع کا معیار تسلیم کرلینا ایک طرح کی غلامانہ ذہنیت اور ادبی خودکشی کی حد تک پہنچتا ہے۔ مدت گزری کہ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے 'نسخہ حمیدیہ' میں اپنے انگریزی‌داں ہم وطنوں کو متنبّہ کیا تھا:—

"تنازع‌للبقا میں مغلوب ہوکر ایشیا والے ایسے مرعوب ہوگئے کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آرا سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانہ میں طالب‌علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیر، ورڈس‌ورتھ اور ٹے‌نی‌سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ ظلم ہوتا ہے"۔ (صفحہ ۷-۳۶)

کیا اچھا ہوتا کہ ڈاکٹر بجنوری کے اس قابل تقلید مشورے کی پروا کی جاتی۔

کتاب کا اول حصہ جو میر سے شروع ہوکر انیس و دبیر پر ختم ہوتا ہے قدیم شاعری کے نام سے موسوم ہے۔ شروع میں بعض اصناف شعر پر نظر ڈالی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اردو شعرا اگر شاعری کے صحیح مفہوم سے واقف ہوتے تو یہ مشکل آسان ہوجاتی"۔ شاعری کا صحیح مفہوم کیا ہے اس کا اظہار کہیں نہیں کیا گیا لیکن وہ "صحیح مفہوم" تو اب عرصۂ شہود میں آیا اور کمبخت اردو شاعری کو پیدا ہوئے کئی صدیاں گزر گئیں۔

نہایت افسوس اس بات کا ہے کہ مصنف نے شاعری کی جامع و مانع تعریف بھی واضح طور پر کہیں پیش نہیں کی۔

غزل کے خلاف جو کچھ فرمایا ہے وہ سب بےکار ہے۔ اگرچہ اب بھی پرانی چال کے غزلگو کچھ نہ کچھ موجود ہیں، لیکن عموماً غزل اب وہ غزل نہ رہی جس کے لیے خواجہ حالی کو یہ کہنا پڑا تھا:—

گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر

نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی

اگر قافیہ بندی کے نظام سے قطع نظر کریں تو عہد حاضر کے مشاہیر شعرا کی غزل سانیٹ اور قطعہ کے درمیان رکھی جاسکتی ہے۔ اصغر۔ عزیز۔ حسرت۔ کیفی۔ فانی اور سیماب کی غزلیں عموماً ایسی بلند پایہ ہوتی ہیں کہ فارسی غزل ان کے سامنے پست معلوم ہوتی ہے۔ وہ فارسی جس کی غلامی کا طوق ولایت سے نیا گڑھوا کر مصنف نے اردو غزل کے گلے میں ڈالا ہے۔ اور اصناف مثل قصیدہ و قطعہ وغیرہ پر بھی اسی طرح خاک ڈالی گئی ہے۔ ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مشاہیر شعرا و اساتذہ کے متعلق آپ کی رائیں معلوم کرنا قارئین کو ضرور محظوظ کرے گا۔

میر — ''میر کی قوت حاسہ مخصوص و محدود قسم کی تھی''۔ پھر فرمایا ہے:- ''میر کی دنیا تنگ تھی'' میر کے کلام پر تبصرہ ان جیسے الفاظ پر ختم ہوتا ہے:- ''میر کے کلام میں خامیاں بھی ہیں اصل نقص لیکن کلام کی ناہمواری کا ہے۔ اس کا معتدبہ حصہ نہایت ہی پست و مبتذل ہے''۔

درد — ''جن تجربات کی درد ترجمانی کرتے ہیں وہ غیر مانوس ہیں اور اکثر درد ان تجربات کو اس جوش و وجد کے ساتھ محسوس نہیں کرتے جو میر کا حصہ ہے۔ اس لیے درد کے اشعار میر کے اشعار سے کم تاثیر کے حامل ہیں۔ رعایت لفظی بھی موجود ہے۔ قند مکرر۔ دل آوارہ۔ اثر مطلق نہیں'' ہم نہیں سمجھتے کہ قند مکرر اور دل آوارہ میں رعایت لفظی کیوں کر پیدا ہوگئی۔ شاعری کے صحیح مفہوم کی طرح رعایت لفظی کا مفہوم بھی مصنف کے ذہن میں خانہ‌زاد ہی ہوگا۔ پہلے فرمایا تھا:

'درد کے اشعار میں تاثیر کم ہے' (صفحہ ۴۲)۔ اگلے صفحے پر ارشاد ہوتا ہے :- "ہر ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے"۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ فرماتے ہیں :- "درد کی دنیا بھی میر کی دنیا جیسی محدود و تنگ ہے"۔ غنیمت ہے کہ اسلوب پر 'شاباش' کا کلمہ آپ کی زبان سے نکلا۔

سودا — مرزا کے الفاظ و تراکیب وغیرہ کا اعتراف کرکے ارشاد ہوا ہے :- "لیکن الفاظ بندشیں، استعارے خود قابل تعریف کیوں نہ ہوں ان سے کسی شاعر کی برتری ثابت نہیں ہوسکتی۔ یہ محض ایک ذریعہ ہیں اظہار جذبات کا ـــــ اگر الفاظ کے ساتھ جذبات و خیالات کی بھی جانچ کی جائے تو سودا کی برتری ثابت کرنا مشکل ہی نہیں غیرممکن ہے"۔ پہلے میر کے کلام کو ناہموار، پست اور مبتذل بتایا گیا۔ اب ارشاد ہوا ہے کہ "ان کے تجارب ذاتی تھے سودا کے مصنوعی ہیں" (صفحہ ۵۰)۔ پھر مرزا کے کلام کی نسبت کہا جاتا ہے :- "ان کے کلام میں ایک بےپایاں زور بھی ہے جو میر و درد کو میسر نہیں" اثر۔ تاثیر۔ زور ان تین کاموں میں کیا تعلق اور نسبت ہے اس کو واضح کرنا چاہیے تھا۔ غرض کہ جس طرح مکسور کے سوال کے حل میں جمع، منفی اور ضرب تقسیم کے لمبے عمل کے بعد جواب نکلتا ہے، اسی طرح اس کو اس سے گرایا اس کو اور کسی سے۔ حاصل یہ ہوا کہ سب کے سب نکمے اور پھسڈی ہیں۔

ذوق — "ذوق بالطبع ذرا خشک طبیعت واقع ہوئے تھے۔ مختلف جذبات و خیالات کو کامل پختگی، حسن و خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن اس لفظی خوبصورتی کا بھی ان کے اشعار میں وجود نہیں جو سودا کے کلام میں تمام ملتی ہے"۔ "انھوں نے اپنی غزلوں میں محض قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے"۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا بوالعجبی ہے کہ جب ایک شاعر کا کلام لفظی خوبصورتی سے محروم ہو تو وہ بیچارہ قادرالکلام کیوں کر ہوسکتا ہے۔

غالب — فرماتے ہیں :- غالب کا دماغ بلند اور تخیل وقیع تھا۔ ان کا مطمح نظر تنگ و محدود نہ تھا" غالب کی غزل کے "اعلیٰ فلسفیانہ مضامین" کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :- "لیکن غالب نے بھی غزل کے نقایص کو رفع نہیں کیا" غالب خوش قسمت

تھے کہ یہ سند ان سے لے اڑے :— "محسوسات و جذبات پر خیالات و تصورات کو ترجیح دیتے ھیں۔ مشکل سے مشکل مضمون کو آسانی سے بیان کرتے ھیں"۔ آخر کا جملہ زبردست سے زبردست غالب پرست کو چونکائے گا اور وہ غالب کا یہ مصرع دوھرا کر سکتہ کے عالم میں رہ جائے گا ۔ ع :— مشکل ھے ز بس کلام میرا اے دل ۔

لیکن غالب کہاں بچ نکلے ۔ ان کا وار بے پناہ ھوتا ھے۔ اعتراف کے بعد فرماتے ھیں :۔ "غالب کے کلام میں چند مخصوص نقایص بھی ھیں ۔ ایک تو ان کے کلام کی مخصوص ناھمواری ھے—ان کا کوئی خاص انداز بیان نہیں"۔ صفحہ ۲۹ میں "پرانے اور فرسودہ خیالات و مروجہ عشقیہ جذبات کو عامیانہ اور رکیک طور پر نظم" کرنے کا الزام غالب پر وارد کیا گیا ۔ اور ارشاد ھوتا ھے: "اس وجہ سے غزل و شعر مفرد کی پراگندگی پراگندہ تر ھوجاتی ھے"۔ شعر مفرد کی پراگندگی کا ثبوت کتاب بھر میں کہیں بھی پیش نہیں کیا گیا۔ غالب کی اس غزل پر جس کا پہلا مصرع ھے :— ع

مدت ھوئی ھے یار کو مہماں کیے ھوئے

تبصرہ فرماتے ھیں :— "غالب نے اپنی ساری قوت متخیلہ محض الفاظ پر صرف کردی۔ اس جدت طرازی کا ماحصل بھی ھے کہ سیدھی سادی بات کی بوقلموں پیرایہ اور رنگین بندشوں میں تکرار ھو"۔

فاضل پروفیسر صاحب کے اس اعتراض پر ٹنی سن کی ایک مشہور نظم کو جو حادثہ پیش آیا اس کا تذکرہ لطف سے خالی نہ ھوگا ۔ اس نظم کا عنوان ھے 'لائٹ بریگیڈ کا دھاوا' اور اس کا مطلع ھے :—

Half a league, half a league, half a league onward.

ایک مجمع میں اس نظم کی بہت تعریف ھو رھی تھی۔ ٹنی سن کی بدقسمتی سے ایک ریاضی کے پروفیسر صاحب بھی وھاں موجود تھے۔ مطلع سن کر وہ بہت چیں بہ جبیں ھوئے اور طیش میں آکر بولے کہ یہ احمق اتنا بھی نہیں جانتا کہ تین آدھوں کا مجموعہ کیا ھوتا ھے۔ اسے کہنا چاھیے تھا $1\frac{1}{2}$ league onward مگر ھمارے نقاد تو ریاضی نہیں لٹریچر کے پروفیسر ھیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ھے۔

مومن

مومن کے تبصرے میں فرماتے ہیں کہ: "نازک خیالی کسی شاعر کا منتہائے خیال نہیں ہوسکتی۔ مومن میں بھی نقص ہے۔ وہ نازک خیالی و معنی آفرینی کو اکثر اصل شاعری تصور کرتے"۔ گویا تخئیل کی نزاکت شاعری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ جب تخئیل اور داخلیت شاعری سے خارج کردیے تو پھر باقی کیا رہ جائے گا؟ وہی "چنا زور گرم" کی بانی۔ اور نہیں تو کیا؟ ارشاد ہوتا ہے:- "لیکن الفاظ کتنے ہی نادر کیوں نہ ہوں، استعارے کتنے ہی نایاب کیوں نہ ہوں اگر صرف اپنے لیے اختراع کیے گئے ہیں تو لائق تحسین نہیں"۔ اس عبارت کا پہلا حصہ مومن کے کلام پر غرابت کا نقص عاید کرتا ہے جو اعتراض فی‌الواقع غلط ہے۔ اب رہا دوسرا حصہ یعنی اپنے لیے استعارے اختراع کرنا، مذاق سلیم ان الفاظ کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہے۔ غنیمت ہے آخر میں مومن کے "حسین خیالات و الفاظ، دل‌کش طرزادا" مصنف سے داد لے گئے۔

یہاں تک گویا غزل اور غزل‌گو شعرا کا تبصرہ تھا۔ صفحہ ۷۵ سے قصیدہ کی باری آتی ہے۔ اب نہ قصیدہ کہنے والے رہے اور نہ وہ لوگ جن کے لیے قصیدے کہے جاتے تھے۔ جو قصاید غدر سے پہلے ہوچکے وہ اس میں شک نہیں کہ فارسی کے مشاہیر قصاید سے مقابلہ کی نظر سے تصنیف کیے گئے تھے۔ ان کا اب کیا ماتم ہے۔ خواجہ حالی نے قصیدۂ الغیاثیہ لکھ کر اس صنف میں انقلاب پیدا کردیا۔ اگرچہ ان کے بعد چند ہی قصیدے ایسے ہوئے جو ذکر کے قابل ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ فاضل مصنف اس اشارے کے ساتھ تبصرے کے اس حصے کو ختم کرتے۔ اور صرف اتنا فرماتے کہ قصیدے کے بارے میں فارسی سے تقابل اور قواعد فن کی سخت پابندی کا لحاظ رکھا گیا۔ بس اتنا تبصرہ کافی تھا۔

سودا کی ہجویں آپ کو بہت پسند ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

مثنوی

قصیدے کے بعد مثنوی تنقید کی زد میں آتی ہے۔ سحرالبیان میں میر حسن نے میر داستان کی شان میں یہ لکھا تھا:-

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال مروت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے نفروں سے نفرت اسے سدا قابلوں سے تھی محبت اسے

اس پر بگڑ کر ارشاد ہوتا ہے :-

" اسے دیکھ کر ہر ذی فہم بھی کہے گا کہ ایسے کامل جانور دنیا میں نظر نہیں آتے " (جانور پر خط ہم نے کھینچا ہے)

ان الفاظ کو سن کر ہر ذی فہم بھی کہے گا کہ یہ مخاصانہ اور شریفانہ انتقاد کی زبان نہیں - کیا کیمبرج کے چڑیا خانہ میں بھی ایسے جانور سدھائے نہیں جاسکتے ؟

مثنوی کی صنف پر عام تبصرہ آپ کا یہ ہے :- اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ "اگر صرف الفاظ اور نازک خیالی پر اکتفا کی جائے تو بعض اردو مثنویاں اعلےٰ پیمانہ کی ٹھہریں گی ۰۰۰۰" - مگر الفاظ کی شستگی اور خیال کی نزاکت تو آپ کے خیال میں معائب سخن میں سے ہیں - گلزار نسیم اور سحرالبیان پر ذرا مفصل تنقید کی گئی ہے -

مرثیہ

ارشاد ہوتا ہے :- " شاعر اپنے ذاتی جذبات کو نہیں بھولتا - وہ شاعرانہ تخیل میں اپنی ہستی فنا نہیں کرتا - اس لیے مختلف نقایص رونما ہوتے ہیں " -

یہ دور کی بات کہی گئی مگر ہے متنازعہ فیہ - پچھلی صدی کے اواخر میں سٹیج پر ایکٹ کرنے کے متعلق یہ سوال اٹھا تھا کہ کیا ایک ایکٹر کو پارٹ کرتے ہوئے اپنی ذات کو فنا کرکے معرض میں جذب ہوجانا چاہیے یا نہیں ؟ اور بھی دو سوال تھے - ایک استفساریہ یورپ اور امریکہ کے مشہور ایکٹروں کے پاس بھیجا گیا - سرہینری اردنگ' بیربھوم ٹری ' مس ایلن ٹیری اور بینکرافٹ وغیرہ اس وقت زندہ تھے - سب جوابات مع تشریح کے ناٹک کے مشہور مبصّر ولیم آرچر نے مرتب کیے اور وہ کتاب کی صورت میں شایع کیے گئے جس کا نام ہے سائیکولوجی آف ایکٹنگ - مشاہیر کی رائیں جو شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں درج ہیں ان میں اختلاف ہے - ہمارا مطلب اس تذکرے سے یہ ہے کہ آپ کی رائے جو ابھی اقتباس ہوئی مغرب میں جہاں سے وہ اخذ کی گئی ہے مختلف فیہ ہے - آپ کو یہی شکایت ہے نا کہ شاعر اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھتا - آپ واقعی اپنے جذبات کو بھول گئے ہوں گے جب آپ نے سحرالبیان کے ہیرو کو " جانور " بناديا - مغربی انتقاد کے رطب و یابس کو جا و بے جا کلیہ کی طور پر فاخرانہ پیش کرنا ہمارے نقد و نظر کے اصولوں کے خلاف ہے - مغرب کے اصول فن شاید یہ سکھاتے ہوں -

صفحہ ۴ پر فرمایا تھا کہ "شاعر کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ طوفان جذبات و تصورات کو قابو میں لاسکے اور انھیں پرکھ سکے"۔ اب صفحہ ۱۲۸ پر یہ ارشاد ہوتا ہے:- "شاعر اپنے جذبات کو نہیں بھولتا، وہ شاعرانہ تخیل میں اپنی ہستی فنا نہیں کرتا اس لیے مختلف نقایص رونما ہوتے ہیں"۔ اگر ایک شے کو "قابو میں رکھنا اور پرکھنا" میں اور اس کے بھلا دینے میں فرق نہیں تو مصنف کے دونوں نظریے جو ابھی بتائے گئے صحیح ہیں ورنہ اجتماع نقیضین کا نقص عاید ہوتا ہے۔ بہ‌ظاہر کسی کو اگر یہ شک ہو کہ مصنف کا معہود ذہنی اردو شاعری کے حق میں مصلحانہ اور ہمدردانہ نہیں بلکہ صریحاً اس کی خواہ مخواہ تحقیر و تضحیک منظور ہے تو کسی کو شکوے کی جگہ نہیں۔

مرثیہ کے بارے میں آپ کی رائے ہے کہ شامیوں کے لشکر کے سپاہیوں کی بہادری اور جلادت کا راگ گایا جانا چاہیے تھا اور یہ کہ مرثیہ گو "رزم کے بعض صحیح اصول سے مطلقاً آشنا نہیں"۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ کوئی یہ ہدایت کرے کہ مسٹر چرچل کا فرض ہے کہ کم سے کم ہفتہ میں ایک بار ایوان عامہ میں ہٹلر کی مدح سرائی کیا کریں اور بی-بی-سی کو چاہیے کہ نازی بمباروں کی قدر اندازی کا راگ گایا کریں ورنہ کہا جائے گا کہ ہوم ڈیفنس کا ناظم رزم کے صحیح اصول سے آشنا نہیں۔

جاننا چاہیے کہ مرثیہ کہنے کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ کیمبرج کا ایک گریجویٹ گرے کی ایلیجی کو سامنے رکھ کر پارکر کا جیبی قلم ہاتھ میں لےکر رقم‌طرازی کرے بلکہ وہ کچھ اور ہے۔

لکھتے ہیں:— "انیس و دبیر کے مراثی میں وہ عام نقایص موجود ہیں جو عموماً صنف مرثیہ میں پائے جاتے ہیں"۔ اور "انیس کے مراثی میں سیرت نگاری کا وجود نہیں"۔ گویا آپ کی رائے میں مرثیہ اور ڈراما میں کچھ فرق نہیں۔

دونوں استادوں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ سند ان کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:- (۱) "انیس واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ انسانی کردار۔ افعال خصوصاً جنگ و نزاع تو نہایت جوش و صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ کہیں کوئی شے مبہم و

تاریک نظر نہیں آتی—'' (صفحہ ۱۴۶)۔ ابھی فرمایا تھا کہ انیس کے مراثی میں سیرت نگاری مفقود ہے۔ اب یہ تمغہ دیا جاتا ہے۔ کیا ایک پرانی مثل کو اب یوں بدلنا پڑےگا :- تنقیدگو را حافظہ نہ باشد۔

اور ارشاد ہوتا ہے :- ''انیس مناظر کی تصویر کشی میں بھی دبیر سے بدتر ہیں''۔ دو بند طلوع سحر کے سلسلے کے دےکر یہ حکم لگایا گیا ہے کہ :- ''الفاظ کی شان، استعاروں کی شوکت، نقوش کا حسن ظاہر ہے لیکن صبح صاف نظر نہیں آتی''۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیوں‌کہ عینک رنگین لگی ہوئی ہے۔

صفحہ ۱۳۸ میں حضرت امام حسین اور حضرت علی اکبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :- ''یہ افراد نہ خالص عرب نظر آتے ہیں نہ ہندی۔ بلکہ ان کی ذات میں دونوں قسم کے اجزا ملتے ہیں''۔ اس کی بیّن وجہ یہ ہے کہ حضرات متعلق عرب کے ہیں لیکن ان کی ذات گرامی سے متعلق حادثات اہل ہند کو بتانے اور سمجھانے ہیں۔

اس کے بعد اس عہد کی تنقید کو ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :-''اس سرسری تنقید سے اردو شاعری کی بے بضاعتی و کم‌مایگی ظاہر ہوگئی'' ۔ اس کی وجہ آپ کے خیال میں مشاہدہ عالم کی کمی بتائی گئی ہے (۱۵۸) دوسری وجہ ''اردو شعرا کی مغربی ادب سے ناآشنائی'' بتائی گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ وجوہات کی تعداد آگے نہ بڑھی ورنہ عجب نہ تھا کہ یہ ارشاد ہوتا چونکہ اردو کا ہر شاعر کیمبرج کا گریجوئیٹ نہیں اور نہ کسی کالج میں انگریزی ادب کا پروفیسر ہے اس لیے اردو شاعری بے بضاعت و کم مایہ ہے۔

صفحہ ۱۶۲ کے بعد ایک ضمیمہ شاہ نظیر اکبرآبادی کے بارے میں سپرد قلم فرمایا ہے۔

لکھتے ہیں :—اکثر وہ جزئیات میں اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں کہ مکمل نقش کے حسن کو فراموش کردیتے ہیں''—'' نظیر کا مطمح نظر بلند نہ تھا اور وہ مغربی ادب سے واقف نہ ہوسکے''۔ اس سے متعلق بھی کہاجاسکتا ہے کہ اس تمام انتقاد نامہ کا لب‌لباب یہ ہے کہ مغربی ادب سے واقفیت کے بغیر کوئی شخص شاعر نہیں کہا جا سکتا۔

اگر فاضل پروفیسر صاحب کا عندیہ مغربی ادب سے یورپ اور امریکہ کے ہر ملک کا ادب ہے تو عاقل کہہ گئے ہیں کہ ایسی باتوں کا جواب خاموشی ہے۔ لیکن اگر انگریزی زبان کے ادب سے مدعا ہو تو انہیں واضح کرنا چاہیے تھا کہ آیا ان کا عندیہ انگریزی کے کس عہد کے ادب سے ہے۔ جو عہد انگریزی ادب کے ہیں اور جو باہمی اختلافات ان میں مسلم ہیں ان سے معترض کے نظریہ پر خاک روشنی نہیں پڑتی۔ بہرحال یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مغرب کے ادب کے طلسم کی نقاب کشائی یہیں کردی جائے اور لوگوں کو اس ہوے کے رعب سے نجات دی جائے۔ اس ذکر میں یہ یاد رہے کہ ہم اپنی رائے کو دخل نہ دیں گے بلکہ خود اہل مغرب کے نقد و نظر کو پیش کردیں گے۔ ایک انگریز نقاد فرماتے ہیں :— ڈاکٹر مور کی تائید کرتے ہوئے جنگ عظیم کے بعد جو رجحانات انگریزی شاعری پر حاوی ہوگئے ہیں ان کی بابت مسٹر کلارک کا قول ہے کہ موجودہ شعرا نے عریاں انسانیت کی تلاش شروع کردی ہے اور ہر قاعدہ و ضابطہ کی قید و بند سے آزاد ہوجانا چاہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ نیچر سے بھی وہ ایسی نیچر مراد لیتے ہیں جو اب تک اچھوتی ہو[1]۔ اگر آپ اسی وجودیت یا حقیقت نگاری کے شیدا ہیں جو اس وقت انگریزی شاعری کا چہرہ بگاڑ رہی ہے تو یاد رہے کہ آپ کی تبلیغ ہندستان میں کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ بدقسمتی سے یہ ملک ایشیا میں واقع ہے، یورپ میں نہیں۔

بعد جنگ عظیم یعنی عہد حاضر کی انگریزی شاعری پر تازہ ترین تبصرہ ڈاکٹر کامپٹن رکٹ کی زبان سے سن لیجیے۔ اس کا لب لباب ہے :—

> ایک لٹریچر نے جس کی شان مضطربانہ جنگ‌جوئی ہے اس (وکٹوریائی عہد) کی جگہ لی ہے۔ یاوہ گوئی نے موسیقی کے علاوہ اور شعبوں پر بھی غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے۔ ہمارے زمانہ نے نثر میں اور نظم میں حتیٰ کہ اخلاق

۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو Realistic Revolt in Modern Poetry, by A. M. Clark, 1922.

میں قطع و برید کی ہے۔ آج کل کے لٹریچر میں تمام کمزوریاں آزمایشی دور کی موجود ہیں جسے خود اپنا پتہ نہیں[1]

اس کے بعد جہاں کہیں انگریزی ادب سے ناآشنائی کا الزام ہمارے شعرا پر تھوپا جائے گا نظر انداز کردیا جائے گا۔

حصہ دوم جدید شاعری سے متعلق ہے۔ اس عہد کے شعرا میں سے نصف سے زیادہ انگریزی کے عالم ہیں اور باقی کے نصف سے زیادہ اچھی انگریزی جاننے والے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف ان امور واقعہ کو جانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔

خیر اب حصہ دوئم کی داستان سنیے۔ آزاد کو "عصر حاضر کی شاعری کا پیش‌رو" کہہ کر چھوڑ دیا۔ مگر نزلہ گرا خواجہ حالی پر۔ غزل کے متعلق آپ کا الزام خواجہ مبرور پر یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی ابتری کا الزام برا کہنے والے شاعروں پر رکھا صنف غزل کو بری قرار دیا۔ (صفحہ ۵) [2]۔ اور فرماتے ہیں:-

"حالی اپنے مطمح نظر کی تنگی کے سبب سے نظم کے معنی قصیدہ۔ مرثیہ مثنوی سمجھتے ہیں۔ یہ علم نہیں کہ ہر نظم مبسوط اور طولانی نہیں ہوتی ــــــ اگر حالی کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے تو اس غلط خیالی کے مرتکب نہ ہوتے ــــ" (۵)

آخر گولر کا پیٹ کھل گیا۔ فرمایا:۔

"حالی کا مقصد اصلاح ہے انقلاب نہیں۔ اور ضرورت تھی انقلاب کی"۔ (۷)

خدا کا شکر ہے کہ یہ ضرورت "اردو شاعری پر ایک نظر" لکھ کر مصنف کی ذات سے پوری ہوئی۔ غنیمت ہے کہ آزاد اور حالی انگریزی سے ناواقف تھے ورنہ کیا عجب

---

1 A Primer of English Literature, By Arthur Compton-Rickett, M.A., LL.D.-1938, P. 197.

۲ کتاب کے ہر حصہ کے صفحات جداگانہ ہیں۔

کہ وہ بھی انقلاب عظیم کا طوفان برپا کردیتے۔

بےچارے خواجہ پر ایک انوکھا اعتراض سنیے :-

"ہر جگہ ہر خیال میں اخلاق کی جلوہ گری ہے۔ اس سے حالی کے خیالات کی دنیا تنگ اور ان کی تنقید کی اہمیت کم ہوگئی ہے"۔ (۷)

واقعی خواجہ حالی نے غلطی کی کہ بداخلاقی کے بدلے اخلاق کو موضوع قرار دیا۔ معلوم نہیں مصنف کی ملٹن اور اس کی بہشت گم کردہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔ وہ جو کہا کرتا تھا کہ یہ "متشاعر بھی کتنے قابل نفرت، نفس پرست اور جاہل ہیں، وہ خدا اور مذہب کو موضوع بنالیں تو شاعری کی شان کتنی بلند ہوجائے" چنانچہ ملٹن خود تھا بھی سب سے زیادہ مذہبی شاعر۔ حالی پر اخلاق کا الزام ہے تو اسی استدلال سے ملٹن پر مذہب کا الزام عاید ہوسکتا ہے۔ مگر ہم غلطی پر ہیں۔ حالی ہندستانی تھے اور ان کی شاعری اور مقدمہ شعر و شاعری اردو میں ہے جب کہ جان ملٹن حضرت مصنف کی مانند کیمبرج کا 'بڈھا لڑکا' تھا اور اس کی شاعری ایک مغربی زبان میں ہے۔ یہاں تک تو حصہ دوم کا دیباچہ تھا۔ اب نقد و نظر کی ابتدا آزاد مرحوم سے شروع ہوتی ہے۔ تبصرہ بہت طویل ہوگیا اس لیے اختصار سے کام لیا جائے گا۔

آزاد کہا گیا ہے آزاد کی مثنویوں کے "مختلف حصوں میں ربط و تسلسل بھی مکمل نہیں۔ کتنی سطریں حذف کردی جاسکتی ہیں۔ مثنوی کے لیے سطر کا لفظ بھی ایجاد مصنف ہے۔ مگر بےچارے مغرب زدگی کے بحران سے مجبور ہیں۔ انگریزی میں نظم کا سب سے چھوٹا جز لائن ہوتی ہے یعنی مصرع۔ ہمارے ہاں کی طرح شعر یا بیت نہیں۔ مطلب تو ان کا یہ تھا کہ اگر کئی شعر نکال دیں تو مطلب خبط نہیں ہوگا مگر لکھ گئے سطر۔

جاننا چاہیے کہ ربط و تسلسل کا نقص اس کلام پر عاید ہوتا ہے کہ اس میں ایسے کھانچے ہوں کہ جب تک انہیں پُر نہ کیا جائے مطلب پورا نہ ہو۔ آزاد کی بلکہ اردو شاعری کی سب سے پہلی نظم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس قدر طوالت کی

ضرورت نہ تھی، یہ دوسری بات ہے، خیر ارشاد ہوتا ہے:-

''آزاد محض معمولی دماغ اپنے ساتھ لائے تھے''

حضرت یہ وہ معمولی دماغ ہے جس نے ملک کی نظم اور نثر کی کایا پلٹ دی، کاش ایسے ہی معمولی دماغ کے اور بہت سے آدمی اس وقت ہوتے!

حالی — خواجہ حالی کی نسبت کچھ تو اس حصے کی تمہید میں آچکا ہے، اب ان کی شاعری پر تبصرہ فرماتے ہیں، ابتدا اس جملے سے ہوتی ہے:-

''حالی کی کائنات ان کا مسدس ہے۔۔۔۔۔۔حالی بھی آزاد کی طرح اوسط درجہ کا دماغ رکھتے تھے اس لیے ان کے خیالات بھی سطحی ہیں، ذرا بھی بلند پروازی یا عمق نہیں'' (۳۰)

مسدس کی شان میں فرماتے ہیں:-

''۔۔۔۔۔اس لیے اصلیت کی تمنا ہی خیال خام ہے۔ مسدس حالی میں بھی نقص ہے کہ یہ نظم قصداً لکھی گئی ہے اس لیے اس میں ہر جگہ آورد کی جلوہ گری ہے ـــــ مسدس حالی مثل ریگستان کے ہے جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سی سرسبز و شاداب جگہ نظر آجاتی ہے۔ جس سے ایک لمحہ کے لیے دماغ سکون و فرحت کا سامان حاصل کرتا ہے پھر تو پریشانی ہی پریشانی ہے۔

آورد اور آمد کے بارے میں مصنف کو کچھ سمجھانا تحصیل حاصل ہے۔ مسدس مدو جزر اسلام کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ وہ آوردستان اور ریگستان ہے جس نے مسلم ہندستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک خلقت کو بیدار کردیا۔ انھیں کشمکش حیات کے لیے تیار اور مستعد بنادیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندو حضرات نے بھی اس نظم سے بشارت لےکر اپنے فرقہ پر اچھا اثر ڈالا۔ ہم بلاخوف اختلاف یہ کہنے کو تیار ہیں کہ دنیا کی کسی نظم نے عامۃالخلایق کی ذہنیت پر اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا اس نظم نے۔

شبلی — فرماتے ہیں علامہ شبلی نعمانی کے کلام میں:- ''اعلا اخلاق موجود ہے مگر شعریت عموماً مفقود ہے'' اور ارشاد ہوتا ہے:-

" صبح امید کے علاوہ ان کی ساری اخلاقی اور اسلامی نظمیں معیار شاعری سے گری ہوئی ہیں " -

معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق اور اسلام سے آپ کو سخت محبت ہے - اتنی کہ انہیں الفاظ اور شعر کا منت‌کش دیکھ نہیں سکتے - اگر مثنوی صبح‌امید معیار شاعری سے گری ہوئی نہیں تو مسدس مد و جزر اسلام بھی ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ دونوں کا موضوع ایک ہی ہے - صرف صنف کا فرق ہے - مثنوی اصل میں مسدس کا ملخص ہے - اور ارشاد ہوتا ہے :-

" تخیل کی کم‌زوری ' قوت‌حاسہ کی کمی ' گرمی جذبات کی برف سامانی یہ نقایص ان (شبلی) کی راہ میں حایل تھے اور انہیں کامیاب شاعر بننے نہیں دیتے "

چونکہ آپ غلط زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے آپ کا تبصرہ صحیح نہیں - نہ شبلی مرحوم کی قوت حاسہ کم‌زور تھی نہ ان کے جذبات میں گرمی کم تھی ' ہاں وہ بحرانی حدت کے معمول نہ تھے - غنیمت ہے کہ آپ نے علامہ مرحوم کو " اکبر اور اقبال کا پیش‌رو " تسلیم کرلیا -

اکبر

اکبر کے کمال فن کا آپ کو اعتراف ہے مگر فرماتے ہیں :-

" سودا کا زور انہیں میسر نہیں اور ان کی نظمیں نسبتاً نہایت مختصر ہوتی ہیں——اکبر میں غضب ' حقارت کا جذبہ نہ تھا ورنہ وہ بلند ترین پیمانہ کے ہجوگو ہوتے " -

اگر اکبر میں بہ‌قول آپ کے یہ اوصاف ہوتے تو وہ سودا کی طرح سب و شتم پر اتر آتے - اکبر کے کلام کو ہجو سے کوئی واسطہ نہیں - وہ طنزیہ اور مزاحیہ حیثیت رکھتا ہے اور یہی اس کا کمال ہے ' آخر میں وہی مغرب پرستی کی بڑ موجود ہے کہ :-

" اگر وہ نظم کے صحیح معنی سے واقف ہوتے اور کم از کم اس میں مغرب کی تقلید کرتے تو ان کی شاعری کی اہمیت زیادہ سے زیادہ ہوتی "-

اس مغربی جنون کا طلسم ہم آگے توڑچکے ہیں -

شوق قدوائی

مصنف کا اعتراض ہے کہ شوق کو فطرت انسانی پر کامل عبور نہیں- یہ شعر عالم خیال سے نقل کرکے :-

ندیوں کو لے کے یوں دریا سمندر سے ملے
لے کے ارمانوں کو عاشق جیسے دلبر سے ملے

فرماتے ہیں: " دوسرے مصرع میں حسین تشبیہ ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے اس تشبیہ کو اختراع کرنے میں کاوش کی ہے" اختراع اور کاوش کا الزام سراسر غلط ہے، کیونکہ اس میں جدت نام کو نہیں۔ اس مصرع پر اگر عمومیت کا اعتراض کیا جاتا تو فن کی رو سے تو نہیں لیکن آپ کے نقطہ نظر سے درست ہوتا، ارشاد ہے :-

" شاعر قصداً سادہ طرزادا اختیار کرسکتا ہے لیکن کامیابی کے لیے شرط ہے کہ وہ اس کو آمد کے سانچے میں ڈھال سکے یعنی اپنی کاوش اپنے تکلف کو مخفی رکھ سکے، اسی میں شوق کامیاب نہیں ہوتے "۔

معترض ایک قابل رحم مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں شعر کی تعریف ہی میں قصد کی شرط لازمی ہے۔ وہ سادہ طرز ہو یا رنگین طرز، آپ کے مغرب میں جو مشاہیر شعرا آپ کے پیر و مرشد ہیں کیا ان کا کلام ذہن کی اضطراری حالت کا مولود ہے یا آپ کے خیال میں شاعر یا ناثر بغیر ارادے کے اپنے طرز کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ اکبر پر اختصار کا الزام تھا۔ شوق پر طوالت کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ کچھ تو کہنا ہوا۔

اقبال

فرماتے ہیں :— " تنزل حال، عروج گزشتہ، بشارت مستقبل یہی اقبال کی شاعری کا سنگ بنیاد ہے۔ انہیں کو وہ مختلف پہلو سے متفرق پیرایہ میں جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اقبال کا مطمح نظر ہی صرف وسیع نہ تھا ان کا دماغ بھی بلند پایہ تھا "۔

اور لکھتے ہیں :-

" ہندستان کے موجودہ عصر کا مورخ مسلمانوں کی بیداری کا ایک اہم ترین سبب اقبال اور ان کی نظموں کو قرار دے گا "۔

یہ تو درست ہے۔ لیکن اس سے اگلے ہی صفحہ پر اپنی عادت کے مطابق تفریق کی ادا سے فرماتے ہیں :-

"قومی و ملی شاعری شاعری کی ایک شاخ ہے، کسی مشرقی و مغربی ادب میں یہ بلند ترین مرتبہ پر نظر نہیں آتی"۔

اگر اقبال کی نظمیں مسلمانوں کی بیداری کا اہم ترین سبب ہیں اور اقبال نے ایشیا کی زبان میں وہ نظمیں کہیں اور اقبال کا وطن ایشیا کے براعظم کا ایک اہم جز ہے تو اس کے لیے کسی ارسطو سے استفتا کی ضرورت نہیں (مغرب سے ہمیں یہاں واسطہ نہیں) کہ مشرقی ادب میں قومی و ملی شاعری کا مرتبہ پست و ادنیٰ بتانا کہاں تک معقولیت رکھتا ہے۔

فرماتے ہیں :۔ "اقبال کی قومی و ملی شاعری کا ماحصل ان کی تین نظمیں ہیں : شکوہ۔ خضرراہ۔ طلوع اسلام"۔ خضرراہ پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :۔

"......یہ ربط یہ ارتقائے خیال مکمل نظم میں بھی موجود ہے لیکن اکثر علیحدہ بند میں نظر نہیں آتا۔ مثلاً جس بند میں زندگی کی ماہیت پر عمیق فلسفیانہ روشنی ڈالی گئی ہے وہاں اشعار میں ربط و تسلسل نہیں—ارتقائے خیال تو سرے سے مفقود ہے—اسی طرح اکثر خیالات کی اہمیت ایسی چھاجاتی ہے کہ شعریت گھبرا کر حلقۂ وزن سے نکل جاتی ہے"۔ (۷۷)

یہ تنقید اس بند سے تعلق رکھتی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے :۔

شب سکوت افزا ہوا آسودہ۔ دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

اس بند میں ربط و تسلسل کا فقدان ہمیں تو کہیں معلوم نہیں ہوتا۔ اس بارے میں کچھ آگے عرض کیا جائےگا۔ پہلے یہ سن لیجیے۔ جو بند اس مصرع سے شروع ہوتا ہے ع :

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک

اس کی بابت ارشاد ہوتا ہے کہ :

"نثریت غالب ہے۔ ہر شعر میں ایک خیال کا سیدھا اور عریاں اظہار ہے جو نثر میں بھی ممکن تھا۔ یہی حال اور نظموں کا ہے"۔

جاننا چاہیے کہ نظم میں رنگینی اور دلاویزی محاکات سے آتی ہے۔ جہاں شاعر اس

سے کام لیتا ہے آپ کہہ دیتے ہیں ربط و تسلسل مفقود ہے۔ جہاں وہ واقعیت اور حقایق نگاری سے کام لیتا ہے آپ فرمادیتے ہیں نثریت آگئی۔ افسوس ہے کہ مغرب زدگی نے یہاں تک آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ مشرق کی کسی چیز میں پسندیدگی نظر ہی نہیں آتی۔ حضرت، اپنے آپ کو مشرق میں تصور کرکے ان بندوں کو پھر پڑھیے اور فن کے محاسن جو اردو شعر پر عاید ہیں ان کی شمع کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو ان بندوں میں بےانتہا خوبیاں نظر آئیں گی۔ آپ کے مطمح نظر کا ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ آپ اسی نظر سے اردو شاعری کو دیکھتے جس نظر سے ڈاکٹر ایچ۔ اے۔ ٹین نے ٹنی سن کے ان میموریم کو دیکھا تھا [1]

غالب کے تذکرے میں اعتراف کیا گیا تھا کہ "ان کی آنکھیں وا ہیں — محسوسات و جذبات پر خیالات و تصورات کو ترجیح دیتے ہیں" (حصہ اول۔ صفحہ ۶۳)۔ اب اقبال کے تذکرے میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"اس قسم کی خیالی نظموں کی اہمیت دنیائے شاعری میں بہت زیادہ نہیں" (۸۹)

سچ کہا ہے: تنقید نگار را حافظہ نہ باشد۔

اس حصہ تنقید کے یہ حصے ازحد افسوس‌ناک ہیں جو صفحہ ۹۲ سے شروع ہوتا ہے :۔

"اقبال کی پرجوش صدا فضا میں گونجی تھی۔ ابھی تک بازگشت آرہی ہے۔ لیکن آواز اپنی اصلیت پر قائم نہیں۔ یہ تیز۔ کرخت۔ بھدی اور بدنما ہوگئی۔ سامعہ بس بس کہہ اٹھتا ہے — اقبال کے معاصرین بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکے، کورانہ تقلید تو گویا اردو شعرا کی فطرت ثانی ہے"۔

"لیکن شعرا میں اصلیت و صداقت عموماً مفقود ہے اور اگر اس کا کہیں وجود

---

1. The great task of an artist is to find subjects which suit his talent. Tennyson has not always succeeded in this. His long poem, In memoriam, is cold, monotonous, and often too prettily arranged.---History of English Literature,---by Dr. H. A. Taine; Vol. II. p. 526.

بھی نظر آتا ھے تو اس کی ترجمانی میں نقایص رہ جاتے ھیں۔"
" شعرا میں اکثر تخیل کی کمی ھے" (۹۶)

ابھی اقبال ھی کے تذکرے میں ایک نظم کا جایزہ لیتے ہوئے جس میں اصلیت و صداقت موضوع تھا ارشاد ھوا تھا کہ ایسی باتیں تو نثر میں بھی کہی جاسکتی ھیں ۔ اب فرماتے ھیں کہ شعرا میں اصلیت مفقود ھے ۔ کہیں "تجربات" کو شاعری کا جزواعظم بتایا جاتا ھے اور تخئیل کو دُلکا جاتا ھے اور کہیں "تخئیل کی کمی" کا ماتم ھے۔

سیماب

ان سے اول تو یہ گلہ ھے کہ وہ نہیں بتاتے کہ اصلاح شاعری کے ضمن میں حقیقی موضوعات کے معنی کیا ھیں ؟ سیماب صاحب کے ھاں جو جدید اردو شاعری کے موضوعات پر نظمیں ھیں ان کی نسبت فرماتے ھیں :-

اس طرز کی نظموں میں تمام وہ نقایص موجود ھیں جن کا بیان ھوچکا ھے" (۱۰۱)

ایک نظم "اے سرمایہ دار" کا ایک بند نقل کرکے اس کے متعلق فرماتے ھیں :-" یہ سب کچھ ھے لیکن یہاں خیالات محض ھیں ۔ شاعرانہ خیالات کا وجود نہیں ۔ خیالات اپنی جگہ پر درست بھی ھیں اور ان کا اظہار بھی برزور پیرایہ میں کیا گیا ھے ۔ الفاظ میں شوکت اور بندشوں میں چستی بھی نظر آتی ھے ' لیکن شعریت کا پتہ نہیں " اب عقل حیران ھے کہ یا رب یہ کیا ماجرا ھے یا ھمارا دماغ صحیح نہیں یا کسی اور صاحب کا ۔ ایک نظم میں جب خیالات درست ھیں الفاظ پرشوکت ھیں اور بندش چست ھے تو پھر اس میں نقص کہاں سے آگیا اور پھر موضوع کی نوعیت واقعیت اور اصلیت چاھتی ھے نہ کہ شاعرانہ تخیل غالباً نقاد کو موضوع کا خیال نہ رھا ۔ جوش ۔ جگر ۔ حسرت اصغر ۔ فانی اور ترقی پسند شعرا پر بھی عنایت ھوئی ھے ۔

چکبست

چکبست میں آپ کو کوئی بات داد و اعتراف کے قابل نظر نہیں آتی ۔ "چکبست میں آزادی فکر نہیں — دماغ غایر و محیط نہیں — خیالات و تصورات محض سطحی ھیں " وغیرہ ۔ حضرت ' چکبست وہ شخص ھے جس نے اودھ اور یو-پی کے شعرا پر نہایت مستحسن اثر ڈالا ۔ وہ ان شعرا میں سے ھے جو غزل اور اصناف نظم پر یکساں قدرت رکھتے ھیں اور جنھوں نے اردو شاعری میں وطنیت کا عنصر داخل کیا ھے ۔

عہد حاضر کے اور شعرا کی نسبت قارئین کرام اندازہ کرسکتے ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں آیا ہے۔ تبصرہ بہت طویل ہوگیا ہے اس لیے اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۷۸ ویں صفحہ سے 'گل نغمہ' پر تقریظ شروع ہوتی ہے۔ طوالت کے خوف سے اس پر یہاں نقد و نظر ناممکن ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ اگرچہ الفاظ احساسات کے اظہار میں بہت کچھ کامیاب ہوسکتے ہیں لیکن ان کی تنظیم بہت اہمیت رکھتی ہے جس پر عموماً نقاد کی نظر نہیں جاتی۔ الفاظ کی تنظیم سے شاعر الفاظ میں جادو کا اثر ڈال سکتا ہے اور انہیں وہ معنوی وقعت بخشتا ہے جو ان کو پہلے نصیب نہ تھی۔ سائنس عہد بہ عہد ترقی کرتا ہے۔ جوں‌جوں وہ اشیا کی تحلیل پر قادر ہوتا جاتا ہے اپنی تدوین و تکمیل کو پہنچتا جاتا ہے۔ لیکن آرٹ کی ترقی کی یہ چال نہیں- وجہ یہ کہ کسی زمانے کے انسانوں کے جذبات و احساسات کے اظہار کی حیثیت سے اس میں بھی افراط وتفریط ہوا کرتی ہے جو اس عہد کے خیالات و اخلاق کی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ کسی عہد کا فن‌کار جس کی ترجمانی کرتا ہے وہ اس کے ماحول کا تابع عموماً ہوا کرتا ہے اور اس طرح آرٹ ہمیشہ ایک چیز کو متغیر رنگوں میں دکھاتا رہتا ہے۔ لیکن اصلیت وہی رہتی ہے یعنی اس انقلاب پذیر دنیا میں انسان کے احساسات اور شعور ذہنیہ۔ توقع ہے کہ ہمارے فاضل دوست ان امور پر اور جو بات شروع میں عرض کی گئی تھی اس پر اب تو ضرور غور فرمائیں گے۔

(ل۔ا)

گل نغمہ

ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کے منظوم کلام کا مجموعہ۔ صفحات ۱۲۹۔ کاغذ و کتابت وغیرہ عمدہ، قیمت ڈھائی روپے۔ ناشر کتابستان، الہ‌آباد۔ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ اور شغل منصبی اگرچہ سائنس سے متعلق رہا لیکن شاعری سے ان

کو عشق اور اس میں ان کا مذاق پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اچھی نظمیں کہتے ہیں جو آج کل کے معیار سے بہت دور نہیں رہتیں۔ اگرچہ تخیل بلند نہیں مگر بعض ٹکڑے اچھے جذبات کے حامل ہیں۔ کلام میں زور کم ہے۔ اسلوب بھی اتنا چست نہیں مگر شگفتگی کی طرف میلان ضرور ہے۔ باتیں جو کہنا چاہتے ہیں بری نہیں لیکن ادا اور بیان میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ آمد کی بھی کمی ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے "زبان در گور" اس میں آورد ہی آورد ہے۔ جو ربط اور اثر میر کے اس دو شعروں کے قطعہ میں ہے اس چار سٹینزا کی نظم میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں اگرچہ اس نظم کا ماخذ یہی قطعہ ہے۔ وہ یہ ہے:—

کل پانو ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

ایک سات شعر کی نظم ہے جس کا عنوان ہے "ہائے جوانی"۔ اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آیا یہ ماتم جوانی کے گزر جانے کا ہے یا زندگی کی عام مکروہات کا۔ ایک قطعہ کا عنوان ہے "برسات اور شاعر"۔ ملاحظہ ہو:—

تھا درختوں کو ابھی عالم حیرت ایسا
جیسے دلبر سے یکایک کوئی ہو جائے دو چار
ڈالیاں ملنے لگیں تیز ہوائیں جو چلیں
پتے پتے میں نظر آنے لگی تازہ بہار
سنسناہٹ ہوئی جھونکوں سے ہوا کے ایسی
چھٹ گئی ہوں کہیں لاکھوں ہی ہوائی یکبار
رعد گرجا ارے وہ دیکھنا بجلی بجلی
ہلکی ہلکی سی پڑنے لگی بوندوں کی پھوھار
رات تاریک ہے آیا ہے امنڈ کر بادل
میں اکیلا نہ کوئی یار نہ کوئی غمخوار

سرد جھونکوں میں ہوا کے ہے لطافت اور دل
اس کا خواہاں ہے نہیں ملنے کے جس کے آثار
ایسی بےچینی خدایا نہ ہو دشمن کو نصیب
اس سے بدتر نہ کسی کو ہو خدایا آزار

وہ تخیل ہے یا مشاہدہ دونوں میں نقص اور بے ربطی نہایت بھونڈی ہے۔ بیان تسلسل سے جو قطعہ کی شرط اول ہے، معصوم ہے اول شعر کے دوسرے مصرع میں تشبیہ عامیانہ ہے جب کہ وجہ شبہ ندارد ہے۔ شروع کے دونوں شعر آپس میں بےواسطہ ہیں اگرچہ دوسرے شعر میں "جو" نے اس نقص پر پردہ ڈالنے کی کچھ کوشش کی ہے۔ چوتھا مصرع قاری کو اس سے زیادہ حیرت میں ڈالتا ہے جو دلبر سے یکایک دو چار ہو جانے سے ہوتی ہوگی کہ ڈالیاں ہلنے سے پتے پتے میں تازہ بہار کیونکر آجاتی ہے۔ یہ تجربہ اگر کوئی ہے تو اعجوبہ روزگار ہے۔ تیسرے شعر میں ہوائی کی جگہ ہوائیاں ہونا چاہیے۔ یہ محل مفرد کے استعمال کا نہیں۔ "ارے وہ دیکھنا!" فجائیہ کلمات بھی عجیب و غریب ہیں۔ یہ ٹکڑا استعجاب کو چاہتا ہے جس کا یہ قرینہ نہیں۔ چھوٹے بچوں نے بھی بجلی چمکتی دیکھی ہے۔ نہایت بھدی غلطی مشاہدے یا بیان کی یہ ہے کہ جب رعد گرجے اور بجلیاں چمکیں اور ہوا سنسنا رہی ہو تو پھوار نہیں پڑا کرتی بلکہ تیز بارش ہوا کرتی ہے اور پھر پھوار کہتے ہی ننی ننی بوندوں کو ہیں۔ اس لیے بوندیں یہاں حشو ہیں۔ نہ یہ سماں ہوا میں لطافت پیدا کرتا ہے۔ خیر۔ یہ سماں ہے اور کسی کے ملنے کی خواہش ہے مگر اس کے ملنے کے آثار نہیں نظر آتے جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نہ موٹر کی ہوٹ سنائی دیتی ہے نہ آنے والے تانگے کے گھوڑے کی ٹاپ۔ قرینہ یہ بتاتا ہے کہ کسی کے آنے کا انتظار ہے اگر دل کسی ایسے شخص کا خواہاں ہوتا جو اس وقت قید حیات میں نہ تھا تو آثار کی جگہ امکان کا کلمہ استعمال کیا جاتا۔ "دل کسی کا خواہاں ہے" یہ غلط زبان ہے۔ آخری شعر سے کوئی ربط اور واسطہ نہیں۔ "بےچینی" کا کلمہ ناگہانی طور پر وارد ہوجاتا ہے۔ وہ بےچینی نہایت شدید قسم کی ہوگی کہ دشمن کو بھی اس سے محفوظ رکھنے کی دعا مانگی

جاتی ہے مگر سب سے آخر کے مصرع سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بےچینی یا آزار جو کچھ بھی تھا ایسا تھا کہ اگر صرف اسی قدر کسی کو نصیب ہو تو مضایقہ نہیں مگر اس سے زیادہ برا کسی کو نصیب نہ ہو چنانچہ آخری دعا ہے:—

اس سے بدتر نہ کسی کو ہو الٰہی آزار

القصہ جتنے نقایص اور سقم کسی کلام میں ہوسکتے ہیں وہ سب اس قطعہ میں اکٹھے ہوگئے ہیں ۔ اس لیے نہایت اعتدال سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظم ادنیٰ ترین درجہ کی شاعری کا بدترین نمونہ ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے صبح چمن ۔ اس کا ایک شعر ہے:—

خموش یا تو پرندے تھے اب یہ حالت ہے
کوئی ہے نغمہ سرا ۔ کوئی دے رہا ہے تال

صاف ثابت ہے کہ شاعر نے صبح چمن کی کیفیت چمن میں جاکر کبھی مشاہدہ نہیں کی ورنہ وہ پرندوں کو تال دینے پر ہرگز مجبور نہ کرتا ۔ پرندے نغمہ‌سرائی ضرور کیا کرتے ہیں مگر تال نہیں دیا کرتے نہ طبلہ بجایا کرتے ہیں ۔ اسی نظم میں درختوں کی شاخوں کی کیفیت میں فرماتے ہیں:—

کبھی الگ ہوئیں وہ اس طرح بہ صد انداز
جدا ہوں رشک سے جس طرح دو پری تمثال

یہ کیفیت بیان کرنی ہے کہ ٹہنیاں کبھی ایک دوسرے سے ملتی تھیں اور کبھی الگ ہوجاتی تھیں ۔ مشبہ بہ میں ایک کہانی مضمر ہے ۔ دو پری تمثال یعنی دو حسین عورتیں ایک دوسرے سے بغل‌گیر ہوئیں کہ ان میں سے ایک کو یکایک یہ یاد آیا کہ جس سے میں بغل‌گیر ہورہی ہوں وہ تو میری سوکن بننا چاہتی ہے یعنی میرے شوہر سے محبت کرتی ہے (نہیں تو کلمہ رشک حشو اور بےمعنی ٹھہرے گا) ۔ فرض کیجیے کہ ایسا ہوسکتا ہے لیکن اس طرح بغل‌گیری کو نامکمل چھوڑ دینے میں اور پھر جب کہ اس مفاجاتی کنارہ کشی کا سبب رشک ہو نہ صرف انداز بلکہ "بہ صد انداز" کا موقع کہاں ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے " فرقت " ۔ اس میں دو شعر قطعہ بند اس طرح واقع ہوتے ہیں :-

سبزے جو ہیں ہوا میں ہلتے　　ابر جو ہیں آپس میں ملتے
اس میں ویسی شرارت کب ہے　　اس میں ایسی رفعت کب ہے
گل بوٹے گو سب ہیں نرالے　　کب ہیں ویسے بھولے بھالے

سبزہ کو سبزے کہنا فاحش غلطی ہے ۔ گل بوٹے کسی درجے میں بھی بھولے بھالے یا چترے چالاک نہیں ہوا کرتے ۔ ایک نظم پرواز عشق میں آٹھ آٹھ مصرعوں کے بند ہیں ۔ قافیہ کی ترتیب یہ رکھی ہے کہ پہلا مصرع اور تیسرا مصرع ہم‌قافیہ ہیں ۔ دوسرا اور چوتھا ہم‌قافیہ ہیں ۔ اسی طرح پانچواں اور ساتواں ہم‌قافیہ ہیں اور چھٹا اور آٹھواں ہم‌قافیہ ہیں ۔ پہلے بند میں مضطر کا تقفیہ بھر کے ساتھ کیا ہے جو غلط ہے کیونکہ مضطر میں ط مفتوح ہے مکسور نہیں ۔ اگلے بند میں اسی لفظ مضطر کو میسر سے قافیہ کیا ہے جو درست ہے ۔ اس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس لفظ کا صحیح تلفظ جانتے تھے لیکن غالباً ان کو کسی نے یہ بہکا دیا کہ شعر کہنے میں لفظوں کے تلفظ کی صحت کا پابند رہنا ایک قسم کی فارسی ۔ عربی کی غلامی ہے اور بیچارے ڈاکٹر صاحب جو خاصا اچھا شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں خواہ مخواہ ' وھٹمینیٹ ' کے پھیر میں پڑ گئے ۔ جبھی تو اسی نظم کے تیسرے بند میں سے (یاء مجہول) کا تقفیہ ہے (یاء مفتوح) سے کر گئے ۔

جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے خوف ہے کہ بزرگ مصنف کا دل دکھائے ۔ ہم کو خود رنج ہے کہ ہمیں اس کتاب پر تبصرہ کرنا پڑا ۔ ہم پھر کہیں گے کہ ڈاکٹر صاحب محترم میں اچھا شاعر بننے کے امکانات تھے لیکن مغرب کی کورانہ تقلید اور غلط مشورے نے ان کی طبیعت کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ۔ کیا اچھا ہو کہ وہ اس اڈیشن کو ناشر سے واپس لے لیں اور کسی اچھے ادیب اور شاعر کو دکھاکر دوسرا اڈیشن شایع فرمائیں تاکہ کتاب دیدہ زیبی کے ساتھ بصیرت‌افروز بھی ہو ۔

(م ۔ ی)

تذکرۂ بےنظیر

(مرتبۂ سید منظورعلی ایم۔اے کتابستان الہ آباد۔ قیمت دو روپے)

یہ تذکرہ سید منظورعلی صاحب، ایم۔اے، نے جو الہ آباد یونیورسٹی میں فارسی کے ری سرچ اسکالر تھے، ڈاکٹر زبید احمد صاحب کی نگرانی میں مرتب کیا اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس کی نظر ثانی کی اور تصحیح وغیرہ میں مشورہ دیا۔

تذکرہ کے مصنف میر عبدالوہاب افتخار تخلص دولت آبادی ہیں جو خود اچھے شاعر اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے۔ افتخار سنہ ۱۱۶۲ھ میں نواب ناصر جنگ بہادر کی ملازمت و مصاحبت میں داخل ہوئے۔ یہ ان فارسی شعرا کا تذکرہ ہے جو بارھویں صدی کے پہلے ۷۲ سال میں ہندستان یا ایران میں گزرے۔ کل ایک سو چونتیس شعرا کا ذکر ہے۔ شعرا کا احوال مختصر ہے سوائے بعض شعرا کے جن کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے تحقیق سے لکھا ہے۔ ہر شاعر کے حالات کے ساتھ اس کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔ جیسا کہ ہمارے عام تذکروں کا دستور ہے تنقید کم ہے۔ البتہ بعض بعض جگہ تعریف میں مبالغہ ضرور پایا جاتا ہے لیکن اس پردے میں کلام کے اصلی محاسن کا اظہار بھی کردیا ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو اردو کے بہت اچھے اور پختہ شاعر ہوئے ہیں لیکن ان کے اردو کلام کا نمونہ نہیں دیا۔

ایک لحاظ سے یہ تذکرہ اردو ادب کے لیے بھی مفید ہے کیونکہ ان اردو شعرا کے کچھ حالات اس میں ایسے ملیں گے جو دوسرے تذکروں میں نہیں ہیں۔

تذکرے کی زبان شستہ اور پختہ ہے اور بیان میں صفائی پائی جاتی ہے۔

اردو کے نئے رسالے

چمنستان

(مدیر: آغا سرخوش قزلباش، نائب مدیر: گوردھن داس ایم۔اے، سالانہ چندہ دو روپے)

کے فرزند ہیں۔ رسالہ اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے لحاظ سے پڑھنے کے قابل اور قدر کے لایق ہے۔ پروفیسر حامد حسن صاحب قادری نے آغا شاعر مرحوم کی شاعری پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی لکھنے والے انھیں اچھے اچھے ملے ہیں۔ جلیل، احسان دانش، احسن مارہروی، فانی، جوش ملیح وغیرہ کا کلام بھی نظر سے گزرتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور خواجہ محمد شفیع، گوری سرن سری واستو ایم۔ اے کے مضامین بھی پڑھنے میں آتے ہیں۔ ہم قابل مدیروں کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے نظم و نثر کا دلکش مرقع مرتب کیا ہے۔

مشہور

(اڈیٹر: حکیم محمد نقی دھلوی۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ ماہانہ رسالہ دھلی سے اسی سال شایع ہوا ہے۔ اس میں ادب اور طب سے بحث ہوتی ہے۔ رسالہ بہت دلچسپ اور مفید ہے۔ کام کی باتوں کے ساتھ افسانے اور مزاحیہ مضمون بھی ہوتے ہیں۔ ادبی اور علمی مضامین بھی ہیں۔ زبان صاف ستھری اور سادہ ہے۔ لکھائی چھپائی اور ترتیب بھی بہت اچھی ہے۔ طب کے حصے میں مفید معلومات اور مجربات درج ہوتے ہیں۔ رسالہ بڑی تقطیع کا ہے اور ساٹھ صفحے سے کم نہیں ہوتا۔ ڈیڑھ روپیہ سالانہ میں ایسا اچھا رسالہ بہت سستا ہے۔ امید ہے کہ اردوداں طبقہ اس کی قدر کرے گا۔

خاص نمبر

مجلۂ عثمانیہ

اس سال کا مجلہ عثمانیہ بہت ضخیم ہے۔ دو نمبر ملاکر چھاپے گئے ہیں۔ اردو حصے کے ۲۹۰ اور انگریزی کے ۷۳ صفحے ہیں۔ اس میں ہر قسم کے مضامین ہیں۔ ادب، معاشیات، تاریخ و سیاسیات، افسانے، نگارش لطیف، سائنس پر اچھے اچھے مضامین ہیں اور زیادہ تر جامعہ کے طلبہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ علاوہ نثر کے دس نظمیں بھی

ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ طلبہ میں ذوق ادب بڑھتا جاتا ہے اور وہ ہر قسم کے مضامین کو سلیقے سے اچھی زبان میں ادا کرنے پر قادر ہیں۔ مجلہ کا یہ نمبر اپنی گوناگوں خوبیوں اور دلچسپیوں کے اعتبار سے پڑھنے کے قابل ہے۔

متفرق

«نئی تعلیم کا آئینہ» مصنفۂ منشی رام پرشاد ماتھر، سابق ہیڈ ماسٹر، مطبوعۂ شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڈھ، سنہ ۱۹۳۹ع۔ کاغذ۔ لکھائی۔ چھپائی عمدہ۔ صفحوں کی تعداد ۴۹۶ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

منشی رام پرشاد صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک کتاب "ہندو تیوہاروں کی اصلیت" کافی مقبول ہو چکی ہے۔ ایک اور کتاب پر اسی رسالے میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ تعلیم پر بھی اس سے قبل ان کی تصنیف "ابتدائی تعلیم کی رام کہانی" شایع ہو چکی ہے۔ تعلیم جیسے خشک موضوع پر عمدہ کتاب لکھنا معمولی بات نہیں، اس کے لیے کافی معلومات اور وسیع تجربہ ہونا چاہیے۔ قابل مصنف نے زندگی بھر یہی کام کیا ہے۔ وہ نہ صرف مدرس بلکہ کئی مدرسوں کے صدر مدرس رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے انھیں سینکڑوں مدرسوں کا معاینہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نئی اور پرانی تعلیم کی خوبیوں اور برائیوں سے بخوبی واقف ہیں اور ایک واقف‌کار کی حیثیت سے انھیں بیان بھی کرتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے تخریبی پہلو اختیار نہیں کیا بلکہ ایک مشفق اور دوراندیش بزرگ کی حیثیت سے تعلیم اور درس‌گاہ کے متعلق اپنے تجربے اور مشاہدے بیان کیے ہیں۔

"قدرت کی تربیت" "پہلے زمانہ میں استاد کا رتبہ اور فرائض" "گروجی کی تعلیم کا تاریک پہلو" "مولوی صاحب کی قمچی" "کمزور بچوں پر ظلم" "عیب‌دار لڑکا" "جغرافیہ اور تاریخ کا مطالعہ" بعض ذیلی عنوانوں کے نام ہیں۔ ان ہی سے تنوع

ظاهر هے اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی هے اور اس کے پڑھنے سے بڑا فائدہ هوگا - یہ کتاب قابل قدر هے - زبان بھی بہت اچھی هے - پانچ سو صفحوں کی عمدہ کتاب کی قیمت دو روپے آٹھ آنے بہت کم هے -

(ن - ح)

سو برس کی زندگی مولفۂ منشی رام‌پرشاد صاحب - اوسط سائز - صفحوں کی تعداد ۱۰۱ - کتابت اور طباعت معمولی - اشاعت سنہ ۱۹۳۰ع قیمت آٹھ آنے - ناشر : رام‌نرائن لال ، الہ‌آباد -

همیشہ سے انسان کی خواهش رهی هے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ ، باصحت اور ــــ جوان رهے ! هر عہد میں ایسے لوگ هوتے هیں جن کے خیال میں بہت بڑی عمر کا هونا عام امکان هے - ان هی لوگوں میں منشی رام‌پرشاد صاحب بھی هیں جن کی یہ کتاب اشاعت کے تقریباً دس سال بعد هم تک ریویو کے لیے پہنچی هے - اگر دنیا کا کار و بار اسی سست رفتار سے چلتا رها تو کچھ تعجب نہیں کہ همارے اعصاب کو ایسا سکون نصیب هو کہ هم اسی کی بدولت سو برس کی عمر حاصل کرسکیں یا سست رفتار کی وجہ سے هماری زندگی اتنی دوبھر هوجائے کہ وہ سو سال کی معلوم هو -

فاضل مولف نے اپنے رسالے میں جابجا اشارہ کیا هے کہ صحت بخش غذا ، اوقات کی پابندی اور ورزش کے ذریعہ هم اپنے معیار صحت کو بلند کرسکتے هیں - کاش فاضل مولف نے صرف ان هی امکانی باتوں کا ذکر کیا هوتا جنھیں وہ بہت سلیقہ اور سادگی سے بیان کرتے هیں - مثلاً مرغن اور مصالحہ‌دار غذاؤں کے متعلق لکھا هے : -

"سب سے عمدہ مصالحہ خود بھوک هے" (صفحہ ۲۶)

اسی بات کو مولانا حالی نے ایک رباعی میں کیا خوب ادا کیا هے : -

کھانے تو بہت میسر آئے هیں همیں

جو دیکھ کے چکھ کے دل سے بھائے هیں همیں

پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں
(حالی)

ظاہر ہے کہ اس کتاب میں تمباکو، لال مرچ اور ان کے "بھائی بند" (!) نشہ بازی اور شراب نوشی کے خلاف بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں بھی اگر اعتدال سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

ج۔ ح

انیسویں صدی میں مدراس کے اردو اخبار

(افضل العلما ڈاکٹر محمد عبدالحق پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس)

مدراس کے اردو اخبارات پر مضمون لکھنے کا خیال ایک مدت سے دل میں جاگزیں تھا، لیکن قدیم اخبارات کو فراہم کرنا ایک ایسا مشکل امر ہے کہ باوجود پیہم کوششوں کے جب میں اس میں کامیاب نہ ہوسکا تو تکمیل مضمون کے خیال کو ہمیشہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس خیال کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مجھ کو اپنے والد صاحب قبلہ مدظلہ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے شمالی ہند کے بعض عربی مدارس میں مدراس کا شمس الاخبار بےحد مقبول تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اخبار بہ‌مقابلہ دیگر اخبارات کے اسلامی اور بیرونی ممالک کی خبریں بہ‌کثرت شایع کیا کرتا تھا۔ میرے محترم بزرگ ایڈیٹر صاحب رسالۂ اردو نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور یہ ترغیب دلائی کہ مدراس کے قدیم اردو اخبارات پر ایک مضمون لکھا جائے، میں نے وعدہ تو کرلیا لیکن ہمیشہ ایفا سے گریز کرتا رہا اور یہ یقین ہے کہ اگر مولوی صاحب کا شدید تقاضا اور انجام‌کار ان کے عتاب کا خوف نہ ہوتا تو شاید ہی یہ وعدہ پورا ہوتا[1]۔ اس مختصر سے مضمون میں میں نے اس امر

۱- مولوی صاحب کا عتاب آمیز خط جس نے مجھے اس مضمون کے پورا کرنے پر مجبور کیا درج ذیل ہے:۔
''حضرت، جولائی گیا اگست بھی گزر گیا۔ آپ کے مقالہ کا اب تک انتظار ہے۔ کب تک انتظار کرائیے گا۔ میرے بعد اگر مکمل ہوا تو یہ حسرت میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، وقت گزرتا جاتا ہے، حالات بدلتے جاتے ہیں، جو کچھ کرنا ہو کر لیجیے نہ معلوم کل کیا ہوتا ہے۔ اب جس طرح بن پڑے تکمیل کر کے بھیج دیجیے اور وقت کا تعین کرکے لکھیے کہ کب تک میرے پاس پہنچ جائے گا ....یہ دونوں کام

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۷۲

کی کوشش کی ہے کہ مدراس اور اس کے اضلاع کے بعض قدیم اردو اخبارات کے متعلق مفید معلومات یکجا جمع کردیے جائیں اور بہت ممکن ہے کہ میں بعض ایسے اردو اخبارات کا ذکر کرسکوں جو اس صوبے میں زبان اردو کے حقیقی خادم تھے۔ جن اخبارات کی جلدیں اور بعض متفرق پرچے میرے پیش نظر ہیں ان کی بنا پر میں نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ ۱۸۴۸ع سے ۱۹۰۰ ع تک کے اردو اخبارات کا مجمل تذکرہ مرتب ہوجائے ۔ یہ امر آسان نہیں ہے کہ میں اپنے مضمون میں ان تمام اردو اخبارات کا ذکر کرسکوں جو اس صوبے میں جاری ہوئے کیونکہ قدیم اردو اخبارات کی جلدیں بالعموم کمیاب ہیں اور صوبۂ مدراس کے اردو اخبارات کی جلدیں تو تقریباً ناپید ہیں ' باوجود اس کے میں نے مدراس اور بنگلور کے اکثر اخبارات کا ذکر کیا ہے لیکن جن کی اشاعت کا مجھے علم نہ ہوسکا ان کے متعلق واقف‌کار حضرات اگر رسالۂ اردو کے صفحات میں مفید معلومات پیش کرسکیں تو میری یہ کوشش یقیناً کارآمد ثابت ہوگی ۔

اب تک اردو اخبارات کے متعلق جو معلومات بہم پہنچے ہیں ان کی بنا پر یہ ظاہر ہے کہ اردو کا پہلا اخبار دھلی سے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر صاحب کی ادارت میں ۱۸۳۶ ع میں جاری ہوا ' اس کے بارہ سال بعد ہی مدراس میں اردو اخبار شایع ہونے لگے۔ سب سے پہلا اخبار جو مجھے دستیاب ہوا ہے وہ ۱۸۴۸ع میں جاری ہوا تھا ' غالباً اس کا پہلا نمبر محرم ۱۲۶۵ ھ میں نکلا تھا اور یہ ھی مدراس کا قدیم ترین ھفتہ وار اردو اخبار ہے : اس کے پہلے صفحہ پر اکثر فورٹ سینٹ جارج گزٹ کے اعلانات طبع ہوتے تھے ' نام کے ساتھ تک‌بندی کی عجیب مثال ذیل کے فقروں سے ظاہر ہے :—

" اعظم‌الاخبار " پنجشنبہ روز اشتہار ' قیمت یک روپیہ ماہوار ' پیشگی دس روپے سال کو یک بار ' محصول ڈاک ذمہ خریدار ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۱

آپ ھی کے کرنے کے ھیں اور آپ ھی کو کرنے پڑیں گے - میری زندگی میں ان سے آپ کو چھٹکارا نہیں مل سکتا ۔

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

نیازمند عبدالحق"

اخبار کا نام غالباً نواب غلام غوث خاں بہادر متخلص بہ اعظم بانیِ مدرسہ اعظم مدراس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تھا، پہلے پہل اردو اخبارات کے اجرا سے مقصد شاید یہی تھا کہ نوابوں اور رئیسوں سے بہ ذریعہ خوشامد تحصیل زر کی صورت نکل آئے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر قدیم اخبارات اپنی قیمتیں متفاوت مقرر کیا کرتے تھے۔ اعظم الاخبار کا جو نمبر میرے پیش نظر ہے وہ ٦ محرم ١٢٦٦ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۴۹ع کا ہے۔ اس میں مقامی کیفیتیں درج ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد، جالنہ، گووا، بمبئی اور ملتان کے متعلق خبریں مندرج ہیں، حیدرآباد کی خبر میں روہیلوں، افغانوں اور سکھوں کی ان تجاویز اور سازشوں کا ذکر ہے جو راجہ نانک بخش کو گرفتار کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔

اس اخبار میں رسم الخط کی ایک یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ہر جگہ «یا» اور «واو مجہول» کو معروف متمائز کیا گیا ہے اور مجہول «یا» اور «واو» پر اس قسم کے نشان پائے جاتے ہیں:۔ «w ' o ' ʌ»۔ فارسی اور عربی ترکیبیں زیادہ ہیں۔ سول اور ملٹری کے لیے اہل قلم اور اہل شمشیر یا شمشیربند کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ذیل میں چند جملے درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ عربی اور فارسی ترکیبیں بکثرت استعمال کی گئی ہیں:—

«ان کی موت کی تفصیل ہنوز کماینبغی معلوم نہیں ہوئی»

«شاید کہ جنون زدہ ہوا ہو۔ لوگوں پر ہنوز کچھ حقیقت اس کی مکشوف نہیں ہوئی۔ گاڑی بانوں کے اہتمام و سعی سے یہ آتش فرو ہوئی»۔

ان کے علاوہ کہیں کہیں فارسی محاوروں کو اردو میں ڈھال لیا گیا ہے مثلاً «رو دادن» سے «رُو دینا» جیسے ذیل کے جملے سے واضح ہے:۔

«اگر ارباب حکومت اس کی کچھ تدبیر مناسب فرماویں تو خوب، نہیں تو ہمیشہ ایسے ہی اتفاقات رُو دیتے رہیں گے»۔

عبارت میں «نے» کا استعمال بالکل کم ہے، اگر کہیں اس کا استعمال کیا بھی گیا ہے تو غلط۔ مثلاً «امام نے اپنے یاروں کے ساتھ دعا اور استغفار میں مشغول تھا» یا «پراس نے عربوں کی تائید سے ان کے ہاتھ گرفتار نہ آسکا»۔

۱۸۴۹ ع میں اس کے علاوہ مدراس سے ایک اور اخبار «آفتاب عالمتاب» نکلتا تھا۔ اس کی خبروں کا حوالہ دھلی کے مشہور ریاضی داں ماسٹر رامچندر کے اخبار «فوائدالناظرین» میں پایا جاتا ھے[1]۔

مدراس کے ایک اور اخبار کا ذکر نواب غلام غوث خاں بہادر اعظم نے اپنے تذکرۂ گلزار اعظم میں کیا ھے۔ مولوی محمد مہدی واصف کے بیٹے حکیم عبدالباسط متخلص به عشق ایک ھفتہوار اخبار «تیسیرالاخبار» کے نام سے نکالتے تھے، حکیم صاحب عربی اور فارسی کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شعر و شاعری سے طبیعت کو لگاؤ تھا اور خان عالم خاں بہادر فاروق اصلاح سخن کیا کرتے تھے۔ نواب اعظم کے قول کے مطابق ان کے اخبار میں مختلف ممالک کے حالات و واقعات درج ھوا کرتے تھے۔ نواب صاحب نے یہ تذکرہ چونکہ ۱۲۶۹ ھ مطابق ۱۸۵۲ع میں مرتب فرمایا اس سے یہ اندازہ ھوسکتا ھے کہ یہ اخبار ۱۸۵۲ع سے کچھ پہلے ھی جاری ھوا ھوگا، بہت ممکن ھے کہ یہ زیادہ مدت تک زندہ نہ رھا ھو کیونکہ اس کے حوالے کسی اور اخبار میں نہیں پائے جاتے[1]۔

غدر سے کچھ دنوں پہلے شاید ۱۸۵۶ع میں محمد خواجہ بادشاہ صاحب عبرت نے ایک اخبار «مظہرالاخبار» کے نام سے جاری کیا، اس کا دفتر ترملکھڑی میں مسجد والا جاھی کے متصل تھا۔ عموماً یہ بارہ صفحات کا ھوتا تھا۔ دتاسی نے اس اخبار کا ذکر کیا ھے اور اس کو عشرہ وار کہا ھے[2] لیکن میرے پاس جو نمبر ۱۸۵۹ع کے موجود ھیں ان سے ظاھر ھوتا ھے کہ یہ ھفتہ وار اخبار تھا، بہت ممکن ھے کہ ابتدائے اشاعت میں یہ اخبار عشرہ وار رھا ھو، پہلے صفحہ پر ایک غزل مدحیہ اخبار کے متعلق ھوا کرتی تھی جس کا مطلع یہ ھے:

۱- رسالۂ اردو بابۃ اپریل ۱۸۳۵ ع صفحہ ۲۰۱ ۔ تذکرہ گلزار اعظم صفحہ ۵۶۴ - تذکرہ نویس نے اخبار کے متعلق یہ تصریح نہیں کی کہ یہ اردو میں شایع ھوتا تھا لیکن میرا یہ قیاس شاید غلط نہیں کہ اس زمانے میں اردو اخبارات کی پسندیدگی عام کی وجہ سے جناب عشق نے اس کو اردو ھی میں جاری کیا ھوگا، صاحب تذکرۂ شعرائے دکن نے عشق کے ذکر میں اسی اخبار کا نام تمیزالاخبار بتایا ھے جو غالباً تصحیف ھے۔

۲- خطبات گارساں دتاسی ص ۵۱۹۔

«ضیائے دیدۂ بینا ہے مظہرالاخبار   مفید مردم ہر جا ہے مظہرالاخبار»

غزل کے بعد ایک مختصر سی نظم تھی جس میں اخبار کی تاریخہائے اشاعت وغیرہ کے متعلق مفصل معلومات درج ہوتی تھیں۔ ذیل میں اس کو درج کیا جاتا ہے :-

اطلاع در مثنوی

قلم اب مضامین رنگیں رقم کر   خیال معانی نو یک قلم کر
تری قید تحریر میں ہیں مطالب   لکھا کر وہی بات جو ہے مناسب
تکلف سے تمہید کی باز آ اب   نہیں ناظرینوں کو ہے اس سے مطلب
یہ اخبارنامہ جو ہے خوب و زیبا   ہمیشہ سہ‌شنبہ کو مطبوع ہوگا
پئے چہارشنبہ جمعرات دو روز   شش و پنج اس میں نہیں اے دل‌افروز
سدا ڈاک پر روز آدینہ جاوے   لفافے پہ زیب مواہیر پاوے
بلاعذر بھجوائے ہر صاحب زر   جو ماہواری یک روپیہ ہے مقرر
اگر پیشگی سال کی ہووے درپیش   روانہ کریں تو روپیے بےکم و بیش
کسی پر گزر جائے گر سال پورا   نہ لیویں روپیہ پندرہ سے کم اصلا
جو ہر ہفتہ روئداد لکھا کریں گے   ہم ان کو چپ اخبار بھیجا کریں گے
مگر ڈاک کی ان کے جانب ہو اجرت   یہ آئین جاری رکھیں اہل خبرت
جو کوئی چھاپنے بھیجے نظم و عبارت   تو فی سطر چار آنے پہنچا دے اجرت
یہی مدعا مشتہر کا ہے ہر آں   رہیں ناظریں شاد و خورسند و فرحاں

زیر نظر نمبر، ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۵۹ع کا ہے۔ دوسرے صفحہ پر ایڈیٹوریل کے سلسلے میں ذیل کا مضمون ہے جو اس زمانے کی عبارت کا ایک اچھا نمونہ ہے :-

مدراس ہمایوں اساس

«بفضلہ اس ہفتے کے ایام ٹھنڈے ٹھنڈے ہی گزرے، نوع غلبۂ حرارت کاستہ نظر آیا، کچھ ابر بھی گھٹا کیا۔ بہ فیض ترشح دو راستہ چھنکاؤ ہوا۔ سرسبزی دکھلائی دی۔ تقاطر آب نے اطفال نباتات کو جو مہد زمیں پر بہ کمال تشنہ‌لبی مضطرب‌الحال تھے

سیرابی بخشی' غرض ماجرائے شب کا یہ اثر ہے روداد روز نوع دیگر ہے۔ چہرۂ آفتاب ہنوز بےنقاب ہے' شدت تپ و تاب سے مہر واحد بےتاب ہے' طائر حواس بر ہوا ہے۔ آشیانۂ جمعیت عنقا ہے۔ نظارۂ باغ و بہار پر ہر بلبل دل بلہار ہے' جدھر دیکھیے ادھر پھولوں کا مہکار ہے' علی‌الخصوص موگرے کی ارزانی مولمو افزائش پذیر ہے۔ بےقدری عطر موتیا سے عطار دلگیر ہے۔ ہر سو سیر و تماشا ہے' ہوائے صحن چمن دلکشا ہے' برسرروڈ دوطرفہ آم کے بنڈیوں کی قطار ہے۔ انبہ فروشوں کی پیدائش روزمرہ روبکار ہے۔ ذائقہ چشی و پسند خاص و عام ہے۔ کثرت انبہ سے قدر دوکان حلوائی قلت سرانجام ہے' کہتے ہیں کہ آج کل پھر برنج کی گرانی نمودار ہونے سے مولمو ہجوم رنج و افکار عاید حال غربا ہے۔ دانۂ گندم کی طرح دل ہر آدم زاد دو نیم بنا ہے۔ رزاق مطلق جلد اپنے فضل و کرم کی نمائش دکھلاوے' بندگان پریشان روزگار کو بہ سرعت تمام راہ راست روزینہ پر لاوے"۔

اس قسم کی عبارت صفحہ ادارت کے مضامین کے لیے ہی مخصوص نہیں' کہیں کہیں معمولی چیزوں میں بھی اس رنگینی کی جھلک ہے' غالباً یہ ایڈیٹر صاحب کے شاعرانہ ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ "نیلام املاک کرناٹک" کے تحت میں لکھتے ہیں:—

"ناظرین کو یاد ہوگا کہ دو ہفتوں کے آگے جو نیلام املاک کرناٹک دیا گیا اور من بعد اس کے ظہور میں چندے وقفہ پائے جانے سے لفظ موقوفی قید قلم ہوا سو اس کا اصل حال آج کھلا۔ پردۂ توقف یک قلم درمیان سے اٹھا۔ چنانچہ بہ‌معرفت رسیور صاحب تمامی اسباب مابقی کرناٹکی از جز تا کل نیلام ہوگیا۔ تخت طلائی کا ایک تختہ بھی سونے کے لیے باقی نہ رہا۔ سڑی (سیڑھی) کی خواہش اس قدر کرسی نشین دل خریدارائی ہوئی کہ فوراً اس رشک چارپائی فلک کی اشترا نمایاں ہوئی۔ پارچہ‌جات و کتب وغیرہ ارزاں تر دست بدست تھے۔ کاروبار گرانی بے بندوبست تھے۔ غرض مشتریان زہرہ طالع نے خاطر خواہ نقد مدعا ہاتھ کیا۔ کو ہر متاع مقصود سے جیب آرزو بھرلیا"۔

عبارت میں فارسی اور عربی ترکیبوں کی بھرمار ہے اور جابجا "نے" کا صحیح استعمال پایا جاتا ہے۔ خبریں اکثر انگریزی اخبارات سے نقل کی گئی ہیں۔

فورٹ سینٹ جارج گزٹ کے بعض اہم اعلان بھی درج کیے گئے ھیں' خبریں ھندستان کے مختلف شہروں سے تعلق رکھتی ھیں ' زیر نظر نمبر میں غدر کے بعد کے حالات ھیں ' « تانتیا ٹوپی » اور فیروز شاہ کی فراری اور ان کی تلاش کا ذکر پایا جاتا ھے ۔

غدر دھلی کے زمانے میں مدراس میں فارسی اور اردو شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا نواب اعظم کے مشاعروں کی بدولت بہت سے ارباب سخن شہر میں جمع ھوگئے تھے اور یہاں ایک علمی فضا پائی جاتی تھی ۔ اس کا اندازہ ان متعدد اخبارات اور مطابع سے ھوتا ھے جو اس زمانے میں یہاں روز افزوں ترقی پر تھے ۔ غدر کے بعد ھی شاہ محمد صادق صاحب شریف مدراسی نے مطبع شریفیہ جاری کیا اور اس مطبع میں ان کے زیر سرپرستی ۱۸۵۹ع میں اخبار صبح جاری ھوا ۔ گارساں دتاسی نے اپنے پندرھویں خطبہ مورخہ ۱۸۶۵ع میں اس اخبار کے متعلق جو کچھ لکھا ھے اس کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ھوگا :۔ «مدراس سے اردو کا اخبار صبح صادق برابر شایع ھورھا ھے ۔ یہ ھفتہ وار ھے اور ھر سہ شنبہ کو شایع ھوتا ھے ۔ یہ بڑی تقطیع پر ھوتا ھے اور ھر صفحہ پر دو کالم ھوتے ھیں ۔ اس کے مدیر عبدالرحمن شفاف ھیں ۔ اس کی متعدد اشاعتیں میری نظر سے گزری ھیں ۔ ان میں سے ایک میں ھندؤوں کی غیر اخلاقی اور وحشیانہ رسوم پر تنقید ھے ۔ ان رسموں میں سے ایک « چرک پوجا » ھے ۔ جس طرح ستی کی رسم کو خلاف قانون قرار دیا گیا ھے ' اسی طرح اس کو بھی خلاف قانون قرار دینا چاھیے ۔ اس مضمون میں بعض ھندو فقیروں اور مالابار کی برھنہ عورتوں کے حالات درج ھیں ۔ اس رسم کو شاستروں کی تعلیم کے خلاف بتایا گیا ھے ۔ ھندو عورتوں کو اگر بالکل نو عمری میں بیاہ نہ دیا جائے تو وہ عمر بھر بن بیاھی رھتی ھیں اور ان کو دیوتاؤں کی نذر کردیا جاتا ھے ۔ یہ سب عورتیں فحش میں مبتلا ھوتی ھیں ۔ اسی اخبار میں سیفی کا ایک مضمون نظر سے گزرا ' یہ اچھا خاصا لکھ لیتے ھیں ۔ یہ مضمون امام حسن اور امام حسین کی شہادت کے متعلق تھا ۔ اس کے علاوہ غالب کی ایک غزل اس میں درج تھی جس کی ردیف پاؤں ھے ۔ مدیر نے مسٹر پامر کے ان مضامین پر تبصرہ لکھا ھے جو موصوف نے اودھ اخبار اور اجنا عالم کے لیے لکھے تھے ' تبصرے میں مسٹر پامر کے طرز انشا کی تعریف کی گئی ھے اور

اس خواهش کا اظہار کیا ہے کہ اچھا ہو کہ اگر گورنمنٹ ایسے یورپینوں کو مدارس کے سررشتہ تعلیم میں اعلیٰ خدمات پر مقرر کرے تاکہ ان سے نفع حاصل کیا جاسکے۔ ایسے اشخاص کا اثر مدارس پر بہت مفید ہوگا ، اس لیے کہ وہ ہندستانی ، عربی اور فارسی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں "۔ گارساں د تاسی نے ۱۸۶۶ ع کے خطبہ میں دوبارہ اسی اخبار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :— "......کہ یہ اخبار مہینے میں تین بار شایع ہوتا ہے اور بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ہوتا ہے جس میں ادبی مضامین ہوتے ہیں۔ اس کی صفائی عمدہ قسم کی ہے۔ سر ورق پر جہاں اخبار کا نام ہوتا ہے اس کے چاروں طرف سرخ رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ ان گل بوٹوں کے اندر چار اشعار لکھے ہوتے ہیں جن میں اس اخبار کی نوعیت اور مقصد کو بتایا گیا ہے[1] "۔

شریف صاحب[2] کی سرپرستی میں ایک اور اخبار طلسم حیرت (مدراس پنچ) جاری ہوا۔ اس کے اجرا کی تاریخ بہ قول مصنف اختر شاہنشاہی (سوانح عمری اخبارات) ۱۸۵۹ ع ہے۔ لیکن میرے پاس جو اجزا اس اخبار کے ہیں وہ ۱۹۰۶ ع کے ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ چھپنویں جلد کے اجزا ہیں [illegible]م طریقہ کے مطابق ہر سال کی ایک جلد قرار دی جائے تو تاریخ اجرا غالباً ۱۸۵۰ ع ہوگی۔ بہر حال اس امر میں قطعی فیصلہ ذرا مشکل ہے۔ یہ اخبار شاہ محمد صادق صاحب کے فرزند جناب غلام محی الدین صاحب حنیف کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا۔ شریف صاحب کے دوسرے فرزند جعفر حسین صاحب حریف اس کے مہتمم تھے۔ عشرہ وار اخبار تھا اور آٹھ صفحوں پر شائع ہوا کرتا تھا۔ باوجود تلاش کے اس اخبار کے وہ نمبر جو انیسویں صدی میں شایع ہوئے ، دستیاب نہ ہوسکے۔ ۱۹۰۶ ع کی اشاعتوں پر قیاس کرنا اور ان کا انتخاب دینا میں اس لیے

۱۔ گارساں د تاسی نے اسی سلسلہ میں مدراس کے ایک اور اخبار مسمی بہ ریاض الاخبار کا ذکر بھی کیا ہے۔ ۲۔ شریف صاحب مدراس کے ممتاز شاعروں میں سمجھے جاتے تھے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔ ان کے شاگردوں میں جناب شاہ عبدالقدوس صاحب ضوء صاحب دیوان ہیں اور بحمداللہ اب تک بقید حیات ہیں۔

غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ میرے عنوان مضمون سے خارج ہے - بہر حال یہ ان گنتی کے دو ایک اخباروں میں ہے جن کی مدت اشاعت تقریباً ساٹھ سال کے لگ بھگ رہی - غالباً اس وصف میں مدراس کا ایک اور اخبار 'طلسم حیرت' پر سبقت لے جاتا ہے اور وہ "شمس الاخبار" ہے - یہ ۱۸۵۹ ع میں جاری ہوا ' پہلے پہل یہ چھوٹی تقطیع پر شایع ہوتا رہا لیکن بعد میں یہ بڑی تقطیع پر شایع ہونے لگا - بمبئی ٹائمز اور اسٹیٹسمین کی تقطیع سے کچھ بڑی تقطیع کے چار بڑے صفحات پر ہفتہوار شایع ہوتا تھا - ابتدائے اشاعت میں یہ عشرہوار تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہفتہوار ہوگیا - ۵ ستمبر ۱۸۷۳ ع کی اشاعت سے یہاں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ اس زمانے میں مدراس کے اخبارات نہایت صاف اردو میں شایع ہوا کرتے تھے :- "چونکہ ماہ اکتوبر آئندہ میں مسٹر اربتھ نٹ صاحب رکن اعظم کونسل گورنمنٹ مدراس ولایت کی طرف کوچ فرمانے والے ہیں لہذا یہ یقین آتا ہے کہ ان کی خدمت دویم گورنری پر مسٹر الس صاحب ماموور یا رابن سن صاحب مقرر ہوں - سننے میں آیا ہے رابن سن صاحب صدر جو فی الحال مقیم ولایت ہیں، عطائے خدمت بالا مذکور میں وہاں نہایت سعی و کوشش کررہے ہیں مگر اس بات کے کہ الس صاحب صدرالوصف کے اس ملک میں بہت دوستدار ہیں ۔۔ ری بات نہیں کہ خدمت مذکور کے وہی صاحب مستحق ٹھیریں اور ماموور ہوجائیں - غرض دونوں صاحب بھی اچھے عقیل اور تجربہکار ہیں اور اس عہدہ کے لایق اور سزاوار ہیں - دیکھنا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے"۔

اس اخبار کی عنان ادارت مدراس کے ایک مشہور علمی خاندان کے ایک ممتاز فرد کے ہاتھ میں تھی - اس کے پہلے ایڈیٹر سید عبدالستار صاحب سنین تھے ' یہ شاہ محمد عزیزالدین صاحب کھٹالہ دید ' فرزند غلام مرتضیٰ کھٹالہ کے سالے تھے - غلام مرتضیٰ کھٹالہ کے پردادا نواب سعادت اللہ خان بہادر کے عہد حکومت میں ارکاٹ (محمد پور) میں مقیم ہوگئے تھے - ان کے والد بڑے صاحب کھٹالے خاندان والا جاہی کے متوسلین میں سے تھے - ارکاٹ کے مدارس و مکاتب کے داروغہ کی حیثیت سے انھیں ماہوار

ایک سو پانچ روپیہ کا وظیفہ دیا جاتا تھا ۔ بڑے صاحب کھٹالے کا علمی ذوق اس امر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس زمانے میں چند رسائل علم ہیئت میں ترجمہ کیے تھے جن میں سے رسالہ مختصر دقائق النجوم ۱۸۴۸ع میں مدراس میں طبع ہوا۔ بڑے صاحب کھٹالے کے بعد ان کے فرزند غلام مرتضیٰ کھٹالہ بھی "داروغہ مدارس اطفال مساکین" کے عہدے پر مامور رہے ۔ ان کے فرزند شاہ عزیزالدین صاحب نواب اعظم کے مشاعرے کے ممتاز اراکین میں سے تھے ۔ یہ ایک صوفی منش بزرگ تھے ۔ علوم عربیہ و فارسیہ کے علاوہ اردو، تلنگی، ٹامل اور انگریزی میں بھی خاصی مہارت تھی ۔ فارسی دیوان، اردو مثنوی اور متعدد رسائل علم نجوم، عروض و قافیہ و تصوف وغیرہ میں ان کی تصانیف کئی ہیں ۔ آخر زمانے میں انھوں نے اس امر پر زور دینا شروع کیا کہ نماز میں صرف قرآن کا اردو ترجمہ پڑھا جائے تو کافی ہے اور اس سلسلہ میں بعضے پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا ۔ شاہ عزیزالدین صاحب کی یہ تحریک اس قدر جدید اور انوکھی تھی کہ ارکاٹ اور ویلور کے علما و مشائخین ان سے بدظن ہوگئے اور انھیں عوام کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھانی پڑیں ۔ اس خاندان کے افراد کی علم دوستی اور اردو پروری کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں اور سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ اس خاندان کے افراد کے مساعی کی بدولت مدراس میں اردو صحافت کو کافی ترقی نصیب ہوئی ۔

سید عبدالستار صاحب سنین کے زیر اہتمام شمس الاخبار نہایت کامیابی سے نکلتا رہا۔ کچھ مدت کے بعد اس اخبار کی ادارت شاہ محمد عزیز الدین صاحب کھٹالہ کے فرزند محمد نصیرالدین کھٹالہ کے سپرد ہوئی۔ یہ بھی عربی فارسی کے قابل عالم تھے اور ان کے مددگار کارکنوں میں بھی عربی اور فارسی جاننے والوں کی ایک خاصی جماعت تھی۔ اسی وجہ سے اس اخبار میں عربی فارسی اور ترکی اخبارات سے بہت سی خبریں ترجمہ کرکے شائع کی جاتی تھیں ۔ پندرہ بیس سال کے عرصہ میں اس اخبار کی شہرت ہندستان سے نکل کر بیرون ہند تک پہنچ گئی ۔ ۱۸۷۸ع میں جنگ روم و روس کے زمانے میں اس اخبار نے حکومت ترکیہ کی امداد کی ترغیب دلائی اور اسی اخبار کی ترغیب و تحریص پر ہندستان کے ہر گوشے سے ہزارہا روپیہ چندہ فراہم

ہوا اور اسی کے مطبع کے ذریعہ سے سلطنت عثمانیہ کی خدمت میں روانہ کیا گیا اور اسی خدمت کے سلسلے میں سلطان عبدالحمید خاں ثانی نے تمغۂ مجیدیہ مرحمت فرمایا۔ اخبار کے لیے یہ اعزاز باعث فخر و ناز تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد سے شمس‌الاخبار کے سرورق پر ہمیشہ شکل تمغۂ مجیدیہ ہوا کرتی تھی۔ مدراس کا بلکہ شاید ہندستان کا یہ سب سے کثیر الاشاعت اخبار تھا اور آج بھی جب کہ اخبار کو بند ہوئے ایک عرصہ گزرا ہے، چام بازار مدراس میں اس کے دفتر کی عمارت شمس‌الاخبار ہی کے نام سے مشہور ہے۔

۱۸۶۰ع کے قبل ان کے علاوہ اور چند اخبار جاری ہوئے۔ ان میں سے بعض کے نام گارساں د تاسی نے اپنے خطبات میں گنائے ہیں لیکن یہ شاید بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکے[۱]۔ ۱۸۶۱ع سے ۱۸۷۰ع تک کا زمانہ مدراس میں اردو اخبارات کے عروج کا زمانہ ہے۔ پرانے اخبارات نے اپنے حجم، طباعت اور اشاعت میں خاصی ترقی کی اور کئی ایک جدید اخبارات جاری ہوئے۔ ان اخبارات کی فہرست پر نظر کرنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ اس صوبے میں ان متعدد اخبارات کی نکاسی کس طرح ہوا کرتی تھی۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ بعض اخبارات کی زندگی نہایت ہی مختصر تھی لیکن باوجود اس کے اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر نئے اخبار کے خیر مقدم کے لیے شائقین کی ایک کثیر تعداد تھی۔

۱۸۶۳ع میں شاہی عمدۃ‌الاخبار جاری ہوا۔ یہ مہینے میں تین بار اور چھے بار چھپتا تھا۔ سر ورق مصور ہوا کرتا تھا۔ آدھے صفحہ پر حویلی کارخانۂ اخبار اور مطبع انوری کا نقشہ ہوا کرتا تھا اور بقیہ آدھے صفحہ پر جدول میں مدراس کے درباری امیر، نقیب، یا فوجی عہدہ‌داروں کی تصویریں لیتھو میں چھپا کرتی تھیں۔ سر ورق کے نچلے حصہ میں اخبار کا نام اور اس کے نیچے یہ قطعہ درج ہوا کرتا تھا:-

ہر ایک کام میں عمدہ ہے عمدۃ‌الاخبار — تمام وصف میں پکا ہے عمدۃ‌الاخبار
عجب ہے کیا جو ہو مقبول عمدگان جہاں — کہ نام نامی تو اس کا ہے عمدۃ‌الاخبار

---

۱ د تاسی نے اپنے خطبۂ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ع میں مدراس کے اخبارات کے ذیل میں مرأۃ‌الاخبار اور قاصد مدراس کے نام دیے ہیں۔

اس کے دھنے جانب قیمت اخبار کی تفصیل اور بائیں جانب ہالوے صاحب کے مرہم کا اشتہار مصور ہوا کرتا تھا۔ آخری صفحہ پر بھی عمارت دفتر اخبار کا نقشہ اور ہالوے کے حبوب اور روغن کے باتصویر اشتہار ہوتے تھے۔ گارساں د تاسی نے اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں کبھی کبھی تصویریں بھی شائع ہوا کرتی ہیں۔ مدراس جام بازار کوچۂ فقیر صاحب میں مطبع انوری میں یہ پہلے پہل طبع ہوتا تھا اور علی العموم اس کی کتابت محمد جمال الدین اعجاز کیا کرتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد یہ مطبع اکبری میں زیر اہتمام محمد اکبر صاحب طبع ہونے لگا اور اس زمانے میں یہ مہینے میں تین بار چھپنے لگا۔ ذیل کی عبارت اخبار مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۷۵ ع سے منقول ہے :-

« مدراس مسرت اساس۔ اگرچہ کہ موسم باران مانند تابستان کے گزرگیا لیکن اس عشرے کے آغاز سے کچھ بوندا باندی شروع ہوئی ہے۔ تیرھویں کی شب کو تھوڑے وقت تک اچھی بارش ہوئی اور رعد اور برق نے اپنی گرمیاں دکھلائے اور دریا کے پل پر صاعقہ گرا اور ایک ستون چوبی کو جو کہ روشنی کرنے کے لیے استادہ کیا گیا تھا ضائع کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک پہرے والا اس وقت وہاں ایک چھپرے میں سورہا تھا اس کے اوپر صاعقہ گرا سو مقام کے درمیان فقط ۵ گز کا فاصلہ تھا لیکن خالق حقیقی کے کرم و فضل سے اس کو کچھ مضرت نہ ہوئی اور اس کو صاعقہ کا آسیب نہ پہنچا۔ اور ایک نادر تماشا یہ دیکھنے میں آیا کہ دوپہر شب کے قریب لائٹ ہوز کے جنوب طرف واقع ہے سو میدان میں ایک کرۂ نوری جو کہ دو یا تین قدم کا مدوّر ہوکا آسمان پر سے اترتا ہوا نظر آیا اور آڑھا تیڑھا بجلی کی سرعت کے مانند دریا طرف گیا۔ اس کے رنگ بو قلموں تھے یعنی نیلگوں اور بنفشانی مگر رنگ بنفشانی کو غلبہ تھا۔ غرض کرۂ مذکور کم ہونے کے پیشتر پھوٹ گیا اور اس کے ناھموار ٹکڑے ہوگئے مگر ہر ایک ٹکڑا منور و مجلا تھا اور رومی چراغ کے مانند رنگ بدلتا تھا بعد ازیں وہ سب کے سب کم ہوگئے، بہت سے دیسی لوگ اس عجیب و غریب تماشے کو دیکھ کر بہت گھبرائے »۔

عبارت میں گو تک‌بندی مفقود ہے لیکن عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا

استعمال برابر جاری ہے۔ ہند اور بیرون ہند کی کیفیتیں اس میں طبع ہوا کرتی تھیں اور جتنے نمبر نظر سے گزرے ہیں ان سے پتا لگتا ہے کہ ایڈیٹوریل کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ مختلف جزوں کے ساتھ مدیر اخبار کی رائے بھی بسا اوقات شامل کردی جاتی تھی۔

اسی زمانہ میں بنگلور سے منشی محمد قاسم صاحب غم کی زیر ادارت «قاسم‌الاخبار» جاری ہوا۔ کیا بہ لحاظ طباعت اور کیا بہ لحاظ مضامین یہ اخبار اپنی آپ نظیر تھا۔ اخبار کے سرورق پر فارسی کا یہ قطعہ درج ہوا کرتا تھا:—

قاسم‌الاخبار اخبارىست بے مثل و شگرف   بر صحائف می زند لاف از کمال برتری
بے سر اغراق سال ہجریش بنوشت عیش   جام جمشید است یا آئینۂ اسکندری

مصرعۂ تاریخ کے لحاظ سے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۵ع گویا اس کی تاریخ ابتدا ہے۔ منشی محمدقاسم صاحب بنگلور کے ممتاز شعرا میں سمجھے جاتے تھے۔ ان کی وجہ سے ایک زمانہ تک شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ ان کے احباب و تلامذہ کی خاصی تعداد تھی اور شہر کے مشاعروں کی ان کی وجہ سے گرم بازاری تھی۔ آج کل بھی ان کے اشعار بنگلوری حضرات کے زبان زد ہیں۔

یہ ہفتہ‌وار اخبار بڑی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ ہر صفحہ میں تین کالم ہوتے تھے اور ہر کالم میں تیس بتیس سطریں ہوا کرتی تھیں۔ بسا اوقات «منقولات» کے ذیل میں اردو رسائل اور اخبارات سے مفید اور علمی مضامین نقل کیے جاتے تھے۔ زیر نظر پرچہ ۲ اگست ۱۸۷۵ع کا ہے۔ اس میں ایک مضمون سائنٹفک سوسائٹی سے نقل کیا گیا ہے جس کا عنوان یہ ہے «بالفعل ہندستان میں پارلیمنٹ کا ہونا ہرگز مناسب نہیں»۔ اس اخبار میں ایڈیٹوریل خاص اہتمام سے لکھا جاتا تھا۔ ذیل کے اقتباسات ایک ایڈیٹوریل سے ماخوذ ہیں جن کا عنوان «صنعت و حرفت» ہے:—

«اگرچہ کہ ہم نے بارہا اس مہمات معاملہ پر بحث کئے لیکن اس کا کچھ فائدہ ظاہر نہ ہوا نہ سرکار والے عام و خاص کے لیے مدارس دستکاری اجرا کیے اور نہ رعایا تجارت کرنے اور ہنر سیکھنے میں مشغول ہوئے جس سے دو بات ہمارے خیال میں آتے

ھیں - پہلی یہ کہ ھماری بات کوئی سننے والا نہیں بلکہ ھماری تحریر لوگوں کے لیے فسانۂ عجائب او چہار درویش کے مقابلہ میں ھے دوسری یہ کہ ھندستان سے ابھی ادباری نہیں گئی ھے اور نہ لوگوں کو آرام و راحت سے ایام گزارنے کا موقعہ ملا ....»

اس طویل مضمون میں صنعت و حرفت اور تجارت کے فوائد پر بحث کی گئی ھے اور مسلمانوں کو ترغیب دلائی گئی ھے کہ وہ دستکاری کی طرف متوجہ ھوں - اس میں انگریزی تعلیم یافتہ ھندستانیوں کی بیکاری کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ھے - ذیل کے بعض جملے آج کل حیرت کی نظر سے دیکھے جائیں گے کہ آج سے پینسٹھ سال پیشتر بھی تعلیم یافتہ بیکاروں کی تعداد روز افزوں ترقی پر تھی :-

«......چونکہ روز بروز انگریزی مدرسے ھی اجرا ھوتے ھیں اس لیے لوگوں کو گمان ھوتا ھے کہ سرکار کا ارادہ ھم سب کو زبان انگریزی میں تعلیم کرکے سرکاری خدمتیں دینے کا ھے - اس خیال سے خاص و عام انگریزی پڑھنا شروع کرتے ھیں - پھر ھنر سیکھنے سے باز رھتے ھیں - جب کہ انگریزی پڑھنے میں ان کے اوقات صرف ھوتے ھیں ، ھنر نہیں سیکھتے - پھر جب کہ سرکاری خدمتیں ان کو نہیں ملتیں ھیں غریب اور مفلس ھوجاتے ھیں.........ھم کو یاد ھے کہ چند روز پیشتر ایک افسر صاحب کہتے تھے کہ ان دنوں انگریزی پڑھے ھوئے لوگ جس آسانی سے کہ ملتے ھیں گھوڑے کا کام کرنے کے لیے اس آسانی سے سائیس نہیں ملتے - جب کہ ابھی یہ حالت ھے تو آئندہ کیا ھوگی....» منقولات اور ایڈیٹوریل کے علاوہ نامہ نگاروں کے مضامین اور خطوط بھی درج اخبار ھوتے تھے اور مختصر خبریں ھند و بیرون ھند کی انگریزی اخبارات سے ترجمہ کرکے شائع کی جاتی تھیں -

۱۸٦۵ ع میں ایک اور اخبار « اخبار کرتاں » کے نام سے نکلنے لگا - اس کے سرپرست کایل پٹن کے ایک مشہور تاجر «کرتان حاجی محمد قاسم» صاحب تھے - محمد قاسم صاحب اس علاقے کے رھنے والے تھے جہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان ٹامل ھے - یہ مدراس جب آئے تو سب سے پہلے انھوں نے چرم کی تجارت شروع کی اور دباغت کے مختلف کارخانے مدراس ، ویلور ، بنگلور ، سکندرآباد اور حیدرآباد میں قائم کیے -

مدراسی مسلمانوں میں یہ سب سے پہلے تاجر چرم تھے جنھوں نے یورپ اور امریکہ سے تجارت شروع کی ۔ اپنے قیام مدراس کے زمانے میں انھوں نے ایک اردو داں دکھنی خاتون سے شادی کی اور غالباً اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ اردو مصنفین اور شعرا کی انھوں نے سرپرستی کی ۔ ان کے ایما پر عبداللہ مشاق نے بوستان سعدی کا ترجمہ اردو اشعار میں بحر متقارب میں کیا اور "بہارستان کرتاں" کے نام سے یہ کتاب ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۴ع میں ویلور کے مطبع مسلمانی میں طبع ہوکر شائع ہوئی ۔ اس کے ہر نسخے پر کرتاں محمد قاسم صاحب کی مہر موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ جملہ بھی درج ہے :— "ہر کتابیکہ از مہر کرتاں محمد قاسم صاحب مفروق است مسروق است" ۔ دتاسی[۱] نے بھی اخبار کرتاں کا ذکر کیا ہے اور اس کو مدراس سے منسوب کیا ہے اور اس کو عشرہ وار چھوٹی تقطیع کا اخبار بتایا ہے ۔ اختر شاہنشاہی میں اخبار طلسم کرتاں کا ذکر ہے اور اس کو بنگلور کا ہفتہ وار اخبار بتایا گیا ہے ۔ اس کتاب سے یہ پتہ لگتا ہے کہ یہ اوسط تقطیع کا تھا اور مطبع نبوی سے شائع ہوا کرتا تھا ۔ اخبار کے نام میں اختلاف سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید دو اخبار مدراس اور بنگلور سے بہ یک وقت حاجی محمد قاسم صاحب کی امداد سے نکلتے تھے اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اس لیے کہ حیدرآباد اور بمبئی میں بھی حاجی صاحب کی تجارتی کوٹھیاں تھیں اور انھوں نے وہاں مطابع قائم کیے تھے ۔ بمبئی سے متین کرتاں اور حیدرآباد سے شوکت اسلام غالباً ۱۸۸۰ع کے بعد ان کی سرپرستی میں جاری تھے ۔

اب تک جن اخبارات کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر ۱۸۷۰ع کے بعد بھی جاری رہے ۔ غالباً اعظم الاخبار کچھ مدت پہلے ہی بند ہوچکا تھا کیونکہ غدر سے بعد کے اخبارات میں اس کے حوالے نظر نہیں آتے ۔ جن اخبارات کے اقتباسات ہم نے اس سے قبل پیش کیے ہیں وہ ان اشاعتوں سے لیے گئے ہیں جو ۱۸۷۰ع کے بعد شائع ہوئے ۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ اخبارات اپنی تاریخ اجرا کے بعد

۱ ۔ خطبات گارساں دتاسی ص ۵۱۸ ۔

سے ایک طویل عرصہ تک جاری رہے۔ ۱۸۷۰ع سے ۱۸۸۰ع تک دس سال کے عرصہ میں اور آٹھ دس اخبار مدراس اور بنگلور سے شائع ہونے لگے۔ ۱۸۷۱ع میں ایک اخبار چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحات کا بنام "یادگار زمانہ" نکلنے لگا۔ یہ غالباً مہینے میں ایک دفعہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے ہر صفحہ میں تین کالم ہوتے تھے، نہایت مختصر خبریں، مختلف اخبارات سے ملخص کرکے اس میں شائع کی جاتی تھیں۔ اس کی صرف ایک اشاعت نمبر ۹ جلد اول مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۷۱ع کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ذیل کے اخبارات سے خبریں لی گئی ہیں:—

"مفصلیٹ۔ انڈین پبلک اوپی نین۔ لکھنؤ ٹائمس۔ پائنیر۔ دھلی گزٹ۔ مدراس اتھینیم۔ اکسلسیر۔ ٹائمس۔ ایوننگ میل۔ انڈین ابزرور، شاھی عمدۃالاخبار"۔ خبریں نہایت مختصر ہوا کرتی تھیں اور بسا اوقات ان پر دو چار سطروں میں تبصرے بھی ہوتے تھے جیسے ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا:—

"تخفیف، گورنمنٹ انڈیا نے مشتہر کیا ہے کہ یکم سپٹمبر سے وہ قانون منسوخ کیا جائےگا جس سے ملازمان سرکار کو ہنگام تخفیف ہرجہ ملتا ہے۔ قانون مذکور اب اس طرح پر ترمیم ہوا ہے کہ جو شخص سپٹمبر سنہ حال سے تخفیف میں دےگا اس کو ہرجہ نہ ملےگا فقط۔ راقم لارڈ میو صاحب نے یہ ایک اور تخفیف نکالی لیکن یہ بات جزرسی میں شمار ہے کہ بیچارے ملازمان سرکار جو تخفیف کی وجہ سے زاید روپیہ بطور انعام یا ہرجہ کے پاتے تھے تو اپنے فقدان ملازمت کا غم بھول جاتے تھے۔ اب اس حکم سے ان کی دلشکنی ہوگی۔ بیچارے غریبوں کی تباہی ہوگی"۔

یہ اخبار محلۂ جام بازار کوچہ فقیر صاحب میں زیر اہتمام منشی محمد عبدالرزاق صاحب شائع ہوتا تھا۔ اس کے کاتب بھی محمد جمال‌الدین صاحب اعجاز تھے۔

اردو اخبارات کی کثرت اشاعت اور ان کی مقبولیت کا اثر صرف مدراس ہی تک محدود نہ تھا، بنگلور میں بھی قاسم‌الاخبار اور اخبار طلسم کرناٹ وغیرہ کی ہر دل‌عزیزی سے بعض قابل حضرات کی توجہ اس جانب مبذول ہوتی جارہی تھی۔ چنانچہ ۱۸۷۳ع میں بنگلور سے «میسور اخبار» نامی ایک اور ہفتہوار اخبار «قاسم‌الاخبار» کی تقلید میں

جاری ہوا۔ بہ لحاظ خوبیٔ طباعت و مضامین یہ بھی کسی صورت میں اپنے پیشرو سے کم نہ تھا۔ حافظ سید محمد صاحب مالک مطبع فردوسی اس کے مہتمم تھے۔ یہ پنجشنبہ کے روز بہ وقت شام پابندی کے ساتھ شایع ہوتا تھا۔ قاسم الاخبار کے مقابلہ میں یہ اخبار سستا بھی تھا کیوں کہ اس کا چندہ عام شائقین سے سالانہ نو روپیہ تھا اور اس کا صرف چھے روپیہ۔ معلومات اور خبروں کے لحاظ سے بھی اس میں کافی دلچسپی پیدا کی گئی تھی اور تحریر میں بھی روانی اور سلاست موجود تھی۔

میسور اخبار جلد ۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۷ جنوری ۱۸۷۵ء میں بنگلور کے لال باغ پر ایک طویل مضمون ہے جس کے بعض حصے یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

"یہ باغ چھاؤنی بنگلور سے کچھ کم تین میل کے فاصلے پر جانب جنوب واقع ہے۔ آوان سلطنت سلطانی میں اس کی بنا ڈالی گئی اور اقسام کے میووں کے درخت اس میں لگائے گئے تھے۔ جب سرکار انگریزی نے اس ملک کو فتح کیا تو چند سال تک لال باغ اپنی قدیم حالت پر رہا، عہد کمشنری سرمارک کبن صاحب میں لال باغ کی اور حالت ہوگئی، میووں کے درختوں کو کاٹ کر بجائے ان کے مختلف قسم کے پھولوں کے درخت بوئے گئے......"۔

اس کے بعد بورنگ صاحب کے عہد کی ترمیم کا ذکر ہے:- "طرح طرح کے پھولوں کے درخت ولائتی و دیسی لگائے، بین بجانے کے لیے ایک نہایت خوشنما گھر تعمیر کرایا، صاحبان انگریز اور ان کی لیڈیوں کی سیر اور ٹہلنے کے لیے ناف باغ میں ایک چبوترہ جس کے دو رویہ خوشنما سڑکیں اور پھولوں کے تختے نظر آتے ہیں، تیار کیا گیا۔ علاوہ اس کے لال باغ کے ایک گوشے میں شیر و شرزہ مختلف قسم کے چرند و پرند رکھے گئے۔ غرض صاحب محتشم الیہ نے عہد حکومت میں لال باغ کو ایسا آراستہ کیا کہ باغ مذکور تمامی جنوبی ہندستان میں بےنظیری کا دم مارنے لگا دور دور سے لوگ اس کے دیکھنے کو آنے لگے"۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس میں افعال کی تذکیر و تانیث کی صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور جابجا متعدی افعال کے ساتھ "نے" بالکل صحیح طور پر استعمال کیا

کیا ہے، زبان کی سلاست اور روانی میں بھی بیّن فرق ہوچلا ہے' عربی اور فارسی ترکیبوں کا استعمال بھی بہت کم ہوگیا ہے۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ بنگلور میں ان اخبارات کی اشاعت نے ایک مستقل اور دیرپا اثر پیدا کیا' یہاں تک کہ وہاں کی زبان منجھ گئی اور ادبی ذوق پیدا ہوگیا۔

میسور اخبار قاسم الاخبار کی تقطیع پر آٹھ صفحوں میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اس کے ہر صفحے میں تین کالم اور ہر کالم میں اٹھائیس سطریں ہوتی تھیں۔ نامہ نگاروں کے علمی اور قومی مضامین کے علاوہ اس اخبار کے ایڈیٹوریل پُر از معلومات ہوتے تھے چنانچہ اس کی اشاعت مورخہ ۳ جون ۱۸۷۵ ع میں ایک مفید ایڈیٹوریل مقالہ ہے جس کا عنوان یہ ہے:-"کیا اخباروں کی آزادی سرکار و رعایا کے لیے مفید ہے"۔ یہ دو صفحہ کا بسیط مضمون ہے جس میں اخبار کے فوائد پر اچھی بحث کی گئی ہے' لارڈ میکالے کی تجاویز آزادیٔ مطابع کی تائید کی گئی ہے۔ ذیل میں ایک مختصر سا اقتباس دیا جاتا ہے:-

"اخباروں اور مطابع کو آزادی کا عنایت کرنا یہ بھی سرکار وقت کی ایک بڑی دانائی کی دلیل ہے۔ اس سے تو چنداں اخبار نویسوں کو فائدہ نہیں' ہاں سرکار و رعایا کے لیے یہ بڑے فائدہ کی بات ہے۔ سچی سچی باتوں کا اظہار' حکام' ماتحت کی کارروائیوں کا افشا' رعایا کی مصیبتیں اور سرکار کی بعض غلطیوں کا اظہار یہ بجز اس کے ہو نہیں سکتا کہ اخباروں کو آزادی ملے۔ اگر اخباروں کو آزادی عنایت نہ کی جائے تو جو فائدے اب اخباروں کی بہ‌دولت سرکار و رعایا کو حاصل ہیں وہ ہرگز حاصل نہ ہوں‌گے۔ اخباروں سے عدم آزادی میں کیا توقع ہوسکتی ہے' یہی کہ سچی باتوں کا اخفا جائز رکھا گیا' سارا اخبار خوشامد سے بھرا ہوا ہے' کام کی بات ایک نہ لکھی گئی' ہزاروں ظلم رعایا پر اور لاکھوں سازشیں رعایا سے عمل میں آئیں مگر اخبار نویس نے ان کو ایسا ظاہر کیا کہ ظلم کو عدل اور سازشوں کو قومی ہمدردی کے جلسے بتلادیا' جب یہ صورت جائز رکھی گئی تو پھر سلطنت کو ترقی معلوم.........."

اس قسم کی صاف اور سلجھی ہوئی عبارت کی مثالیں ان اخبارات سے بہ کثرت تلاش کی جاسکتی ہیں ۔ بنگلور کے اخبارات کی ایک اور خصوصیت قابل غور ہے کہ ان میں سے اکثر اپنی اشاعتوں میں کسی قسم کے اشتہارات شایع نہیں کرتے تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبع و اشاعت کے اخراجات صرف چندۂ خریداری سے پورے کیے جاتے تھے ۔ اس صورت میں یہ قیاس غلط نہیں ہوسکتا کہ ان کے خریداروں کا حلقہ کافی وسیع تھا ۔ بنگلور کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ سب سے پہلے یہیں سے جنوبی ہند کا پہلا مذہبی اخبار شایع ہونے لگا ، غدر کے بعد سے عیسائی مشنریوں نے ہندستانیوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً اشاعت مسیحیت کو ضروری سمجھا ۔ صوبۂ مدراس میں عیسائی مشن نے تبلیغ مسیحیت کی مختلف شاخیں قائم کیں اور صرف مسلمان طلبہ میں اشاعت مسیحیت کے خیال سے شہر مدراس میں هارس هائی اسکول کھولا ۔ بنگلور چھاؤنی میں عیسائی فوجوں کے قیام کی بدولت مشنریوں کو خوب موقع ملا ۔ اس زمانے میں شمالی ہند سے عیسائیوں کے اخبار «نور افشاں» اور «کوکب ہند» شایع ہوا کرتے تھے اور اپنی اشاعتوں میں ہمیشہ اسلام کے خلاف زہر اگلا کرتے تھے ۔ ان مسیحی اخبارات کا اثر تھا کہ جنوبی ہندستان کے مشنری بھی آئے دن مسلمان علما سے مقابلہ و مناظرہ کیا کرتے تھے ۔ بنگلور اور مدراس گویا جنوبی ہند کے دنگل تھے اور یہاں ہمیشہ مناظروں اور مباحثوں کے جلسے ہوا کرتے تھے ۔ غرض اس ماحول میں بنگلور کے ایک جوشیلے مسلمان محمد شریف صاحب نے ۱۸۷۲ ع میں ایک عشرہ وار اخبار بنام «منشور محمدی» نکالنا شروع کیا ۔ یہ پہلے پہل منشی محمد قاسم صاحب غم مدیر قاسم الاخبار کے چامراج پریس سے شایع ہوتا تھا ۔ اس کے بعد اپنے مطبع فخرالاسلام سے نکلنے لگا ۔ غالباً یہ وہی اخبار ہے جس کے نام پر سر سید مرحوم نے ان الفاظ میں اعتراض کیا تھا :—

« . . . . یہی خیالات ہیں جن کے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل تو کانپ جاتا ہے ، ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) «منشور محمدی» رکھا جاتا ہے ۔ کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم

ٹوٹ نہ گیا جو اس نے ان لفظوں کو لکھا...... "[۱]

اس اخبار کی سالانہ قیمت مع محصول ڈاک پانچ روپئے دس آنے تھی۔ البتہ علم دوست مخیر اصحاب وقتاً فوقتاً اس اخبار اور مطبع کی امداد کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے یہ اخبار تقریباً بیس پچیس سال تک دینی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کا مقصد وحید یہ تھا کہ مذہب عیسوی کی تردید کی جائے۔ لیکن کبھی کبھی اثبات حقانیت اسلام کے سلسلہ میں ہندو مذہب اور معتقدات کی تردید بھی کی جاتی تھی۔ آریہ سماج کے بانی مہاشے دیانند سرستی کے خلاف متعدد مضامین اس کی مختلف جلدوں میں پائے جاتے ہیں۔ اخبار کے سرورق پر اردو فارسی قطعات درج ہوتے تھے۔ عام طور پر سال کا ایک تاریخی قطعہ علیحدہ ہوا کرتا تھا۔ ۱۲۹۴ھ کی جلد پر ذیل کا قطعہ درج ہے جس سے تاریخ اجرائے اخبار کا پتہ لگتا ہے:-

"چو منشور محمد کرد روشن مہر شوکت را برنگ ذرہ شد بےزیب و زینت کوکب ہندی
پے تاریخ اجرا شد بلا اندیشہ و دقت خرد گفتا بر افتادہ ز عزت کوکب ہندی
۱ ۴ ۱۲۸۹ = ۱۲۹۴ھ

اس اخبار کی چھٹی جلد کی اشاعتوں میں ذیل کے اردو قطعات درج ہیں:-

(۱) منشور محمدی الٰہی شائع ہو ز ماہ تا بہ ماہی
انجیل و زبور پر ہو دائم صد بار مفخر و مباہی

(۲) مہر منشور محمد سے دلا مجلس کونین روشن کل ہوئی
از پئے تاریخ نورافشاں لکھو شمع نورافشاں بہ کیسی کل ہوئی

اس اخبار کی مختلف جلدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اخبار ہندستان بھر میں اپنی آپ نظیر تھا۔ یو۔ پی، پنجاب، بنگال اور بمبئی کے بہت سے علما اور محققین اس اخبار کے نامہ نگار تھے۔ اس کے مستقل مضمون نگاروں کی فہرست میں

---

۱ حیات جاوید جلد دوم صفحہ ۵۴۱ مطبوعہ ۱۹۰۱ع نامی پریس۔ سر سید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اس تجویز پر کہ چیزر کے عوض سبحان اللہ کہا جائے اعتراض کیا تھا اور اس کو شعائر اسلام کے تہتک میں داخل کیا تھا' اسی سلسلہ میں انھوں نے بعض ایسے اخبارات کے نام گنائے ہیں جن کے نام ان کے خیال میں سوء ادب پر محمول کیے جاسکتے ہیں۔

ذیل کے مشاہیر اصحاب بھی شامل تھے :۔ "شیخ رحیم بخش رئیس بٹالہ گورداسپور، مرزا غلام احمد رئیس قادیان، مرزا سلطان احمد از گورداسپور، سراج الدین احمد از جبل پور، کرم الہی (جماعت ہشتم) از گجرات پنجاب، مولوی محمد سلیم اللہ فیض آبادی مولوی میرزا موحد جالندھری، مولانا محمد علی کانپوری" ۔ ذیل میں صوبۂ مدراس کے علاوہ ان شہروں کی ایک مجمل فہرست دی جاتی ہے جہاں اس کے خریدار اور معاون موجود تھے :۔ " امرتسر ۔ ایبٹ آباد ۔ اکولہ ۔ اجمیر ۔ اندور ۔ امان پور ۔ الہ آباد ۔ بمبئی ۔ بھوجپور ۔ بان کوٹ ۔ بجنور ۔ بستی ۔ پونا ۔ پرتاب گڑھ ۔ دھلی ۔ رنگون ۔ سورت ۔ سیا ۔ سکندرآباد ۔ عظیم آباد ۔ پٹنہ ۔ علی گنج ۔ فیروز پور ۔ قصور ۔ شاہ آباد کاشی پور ۔ کرولی ۔ کمپ مئو ۔ کٹرہ گڑھی ۔ مہر پور ۔ لودھیانہ ۔ معین پور ۔ مرادآباد مظفرگڑھ ۔ مارہرہ ۔ میرٹھ ۔ متھرا ۔ مہدپور ۔ میرزا پور ۔ نصیرآباد ۔ وزیرآباد ۔ ھردوئی ۔

یہ اخبار بارہ صفحوں کا فلسکیپ تقطیع پر شایع ھوتا تھا ۔ اس میں مذھبی مضامین اور مناظروں کے علاوہ اسلامی ممالک کی مختصر خبریں عربی، انگریزی اور اردو اخبارات سے لی جاتی تھیں ۔ کبھی کبھی بعض شہروں سے نامہ نگار مقامی حالات لکھ بھیجتے تھے ۔ اس کی چھٹی اور ساتویں جلد میں ذیل کے اردو اخبارات و رسایل کے حوالے موجود ھیں :۔ عمدۃالاخبار فتح گڑھ ۔ کشف الاخبار بمبئی ۔ جریدۂ روزگار مدراس ۔ عمدۃ الاخبار شاھی مدراس ۔ شمس الاخبار مدراس ۔ لوح محفوظ مرادآباد ۔ سیف الاسلام بمبئی ۔ نسیم سحر ۔ اخبار انجمن پنجاب ۔ قاسم الاخبار بنگلور ۔ رھبر ھند ۔ نصرت الاخبار دھلی ۔ خیر خواہ عالم ۔ اخبار اردو اکولہ ۔ خورشید دکن ۔

اس اخبار کے مضامین یا تو اقتباسات تھے یا مستقل مضمون نگاروں کے فیض قلم کا نتیجہ تھے ۔ ذیل میں جس عبارت کا نمونہ پیش کیا گیا ھے وہ غالباً ادارت کی جانب سے ھے :۔

"اخبار منشور محمدی سر چشمۂ فیض سرمدی چھے برس سے جاری ھے ۔ الحال بہ فضل ایزد باری سال ھفتم کی باری ھے، اس کے انوار آفتاب عالمتاب توحید نے روشنی چراغ

تثلیث کو مٹادیا اور تیرہ روان کوئے جہل و بے دانشی کو رستہ دین حق و یقین کا دکھادیا لیکن ۔

گر نہ بیند بہ روز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بہ مقابلہ اہل تثلیث کیا کیا جواب دنداں‌شکن دے رہا ہے' دین محمدی کے بدخواہوں کے دھجیاں لے رہا ہے' اس کی نورافشانی نے نورافشاں کو مات کیا' کوکب ہند و شمس‌الاخبار کو ایک بضاعت مزجات بنادیا ۔ کس کی تاب کہ اس کے سامنے رونق پائے اور کون ایسا ستارہ ہے کہ آفتاب کے آگے چمک دکھائے' کہاں نور کہاں نار' کہاں گلزار کہاں خار' کہاں حقیقت کہاں مجاز' کہاں سوز کہاں ساز "۔

"اس عبارت میں جس شمس‌الاخبار کا ذکر ہے وہ عیسائیوں کا پندرہ روزہ اخبار تھا جو لکھنؤ سے پادری کریون صاحب کے زیر اہتمام شایع ہوا کرتا تھا' آٹھ سال کے بعد اسی اخبار کا نام بدل کر کوکب ہند رکھا گیا ۔ چنانچہ منشور محمدی کے پہلے صفحہ پر جو نظم شایع ہوا کرتی تھی اس کے اشعار میں اسی کی طرف اشارہ ہے :–

اس کے انوار سے نہیں ہے عجب شمس گھٹ گھٹ کے گر بنے کوکب
شمس تاباں کو جب کرے مستور کیوں نہ کوکب کو وہ کرے بےنور"

اس اخبار میں مذہبی مضامین کے علاوہ خاص طور پر یہ اہتمام کیا جاتا تھا کہ اسلامی ممالک کی اور بالخصوص حکومت ترکیہ کی خبریں شائع ہوں ۔ چنانچہ جنگ روم و روس کے سلسلے میں مختلف اخبارات سے مسلسل خبریں نقل کی جاتی تھیں اور ترکوں کی مالی امداد کے لیے متعدد مضامین اور فتوے شائع ہوتے تھے' الجوائب اور اخبار دارالخلافۃ استنبول سے مضامین اور خبریں ترجمہ کرکے شایع کی جاتی تھیں' غازی عثمان پاشا اور پلونا کے معرکے کے متعلق نہایت تفصیلی مضامین اس میں موجود ہیں ۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اخبار دارالخلافہ میں جو استنبول سے فارسی میں شایع ہوتا تھا' کبھی کبھی اردو میں بھی مختصر مضمون شایع ہوتے تھے ۔ چنانچہ منشور محمدی کی اشاعت نمبر ۲۸ جلد ششم میں اس اخبار کا ایک فارسی اقتباس موجود ہے اور اس کی دوسری اشاعت نمبر ۲۷ جلد ششم میں ذیل کا اردو اقتباس درج ہے :–

"در زبان اردو از دار الخلافه"

سبحان الله یه کیا عجیب حال هے جس کے دیکھنے سے آدمی دریائے حیرت میں مستغرق هوتا هے ۔ ان دنوں میں دارالخلافه استنبول کے محلوں میں موکب همایوں کے واسطے لوگوں کا نام دفتر نظام یعنی دفتر لشکر میں لکھا جاتا هے ۔ اگرچه قاعده اور اصول اس کا یه هے که بیس برس سے چالیس برس تک جن کی عمر هو اونهیں کو دفتر عسکر میں قید کرتے هیں مگر هر ایک کو ایسا هی شوق پیدا هوا هے که جس کی عمر پچاس برس کی هو وه ایسا کہتا هے که میری عمر ابھی چالیس کو نهیں پهنچی هے مجھے بھی عسکر میں داخل کرو اور جو باره تیره برس کے هیں وه بھی ایسا کهتے هیں که هماری عمر ابھی بیس کو نهیں (؟) پهنچی هے پھر کس واسطے هم کو بھی سپاهیوں میں داخل نهیں کرتے هو که هم بھی جا کر دشمن سے لڑیں ۔ سرکاری مامور ان کو تسلی کے واسطے کهتے هیں ابھی کچھ احتیاج نهیں جب کچھ لزوم هو تم کو بھی بلائیں گے ۔ اب تم آرام کرو مگر وه روتے هیں اور کهتے هیں عجب بات دشمن ابھی همارے وطن میں هو اور هم آرام کریں هم ضرور جنگ کرنے کو جاویں گے یا تو دشمن کو مار کے وطن سے نکالیں گے یا شهید هوکے ثواب پاویں گے ۔ اب استنبول میں دن رات قواعد هورهی هے اور هر روز بهت سے مجاهدین استنبول میں آکے میدان جنگ کو جارهے هیں ۔ وزرائے دولت بھی رات دن جمع هوکے مشورت کر رهے هیں "۔

خط کشیده جملوں اور محاوروں میں بیرونی زبان کا اثر صاف طور پر نمایاں هے اور یه بات بالکل قرین قیاس هے که یه اسلوب بیان کسی هندستانی اردو داں کا نهیں هے ۔ اخبار دارالخلافه مطبع مهران افندی میں چھپتا تھا اور زیر اهتمام اسکندر افندی جاده باب عالی استنبول سے شایع هوتا تھا ۔ اسی مطبع سے اسکندر افندی کی زیرنگرانی ۱۸۷۸ء میں ایک پندره روزه اردو اخبار شایع هونے لگا جس کا نام "ترجمان مشرق" تھا [۱] ۔ غالباً ترجمان مشرق کی اشاعت سے پهلے وقتاً فوقتاً اردو مضامین

۱ سوانح عمری اخبارات حصهٔ اول اختر شاهنشاهی صفحات ۱۰۸ اور ۱۱۸ ؟

اخبار دارالخلافہ میں شایع کیے جاتے تھے لیکن جنگ روم و روس کے زمانے میں جب عالمگیر اسلامی ہمدردی اور اخوت کی تحریک ضروری سمجھی گئی تو ہندستانی مسلمانوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے شاید اس اردو اخبار کو جاری کیا گیا۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ اسی سال مدراس کے شمس الاخبار کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور دربار خلافت سے تمغۂ مجیدی مرحمت ہوا۔ ان روز افزوں تعلقات کی بنا پر شاید ہندستان کے اردو اخبارات کو تو استنبول کے اصلی واقعات سے واقف کرانے کے لیے اس اخبار کو جاری کیا گیا۔ ہندستان کے مختلف اخبارات میں اس کے اقتباسات پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں منشور محمدی کی ایک اشاعت سے ترجمان مشرق کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے تاکہ استنبول کے اردو دانوں کا اسلوب بیان واضح ہوجائے۔ ولایت بوسنیا و ہرزی گوبنا میں اسٹریا کی دخل دہی پر اخبار "ترجمان شرق" کا بیان ہے۔

" یا حکومت اوستریا بخلاف رائے کانگرس[۱] جو کہ ہیئت مجموعہ یورپ سے عبارت ہے اس کام کو اجرا کرنے میں کس طرح پر جسارت کرتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت اوستریا اس کام میں تنہا نہیں ہے بلکہ یا کانگریس نے مخفی طور پر اس کو ایسے افعال شنیعہ کے اجرا کرنے کے لیے امر دیا ہے ویا سب سے بڑی ایک دولت کے معاونت سے کام کررہی ہے۔ چونکہ کسی طرف سے اس پر اعتراض بھی نہیں ہوتا ہے۔ جب کہ ایسا ہو پس اظہر من الشمس ہے کہ دولت اوستریا اور بھی بہت سے کام جو کہ عہدنامہ برلین میں محرر نہیں ہیں ان کو بھی کرنا چاہتی ہے چونکہ ویانہ کی جراید اس باب میں بعضے چیزوں کو بصورت آشکار بھی تحریر کرتے ہیں۔ و اخبار تار برقی بھی دنیا کی ایک گوشہ سے بھی دوسرے گوشے تک افعال تجاوز کارنۂ (؟) اوستریا کو نشر کررہے ہیں۔ اگرچہ برلین کی عہدنامہ میں دولت اوستریا کا ولایت بوسنہ و ہرسک میں داخل ہونا و (یکی بازار) میں داخل نہ ہونا صراحۃً بیان ہوا ہے۔ اما چہ فایدہ کہ آج حکومت اوستریا وہاں بھی داخل ہونا چاہتی ہے[۱] جو کہ خبر ویانہ سے آئی ہے اس سے ایسا معلوم ہوا ہے

۱ کونگریس سے مراد برلین کانگریس ہے؛ یوروپین زبانوں میں عموماً یہی تلفظ رائج ہے۔

که دولت اوستریا ولایت بوسنه و هرسک میں بلا شرط داخل هونگے بعد تنها (یکی بازار) کے لیے دولت عثمانیه کے ساتھ ایک مقاوله نامه کو عقد کرنا چاهتی هے و لیکن اسی ماده میں جو که برلین کی معاهده میں داخل نهیں هے آیا دولت عثمانیه دولت اوستریا کے ساتھ کس طرح پر ایک مقاوله نامه عقد کرسکے گی گرچه اوستریا نے ولایت بوسنه و هرسک میں داخل هونے کے لئے برلین کے کونگرس کے قرار کو وسیله اتخاذ کیا مگر هم نهیں جانتے هیں که (یکی بازار) میں داخل هونے کے کیا وسیله اتخاذ کرے گی و کس طرح پر مقاوله نامه کو تکلف کرے گی۱ . . . . . .» علی العموم منشور محمدی کی عبارت میں عربی اور فارسی ترکیبوں کی بهتات هے اور مولویانه طرز تحریر کی ساری خصوصیتیں موجود هیں، عربی قواعد کی رو سے هندی الفاظ کی جمع بھی بنائی گئی هے ۔ جابجا «اتواپ» اور «پوادر» (جمع توپ اور پادری) اور اسی قسم کے الفاظ مستعمل هیں ۔ منشور محمدی کی پرانی جلدوں کے مطالعه سے یه واضح هوتا هے که اس کے معاون اور مضمون نگار زیاده تر شمالی هند اور پنجاب کے باشندے تھے ۔ مدراس کے مضمون نگاروں میں قابل ذکر مولوی سید نظام الدین صاحب فخری هیں جنهوں نے اپنے ان مناظروں کی تفصیلی روئدادیں شایع کی هیں جو ان کے اور پادری گولڈ اسمتھ کے مابین پیش آئے تھے ۔ منشور محمدی کی جلدیں اس قسم کے مذهبی مناظروں اور مباحثوں کی روئدادوں سے بھری پڑی هیں ۔

بنگلور کے اخبارات کا ذکر ختم کرنے سے پهلے اس دور کے ایک اور اخبار کا تذکره ضروری هے ۔ یه اخبار «محافظ بنگلور» کے نام سے اپریل ۱۸۷۵ع میں جاری هوا ۔ پهلے صفحے کے بالائی حصه میں نصف دائره کی سی شکل میں اس کا انگریزی نام «دی بنگلور گارڈین» درج هوتا تها ۔ یه اخبار کسی انفرادی کوشش کا نتیجه نه تها، بلکه ایک انجمن «زمرهٔ احباب» کی جانب سے مهینے میں دو مرتبه آٹھ صفحوں میں شایع هوا کرتا تها۔ زمرهٔ احباب کے سکرٹری محمد عبدالمجیب کے زیر اهتمام منشور محمدی کے مطبع بحرالاسلام میں یه طبع هوتا تها ۔ اخبار کی اشاعت کا مقصد سرورق پر ان الفاظ میں ادا کیا گیا هے :—

۱ منشور محمدی شماره ۲۷ جلد ۷ ۔

« قومی ھمدردی اور ملکی محبت کو حقانیت کی تلاش اور سچائی کے اظہار میں تمام کرنا ھمارا شعار ھے »۔

«.....اس میں مضامین مفید عام خصوصاً ھندستانیوں کے امور تمدن و معاشرت کی ترقی اور اصلاح کی نسبت مندرج ھوا کریں گے اور نیز پولیٹکل مضامین بھی جن کی بنا دیسیوں کی رفاھیت اور ترقی پر ھوگی نیک نیتی سے بحث کی جائےگی اور جو مضمون کہ خواص حکام کی اطلاع کے لیے لکھا جائےگا اس کا انگریزی ترجمہ اس پرچے کے اخیر صفحے میں مندرج ھوا کرےگا.....» ۔

اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ھے کہ انجمن زمرۂ احباب کے قیام کا غالباً یہ بھی ایک مقصد تھا کہ حکام تک اپنی شکایتوں کو پہنچایا جائے اور قومی اور ملکی مہم معاملات کی جانب ان کی توجہ منعطف کرائی جائے ۔ اراکین زمرۂ احباب کو یہ بلاقیمت بھیجا جاتا تھا۔ مضامین میں تنوع کے لحاظ سے یہ اخبار خاصا دلچسپ تھا، علمی مضامین کے علاوہ دلچسپ قومی مضامین بھی شایع کیے جاتے تھے۔ منشور محمدی کے بعض مضمون نگاروں کے نام بھی اس کے کالموں میں پائے جاتے ھیں ۔ اپنی طرز، ھیئت، تقطیع وغیرہ کے لحاظ سے یہ قاسم الاخبار اور میسور اخبار کے مماثل تھا۔

اس کی اشاعت نمبر ۳ جلد اول میں ایک سائنٹفک مضمون اس عنوان پر ھے کہ « دریا (سمندر ؟) کا پانی کیوں کھارا ھے " ۔ اسی اشاعت میں دوسری جگہ ضلع سیلم میں مسلمان لڑکوں کے لیے ابتدائی تعلیم کے مدرسوں کا ذکر ھے اور یقیناً یہ بات آج بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھی جائےگی کہ ضلع سیلم کے صرف ایک سب ڈیویژن ھسور میں جس میں کشنگری، دھرم پوری وغیرہ مقامات شامل ھیں، بارہ ھندستانی مدرسے کھولے گئے اور لوکل فنڈ اور رزلٹ گرانٹ سے ان مدرسوں کے اساتذہ کی تنخواھیں دی جاتی تھیں ۔ مدیر اخبار نے نامہ نگار کی مسرت پر ذیل کے عبرت انگیز الفاظ میں تبصرہ کیا ھے :-

« ھمارے کارسپانڈنٹ صاحب کی خوشی کو جو خدمت استادی پر مامور ھونے پر ظاھر کی گئی ھے، دیکھنے سے یہ دردناک حقیقت ظاھر ھوتی ھے کہ اس بے رحم زمانے نے ھماری

قوم کو افلاس کے کس نہایت درجہ میں چھوڑا ہے کہ آٹھ دس روپیہ کی ماہواری چلنا بھی ان کے پاس مغتنمات سے گنا جاتا ہے ۔ کشنگری اور دھرم پوری میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان سرداروں اور مقدس مشائخین کے وجود سے ان مقامات کی بزرگی زیادی ہوتی تھی ۔ ٹیپو سلطان کے ایک نامور سپہ سالار جنھوں نے نپولین بونیپارٹ شہنشاہ فرانس سے کمک چاھنے کے لیے ٹیپو سلطان کی جانب سے ایلچی مقرر ہوکے فرانس گئے تھے اور نپولین سے تحفے حاصل کیے اور آخر کو سلطان کے جہازوں کے بیڑے کے مختار ہوکے خطاب میریم حاصل کی تھی اب ان کے ایک نواسے بھی ان مدرسوں کے ایک استاد مقرر ہوئے ہیں ۔ اللہ اکبر اگر کوئی مورخ دنیا کی تمام قوموں میں نہایت درجہ کی تنزل یافتہ قوم کو ڈھونڈھے تو مسلمانوں سے بڑھکر بدنصیب کسی کا نشان نہیں مل سکے گا ۔ مسلمانوں کو آئندہ کی ترقی کے سامان مہیا کرنے اور ادبار کو آپ سے دور رکھنے کے تدابیر عمل میں لانے کے لیے یہ مثالیں نہایت پر تاثیر ہیں' ۔

کس قدر دلخراش حقیقت ہے ! آج بھی یہ واقعہ باعث عبرت ہے' صرف یہی نہیں بلکہ آج کشنگری اور دھرم پوری کے علاقے میں اردو کی کس مپرسی کا مقابلہ ستر سال پہلے کے واقعہ سے کیا جائے تو افسوس ہوتا ہے کہ ہم روز بہ روز اپنی زبان اور اپنے علوم سے بےبہرہ ہوتے جاتے ہیں ۔

اس اخبار میں بھی علی العموم ۱۸۷۵ ع کے دیگر اردو اخبارات کی طرح ملہر راؤ کے مقدمہ زھرخورانی کے متعلق تفصیلی کیفیتیں درج ہیں اور کہیں کہیں لندن پنچ یا دیگر اخبارات کی رائے پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے ۔ ایک اور دلچسپ خبر جس سے مدراس کی قدیم ترین اسلامی درس گاہ کو ایک گونہ تعلق ہے ۔ اسی اشاعت کے ایک اور کالم میں پائی جاتی ہے :-

" مدراس کے مسلمانوں اور خصوصاً خاندان والا جاھی کے ارکان کی یہ تجویز ہے کہ ایک معقول رقم عام چندے سے فراہم کرکے مدراس پریسیڈنسی کالج میں لارڈ ہوبارٹ صاحب بہادر کے نام سے اسکالرشپ قائم کریں اور یہ اسکالرشپ خاص مسلمان طالب علموں

کو دیا جاوے جو سالیانہ امتحان میں الیق نکلیں اور نیز اون کے قد کے برابر ایک تصویر بنوا کے مدرسۂ اعظم مدراس میں لٹکائی جائے چنانچہ اس یادگار کے لیے چندہ جمع کیا جاتا ہے" ۔

غالباً اس پر عمل نہیں کیا گیا اور یہ تجویز شاید رائے و مشورہ کی مد سے آگے بڑھنے نہ پائی ۔

اس اخبار میں برقی خبروں کے مختصر خلاصے اور ہند و بیرون ہند کی دلچسپ خبریں شائع کی جاتی تھیں اور بسا اوقات لطیفے اور دلکش اقتباسات ہم‌عصر رسائل اور اردو اخبارات سے نقل کیے جاتے تھے ۔ قاسم‌الاخبار، میسور اخبار اور منشور محمدی کے مقابلے میں اس اخبار کو شاید زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کی مدت اشاعت ان اخبارات کے مقابلہ میں بالکل کم رہی ۔

اس دور کے اخبارات میں ہم نے بنگلور کے اخباروں کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور قبل اس کے کہ ہم ۱۸۸۰ع کے بعد شایع ہونے والے اخبارات کا ذکر کریں، مدراس سے نکلنے والے ان بعض اخبارات کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۸۰ع سے پہلے شائع ہونے لگے۔ ان میں قابل ذکر مدراس کا مشہور ہفتہ وار اخبار "جریدۂ روزگار" ہے* ۔ شمس‌الاخبار کی مقبولیت عام کا اثر تھا کہ رائےپیٹھ کے مطبع حیدری میں سید مرتضیٰ شاہ قادری افندی کے زیر اہتمام ۱۸۷۵ع میں یہ اخبار جاری ہوا ۔ اس میں عام خبروں کے علاوہ خاص طور پر اس کا انتظام تھا کہ سلطنت آصفیہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ خبریں شایع کی جائیں ۔ کچھ مدت کے بعد تو اس اخبار کے اکثر صفحات محض حیدرآباد کی خبروں اور وہاں کے اشتہارات اور اعلانات کے لیے وقف ہوگئے ۔ حکومت کی جانب سے امداد کے علاوہ اس کے اکثر خریدار بھی ممالک محروسۂ سرکار عالی کے باشندے تھے۔ ابتدائی زمانے میں یہ اخبار بہت مشہور رہا ۔ ہندستان کے مختلف اردو اخبارات میں اس

---

* پنڈت کیفی نے اپنے مضمون "اب سے ادھی صدی پہلے اردو اخبار" میں اس کا مقام اشاعت حیدرآباد، دکن بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ غالباً یہ خیال اس وجہ سے ہوا ہو کہ اس اخبار میں زیادہ تر خبریں مملکت آصفیہ سے متعلق ہوا کرتی تھیں ۔ جریدۂ روزگار گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں روزانہ ہوگیا تھا اور ۱۹۲۰ کے بعد بھی کبھی کبھی یہ برآمد ہوا کرتا تھا۔

کے اقتباسات کی کثرت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنے ہمعصر شمس الاخبار کی طرح مقبول رہا ہوگا۔ سلطنت آصفیہ کے متعلق اس اخبار کی پالیسی یہ تھی کہ برسراقتدار اصحاب کی تائید کی جائے۔

اس زمانے میں بنگلور اور مدراس میں اخبارات کی کثرت اور ان کی کمی مقبولیت حکومت ترکیہ اور روس کے مابین جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے تھی' جریدۂ روزگار بھی شاید اسی بنا پر جاری ہوا اور اس کی ابتدائی جلدوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمس الاخبار اور جریدۂ روزگار ترکوں کے متعلق خبروں کو شایع کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ مہتمم اخبار سید مرتضیٰ شاہ قادری کے نام کے ساتھ « افندی » کا الحاق ہمارے اس قیاس کا شاہد ہے ۔ شمس الاخبار کے مدیر محمد نصیرالدین کھٹالہ بھی اپنے نام کے ساتھ برابر « افندی » لکھا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ حضرات ترکی سے براہ راست خط و کتابت رکھتے تھے اور ان مکاتبات و مراسلات میں ان کو « افندی » کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا جس کو انھوں نے باعث اعزاز خطاب سمجھ کر اپنے ناموں کے ساتھ شامل کرلیا۔ جریدۂ روزگار نے بھی حکومت ترکیہ کی امداد میں بہت کچھ حصہ لیا تھا اور متعدد دفعہ چندہ کی اپیل میں پر زور مضامین شایع کیے تھے۔ عبارت کے لحاظ سے اس اخبار کو شمس الاخبار پر ترجیح نہیں دی جاسکتی البتہ اس کے آخری دور میں جب کہ اس کی عنان ادارت محمد عبداللطیف صاحب کے ہاتھ میں تھی تو اس کے لب و لہجہ اور تحریر میں خوبی اور سنجیدگی نمایاں ہوگئی تھی۔

یہ اخبار متوسط تقطیع کا تھا اور سولہ صفحوں پر شایع ہوا کرتا تھا۔ اس کی سالانہ قیمت بھی بحسب تفاوت مدارج خریداراں متفاوت تھی۔ وقتاً فوقتاً اس میں مشاہیر شعرا کی نظمیں بھی شایع کی جاتی تھیں۔ ذیل میں اس کے دو ایک اقتباس دیے جاتے ہیں جن سے اس اخبار کی عبارت اور طرز تحریر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ اخبار اپنی اشاعت ۲۴ جلد سوم بابتہ ۱۸۷۷ ع میں جنگ روم و روس کے سلسلہ میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان غیر جانبداری پر ذیل کے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے :-

"البتہ یہ بات تو ہے کہ جب ہماری ملکہ عالیہ کسی ایک کے جانب نہ ہو تو رعایائے سلطنت بھی کسی ایک کے طرفدار نہ بنیں مگر ہم مسلمان رعایائے سلطنت قیصریہ جو ترکی سلطنت کی جانب زیادہ میلان رکھتے ہیں اس کا باعث یہ ہے کہ سلطان روم اہل اسلام کے پادشاہ ہونے کے سوا جتنے متبرک و مقدس مقامات و مواضعات مذہبی ہیں ان کے متولی و مجاور یہی سلطان ہیں اور ہم سب مسلمان اس شہنشاہ اسلام کو مذہبی طور سے اپنا پیشوا و امیرالمومنین و امام‌المسلمین سمجھتے ہیں اور ان سے نہایت رسوخیت و اعتقاد سے ملتے ہیں اگرچہ کہ بسبب بعدیت ہم ان کے مخالف سے جنگ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے مگر ان کی فتح کو ہماری فتح اور ان کی شکست کو ہماری شکست اور ان کے لشکر کے بیوگوں و یتیموں و مجروحوں کے آنسو پونچھنے اور ان کے سر پر کپڑا ڈھانکنے اور مرہم پٹی باندھنے کو بہترین قومی ہمدردی اور عبادت تصور کرتے ہیں اور ۵۷ع کے غدر کے بعد جو اشتہار ملکہ عالیہ سے اصدار پایا وہ اشتہار ہم کو ہمارے مذہبی امورات کی آزادی پر آمادہ کرتا ہے اور خود گورنمنٹ عالیہ نے اپنے اس اشتہار میں کسی ایک مذہبی معاملات میں دخل دہی کرنے کو مستثنا کرلیا ہے بلکہ وعدہ کیا ہے کہ ہم کسی کے مذہب میں دخل دہی نہ کریں گے بلکہ کلکتہ و مدراس و بمبئی کے مسلمانان اپنے مافی‌الضمیر کی اطلاع ملکہ عالیہ کے حضور میں درپیش کرچکے بلکہ یہ تمنا بتلائی کہ ہم سب رعایاے ہندستانی اپنے مذہب و ملت کو تھامنے اور مقدس و متبرک مقامات کو کسی طور کا آسیب نہ پہنچنے کے لیے سلطان اسلام کی تائید کریں بلکہ ہمارے دین و ایمان کے دشمن پر تلوار اٹھاویں"۔

اسی جلد میں اگست ۱۸۷۷ع کی ایک اشاعت میں مدیر جریدۂ روزگار نے اخبار "ٹروتھ" سے ایک انوکھی تجویز نقل کی ہے جس میں ایک انگریز نے یہ مشورہ دیا ہے کہ آیندہ "نوجوانان ہند کو عہدۂ ہائے حکومت عنایت ہوں" تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کردیا جائے کہ نازنینان انگلستان ان کے کاشانوں کی زینت بنیں تاکہ عہدہ‌دار "طرز معاشرت و معاملت میں یگانہ آفاق" ہوں اور "امور مملکت میں موافقت و موانست" رہے "اور انگلستان کی محبت کا نقش مرتسم ہوجائے"۔ مضمون نگار کے خیال میں یہ ایسی تجویز

ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد مشنریوں کی چنداں حاجت باقی نہ رہے گی اور انگلستان اور ہندستان بہت جلد ایک ہوجائیں گے۔ لیکن ، احتمال یہ ہے انگلش لیڈیاں شاید ہندستانی رئیس زادوں کے ساتھ اپنی شادی اس وجہ نہ پسند کریں کہ وہ لوگ گندم گون سیہ فام ہوتے ہیں ، مضمون نگار نے خود اس احتمال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے :۔

" ہم انگلش لیڈیوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ہندستان کے لوگ پرتگیز اور اسپین اور برازیل کے لوگوں سے بہت زیادہ سیاہ ہیں جو ان مقامات کے رؤسا کے ساتھ انگلش لیڈیاں شادی کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں باوجودیکہ وہاں کے لوگوں کے رنگ ہندستانی لوگوں سے زیادہ سیاہ ہیں پس ہندستانی رئیس‌زادوں کا تناکح کیوں نہیں پسند کرتے ہیں "۔

جریدۂ روزگار نے اس تجویز کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار ذیل کے الفاظ میں کیا ہے :۔

" امرازادے ہمارے ملک کے اوس سفید چمڑے کو اون کے پسند نہیں کرتے جس میں چونچلاپن و ناز و نخرا نہ ہو گو وہ حور بھی ہو پسند نہیں ہے۔ یہ تو ظاہری سبب ہوا باطنی ناراضی مذہب کی ہے ایسے رنڈیوں کے ورغلانے سے دیندار اپنے دین سے پھرتا نہیں بلکہ ہزارہا جائے ایسا ہوا ہے کہ خود لیڈیاں مسلمان ہوگئے اور اون سے جو اولاد ہوئی وہ بھی مسلمانی پر ہی رہے اس حالت میں عورتوں کے عنایت کی کیا ضرورت ہے اگر حق پوچھو تو عدل و انصاف گورنمنٹ کا مطیع و منقاد بناتا ہے اور ویسی محبت و الفت فقط نیک رویہ سے حاصل ہوتی ہے"۔

سید محمد مرتضیٰ شاہ قادری کے زیر اہتمام ۱۸۷۶ع میں منشور محمدی کی تقلید میں ایک پندرہ روزہ مذہبی رسالہ ظہیرالاسلام کے نام سے جاری ہوا لیکن یہ بہت جلد بند ہوگیا۔ یہ بھی جریدۂ روزگار کے مطبع ہی میں طبع ہوتا تھا۔

اب تک جن اخبارات کا تفصیلی ذکر آچکا ہے ان کی طرز تحریر میں باستثنائے معدودے چند ایک گونہ یکسانیت پائی جاتی ہے اور یہ صاف ظاہر ہے کہ بعض خصوصیتیں ان میں مشترک ہیں۔ سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ عربی اور فارسی ترکیبیں

ان اخبارات میں بہت زیادہ استعمال کی جاتی ہیں اور اسلوب تحریر میں بھی فارسی اور عربی کی تقلید کی جاتی ہے ۔ جمع الجمع کا استعمال بہت کثرت سے ہے ؛ مثلاً امورات، مواضعات، اہالیان، عمائدین اور ہنودوں کے سے الفاظ ہر اخبار کے صفحات میں پائے جاتے ہیں ۔ عربی قواعد کے مطابق ہندی الفاظ کی جمع بنائی جاتی ہے ۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں پائی جاتی ۔ ایک ہی لفظ کہیں مذکر مستعمل ہے تو کہیں مونث اور بسا اوقات مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر استعمال کیا جاتا ہے ۔ حروف ربط کے ماقبل الفاظ میں « دن » کی جمع کے عوض الف نون کی جمع کا استعمال زیادہ ہے ۔ کسی فقرے میں ضمیر فاعل ہو اور وہی مفعول بھی واقع ہو یا اضافی حالت میں ہو تو بجائے اس کے کہ اپنا، اپنی یا اپنے حسب موقع استعمال ہوں اسی ضمیر کی مفعولی اور اضافی حالت کو دہرایا جاتا ہے ۔ ہندی الفاظ کے مابین حرف عطف 'اور' کے عوض "و" بالعموم مستعمل ہے ۔ فارسی اور ہندی اور عربی اور ہندی الفاظ میں بھی صرف "و" کو عطف قرار دیا جاتا ہے ۔ 'نے' کے استعمال میں بھی اکثر جگہ سہل انگاری سے کام لیا جاتا ہے ۔ اس دور کے اخبارات میں صرف چند ایک ایسے ہیں جنھوں نے بالکل صحیح طور پر اپنی تحریروں میں 'نے' کا استعمال کیا ہے اور افعال کی تذکیر و تانیث کو پیش نظر رکھا ہے ۔ انگریزی اخبارات کے تراجم میں نسبتاً زیادہ صفائی پائی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی انگریزی طرز عبارت و قواعد کی تقلید کی جاتی ہے اور اردو محاورہ اور قواعد کی پابندی کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے ۔ مثلاً ذیل کے جملے ایسے ہیں کہ اردو ان سے قطعاً نا آشنا ہے ۔

" غدر کے بعد جو اشتہار ملکہ عالیہ سے اصدار پایا " ۔

" جو کچھ کارروائی صاحبان ترک سے ظہور میں آئے گی...... " ۔

انگریزی الفاظ ایک دوسرے کی طرف مضاف ہوں یا عربی اور فارسی الفاظ انگریزی الفاظ کی طرف مضاف ہوں تو عموماً فارسی قواعد کے مطابق کسرۂ اضافت استعمال کیا جاتا ہے ۔ عربی اور فارسی اخبارات کے ترجموں میں محاورات کا استعمال نسبتاً صحیح ہے البتہ مولویانہ طرز نگارش کا اثر صاف نمایاں ہے بلکہ بسا اوقات تحت اللفظ ترجمہ کیا جاتا ہے ۔

علمی اور مذہبی مضامین میں محاورات اور اصطلاحات علمیہ کی اس قدر بھرمار ہوتی تھی کہ ان اخبارات کے پڑھنے والے شاید ہی سمجھتے ہوں۔ذیل میں ایک عبارت جریدہ روزگار (اشاعت جولائی ۱۸۷۸ ع) سے نقل کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ عبارت کو کس قدر ثقیل بنایا جاتا تھا۔ اس مضمون کا عنوان "آثار قیامت" ہے۔دیکھنا عبارت میں کس کی پیچیدگی اور الفاظ میں کس درجہ کی ثقالت پائی جاتی ہے:-

"حالات زمانہ کے نظر کرتے قیامت قریب ہے اور لاریب شدنی ہے۔ لیکن فلاسفہ ناحق شناس اس کے منکر ہیں کہتے ہیں کہ اگر اس عالم کی طرح دوسرا عالم موجود ہووے بیشک کروی‌الشکل ہوگا اور دو کروں کا متماثل التصاق اور انطباق بغیر اس کے دونوں میں فرجہ واقع ہووے ممکن نہیں پس درصورت وقوع فرجہ خلا لازم آوےگا وہ محال ہے حالانکہ یہ استدلال مغالطہ محض ہے اس واسطے کہ اولاً خلا کا استحالہ ممنوع ور اس کے سائر براہین بجائے خود مقدوح اور ثانیاً یہ کہ عالم بہ‌تمامہ کروی ہووے ہندسے کے دلائل صرف افلاک متحرکہ کے رویت پر قایم ہیں......"

اور آگے چل کر مضمون نگار یوں گہر افشاں ہوتے ہیں:-

"آثار قیامت دو ہیں ایک صغری دوسرے کبریٰ۔ آثار صغریٰ امور ماموره میں فتور اور فجور منہیہ کے ظہور پانے، علم دینی کا گھٹنا، علم دنیا کا بڑھنا، مذاہب باطلہ کا رواج پانا احادیث اور اخبار کاذبہ سنانی، اراذل کا صاحب شوکت اور اسافل کا اہل خدمت ہونا........"

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں مولویوں کی گفتگو اور تحریر کی جو ہجو کی ہے وہ غالباً اسی قسم کی عبارتوں پر مبنی ہے!

اس دور کے اخبارات میں مدراس کا ہفتہ وار اخبار مظہرالعجائب بھی شامل ہے۔ یہ ۱۸۷۹ع میں جاری ہوا۔ یہ عبارت اور ترتیب کے لحاظ سے ان تمام اخبارات سے کسی قدر مختلف ہے جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ مدراس کی مشہور مسجد والاجاہی کے احاطے میں مطبع مظہرالعجائب سے شایع ہوتا تھا۔ غالباً غدر دھلی کے کچھ دنوں بعد ہی یہ مطبع قائم ہوا۔ اس مطبع کی اردو، فارسی اور عربی مطبوعات کی فہرست میں بعض نہایت ہی کارآمد کتابیں پائی جاتی ہیں۔ ۱۸۶۱ء میں میر مہدی واصف

کا مشہور اردو لغت دلیل ساطع اسی مطبع میں طبع ہوا اور واصف کا تذکرۂ علمائے مدراس عربی زبان میں ۱۸۷۷ء میں یہیں سے شایع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدراس کے بعض علما اور شعرا اس مطبع کے منتظمین اور کارکن تھے اور اسی وجہ سے یہاں کی طباعت میں صحت و صفائی پائی جاتی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں ممالک محروسۂ سرکار عالی میں جریدہ روزگار کے قبول عام نے اس مطبع کے منتظمین کو اس امر پر متوجہ کیا کہ وہ بھی ایک اخبار اس کی ریس میں نکالیں اور مملکت آصفیہ کی خبروں کی اشاعت سے اپنے اخبار کی قدر و قیمت میں اضافہ کریں۔ بہت ممکن ہے کہ ابتدائی ایام میں عہدہ‌داران حیدرآباد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی قسم کی امداد جاری رہی ہو۔ یہ اخبار پیسہ اخبار کی تقطیع پر بارہ صفحات کا تھا۔ سرورق پر مسجد والاجاہی کی تصویر تھی اور اس کے ذیل میں بیل بوٹوں میں اس اخبار کا نام ہوتا تھا۔ مسجد والاجاہی کی تصویر کے نیچے یہ شعر ہوا کرتا تھا:

الٰہی نغمہ سنجی بخش چون بلبل زبانم را برنگ گل بہار آرائی محفل کن بیانم را

یہ بھی اخبار «جریدہ روزگار» کی نقل تھی کیونکہ اس کے سرورق پر میر غلام علی آزاد کا یہ شعر درج ہوا کرتا تھا:

برآر از مد بسم‌اللہ تیغ خوشمقالی را مسخر کن سواد اعظم نازک خیالی را

اخبار مظہرالعجائب کی اجرا کا قطعۂ تاریخی اور ہر سال کا جدید قطعۂ تاریخ علی‌العموم ہر اشاعت کے ساتھ شایع ہوتے تھے۔ اس اخبار کی عنان ادارت مولوی ابوالمحامد سلطان محمود صاحب حنفی متخلص بہ «حمد» کے سپرد تھی۔ مقاصد اخبار کے ذیل میں اخبار کی پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی تھی:-

«سوائے واقعات واقعی و مضامین علمی کے اور کوئی امر غیر واجبی دور از تہذیب درج اخبار نہ ہوگا۔ اکثر اوقات ابواب دینی بھی مرقوم ہوا کریں گے۔ مدح و ذم غیرواجبی سے کام نہیں تو تو میں میں کا نام نہیں»۔

آخری جملہ میں ممکن ہے جریدۂ روزگار پر حملہ ہو کیونکہ یہ اخبار کبھی کبھی حیدرآباد کے بعض افسروں پر ناواجب نکتہ‌چینی سے نہیں چوکتا تھا۔

مظہرالعجائب مصطفےٰ حسین صاحب کے زیر اہتمام ہر پنجشنبہ کو وقت پر شایع ہوتا

تھا عموماً اس کی ہر اشاعت میں دو تین صفحے اشتہارات کے لیے وقف ہوا کرتے تھے۔ اشتہارات اکثر حالیہ صاحب کی ادویہ اور دھلی اور بنارس کے اطبا کی مقوی دواؤں سے متعلق رہا کرتے تھے۔ اخبار کی کتابت مدراس کے مشہور کاتب محمد جمال‌الدین اعجاز کیا کرتے تھے۔ اس کی ہر اشاعت میں پہلے صفحے پر ہفتہ آئندہ کی جنتری ہوتی تھی جس میں طلوع و استواء و غروب آفتاب کے اوقات اور مشاہیر کی وفات اور اعراس کی تاریخیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اس کے نیچے بعض فتاوے بہ‌صورت سوال و جواب درج کیے جاتے تھے۔ شعر و سخن کے لیے بھی ایک یا دو کالم مخصوص تھے۔ ایڈیٹوریل کے علاوہ «انتخابات تار برقیات»، «انتخابات اخبارات انگریزی» «انتخابات اخبارات اردو» اور «مضامین و اخبار نامہ نگاران» کے مستقل عنوان اس اخبار میں پائے جاتے ہیں۔

فروری ۱۸۸۴ع کی دو اشاعتوں کے مطالعہ سے مدراس کی مذہبی ھلچل کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پادری گولڈ اسمتھ جن کا انتقال اسی سال (اکتوبر ۱۹۴۰) ہوا ہے مدراس کے مشہور مشنری تھے اور انھوں نے جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے ایک مدرسہ مسلمان طلبہ کے لیے ھارس ھائی اسکول کے نام سے یہاں جاری کیا تھا۔ مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت کی کوششوں میں یہ دن رات مصروف رہا کرتے تھے۔ انھوں نے یوسف‌حامد نامی کسی شخص کو کرسٹان بنایا تھا اور اس کے نام سے ایک رسالہ اردو میں شایع کیا تھا جس میں اسلام پر اور آں‌حضرت صلی‌اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ناواجب حملے تھے۔ یہ کتاب مدراس کے کسی مطبع میں طبع ہوکر شایع ہوئی اور اس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ مسلمانوں کو سب سے بڑا صدمہ اس امر پر ہوا کہ اس رسالے کے کاتب اور طابع مسلمان تھے۔ اس واقعہ پر شہر میں عام ناراضی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مدیر مظہرالعجائب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور یہ تجویز پیش کی کہ علما کی تنظیم کے لیے ایک باقاعدہ انجمن بنائی جائے۔ چنانچہ ان کی تحریک پر ایک مجلس بنام «مجلس علمائے اسلام» منعقد کی گئی۔ مظہرالعجائب کے ایڈیٹر اور مولانا محمود صاحب مرحوم فرزند قاضی‌الملک کی دستخطوں سے دعوتی رقعے تقسیم کیے گئے اور احاطۂ مسجد والا جاھی میں علمائے مدراس کا پہلا شاندار جلسہ ۵ فروری ۱۸۸۴ع کو منعقد ہوا۔ میر مجلس مدراس کے نامور عالم

مولوی طرازش خان بہادر منتخب ہوئے اور بالاتفاق مدیر مظہرالعجائب کو "کارفرمائے مجلس علمائے اسلام" مقرر کیا گیا۔ اس کے اہم مقاصد یہ تھے کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جائے اور ان کو خلاف شرع حرکتوں سے باز رکھا جائے اور غیر مسلموں کے اعتراضات اور حملوں کے جواب دیے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا جلسہ بہت ہی کامیاب رہا۔ جلسہ میں مولوی شاہ محمد صادق صاحب شریف مدیر طلسم حیرت نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ مشنریوں کی تعلیم سے احتراز کریں گے اور اس بنا پر انھوں نے ہارس ہائی اسکول کی مدرسی سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد کی اشاعتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یوسف حامد کے رسالہ کی کتابت اور طباعت میں حصہ لینے والوں نے اپنے ارتداد کا اقرار کیا اور تجدید ایمان کا اعلان کیا۔ اس ہلچل کی بہ دولت بہت سے مسلمان طلبہ اسکول سے علیحدہ ہونے لگے۔ منتظمین مدرسہ کو فوراً ہی ایک اعلان شایع کرنا پڑا جس میں ہیڈ ماسٹر اور پادری گولڈ اسمتھ نے اس امر کا عہد کیا کہ آئندہ مسلمان طلبہ سے دوران تعلیم میں کسی قسم کا مذہبی مباحثہ نہ کیا جائے گا اور نہ اسلام کے خلاف کسی قسم کے خیالات ظاہر کیے جائیں گے۔ انجمن علما کی یہ کامیاب کوشش بارآور ثابت ہوئی اور مشنریوں کو مدراس کے مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت سے سخت مایوس ہونا پڑا۔

مظہرالعجائب کی مابہ‌الامتیاز خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہر قسم کے مذاق والوں کے لیے مضامین، خبریں اور دلچسپ انتخابات مہیا کیے جاتے تھے۔ اس کے مدیر مولوی سلطان محمود صاحب مدراس کے مشہور عالم مولوی غلام قادر صاحب مصنّف صراط‌الاسلام و صراط‌النجات کے فرزند تھے۔ یہ ایک لائق عالم اور مشہور واعظ تھے۔ شعر و شاعری سے بھی انھیں خاصی دلچسپی تھی اس لیے ان کے اخبار میں مذہبی اور ادبی پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان کے شریک کار مولوی زکی‌الدین احمد بھی اردو کے اچھے ادیب اور شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اخبار کے نائب مدیر کی حیثیت سے یہ اپنے فرائض انجام دینے کے علاوہ مستقل طور پر ۱۸۸۴ء سے تحفہ نامی ایک ادبی رسالہ مہینہ میں دو بار شایع کیا کرتے تھے۔ اس کی ترتیب کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوسکتا ہے:-

"یہ عمدہ رسالہ علوم و فنون کی روشنی کا مخزن، مباحث علمی کا معدن، دینی ابواب کا مظہر، دنیوی ابواب کا مدبر، حالات سلف صالحین و حکمائے عاقلین کا مورخ، شعرائے نامدار اور سخنوران گرامی کا تذکرہ خواں، عمدہ عمدہ مضامین سے دلوں کو روشن کرنے والا، حالات تمدن اور حسن معاشرت سے رعایا کو اور رعایا کی فریاد سے حکام کو اطلاع دینے والا، پولٹیکل معاملات کا واقف کار، قیصر کا خیرخواہ اور خلایق کا معاون، حضرات مذاق پسندوں کے حسب خاطر مضامین علمی، شعر و سخن، اخبارات دینیات و دنیوی معاملات و دلچسپ حکایات وغیرہ سے مرکب ایک عمدہ ارگجہ تیار کرکے خاص و عام کے خدمات میں تحفہ ارسال ہوتا ہے"۔

غالباً اسی ترتیب کو ہفتہوار اخبار مظہرالعجائب میں بھی ملحوظ رکھا گیا تھا لیکن باوجود اس کے اس اخبار کو شمس‌الاخبار اور جریدۂ روزگار کی سی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

اردو اخبارات کے متعلق یہ کہنا بےجا نہیں ہے کہ "ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے ان کی رونق" اور اس معیار سے ۱۸۵۸ع سے ۱۸۷۸ع تک ہندستان اور بیرون ہند میں کئی ایک ایسے ہنگامے پیش آئے کہ مسلمانوں کو ان سے براہ راست تعلق تھا اور اس لیے اس بست سالہ مدت میں کافی اخبار مدراس سے جاری ہوئے اور روز افزوں ترقی کرتے رہے۔ لیکن ۸۰ع کے بعد ایسے ہنگامہ‌خیز مواقع بہت کم پیش آئے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ۸۰ع سے بعد شایع ہونے والے اخبارات زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے اور میدان مقابلہ میں یہ جدید اخبارات پرانے اخبارات کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے۔ ذیل میں ان اخبارات کے نام دیے جاتے ہیں جو ۸۰ع سے ۹۰ع تک شایع ہوئے۔ ان میں سے اکثر ایک سال یا دو سال کے عرصے میں بند ہوگئے۔ ان کی اشاعت بھی غالباً محدود تھی اس لیے ان کے نمبر بھی نہیں ملتے۔ مصر و سوڈان کے معاملات اور مہدی سوڈانی اور خرطوم کی جنگ کے واقعات مسلمانان ہند کے لیے جاذب نظر تھے لیکن امن کے زمانے میں اکثر اخبارات نے یہی مناسب سمجھا کہ ہنگامے پیدا کیے جائیں چنانچہ انیسویں صدی کے آخری دور میں اخبارات کی جلدوں کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے

۱ اختر شاہنشاہی

کہ معاصرانہ چشمک، جا و بےجا مدح و ذم، عیب جوئی اور نکتہ چینی اور ناروا حملے وغیرہ ھی وہ وسایل تھے جن کے ذریعہ سے ان کی اشاعت کو بڑھایا جاسکتا تھا ۔ مدراس کے اخبارات کے لیے اس سلسلے میں دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں رائےزنی کی جائے۔ جریدۂ روزگار کو اس سلسلے میں یہ کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ حکومت کی جانب سے غالباً ایکسو روپیہ کا ماہانہ وظیفہ جاری ہوا تھا اور اس کے علاوہ کافی تعداد میں خریدار مملکت آصفیہ سے مل گئے تھے۔ اس غیر متوقع کامیابی نے مدراس کے دیگر اخبارات کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ بھی جریدۂ روزگار کی تقلید کریں چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کے مدراس سے کئی ایک اخبار جاری ہوئے لیکن انھیں خاطرخواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور بہت ممکن ھے کہ انھیں بہ صد حسرت و یاس یہ کہنا پڑا ہو:—

در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

۱۸۸۱ ع میں حکیم موسیٰ رضا صاحب کے فرزند حکیم محمد حسین صاحب نے ایک اخبار احسن‌الجرائد کے نام سے جاری کیا ۔ مدراس میں اخبارات کی کثرت نے اب مختلف گروہ اور جماعتیں پیدا کر دی تھیں ۔ ہر ایک اخبار کے حمایتی دوسرے اخبار کو بالخصوص جدید اخبار کو حسد کی نظر سے دیکھا کرتے اور یہ نہیں چاھتے تھے کہ کسی نئے اخبار کو فروغ حاصل ہو اور اس کی بدولت ان کی اشاعت کو صدمہ پہنچے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپس میں چھیڑ چھاڑ نہایت معمولی بات تھی ۔ احسن الجرائد کے مخالفین نے ذرا سی تصحیف کے بعد اس کا نام اخس‌الجرائد رکھا اور یہ پھبتی کچھ ایسی پھب گئی کہ اخبار کے بند ہونے کے ایک مدت بعد تک یہ نام عام طور پر مشہور رہا۔ حکیم محمد حسین صاحب فارسی اور اردو میں اچھی قابلیت رکھتے تھے، شعر و شاعری کا اچھا ذوق تھا ۔ ان کی سرپرستی میں ایک انجمن بنام انجمن شعرا قائم کی گئی تھی جس کے سکرٹری میر صادق‌حسین صاحب تھے ۔ ۱۸۸۴ ع میں احسن‌الجرائد کے ساتھ انھوں نے حدیقۂ شعرا نامی ایک گلدستہ بہ‌طور ضمیمہ اخبار جاری کیا ۔ یہ ہفتہ‌وار اخبار تھا اور ہر پنجشنبہ کو مطبع اعجاز محمدی میں طبع ہوکر ترملگھیرٹی ھائی روڈ مکان نمبر ۹ سے شایع ہوا کرتا تھا ۔ اس اخبار کی تاریخ اجرا سے دو سال بعد ایک اور اخبار بہ‌نام «حاکم» مطبع انوری سے شایع ہونے لگا

یہ بڑی تقطیع کے صرف ایک ورق پر ہفتہوار طبع ہوتا تھا ۔ اس کے مالک و مہتمم محمد انور صاحب مالک مطبع انوری تھے ۔ غالباً یہ اخبار بہت جلد بند ہوگیا اس واسطے اس کے حوالے کسی اخبار میں نہیں پائے جاتے ۔

۱۸۸۴ء میں مدراس سے کئی نئے اخبار جاری ہوئے ۔ ان میں سے بعض صرف چند مہینوں کے بعد ہی بند ہوگئے ۔ جنوری ۱۸۸۴ء میں محلۂ ترملکھیرٹی میں ایک مجلس انجمن احباب کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کے سکرٹری عبدالوہاب صاحب تھے ۔ ان کی سعی و کوشش سے انجمن کی جانب سے "اتحاد" نامی ہفتہوار اخبار نکلنے لگا ۔ اس کے ایڈیٹر غلام غوث صاحب غالباً مطبع اتحاد کے مہتمم بھی تھے ۔ اخبار کے مقاصد اور پالیسی کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے :—

" تمامی خلایق پر فواید و نتائج اتحاد کو ظاہر کردےگا ۔ یہ اخبار خصوص ترقی اسلام و خیرخواہی جمیع کافہ انام میں مصروف رہےگا اور رعایا کی فریادی گورنمنٹ کے گوش گزار کرےگا اور گورنمنٹ کے احکامات رعایا پر ظاہر کرےگا اور گورنمنٹ کے درمیان سلسلہ اتحاد کا باقی رکھےگا اور عناد کا بیخ کن ہوگا اور اپنے ملک اور دیگر ممالک کے سچے اور عبرت انگیز واقعات سنائےگا ۔ اور ہر ملک کی اشیا کے نرخ مشتہر کرےگا جس سے تجارت کو بہت ترقی حاصل ہو اور ہر ایک امر میں اپنی رائے آزادانہ ظاہر کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا[۱] ۔

یہ اخبار جس محلے سے نکلتا تھا اسی محلے سے ایک اور اخبار اسی نام کا انجمن اسلامیہ کی سرپرستی میں چار پانچ مہینوں کے بعد جاری ہوا اور دونوں اخبار کچھ دنوں تک برابر نکلتے رہے[۲] ۔

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ اخبارات کی کثرت نے اختلافات بڑھا دیے تھے ۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اس دور کے اخبارات نے جس قسم کے نام اپنے لیے منتخب کیے ہیں ان میں خود ان کے مقاصد کی جھلک پائی جاتی ہے چنانچہ اتحاد کی اشاعت کے بعد ہی ایک اور اخبار اتفاق کے نام سے جاری ہوا ۔ یہ ابتدا میں ہفتہ میں دوبار شایع ہوتا تھا لیکن ۱۸۸۵ء میں اس کو روزانہ کردیا گیا ۔ غالباً یہی مدراس کا سب سے پہلا روزانہ اردو اخبار ہے ۔ اس اخبار کو انجمن اسلامیہ کے علاوہ امرائے مدراس کی سرپرستی

۱ اختر شاہنشاہی ۲ اختر شہنشاہی

بھی حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے منتظمین نے مصارف کے بارگراں کو سنبھال لیا۔ آنریبل میر ھمایوں جاہ بہادر سی۔ایس۔آئی انجمن اسلامیہ کے صدر تھے اور مدراس کے مسلمانوں کی قومی اور سیاسی تحریکات میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ سالانہ اجلاس انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ کراچی ۱۹۱۳ ع کے صدر نواب سید محمد بہادر ان کے فرزند ارجمندتھے۔ نواب میر ھمایوں جاہ کے ہم نشینوں میں بڑی قومی ھمدردی رکھنے والوں کی خاصی تعداد تھی چنانچہ نواب صاحب کی تحریک پر جناب احمد محی الدین خان صاحب سکرٹری انجمن اسلامیہ نے اردو اخبار کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کی ضرورت کو اچھی طرح سے محسوس کیا اور عہدہ‌داران انجمن کی تائید سے ایک ھفتہ وار انگریزی اخبار ”محمڈن“ کے نام سے جاری کیا جو کچھ مدت کے بعد نصیرالدین صاحب گھٹالہ مدیر شمس‌الاخبار کے سپرد کیا گیا اور ایک مدت مدید تک یہ شمس‌الاخبار کے دوش بدوش نکلتا رہا۔

۱۸۸۴ ع کی ابتدا میں سید حسن رضا صاحب آتشی نے ایک اخبار ”دبیر مدراس“ کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ سید حسن رضا صاحب پہلے پہل مدرسۂ اعظم میں استاد تھے اور اس کے بعد کچھ دنوں تک سرکاری ملازمت میں مہتمم مدارس کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کی فارسی قابلیت مسلم الثبوت تھی۔ انھوں نے جنوری۱۸۸۴ ع میں محلہ رانی‌پیٹھ میں مطبع حسنی کے نام سے ایک جدید مطبع قایم کیا۔ اسی مطبع میں ھفتہ وار دبیر مدراس بڑی تقطیع کے بارہ صفحات پر شایع ھوتا تھا۔ دو تین مہینے کے بعد منشی محی الدین خان صاحب ”تسنیم“ نے یہیں سے ”کرناٹک پنچ“ جاری کیا مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں طلسم حیرت کے بعد یہ دوسرا ظریف پرچہ ھے جو عشرہ وار بہ طور ضمیمہ دبیر مدراس شایع ھوا کرتا تھا۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہ ھونے پایا تھا کہ منشی محی الدین خان صاحب ”تسنیم“ نے مطبع حسنی سے غالباً قطع تعلق کرلیا اور مرزا قاسم بیگ کے مطبع ھدایت سے ایک اخبار دبیر ھند کے نام سے جاری کیا۔ جنوری ۱۸۸۵ ع‌میں بہ طور ضمیمہ دبیر ھند ایک ھفتہ وار ظریفانہ نکالا جو ”دکن پنچ“ کے نام سے مشہور تھا[۱]۔ معلوم ھوتا ھے کہ اس زمانے میں قیام مطابع و اجراے اخبار کو ایک نہایت سہل کام سمجھا گیا تھا۔ جس بے سر و سامانی سے اخبار جاری ھوتے تھے

۱ اختر شاھنشاھی

اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ تاریخ اشاعت کے چند روز بعد ھی یہ بند ھو جایا کرتے تھے۔ ابتداے اشاعت میں ان کے لیے چند خریدار اور ھمدرد و معاون پیدا ھوجاتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کی سہل انگاری اور منتظمین اخبار کی بے توجہی کی بہ دولت اخبار کی زندگی خطرے میں پڑجاتی تھی۔

اپریل ۱۸۸۵ع میں مطبع گلزار بنگلور سے محمد ابراھیم صاحب طیش کے زیر اهتمام اخبار "باد صبا" نکلنے لگا۔ یہ تقریباً پندرہ سولہ سال تک کامیابی کے ساتھ جاری رھا۔ اپنی اشاعت کے دوران میں کچھ مدت کے لیے یہ ھفتہ میں چار دفعہ شائع ھوا کرتا تھا۔ طیش صاحب کی وفات کے بعد ان کے فرزند محمد اسماعیل نے اس کو جاری رکھا۔ آخری زمانے میں یہ شاید ھفتہ وار کردیا گیا تھا۔ بنگلور سے اس اخبار کے علاوہ ایک اور اخبار "بنگلور اخبار" کے نام سے ھفتہ میں دوبار شایع ھوتا رھا۔ ۱۸۸۶ع میں ارکاٹ (محمد پور) کے مطبع شوکت الاسلام سے شاہ عزیزالدین صاحب کھٹالہ نے ایک اخبار عزیزالاخبار کے نام سے جاری کیا لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ھے، شاہ صاحب اپنے بعض خیالات کی وجہ سے بدنام ھو چکے تھے، اس لیے اس اخبار کو فروغ حاصل نہ ھوسکا۔

انیسویں صدی کے آخری دس سال میں چار اردو اخبار مدراس سے شایع ھوئے۔ ۱۸۹۴ع میں مولوی نوراللہ حسین صاحب کے زیر ادارت اخبار "الحامی" نکلنے لگا۔ مولوی صاحب موصوف بلھاری (ضلع مدراس) کے مدرسۂ عربیہ کے فارغ التحصیل مستعد عالم تھے۔ مدت تعلیم کے اختتام پر انھوں نے مدراس میں اقامت اختیار کی اور اخبار نکالنے کی تجویز کی۔ یہ اخبار ھفتہ میں دو بار شایع ھوتا تھا۔ اسلامی ممالک کی خبروں کے علاوہ دلچسپ علمی مضامین اور غزلیں درج اخبار ھوتی تھیں۔ اس کی چھٹی جلد کے متفرق پرچوں کو دیکھنے سے پتا لگتا ھے کہ انھوں نے یہ التزام کر رکھا تھا کہ ایک کالم میں "مذھبی امورات" اور ایک میں "مشاھیر اھل اسلام کی سوانح عمریاں" ایک کالم میں "عام سوالات" یا "امور عامہ" اور ایک میں "مذاق" کے عنوان قایم کیے جائیں اور ان کے ذیل میں مسلسل مضامین شایع ھوں۔ اس کے بعد مدراس اور اضلاع مدراس سے

متعلق خبریں ہوتی تھیں اور آخیر میں اسلامی خبروں کے عنوان سے ممالک اسلامیہ کی تازہ ترین خبریں مہیا کی جاتی تھیں۔ ہر مہینے کی آخری اشاعت میں مصرع طرح پر مختلف شعرائے مدراس و حیدرآباد کی غزلیں یا کبھی کبھی ان کے علاوہ ان کا غیر طرحی کلام بھی شایع ہوتا تھا۔ مجموعی حیثیت سے اس امر کی کوشش کی جاتی تھی کہ ہر قسم کے مذاق والوں کے لیے یہ اخبار دل چسپ ثابت ہو۔ چنانچہ مدراس میں اردو اخباروں کی ہردل عزیزی میں نمایاں طور پر کمی ہونے کے باوجود یہ اخبار سات آٹھ سال تک کامیابی سے نکلتا رہا۔

«الحامی» کو نکلے ہوئے ابھی ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ایک اور اخبار بنام «مخبر دکن» مدراس سے نکلنے لگا۔ یہ اپنی اشاعت اور شہرت کے لحاظ سے اپنے پیش رو اخبارات سے پیچھے نہ تھا۔ ۱۸۹۵ ع میں سید عبدالقادر صاحب نے اس کو جاری کیا۔ یہ بارہ صفحوں پر مطبع سلطانی رانی پیٹھ میں ہفتہ وار چھپ کر شایع ہوتا تھا۔ اردو عبارت اور طرز تحریر کے لحاظ سے یہ اخبار مدراس کے اکثر اخبارات پر فوقیت لے جاتا ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں بہت سے قابل حضرات تھے۔ ان میں منشی محی الدین حسین صاحب اور سید علی قادری صاحب بہار تلمیذ شریف مدراسی و داغ دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخبار کا اکثر حصہ ان حضرات کے قلم کا رہین منت رہا کرتا تھا۔ بہار ضلع نیلور کے مردم خیز قصبۂ اودگیر کے رہنے والے تھے۔ فارسی اور اردو کے اچھے عالم تھے۔ شاعری کا خاصا ذوق تھا۔ ۱۸۸۷ع میں انھوں نے مدراس سے ایک ماہوار رسالہ «جلوۂ سخن» کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا۔ اس میں علاوہ مختلف مضامین کے مدراس یونیورسٹی کے امتحانات کی فارسی کتابوں پر نوٹس اور ان کے مشکل مقامات کے حل موجود ہوتے تھے۔ بہار صاحب یہاں کے ایک کہنہ مشق ادیب تھے۔ «مخبر دکن» کی اشاعت کے بعد مستقل طور پر ان کی خدمات حاصل کرلی گئی تھیں اور بعد میں ایک معقول مشاہرہ پر انھیں حیدرآباد روانہ کیا گیا تھا، وہ وہیں سے مملکت آصفیہ کے متعلق خبریں اور مضامین مہیا کر کے اخبار کے لیے روانہ کرتے تھے۔ جریدۂ روزگار سے اس اخبار کی معاصرانہ چشمک تھی۔ عموماً یہ اخبار حیدرآباد کے معاملات

پر سختی سے نکتہ چینی کیا کرتا تھا ۔ حیدر آباد میں شمالی ہند کے اصحاب کے اثر و نفوذ سے یہ اخبار ہمیشہ بیزاری کا اظہار کیا کرتا تھا بلکہ اس سلسلہ میں اس نے کچھ اس طرح کا پروپگنڈا کیا کہ یہ کہنا بےجا نہیں ہے کہ ملکی اور غیر ملکی کے جھگڑوں کو اس اخبار کی وجہ سے بہت کچھ فروغ حاصل ہوا ۔ اس کی پہلی جلد کے مطالعہ سے حیدرآباد کے اندرونی معاملات اور مالی نظم و نسق پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔ اعلیٰحضرت مرحوم کی پیشی کے سکرٹری نواب سرور جنگ کے خلاف اس اخبار نے مسلسل مقالے لکھے ۔ «ایوننگ میل» بنگلور بھی غالباً نواب سرور جنگ کی پالیسی سے نالاں تھا اس لیے جابجا «مخبر دکن» میں اس کے حوالے اور اقتباسات پائے جاتے ہیں ۔

اس کے پہلے نمبر میں اخبار کی ضرورت اور اس کے فوائد پر بہ عنوان «ہم اور اپنا اخبار» ایک مفید مقالہ ہے جس میں سے ذیل کا اقتباس مدراس میں اردو اخباروں کی بےقدری پر شاھد ہے :—

«......مگر ہماری قوم کے مذاق کی، افسوس! یہ کیفیت ہے کہ اخباروں کی طرف ان کے عظیم الفوائد اور کثیر المنافع ہونے کے باوصف ایک سر مو التفات نہیں؛ ان کے مطالعہ کا حاشا شوق نہیں ۔ قدردانی تو ایک طرف، مفت بھی ملیں تو تقویم پارینہ سے زیادہ رتبہ نہیں ۔ یہی تو ایک بھاری وجہ ہے جو ہمیں گھر بیٹھے دنیا کے حالات سے ماہر ہونے اور ان سے پند و نصیحت لینے کا موقع نہیں ملتا ہے ۔ جب ہمیں اخبار ناموں کے مطالعہ کا شوق نہیں تو جن فوائد کو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور جن سے ساری مہذب قومیں فائدہ اٹھا رہی ہیں ان سے ہم کیونکر متمتع ہوسکیں گے اور اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل کا نقشہ ہماری آنکھوں میں کس طرح بیٹھ سکےگا؟»

اس عبارت میں علامات وقف کا استعمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مضامین نہایت احتیاط سے لکھے جاتے تھے ۔ اس کے ادارتی مقالے طویل اور پرمغز ہوا کرتے تھے ۔ ذیل مین پہلی ششماہی کے مقالات کے عنوان درج کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوگا کہ ان میں سے اکثر مضامین حیدرآباد سے متعلق ہوا کرتے تھے :—

(۱) رزیڈنٹ اور حیدرآباد کے ملکی امور (۲) سر ولیم هنٹر اور مسلمانان هند (۳) ونیلاک اسکالرشپ (۴) ریاست حیدرآباد کی بدنظمی (۵) آرمینیه کے ادعائی مظالم (٦) ٹون هال لورپول میں شهزاده نصرالله خاں کی تقریب ضیافت میں قرأت قرآنی اور غصیلے متعصبانه عیسائیوں کی تعریض (۷) حجاج کے جهازوں کا مسوده قانون (۸) ریاست حیدرآباد دکن اور اس کے بےجا مصارف (۹) قابل توجه پیشی سکرٹری نواب سرور جنگ بهادر (۱۰) عیسائیوں کا پهر مسلمانوں پر سخت ظلم (۱۱) قرآن مجید کا ترجمه (۱۲) شهزاده نصرالله خاں کے سفر کے مصارف (۱۳) حضور عالیه نواب بیگم صاحبه کرناٹک (۱۴) مسئله آرمینیه پر پهر ایک سرسری نظر (۱۵) اردو فارسی مترجم گورنمنٹ مدراس (۱٦) هم اور پهر جریدهٔ روزگار (۱۷) جدید شریف مدراس کا تقرر (۱۸) ایک قابل تقلید فیاضی (۱۹) عیسائیوں کے ظلم و تعدی کا نمونه (۲۰) لیجسلیٹو کونسل کے لیے مسلمان رکن (۲۱) مسئلهٔ ترکی۔

حیدرآباد کے متعلق بعض مقالات مسلسل دو دو تین نمبروں میں شایع کیے گئے هیں۔ ان کے علاوه اس اخبار کی هر اشاعت میں ممالک محروسهٔ سرکار عالی کی بعض بد انتظامیوں کے متعلق دو ایک مضمون مراسلات کی تحت میں یا بسا اوقات سب ایڈیٹوریل کی حیثیت سے لازمی طور پر پائے جاتے هیں۔ "هم اور پهر جریدهٔ روزگار" کے عنوان سے اس اخبار نے جو ایڈیٹوریل شایع کیا هے اس کے اقتباسات ذیل سے اندازه هوگا که اس اخبار کی پالیسی حیدرآباد کے متعلق کیا تهی:—

"همیں سخت تعجب هے که همارے همعصر نے عمر بهر اڈیٹری کی لیکن اڈیٹر کے فرائض اور اخبار کی اغراض و مقاصد سے انهیں اب تک خبر هی نهیں هوئی۔ "چندین مدت خدائی کردی هنوز گاو خر را نشناختی" کی مثل ان پر پوری صادق آتی هے۔ اڈیٹری اس کا نام نهیں که جهوٹی خوشامد کی جائے اور بےجا تعریفوں کے پل باندهے جائیں جیسا که اخبار جریدهٔ روزگار کا مشرب هے، همارا بدخواه سلطنت بننا صاحب جریده نے صرف اس بنا پر ٹههرایا هے که هم نے چند عهده داران سرکار نظام (خلد الله ملکه و دولته) کی بعض بےجا کارروائیوں اور خود غرضانه کاموں پر اعتراض کیا هے، نرا کوئی

اس پیر مغاں سے پوچھیے کہ آپ کا ارشاد یورپ والوں کی نسبت کیا ہوتا ہے کیونکہ یہی شغل ان کے رگ و پے میں بھی ساری ہے اور یہی شوق انھیں دن رات لگا رہتا ہے - دیکھیے کوئی روز ایسا نہیں گزرتا ہے جب کہ کسی نہ کسی اڈیٹر نے کسی لارڈ یا ڈیوک کی کارروائی پر نکتہ چینی نہ کی ہو اور ان کے معائب کی تصویریں ملک کے رو بہ رو کھینچ کر نہ رکھ دی ہوں - کوئی کمبخت دن ایسا نہیں بسر ہوتا ہے جب کہ لارڈ سالسبری یا لارڈ روزبری وغیرہ کے کاموں پر جرح و قدح نہیں ہوتا یا ان کو آڑے ہاتھوں نہیں لیا جاتا ہو ؛ لیکن انھیں کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ بد خواہ سلطنت ہیں اور بدنام کنندۂ والی ملک - بلکہ ان کے اعتراضوں پر نوٹس لیا جاتا ہے اور رغبت سے ان کی باتوں کو سنا جاتا ہے مگر ہمارے مخاطب ہمعصر کا یہ حال ہے کہ ہم کو بدخواہ سلطنت اسلامی و بدنام کنندۂ ملک آصفی بتاتے ہیں محض اس وجہ سے کہ اپنا فرض منصبی برابر ادا کیا چاہتے ہیں " ۱ -

جب تک مخبر دکن نکلتا رہا جریدۂ روزگار سے اس قسم کی معاصرانہ چشمک برابر جاری رہی - تیس پنتیس سال تک یہ اخبار جاری رہا اور یہ اسی وقت بند ہوا جب کہ اس کے اڈیٹر مولوی عبدالقادر صاحب نے وفات پائی -

مولوی سید علی صاحب بہار کے علاوہ اس اخبار کے مستقل مضمون نگاروں میں مدراس کے بعض اور قابل حضرات بھی تھے جن میں مولوی نظام الدین صاحب فخری ' سلطان محمود صاحب اور حکیم محمد سعید صاحب چودھر قابل ذکر ہیں - موخرالذکر دونوں حضرات نے مخبر دکن کی ابتدائے اشاعت میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا - یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندستان میں شیکاگو کی کانفرنس کی تقلید میں مختلف مذاہب کی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز تھی - مخبر دکن نے ان دونوں حضرات کی تائید سے اس سلسلہ میں متعدد مقالے درج اخبار کیے - یہ دونوں حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے معترف و مداح تھے اور اس وجہ سے اس اخبار نے بھی دفاع اسلام کے لیے مرزا صاحب کا نام پیش کیا -

۱ - مخبر دکن جلد ۱ شمارہ ۳۱ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۹۵ ع -

اس سلسلہ میں مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی کے متعلق بھی کئی ایک مضامین شایع ہوئے - سلطان محمود صاحب مدراس میں مرزا صاحب کے متبعین میں امتیازی درجہ رکھتے تھے - ایک مدت تک وہ استرخا و فالج میں مبتلا رہے لیکن باوجود ان عصبی امراض کے وہ اپنی زندگی کے آخریں لمحات تک قادیانیوں کی حمایت میں مدراس اور بنگلور کے متعدد اخبارات میں مضامین شایع کیا کرتے تھے -

مخبر دکن کے اس دور کے مضمون نگاروں میں حکیم محمد سعید صاحب چودھر اب تک بقید حیات ہیں اور یہ مدراس میں قادیانی جماعت کے ممتاز فرد ہیں - ان کی متعدد نظمیں مخبر دکن کے صفحات میں شایع ہوا کرتی تھیں - اس اخبار کی ابتدائی جلدوں کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں وقتاً فوقتاً علمی ادبی اور تحقیقی مضامین بھی شایع کیے جاتے تھے - بیسویں صدی کی ابتدا میں بھی اس اخبار نے اپنے بلند معیار کو بالکل اسی طرح باقی رکھا -

۱۸۹۸ع میں اسد الدین احمد منیجر مطبع آصفی نے حکیم محمد سعید صاحب چودھر کی نگرانی میں سولہ صفحہ کا ایک ہفتہوار اخبار نیّر آصفی کے نام سے نکالنا شروع کیا - حکیم صاحب مدراس کے ان تجربہ‌کار طبیبوں میں سے ہیں جنھیں ڈاکٹری کے فن میں بھی خاصی مہارت حاصل ہے - ان کی کتابیں کلیات طب جدید اور تحقیقات ہیضہ وغیرہ چھپ کر شایع ہوچکی ہیں - فن طبابت کے علاوہ اردو فارسی ادب میں بھی ان کا نہایت ستھرا مذاق ہے ' ان کا اخبار نیّر آصفی بہ‌لحاظ عبارت اور طرز تحریر کے مخبر دکن کے دوش بہ‌دوش تھا - جریدۂ روزگار اور مخبر دکن کی ریس میں اس اخبار نے بھی اپنے بیشتر صفحات حیدرآباد دکن کے واقعات کے لیے وقف کر رکھے تھے - تقریباً دس بارہ سال تک یہ اخبار پابندی سے شایع ہوتا رہا - عربی اور ترکی اخبارات کے تراجم بھی اس میں بہ‌کثرت شایع کیے جاتے تھے - بظاہر یہ قیاس غلط نہیں ہے کہ جناب سلطان محمود صاحب اور ان کے ہم خیال مضمون نگاروں کا مخبر دکن کے ارباب انتظام سے نباہ نہ ہوسکا ہوگا اور غالباً اس کی وجہ اختلاف عقائد تھی ' چنانچہ نیّر آصفی کا اجرا اور اس کے

کالموں میں کہیں کہیں مخبر دکن پر دبی زبان سے اعتراض پائے جاتے ہیں ۔ مملکت آصفیہ سے متعلق اس اخبار کی پالیسی به نسبت مخبر دکن کے جریدۂ روزگار سے زیادہ ملتی جلتی تھی ۔ اس اخبار کی ابتدا کے متعلق اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

«چونکہ ہمارا نیر آصفی جلسۂ سالگرۂ آفتاب سپہر آصفیہ سے خصوصیت خاص رکھتا ہے اور اس کا وجود پیوستہ موقعہ سالگرہ کے دن عالم شہود میں آیا ، جو واقفین سے پوشیدہ نہیں ہے لہذا اعلیٰحضرت کی مسرت انگیز سالگرہ سے ہم کو سب سے زیادہ دلچسپی ہے اور ہم کوشش کریں گے کہ ہم سے اس رسم ہمایوں کے متعلق کوئی اہم فروگذاشت نہ ہو اور جتنے بڑے بڑے جلسے اس تقریب میں ہوں ان کے ظہار سے ہم اپنے ناظرین کو مطلع کرکے رعایائے آصفیہ کی وفاداری و جاں‌نثاری اور اعلیٰ حضرت کی توجہات شاہانہ کی داد دیں اور ہم اپنے ایک اہم اور مسرت انگیز فریضہ سے سبکدوش ہوں ۱»۔

باوجود اس کے کہ عہدہ‌داران ریاست حیدرآباد کی رضاجوئی اس اخبار کے پیش نظر تھی اس کے کالموں میں بعض ایسے مضامین جس میں جائز تنقید کا پہلو نکلتا ہے، پائے جاتے ہیں چنانچہ چونتیسویں سالگرہ کے سلسلہ میں اعلیٰحضرت مرحوم نے اخبارات کے اڈریس کے جواب میں جو تقریر فرمائی ہے اس کے متعلق یہ اخبار رقمطراز ہے :-

«لیکن ہم یہاں کمال ادب سے عرض پرداز ہیں کہ جو آزادی ریاست آصفی میں اخبار ناموں کو حاصل ہے وہ فی‌الحقیقت ایسی آزادی نہیں ہے جس کے وہ قانوناً اور انصافاً مستحق ہیں بلکہ وہ تو بدقسمتی سے سر فٹز پیاٹرک کے زمانہ رزیڈنسی میں نیست و نابود ہوگئی ۔ ہمیں تاسف ہے کہ حضور عالی نے اس آزادی کے نسبت کچھ ارشاد نہیں فرمایا ۔ لیکن ہمیں اعلیٰحضرت کے جواب کے پہلے فقروں سے یہ امید بنتی ہے کہ حضور عالی جائز آزادی اخبارات کو اپنے ممالک محروسہ میں بھی انھیں اصول پر مبنی سمجھتے ہیں جن پر وہ برٹش انڈیا میں قائم ہے ۔ اگر حضرت اقدس کا یہ خیال ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد »۔

جہاں اس اخبار نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہیں ذیل کا فقرہ بھی نظر آتا ہے جس میں غالباً مخبر دکن کی طرف اشارہ ہے :-

---

۱ نیر آصفی نمبر ۲۴ جلد ۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۹ ع ۔

" ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے بعض ہمعصر جو نفاق انگیز تحریروں میں خاص مذاق رکھتے ہیں حضور انور کی اس سنجیدہ اور باوقعت سرزنش سے متنبہ ہوکر اپنی رفتار کو درست کریں گے درحقیقت اخبار کا کام باہمی اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کا ہے نہ کہ افتراق و انفصال کا

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی"

سالگرہ کے جشن و انتظامات کے متعلق اس اخبار نے اپنی اسی اشاعت میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جس میں سے ذیل کی عبارت نقل کی جاتی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں :-

"[1] کتبے بہت کم اور اکثر غیر موزوں تھے اس قسم کا مذاق ہنوز کمی پر ہے ' بہت جگہ شاہراہ اور دروازوں پر انگریزی میں دعائیہ جملے لکھے ہوئے تھے جو بعض اوقات مالکان مکان اور اکثر آئند و روندگاں کی علم و فہم سے خارج تھے ۔ ڈپٹی کمشنر سمت بیدر کے دروازے پر یہ ذومعنی بیت دلچسپی سے دیکھی گئی :-

حضرت آصف کا عالم میں یہ فیض عام ہے ہے ولادت کی خوشی یاں دفتر انعام ہے

بعض جگہ عجیب بھونڈا شاعرانہ مذاق دکھلایا گیا ہے ۔ شاید اہل مذاق ہی خوب سمجھیں ۔ راجہ مرلی منوہر بہادر کے ایک پڑوسی اپنی کایتھی شاعری میں سالگرہ کی خوشی یوں مناتے ہیں :-

مبارک گرہ ہو مبارک ہو سال مبارک ہو تخت شہ ذوالجلال

صفائی بلدہ کا کتبہ اگر بجائے نظم کے نثر میں ہوتا تو سالگرہ کے دن شاعری کا خون نہ ہوتا ۔ ....راجہ مرلی منوہر کی ڈیوڑھی کے محاذی جو کتبہ نثر میں ہے وہ عام فہم سے خارج ہے اس کا درج کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :- " سالگرہ بہ فرح شاہ نظام الملک "۔

اپنے موضوع سے خارج ہونے کے خوف کے باوجود بھی اس اخبار کی ایک اشاعت شمارہ ۳۷ جلد ۹ (مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۶ع) کا ایک طویل اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے

---

۱ ماخوذ از نیّر آصفی نمبر ۳۴ جلد ۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۹ع ۔

محض اس لیے کہ ۱۹۰۶ ع میں اس اخبار نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر تقریباً بیس سال کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کی صورت میں جلوہ‌گر ہوئی - یہ اقتباس ایک کھلی چٹھی سے لیا گیا ہے جو مدارالمہام سرکارعالی کے نام ہے اور اس میں " سالارجنگ اعظم " کو خطاب کیا گیا ہے اور اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ " ریاست دکن کے متعلق چند ایسے قابل یادگار کام " کیے جائیں جو " عمدہ اور مفید خلائق " ہو سکتے ہوں :-

" البتہ اتنی بات ضرور کہوں گا کہ زمانۂ حال کے مدبرین و حکماء کا قول فیصل یہی ہے کہ اعلیٰ تعلیم ہی ترقیات ملک و قوم کا باعث ہے اور خصوصاً وہ تعلیم جو فنون و حرفت کے متعلق ہو -

اعلیٰ تعلیم سے یہ مراد نہیں کہ ولایت جا کر بی - اے یا بارسٹر ہو آئیں ! اور کوٹ اور پتلون پہننے اور میز پر شراب و کباب اڑانے کی بری لت سیکھ آئیں ! بلکہ علوم دینی و علوم مشرقی کے ساتھ فنون مغربی کو ملا کر ایک نئی طرز تعلیم کا آغاز کیا جائے جو ملکی ضرورتوں کو پورا کرسکے - ملکی یونیورسٹی قائم کی جائے اور جملہ فنون کی حیدرآباد ہی میں زبان اردو میں تعلیم دلائی جائے - اکثر کتب کے تراجم ہو چکے ہیں - بقیہ کی تکمیل سررشتہ علوم و فنون سرکار عالی سے کرانی چاہیے -

(۳) اپنے سررشتۂ تعلیم کی اصلاح و ترقی فرمائیں مثل ریاست بڑودہ کے یہاں بھی جبری تعلیم کا قانون جاری فرمائیے اورمذہبی تعلیم کا پرچہ مسلمانوں اور ہنود کے لیے امتحان مڈل میں لازمی قرار دے دیا جائے تاکہ ابتدائی جماعتوں میں پابندی کے ساتھ کام چلے اور ملک کی اخلاقی حالت جو بہت کچھ خراب ہوچکی ہے سنبھل جائے اور رفتہ رفتہ درست ہوجائے -

(۴) جیساکہ سرکار نے وعدہ فرمایا ہے (بوقت دورۂ اندور) ہر ضلع میں ایک ایک صنعتی و تجارتی اسکول قائم کرکے ملک کی مردہ صنعت کو از سرنو تازہ فرمائیں -

اور بلدہ کے تمام مدراس فنون کو ترقی دے کر کالج بنا دیں اور ان میں زبان اردو میں تعلیم دلائی جائے تاکہ آپ کی خاص توجہ سے زبان اردو علمی ذخیرہ سے معمور ہو کر آپ کی ممنون احسان بنے -

سرکار! جب علی گڈھ والے اور اہل بنگال بھیک مانگ مانگ کر اپنی یونیورسٹیاں قایم کررھے ھیں تو ھماری اتنی بڑی ریاست میں (خدا اس کو ابدالآباد قائم رکھے) یونیورسٹی کا نہ ھونا اور سلطنت نظام کو مدراس یا پنجاب یونیورسٹی کا محتاج بنا رکھنا ریاست کے لیے کس قدر ندامت بلکہ ذلت کا مقام ھے!

سرکار! جب یہاں مذکورۂ بالا مدارس فنون مثلاً مدرسۂ انجینری مڈیکل اسکول، فارسٹ اسکول مدرسۂ طب یونانی مدرسۂ صنعت و حرفت وغیرہ کو ترقی دے کر بڑے پیمانہ پر قایم کیا جائےگا تو خودبخود یونیورسٹی قایم ھوجائےگی»—

مدراس کے اس دور میں شایع ھونے والے اخبارات کے پیش نظر صرف ایک ھی چیز تھی اور وہ یہ کہ ریاست حیدرآباد کے متعلق خامہ فرسائی کی جائے اور اگر ھوسکے تو وھاں کے عہدہ‌داروں کی ھمدردی حاصل کی جائے - چناں‌چہ جولائی سنہ ۱۹۰۰ عیسوی میں ایک اور ھفتہ‌وار اخبار «آفتاب دکن» کے نام سے سید جلال‌الدین صاحب گھائل نے جاری کیا - یہ اخبار آٹھ صفحوں کا تھا اور مطبع عطاءالرحمن میں چھپ کر شایع ھوا کرتا تھا - مدراس کے اچھے شاعروں میں گھائل صاحب کا شمار تھا - وہ ایک مدت تک مدراس میں مقیم رھے - اپنی عمر کے آخر زمانہ میں مدراس سے منتقل ھوکر وانمباڑی چلے گئے اور وھاں اسلامیہ کالج کے اردو و فارسی کے استاد مقرر ھوئے - گھائل صاحب کی تحریر نہایت سلجھی ھوئی اور بامحاورہ ھوا کرتی تھی - ان کے اخبار (نمبر ۳ جلد ۱ مورخہ یکم اگست سنہ ۱۹۰۰) کے اداریہ سے جس کا عنوان «پرنس آف ارکاٹ اور تعلیم صاحبزادگان» ھے ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ھے جس سے یہ بتلانا مقصود ھے کہ آج سے چالیس برس پیشتر مدراس کے اردو اخبارات اپنی زبان کے لحاظ سے ھندستان کے دوسرے صوبوں کے اخبارات سے پیچھے نہ تھے :—

«جب کسی خوش حال مسلمان کو ھم مصروف تعلیم و تربیت دیکھتے ھیں تو دل بالکل باغ باغ ھوجاتا ھے اور بے اختیار یہ دعا زبان پر آتی ھے کہ خداوندا تو اس کو اپنے مساعی میں کامیاب کر کیونکہ ایک دن تھا کہ مسلمان چار دانگ عالم پر حکمران تھے۔ ان کی سطوت اور ان کی صولت کا جابجا چرچا تھا ان کی ترقیوں اور ان کی تدبیروں

کا شہر بہ شہر شہرہ تھا، علوم میں یہ نامور تھے فنون میں یہ افسر تھے، ان کے اقبال کا ستارہ ثریا کے پار گزرا، تھا اور ان کی دولت کا آفتاب قطبین پر چمکا تھا ۔ اب جو دیکھیے بالکل کایا پلٹ گئی ہے، مقدمہ الٹا نظر آتا ہے ۔ خاص کر ہندستان میں مسلمان کہلانا بے علمی کا سرٹیفکٹ ہے اور بے ہنری کا مصدقہ ۔ شاذ و نادر اگر کوئی پڑھا لکھا ہو تو النادر کالمعدوم سمجھا جاتا ہے ۔ ہر کہیں یہ ذلیل وخوار ہیں، دولت تو ایک طرف قوت شبینہ کے لیے یہ محتاج اور سرگشتۂ روزگار ہیں ۔ یہ ان کا ادبار صرف بے علمی اور کہالت کی وجہ سے ہے ۔ نہ تو انہیں علم کا شوق ہے اور نہ محنت کے یہ عادی ۔ یہ تو عامہ اسلامیاں کا حال ہے ۔ اب امراء اور رؤسا کو دیکھیے، علم سیکھے ان کی بلا اور کسب کریں ان کے دشمن ۔ بھالی کے بختاور انا کی گودی سے کیوں اتریں ۔ استاد دیوڑھی پر آیا انا نے گالیاں دیں اور اصیلوں نے صلواتیں سنائیں کہ نگوڑا استاد آتا ہے تو صاحبزادہ سہما جاتا ہے، ایسی پڑھائی کی ایسی تیسی کیا کسی کی نوکری کرنی ہے کہ خواہ مخواہ علم سیکھیں خدا کا دیا بہت کچھ ہے آرام سے گزر سکتی ہے ۔ پھر تو بے چارہ معلم اپنا سا منہ لیا جاتا ہے ۔ ولو بالفرض اگر کبھی نواب صاحب کی خاص خبرداری سے کسی دن مکتب میں بیٹھنا بھی نصیب ہوتا ہے بس حضرت جی ع "الٰہی غنچۂ امید بکشاے" کی تسبیح لگائے رہتے ہیں مگر میاں کا غنچۂ دہن کھلتا ہی نہیں اور زبان حرف آشنا ہوتی ہی نہیں ۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہیں اور دل کا حال کیا پوچھنا ع "مراد خاص خاطر مرگ استاد" اس ایک روز کا مکتب میں بیٹھنا غضب ہوگیا پھر تو ہفتہ بھر جمعہ ہی رہی ۔ یہ تو ابتدائی حال ہے جب صاحبزادہ صاجب پر و بال نکالتے ہیں تو البتہ کچھ سیکھتے ہیں، وہ کیا؟ پتنگ آپ اچھی طرح لڑائیں، گنجیفہ آپ اچھا کھیلیں اور شاطر آپ کہلائیں، اگر کچھ پڑھیں لکھیں بھی تو اس کی معراج یہی ہے کہ شاعر غرا کہلائیں اور جھوٹ بولنے اور خیالی پلاؤ پکانے کا تمغہ حاصل کریں جس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک دو بطن میں اثاث البیت خالی ہوجاتا ہے...."

اس اخبار میں کبھی کبھی نظمیں بھی شائع ہوا کرتی تھیں لیکن اخبار کا اکثر حصہ

حیدرآباد دکن، ممالک اسلامی، ہند و بیرون ہند کی خبروں کے لیے وقف تھا۔ بعد کے واقعات سے پتا لگتا ہے کہ اس اخبار کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور حسب امید عہدہ داران ریاست کی سرپرستی میسر نہ ہوسکی اس لیے اخبار بہت جلد بند ہوگیا۔

اس مختصر مضمون کو ختم کرنے سے پہلے انیسویں صدی کے آخر دور کے اخبارات کی دو ایک عمومی خصوصیات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۸۰ سے ۱۸۹۰ تک کا زمانہ مدراس میں اردو اخبارات کی ترقی کے سلسلے میں منتہائے عروج کا تھا۔ اسی دور سے یہاں کی اردو صحافت کو بھی زوال شروع ہوتا ہے۔ اب تک مسلمانان مدراس میں فارسی اور عربی تعلیم کا چرچا کافی تھا لیکن ۱۸۸۰ ع کے بعد مسلمانوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کے افراد میں فارسی اور اردو کی جگہ انگریزی نے لے لی اور رفتہ رفتہ اردو اخباروں کے دلدادہ حضرات کی تعداد میں خاصی کمی ہونے لگی۔ اس کے علاوہ کرناٹک کے انگریزوں کے حوالے ہونے کے بعد ہندو فارسی سے منہ موڑ چکے تھے ورنہ والاجاہی حکومت کے زمانے میں متعدد ہندو شعرا فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ ملک العلماء بحرالعلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی کے تلامذہ میں متعدد ہندوؤں کے نام پائے جاتے ہیں۔ مدراس کی جامع مسجد جو والا جاہی کے نام سے مشہور ہے اس کے محراب پر فارسی قطعۂ تاریخ ایک ہندو فارسی دان شاعر کی موزونی طبع کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۵۰ سے پہلے مدراس کے پریسیڈنسی کالج سے کامیابی کی سند لینے والے طلبہ میں اردو و فارسی داں طلبہ کے نام پائے جاتے ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر یہ قیاس غلط نہیں ہوسکتا کہ ابتدا میں ہندو بھی کافی تعداد میں اردو اخبارات کے خریدار رہے ہوں لیکن تعلیمی انقلاب کی بدولت جس کی وجہ سے فارسی و اردو کی جگہ انگریزی کو ملی اردو اخبارات کے عوض انگریزی اخبارات کی قدر بڑھنے لگی۔

اردو اخبارات کی مقبولیت عام اور کثرت اشاعت نے بہت سے بیکار انشاپردازوں کو اس امر کی طرف مائل کردیا تھا کہ وہ بھی اخبار جاری کریں اور اپنے ہمعصروں کی طرح فائدہ اٹھائیں لیکن خریداروں کی کمی اور اخبارات کی کثرت کی وجہ سے نفع کے عوض انھیں نقصان برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اکثر اخبارات بلند آہنگ دعووں کے ساتھ برآمد

ہوتے تھے لیکن جس سرعت کے ساتھ یہ بند ہوجاتے تھے اس سے عام طور پر یہ خیال پھیل گیا کہ اردو اخبار غیر مستقل اور ناپائدار ہوا کرتے ہیں۔ اس خیال نے مدراس کی اردو صحافت کو بہت بھاری نقصان پہنچایا۔

ایک اور سبب جس کی وجہ سے اردو اخباروں کی اشاعت کو نقصان پہنچا وہ مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت سے متعلق ہے۔ غدر سے کچھ دنوں بعد تک مدراس کی سوسائٹی کا اعلیٰ اور متوسط طبقہ مسلمانوں پر مشتمل تھا لیکن مغربی تعلیم کی کمی کی وجہ سے روز بروز ان کی اقتصادی حالت پست ہوتی چلی گئی اور آخرکار ایسے افراد گنتی کے رہ گئے جو اردو اخبارات کی سرپرستی کرسکتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر یہاں کے اردو اخبارات کو تنزل نصیب ہوا۔ اس دور میں صرف دو چار ہی اخبار ایسے رہ گئے تھے جنھوں نے تمام دقتوں کا مردانہ‌وار مقابلہ کیا اور اپنی اشاعت بیسویں صدی میں بھی برابر جاری رکھی۔ ان میں شمس‌الاخبار ،جریدۂ روزگار، طلسم حیرت اور قاسم‌الاخبار قابل ذکر ہیں۔

البتہ جنگ عظیم کے دوران میں اردو روز ناموں کی مقبولیت نے یہاں کی صحافت میں کچھ دنوں کے لیے جان ڈال دی لیکن مضامین اور زبان کے لحاظ سے ان اخبارات کا معیار ایسا بلند نہ ہوسکا کہ وہ دوسرے صوبوں کے اخبارات سے مقابلہ کرسکیں۔ اس امر پر بےحد تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں بیک وقت آٹھ دس کامیاب ہفتہ‌وار اخبار جاری رہے ہوں آج وہاں ایک بھی ایسا قابل ذکر ہفتہ‌وار اخبار نہیں ہے جو اپنی طباعت، تحریر اور مضامین کے لحاظ سے دیگر صوبوں کے اخبارات کی برابری کرسکے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ اس صوبے کے اردوداں حضرات اس کی طرف توجہ کریں اور ہو سکے تو ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے ہمارے صوبے کی اردو صحافت روز بروز پست ہوتی جارہی ہے۔

حضرت برق دہلوی مرحوم

(از جناب کیلاش ورما شایق صاحب ھنگامی بی-اے)

«خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں» غالب

حضرت برق دھلوی کا انتقال پرملال ایک ایسا ناقابل برداشت سانحہ ھے جو ایک عرصے تک بھلایا نہیں جا سکتا۔ حضرت برق دھلوی کا ذکر کرتے ہوئے قلم کانپ اٹھتا ھے۔ کسے گمان ہوسکتا تھا کہ یہ چہکتا ھوا بلبل دیکھتے ھی دیکھتے روپوش ھوجائےگا اور گلشن ادب کے گلہاے رنگیں کو پژمردہ کردےگا۔ حضرت برق کی ذات خاص سے اردو ادب کی کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس، ان امیدوں پر پانی پڑ گیا اور اس کی مرادیں بر نہ آئیں۔

ابھی حضرات رواں، چکبست، عزیز جیسے شعرا کی مرگ ناگہانی کا صدمہ لوگوں کے دلوں سے دور نہیں ھوا تھا کہ دفعتاً ۱۲ فروری ۱۹۳۶ع کو حضرت برق کی وفات کی غمناک خبر ملی۔ پرانا زخم پھر ھرا ھوگیا۔ افسوس، کہ ایسا ھونہار اور بلند پایہ شاعر جس کی پرورش اُس شہر دھلی میں ھوئی تھی جو شاعری کا مرکز تھا اور جہاں مشہورِ زمانہ شعرا میر، ذوق، مومن، غالب، داغ وغیرہ ھوگزرے ھیں، ھم سے ھمیشہ کے لیے جدا ھوگیا۔

جناب برق ۹ فروری ۱۹۳۶ ع کو ایک شاگرد کے اصرار پر ایک شادی کے سلسلے میں اپنے بال بچوں کے ھمراہ پانی‌پت گئے۔ ۱۲ فروری کو آدھی رات کے قریب یکایک آپ کو بےچینی سی معلوم ھوئی اور دل کی حرکت بند ھونے لگی۔ علاج کا معقول

انتظام بھی نہ ہونے پایا تھا کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور قدردانان اردو ادب کو داغ مفارقت دے کر مغموم بنا گئے - سچ ہے

عمر برق و شرار ہے دنیا کتنی ناپائدار ہے دنیا

مجھے آپ کی زیارت کی خوش‌نصیبی پہلے پہل کانپور میں حاصل ہوئی - یہ ملاقات صرف چند منٹوں کی تھی - آپ دسمبر ۱۹۳۳ع میں کانپور آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے - کیا خیال تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی -

آپ کا نام منشی مہاراج بہادر اور تخلص برق تھا - سکسینہ کایستھ تھے - فن شاعری آپ کو ترکے میں ملا تھا' ماں اور باپ دونوں کی طرف سے - آپ کے والد ماجد کا نام منشی ہرنراین داس حسرت تھا - آپ کے نانا منشی دولت رام عبرت ایک مشہور و معروف شاعر تھے اور حضرت ذوق کے شاگرد تھے - برق کی والدہ زیادہ پڑھی لکھی تو نہ تھیں لیکن وہ اس ہونہار نوعمر شاعر کو روزانہ راماین سنایا کرتی تھیں - انھوں نے مثنوی گلزار نسیم کے بھی کچھ شعر انھیں یاد کرا دیے تھے -

آپ کے خاندان کا وطن قصبہ سکیٹ ضلع ایٹہ ہے - ان کے بزرگوں نے شاہی زمانہ میں دھلی جاکر اونچے اونچے عہدے حاصل کیے تھے - پس برق نے بھی وھیں مستقل سکونت اختیار کی - آپ جولائی ۱۸۸۴ع میں پیدا ہوئے تھے - بچپن ہی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ آگے چل کر ایک بڑے شاعر ہوں گے - آپ کے شاعرانہ جذبات کی ایک مثال سن لیجیے - بچپن میں آپ کی آنکھ دکھ رہی تھی - ایک دوست نے پوچھا کہو کیا حال ہے ؟ آپ کی زبان سے بےساختہ یہ شعر نکلا :-

دل تو آتا تھا مگر اب آنکھ بھی آنے لگی پختہ کاری عشق کی یہ رنگ دکھلانے لگی

لکھنے کی نسبت برق کو اشعار سننے میں زیادہ لطف آتا تھا - یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے تھے جنھیں مزہ لے لے کر بار بار پڑھا کرتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے - تعلیم کے ساتھ ساتھ شعرگوئی بھی صلاحیت میں ترقی کرتی گئی اور شاعری پرشباب نمودار ہونے لگا - جیسا عرض کیا جا چکا ہے آپ کے والد بھی شاعر تھے اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی شاعری کی قدر کرتے

اور وقتاً فوقتاً ان کے کلام میں اصلاح بھی دیا کرتے تھے - باپ کو بیٹے سے بے حد محبت اور شفقت تھی' کیونکہ برق اپنے پانچ چھے بھائیوں اور ایک بہن کے انتقال کے بعد اپنے باپ کی ڈھلتی عمر میں پیدا ہوئے تھے - ۱۹۰۳ ع میں آپ نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی ساتھ مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے - نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز ترقی ہوتی گئی - ابھی حصول تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ فروری ۱۹۰۵ ع میں آپ کے والد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا اور ان کے کاموں میں خلل واقع ہوا - اب مجبوراً تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور دفتر میں معمولی نوکری کر لینی پڑی - رفتہ رفتہ طبعی ذہانت کی وجہ سے آپ افسری کے عہدے پر پہنچ گئے - ملازمت میں ہوتے ہوئے بھی آپ کی شاعری کو برابر فروغ حاصل ہوتا رہا - آپ اپنی خدا داد لیاقت کی وجہ سے پوسٹل آڈٹ آفس میں سپرنٹنڈنٹ جیسے معزز عہدہ کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے -

والد کے انتقال کے بعد جو کمی آپ کی تعلیم میں رہ گئی تھی اسے نجی طور پر بڑی لگن کے ساتھ پورا کیا - ۱۹۱۸ ع میں آپ نے منشی‌فاضل کا امتحان پاس کیا - ۱۹۲۰ ع میں بی- اے کی ڈگری حاصل کی - بعد ازاں آپ نے ۱۹۲۲ ع میں اپنے محکمہ کے سب اکاونٹ سروس کا امتحان پاس کیا - اب آیندہ ترقی کا دروازہ کھل گیا - سرکاری ملازمت اور شعرگوئی جاری رکھتے ہوئے بھی جس قدر جلدی اور جس طرح آپ نے تمام امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی ان سب سے آپ کی ذہانت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے -

چونکہ برق شاعر کا دل لے کر دنیا میں وارد ہوئے تھے ان کے لیے لازمی ہوگیا کہ وہ کسی سے شرف تلمّذ حاصل کریں پس اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے آغا شاعر دہلوی کے شاگرد ہوئے -

شروع شروع میں برق نے اپنا تخلّص کچھ اور رکھا تھا لیکن بعد میں منشی دوارکاپرشاد افق کے کہنے پر برق رکھا -

برق شروع میں منشی درگا سہائے سرور جہاں‌آبادی کے کلام کا بغور مطالعہ کرتے تھے اور ان کے ثناخواں تھے - آپ سرور کے کلام سے متاثر ہوئے اور ان کے

کلام کا اثر برق پر بہت گہرا پڑا اور ان کی طبیعت کا رجحان طرز جدید شاعری کی طرف ہوا۔ یہ رغبت روز بروز بڑھتی ہی رہی۔ یہ اثر سرور کی نظموں ہی کی بہ دولت ہوا تھا۔ دوسرا اثر جو ان پر پڑا وہ انگریزی زبان کے شاعروں کا تھا۔ آپ انگریزی کے نامور شعرا مثلاً ورڈس‌ورتھ، کیٹس، شیلی، ٹینی‌سن، براؤننگ کے کلام کا دلچسپی اور غور و خوض سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔

آپ کو نظم گوئی اور غزل گوئی دونوں میں یکساں ملکہ تھا لیکن پھر بھی میرے خیال میں آپ کی نظمیں آپ کی غزلوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ فوقیت رکھتی ہیں۔ آپ کے کلام میں تشبیہات اور استعارات نادر ہوتے ہیں اور ایک خاص خصوصیت رکھتے ہیں۔ زبان دل‌چسپ، سادہ اور عربی فارسی ترکیبوں سے مبرا ہوتی ہے۔ طرز بیان نیا اور اپنا جداگانہ رنگ رکھتا ہے اور پر اثر ہوتا ہے۔ خیالات بلند، پاکیزہ اور موثر ہوتے ہیں۔ آپ کی غزلوں میں زیادہ تر معرفت کا رنگ غالب رہتا ہے۔ آپ کی نظمیں بھی حقائق و معارف کا ایک صاف اور شفاف آئینہ ہیں جس میں شاعرانہ دلی جذبات کا عکس مکمل طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ خوبی برق کے کلام میں بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ قدرتی مناظر کا مشاہدہ شاعر نے نہایت غور و خوض سے کیا جس کا اظہار آپ کے کلام سے ہوتا ہے۔ آپ نے مذہبی، تاریخی، سماجی، فلسفیانہ وغیرہ ہر رنگ میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر فن میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ موقع موقع پر محاکات بھی نظر آتے ہیں۔ برق پر معمولی سی معمولی باتوں کا جلد اثر پڑتا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں سوچتے بچارتے رہتے تھے۔ تیج دہلی کے دفتر میں آپ نے ایک نظم بہ عنوان «گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ» پڑھ‌کر سامعین کو بحر غم میں ڈبو دیا تھا۔

ابتداء آپ نے ناٹک لکھنا بھی شروع کیا تھا۔ لیکن یہ ڈرامہ نگاری کا سلسلہ عرصہ تک قائم نہ رہا اور نہ اس فن میں آپ کو زیادہ کامیابی ہی حاصل ہوئی۔ برق کا ایک ڈرامہ «ساوتری» کئی بار اسٹیج پر کھیلا گیا اور اسے لوگوں نے پسند بھی کیا لیکن افسوس کہ وہ کتابی صورت میں شایع نہ ہوسکا کیونکہ اس کا مسودہ گم ہوگیا تھا۔

آپ میں ایک فطری خوبی یہ تھی کہ آپ ہر طبقہ کے لوگوں سے اچھی طرح ملتے جلتے تھے۔ آپ نہایت خوش‌مزاج، نیک سیرت اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔

سب سے پہلی غزل جو برق نے ۱۹۰۴ ع میں اپنے استاد کے پاس اصلاح کے لیے بھیجی تھی اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہمارے خون کی مہندی لگالو دست خنجر میں
قسم ہے ایک ہی ہوگے، تمھیں تم ہوگے محشر میں
سوال بوسۂ ابرو پہ جھنجھلا کر کہا اس نے
کوئی تلوار کا بھی نام لیتا ہے بھرے گھر میں

آپ نے سب سے پہلی غزل جو دہلی کے ایک مشاعرے میں پڑھی اس کا مطلع:

مثل شمشیر کھنچا جاتا ہے قاتل اپنا　　خاک ارمان نکالے کوئی بسمل اپنا

لوگوں نے بہت پسند کیا اور آپ کو کافی داد ملی۔ اور دوسری غزل جو آپ نے ایک بڑے مشاعرے میں پڑھی اس کے یہ دو شعر:

وفائیں کر کے تم سے بیوفائی دیکھنے والے　　ہمیں تو ہیں بھلائی میں برائی دیکھنے والے
نقاب الٹی صبا نے سامنے میرے تو فرمایا　　کہ اب تو ہر طرح تیری بن آئی دیکھنے والے

سامعین نے بہت پسند کیے۔

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے شروع کا کلام بالکل لکھنوی رنگ میں شرابور ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ آپ کی غزلوں میں وہ رنگ پیدا ہوا جو اس زمانہ میں باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔

برق کی سب سے پہلی نظم جو ۱۹۰۸ ع میں رسالہ زبان دہلی میں شایع ہوئی تھی وہ "کار خیر" تھی۔ اس نظم کو لوگوں نے اس قدر پسند کیا کہ وہ کئی بار پمفلٹ کی شکل میں شایع ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں:

شریک درد دل ہوکر کسی کا دکھ بٹایا ہے　　مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے　　کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے

کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بچارے کو سخی بن کر دیا کچھ تو نے مفلس کے گزارے کو
تسلی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو کبھی تو نے سہارا بھی دیا ھے بےسہارے کو
کبھی فریاد رس بن کر خبر لی بے نواؤں کی
لگی ھے چوٹ بھی دل پر صدا سن کر گداؤں کی

یہ نظم واقعی پر اثر ھے۔ زبان اتنی سادہ اور شیریں ھے کہ کان اسے بار بار سن کر بھی آسودہ نہیں ھوتے۔ شاعر اس نظم کے ذریعے کتنے سوال کرتا ھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ھے۔ پھر ایک ھی سوال کو کتنی بار اور مختلف ڈھنگ سے کن خوبیوں سے ادا کرتا ھے۔ شاعر میں جتنی قوت فکر ھوگی وہ اتنا ھی اسے وسعت دے کر بیان کرے گا۔ آج جب ھم برق کا کلام پڑھ کر محظوظ ھوتے ھیں تو دل میں فوراً یہ خیال پیدا ھوتا ھے کہ اگر وہ ابھی کچھ عرصے تک اور زندہ رھتے تو اردو ادب میں اپنے کلام کے ذریعہ ایک قابل قدر اضافہ کرتے۔

برق نے بسنت پر چھے نظمیں مختلف رنگ میں لکھی ھیں۔ اس مختصر مضمون میں آپ کی ھر نظم کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا مشکل ھے کیوں کہ مضمون کے طویل ھونے کا احتمال ھے۔ اس لیے یہی مناسب ھوگا کہ آپ کی نظموں کے صرف وھی بند پیش کیے جائیں جو ھردلعزیز اور قابل ستائش ھیں۔ بسنت رت کا آغاز پت جھڑ کے بعد ھوتا ھے۔ بہار کا وقت آتا ھے، نئی نئی کونپلیں نکلتی ھیں۔ آموں میں بور آتے ھیں۔ انواع و اقسام کے پرندے اپنی خوش الحانی سے فضا میں سرور کی کیفیت پیدا کرتے ھیں۔ ٹیسو کا پھول انوکھی بہار دکھلاتا ھے۔ معلوم ھوتا ھے بن میں آگ لگی ھوئی ھے۔ سرسوں کے کھیت کی طرف جب ھماری نگاہ جاتی ھے تو حضرت چکبست لکھنوی کے خیال کے مطابق ایسا معلوم ھوتا ھے "بجائے خاک کے اڑتا ھے رنگ سرسوں کا"۔ سردی میں کمی ھونے لگتی ھے، صرف گلابی سردی رہ جاتی ھے۔ شاعر ان خیالات کا ذکر کتنے لطیف پیرایہ میں کرتا ھے، ملاحظہ فرمائیے:

بسنت رت کیا جہاں میں آئی پیام دور بہار آیا
نظر ھے مست شراب جلوہ کہ روئے گل پر نکھار آیا

اچھوتی کلیوں کے بھی لبوں پر تبسم بےقرار آیا
نئے شگوفے کھلائے گویا یہ موسم خوش‌گوار آیا

نصیب سبزے کے جاگ اٹھے ستارہ ہے اوج پر چمن کا
جما ہے نقشہ روش روش پر شگفتہ پھولوں کی انجمن کا

اب سرسوں کے کھیت کا بیان دیکھیے، کتنا دل‌چسپ ہے :-

سماں یہ سرسوں کے کھیت کا ہے کہ زعفراں زار کھل رہا ہے
فضا میں کندن دمک رہا ہے سرور آنکھوں کو مل رہا ہے

سرسوں کے کھیت کیا ہیں کیسر کی کیاریاں ہیں
قدرت کی خاک پر یہ زیبا نگاریاں ہیں

پھولی ہوئی ہے سرسوں تابندہ شرارے ہیں
یا خاک کے دامن پر چھٹکے ہوئے تارے ہیں

کہاں ہے سردی کی سرد مہری شباب جاڑے کا ڈھل چکا ہے
ہوا ہے آغاز دور نو کا زمانہ کروٹ بدل چکا ہے
کھلی ہے خوابیدہ چشم نرگس روش یہ سبزہ سنبھل چکا ہے
قبائے غنچہ ہے چاک خوردہ کلی کا دامن نکل چکا ہے
خزاں الم سے چراغ پا ہے کہ آتش گل بھڑک رہی ہے
بہار کی ہے جو آمد آمد چمن کی قسمت چمک رہی ہے
کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ہے شفق زمیں پر
چنے ہیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ہائے شراب احمر

جب ان پہ پڑتی ہے ہلکی ہلکی شعاع سیمین ماہ انور
مرقع شان دل‌فریبی دکھاتا ہے جاں فروز منظر
لگائے صحرا کو لعل اس نے جو وجہ زیبائش چمن ہے
نہال فطرت کے فیض سے ہے زمین گلزار ہے کہ بن ہے

کتنی پیاری تشبیہات ھیں، کتنے اچھوتے استعارات اور کتنا اونچا خیال ھے۔

گلہائے اشرفی کا سکہ چلا چمن میں شبنم نے ہر کلی کے موتی بھرے دھن میں

اوس کا کلیوں کے منہ میں موتی بھرنا کتنا اعلیٰ تخیل ھے۔

شگوفہ کاری فطرت کا ہر طرف ھے ظہور شگفتگی سے چمن زار دھر ھے معمور
وفور جلوۂ گل سے برس رہا ھے نور نگاھیں کیف میں ڈوبی ھیں دل ھے مستِ سرور
کلی کلی گرہ رنگ و بو ھے گلشن میں
بسنت رت میں یہ شان نمو ھے گلشن میں

اگر آپ کی تشبیہات اور استعارات کا زیادہ لطف اٹھانا مقصود ھو تو آپ کی نظم بہ عنوان «جگنو» کا مطالعہ کرنا چاھیے:

ماہ پروانہ یہ لعل یمنی ھے شاید اڑتی پھرتی کوئی ھیرے کی کنی ھے شاید
کسی ناشاد کی آھوں کا شرارا تو نہیں آسماں سے کوئی ٹوٹا ھوا تارا تو نہیں
شوخیوں میں تری ھیں برق نظر کے انداز تیری پرواز میں ھیں رقص شرر کے انداز
تیرے جلوے سے منوّر ھوا صحن گلشن
تو ھے وہ شمع کہ ھے موج ھوا پر روشن

آخری شعر کس قدر ستائش کا مستحق ھے۔ شاعر نے جگنو کو ھوا میں جلنے والا چراغ کہہ کر ایک نئی بات پیدا کی ھے جو بالکل ٹھیک ھے اور لوگ اس کو مانتے بھی ھیں۔ اس ایک لفظ نے شعر میں جان پیدا کر دی ھے۔

اب آپ کی نظم بہ عنوان «گنگاجی» دیکھیے، یہ بھی اپنے رنگ میں بےمثل ھے:

رنگت میں چاندنی سے اجلا بدن ملا ھے آب رواں کا ھلکا سا پیرھن ملا ھے
ہر موج کا ھے دعوی مہتاب کی کرن ھو آئینۂ صفا ھو سیماب پیرھن ھو
ہر لہر کہہ رھی ھے اک موج نور ھوں میں ھے ہر حباب گویا جام بلور ھوں میں
پانی کے آئینے میں تارے ھیں عکس افگن یا جلوۂ چراغاں ھے تیرے زیر دامن
بھارت کی سرزمیں کے تجھ سے نصیب جاگے پانی بھرے نہ کیوں پھر ہر بحر تیرے آگے

آخری شعر میں ایک بےمثل بات کہی ھے۔ شعر اعلیٰ پایہ کا ھوگیا ھے۔ ساتھ ھی ساتھ محاورہ بھی نہایت خوبی سے بٹھایا گیا ھے۔ گنگاجی کا درجہ کتنا بلند ھے۔ اس

کیے آگے سمندر بھی پانی بھرتا ہے یا یوں کہیے کہ سمندر اپنے میں گنگا جی کا پانی لیتا ہے۔ اور دیکھیے:

مسکن ہے تو قدیمی اسلاف کا ہمارے | ڈالے رہے ہیں ڈیرے صدیوں ترے کنارے
تھا شان‌دار کیسا دور کہن ہمارا | فردوس بر زمیں تھا گویا وطن ہمارا
ہے تجھ کو یاد ازبر وہ داستاں ہماری | لہریں تری ورق ہیں تاریخ کے ہماری
دامن میں تیرے پنہاں خاکستر سلف ہے | گنج گہر نہاں ہے جس میں تو وہ صدف ہے
تو عظمت گذشتہ کی آج تک امین ہے | جاہ و جلال تیرے پہلو میں تہ نشیں ہے
وحدانیت کا نغمہ موجوں کے ساز میں ہے | اعجاز حق نمائی رنگ مجاز میں ہے

کیا کہنا۔ آخری شعر بےنظیر ہے۔ گنگاجی جس وقت بہتی ہیں لہروں میں آواز پیدا ہوتی ہے، وہ آواز کیا ہے؟ حمد خدا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن عالم میں جو ندی کی لہروں میں نظر آتا ہے، ہم جلوۂ حق دیکھ سکتے ہیں۔ تیسرے شعر میں آپ نے بتلایا ہے کہ گنگا جی کی ہر لہر گویا ہماری تاریخ بتلا رہی ہے جس کو دیکھ کر ہم اپنے زمانۂ قدیم ہندستان کی عظمت کا قیاس کرسکتے ہیں۔

تاروں بھری رات کا کیا اچھا نقشہ کھینچا ہے:

کیا گل ہیں کھلے دامن گلزار فلک پر | صدقے ہیں زر و لعل و گہر جن کی چمک پر
لیلائے شب اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا ہے | کیا حسن ضیا پاش ہے دل جس پہ فدا ہے

دامان فلک پر گل خوش رنگ پڑے ہیں
یا سقف زمرد میں در و لعل جڑے ہیں

آخری شعر کس غضب کا ہے۔ بےاختیار منہ سے تحسین آفریں کلمے نکلنے لگتے ہیں۔

آپ نے تاریخی نظمیں بھی لکھی ہیں جیسے «پدمنی کا جوہر»، «بھیلنی کے بیر یا پریم کا تحفہ»، «راجکماری پنّا»، «شکتی بان»، «پرتاب کی تلوار» وغیرہ وغیرہ۔ یوں ہر نظم اپنا خاص رنگ اور خاص نوعیت اور اہمیت رکھتی ہے لیکن جب ہم «میرا بائی» اور «بھیلنی کے بیر» پڑھتے ہیں تو کیف آمیز کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ ہمیں ان نظموں کے مطالعہ سے بھگتی اور پریم کا اچھا سبق ملتا ہے۔ نظم «میرابائی»

اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس نظم میں آپ نے پاکیزہ خیالات کے دریا بہادیے ہیں ۔ شاعرانہ جذبات اپنی ایک عجیب ندرت رکھتے ہیں :

بھگوان کرشن کے مندر میں ہے محو ثنا میرابائی
اک بین ہے دست نازک میں اب وقف نغمہ آرائی
کیا راگ ہے کیا لے‌کاری ہے اک وجد کا عالم طاری ہے
جو سر ہے پریم کٹاری ہے جو زخم ہے زخم کاری ہے
احساس خودی کافور ہوا عرفان سے دل معمور ہوا
یکرنگی پریمی پریتم ہیں اب پردۂ حائل دور ہوا

میرا کو کرشن بھگوان سے پریم تھا۔ ان کی بھگتی کا بکھان سن کر شہنشاہ اکبر تان‌سین کے ہمراہ ان کے پاس جاتا ہے اور میرا کی بھگتی دیکھ کر بہ‌ادب کہتا ہے:

اے دیوی! کرشن مراری کو ہم بھینٹ چڑھانے آئے ہیں
تیرے روحانی نغموں سے کھنچ کر دیوانے آئے ہیں
لے یہ ہیروں کی مالا ہے یہ ادنیٰ نذر ہماری ہے
کر ارپن ان کی سیوا میں تو جس کی پریم بھکاری ہے

اس نظم کے مندرجہ بالا اشعار کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے اور شاعر کے خیالات کی داد دیجیے جس کے وہ بدرجہ اولی مستحق ہیں۔ زبان کتنی سلیس اور روزمرہ ہے۔ الفاظ میں کتنی شیرینی اور مصرعوں میں کتنا ترنم ہے۔ ایسی نظمیں فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ شاعرانہ جذبات کی بے‌عدیل مثال اس نظم میں پائی جاتی ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے معرفت کا دریا دل میں موجزن ہونے لگتا ہے۔

ایک اور تاریخی نظم بہ عنوان « اچھوت ادھار » اپنا پایہ نہیں رکھتی۔ شری رام چندرجی مہاراج بن باس کی حالت میں جنگلوں میں گھومتے ہوئے اتفاقاً اچھوت سیوری کے جھونپڑے میں پہنچتے ہیں۔ سیوری با عزت ان کی خاطر مدارات کرتی ہے اور انھیں کھانے کے واسطے بیر پیش کرتی ہے۔ رام جی بلا ذات پات کا خیال کیے ہوئے بیر کھانے لگتے ہیں۔ ان کے دل میں زیادہ احساس پذیر شے سیوری کا آخلاص اور مدارات ہے۔

شری رام کے نزدیک ان خوبیوں کے سامنے دھرم اور مذھب کوئی چیز نہیں ھے۔ اخلاص اور صدق دلی کا درجہ کہیں زیادہ رفیع اور با عظمت ھوتا ھے۔ شاعر کہتا ھے:

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا وا رفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ھوئے تھے بیر محبت کے جو رس میں
خود پریم کے ساگر بھی ھوئے پریم کے بس میں

دراصل پریم اور محبت اسی کا نام ھے۔ فرضی پریم کوئی پریم نہیں ھے اور نہ یہ کوئی حقیقت ھی رکھتا ھے۔

آپ کا کلام زیادہ‌تر زمانہ، ادیب، مخزن، زبان اور تیج جیسے مشہور ماھانہ اردو رسائل میں شایع ھوتا تھا۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ «مطلع انوار» کے نام سے ۱۹۲۹ع میں شایع ھوا تھا۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ «تجلّیات برق» کے نام سے شایع ھونے والا تھا لیکن افسوس کہ وہ ان کی زندگی میں شایع نہ ھوسکا اور آپ کی یہ دلی خواھش پوری نہ ھوسکی۔ «مطلع انوار» میں مذھبی، سماجی، تاریخی سب ھی طرح کی نظمیں ھیں اور تمام نظمیں اپنے اپنے رنگ میں بےمثل ھیں - یہ بات صرف آپ کے کلام کا مجموعہ پڑھنے سے عیاں ھوتی ھے۔

ماہ جون ۱۹۱۳ع کے رسالہ زمانہ میں آپ کی ایک نظم «راجہ اج کا بلاپ» شایع ھوئی تھی۔ رانی اندومتی بددعا کے باعث آکاش سے ایک پھولوں کی مالا گرنے سے یکایک مرجاتی ھے۔ راجہ درد و کرب کے ساتھ بلاپ کرتے ھیں۔ نظم بےحد پردرد اور پر تاثیر ھے۔

اف اف یہ دردناک صدا کس غضب کی تھی آواز دلخراش یہ کس جاں بلب کی تھی
کیا وجہ یہ شکست خموشئ شب کی تھی یہ آہ دل‌گداز کس ایذا طلب کی تھی
یہ کون چپ ھوا نفس سرد کھینچ کر
دی کس نے جان نالۂ پردرد کھینچ کر

نظم «جوش بہار» میں شاعر نے ایسے ایسے الفاظ منتخب کرکے رکھے ھیں کہ نظم

میں موسیقی کا لطف پیدا ہوگیا ہے جو شعر کی جان ہے - پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہار کی لہر رگ رگ میں دوڑ رہی ہے اور اس میں وہ رس بھر رہی ہے جس میں بہار کے آتے ہی سارے اجزائے قدرت تروتازہ ہوجاتے ہیں - قوت نمو کا جوش موجزن ہونے لگتا ہے - ان خوبیوں کو شاعر نے کس ندرت کے ساتھ ایک عجیب طرز میں بیان کیا ہے - ملاحظہ فرمائیے :

نکھرا ہوا سر فلک جو ابر قطرہ بار ہے خزاں پہ اوس پڑگئی چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے ورق ورق ہے خوشنما نظر نظر نثار ہے
جمی تھی برگ برگ پر جو گرد اب وہ دھل گئی
کلی کلی نکھر گئی، گرہ دلوں کی کھل گئی
نمو کا آشکار ہے، بساط خاک سے عیاں بچھا ہے فرش مخملی گیاہ نو سے ہے عیاں
اگل رہی ہے لعل اب زمین باغ بے گماں روش روش کھلے ہیں گل چمن ہے روکش جناں
کلی ہے نیم وا کوئی دلھن ہے یا حجاب میں
کھلا ہوا ہے نیم رخ ہے نیم رخ نقاب میں

« مطلع انوار » میں جو برق کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے اس قسم کے قدرتی مناظر پر اچھی اچھی نظمیں ملیں گی مگر اس طرح کی بہت ہی کم ملیں گی - اگست ۱۹۱۳ع کے رسالہ ادیب میں برق کی ایک نظم « سیتاجی اشوک بن میں » کے عنوان سے شایع ہوئی تھی - نظم بےنظیر ہے - شاعر کو اس نظم میں کامیابی حاصل ہوئی ہے - اس کا بھی لطف اٹھائیے :

سراپا یاس کی صورت مجسم نقش حیرانی کھڑی ہیں سرنگوں زیر شجر سیتا مہارانی
پریشاں تا کمر ہیں موئے سر بیگانۂ تزئیں لباس جوگیا ہے پردہ دار جسم نورانی
برستا ہے ملال دلنشیں مغموم چہرے سے نگاہ مضطرب ہے ترجمان درد پنہانی
ہجوم درد میں پنہاں ہو جیسے شعلۂ آتش نہاں الجھے ہوئے بالوں میں ہے یوں نورپیشانی
سیتا جی کی زبانی :
یہ کن کرموں کا بدلہ لے رہا ہے اے فلک مجھ سے یہ کن پاپوں کے کارن ہوں گرفتار پریشانی

غضب ڈھایا اکیلا پا کے مجھ کو دشت راون نے دیا دھوکا خلاف رسم آئین جہانبانی
پتی برت دھرم سے لیکن گرا سکتا نہیں مجھ کو میں ست ونتی ہوں کر کے ہی رہوں گی اپنی من مانی
زمین و آسمان زیر و زبر ہو جائیں ممکن ہے مگر یہ غیر ممکن ہے بنوں لنکا کی پٹرانی

آپ کی ایک نظم بہ عنوان " شمع کشتہ " نہایت دلکش اور لطیف ہے ۔ شاعرانہ جذبات کی نادر مثال اس نظم میں پائی جاتی ہے ۔ شاعر نے اس چھوٹے اور معمولی مضمون کو غیر معمولی اور موثر انداز میں بیان کیا ہے ، آپ فرماتے ہیں :

رات بھر جلوہ فروز محفل عشرت رہی بزم میں تیری تجلی وجہ صد زینت رہی
تیرے پروانوں سے شب بھر گرمیٔ صحبت رہی دونوں جانب سے بھڑکتی آتش الفت رہی
کوئی پروانہ جو گر کر ہو گیا فی النار بھی
تا سحر ٹوٹا نہ تیرے آنسوؤں کا تار بھی

رات بھیگی اوس نے چھینٹے دیے گلزار پر آ گیا کچھ کچھ عرق تیرے گل رخسار پر
پھر گئی زردی سی روئے مطلع انوار پر رات بھاری ہو گئی تیرے دل بیمار پر
لاکھ ہاتھوں چھاؤں رکھا اہل محفل نے تجھے
خاک کر ڈالا جلا کر سوزش دل نے تجھے

ضو فشاں جب جلوۂ رنگ شفق ہونے لگا خاکدان دہر کا روشن طبق ہونے لگا
تیرے روئے آتشیں کا رنگ فق ہونے لگا عارض رنگیں ترا سادہ ورق ہونے لگا
ہستیٔ بے بود آخر دے گئی دھوکا تجھے
کر گیا ٹھنڈا نسیم صبح کا جھونکا تجھے

تیرے گل ہوتے ہی قصہ مختصر کچھ بھی نہ تھا خواب کا نقشہ تھا سب رنگ اثر کچھ بھی نہ تھا
کھل گیا جز بے ثباتی جلوہ گر کچھ بھی نہ تھا رات بھر کی ساری رونق تھی سحر کچھ بھی نہ تھا
شمع کشتہ تو مجسم یاس کی تصویر ہے
یا بیاض صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے

برق اہل فن شاعر تھے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کا نام اردو ادب میں قائم ہے اور اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اردو ادب کا وجود

رھے گا - ھر شاعر کا رنگ اور طرز بیان جداگانہ ھوتا ھے - شاعر اپنی ایک امتیازی خصوصیت لے کر آتا ھے اور اگر وہ اخیر تک اپنے خاص انداز کو اپنائے رھے تو بلاشبہہ وہ اپنے رنگ کا موجد اور بلند پایہ شاعر ھوکر رھےگا - برق کی بےوقت وفات سے اردو ادب میں ان کے قدردانوں کو دلی صدمہ ھوا - قدردانان اردو ادب نے آپ کے غم کا اظہار مختلف طریقوں پر کیا - ماتمی مجلسیں منعقد ھوئیں' کچھ شاعروں نے نوحہ کے ذریعہ اپنے غم کا اظہار کیا اور کچھ نثر نگاروں نے بہ ذریعہ نثر - قصہ کوتاہ آج تک اردو ادب آپ کے غم ھجر میں آپ کا ماتم منا رھا ھے -

آپ کی نظموں کے اتنے نمونے پیش کرنے کے بعد اب مناسب ھوگا کہ آپ کے اردو منظوم ترجمے بھی اھل ادب کے سامنے پیش کیے جائیں - آپ نے انگریزی زبان کی نظموں کا بھی اردو منظوم ترجمہ کیا ھے - ڈاکٹر سر رابندرناتھ ٹیگور کی بلند پایہ اور شہرۂ آفاق تصنیف گیتا نجلی کا بھی کچھ حصہ اردو زبان میں نظم کیا ھے - اس کے علاوہ آپ نے اور بھی مختلف زبانوں کے ترجمے کرکے اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ھے - ترجمہ کا کام کوئی آسان اور معمولی کام نہیں ھے - صرف وھی شاعر اس فن میں کامیاب ھوسکتا ھے جس میں یہ ملکہ خدا داد ھو - برق میں یہ بھی خصوصیت پائی جاتی تھی کہ وہ ھر زبان کی نظموں کا اچھا اور کامیاب ترجمہ کرسکتے تھے -

اب آخر میں آپ کی غزلوں کے بھی کچھ نمونے پیش کرنا لازم ھوگا تاکہ اس بات کا انکشاف اردوداں پبلک پر عام طور سے ھوجائے کہ شاعر کے آخری زمانے کی غزلوں میں کس رنگ کی کثرت ھے - جیسا پیشتر عرض کیا جاچکا ھے شاعر نے شروع میں لکھنوی انداز بیان کو اپنا کر اپنے اشعار میں تغزل کی شان پیدا کی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور اس قسم کے اشعار متروک سے نظر آنے لگے اور قدردانان اردو ادب میں اس کی کچھ اھمیت نہ رہ گئی' شاعر نے زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے انداز بیان میں بھی تبدیلی واقع کردی اور اس میں فلسفہ' حقائق و معارف وغیرہ کا شائبہ نظر آنے لگا -

غزل کا میدان بہت تنگ ھے لیکن پھر بھی اسے وسعت دی جاسکتی ھے - اسے وسیع

کرنے کے لیے ضرورت ھے خیالات کی بلند پروازی کی ، نئی تشبیہات اور اچھوتے استعارات کی ۔ ھمارے قدیم شعرا نے غزل میں بہت کچھ کہا اور بہت سی یا یوں کہیے کہ ھر قسم کی تشبیہوں کا بخوبی استعمال کیا ۔ انھوں نے اس کا بہت کم موقع دیا کہ اور شعرا بھی اس پر طبع آزمائی کریں ۔ پس یہ لازم ھوگیا کہ کوئی بھی غزل گو شاعر جو اس رنگ میں قلم اٹھائے جدت پیدا کرے کیونکہ اگر وہ لکیر کا فقیر بن کر اسی قدیم طرز کو اختیار کرے گا تو اس میں نہ تو کوئی خوبی ھی ھوگی اور نہ لوگ اس کی قدر کریں گے کیونکہ یہ ظاھر ھے کہ جس کا ایک بار مطالعہ کیا جاچکا ھے اسی کا بار بار مطالعہ کرنے میں وہ لطف حاصل نہ ھوگا جب تک کہ اس میں کوئی نمایاں خصوصیت نہ ھو ۔

جب ھم برق کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ھیں یا کسی کی زبان سے ان کو سنتے ھیں تو ھمیں محسوس ھوتا ھے کہ انھوں نے موجودہ زمانہ کے غزل گو شعرا کی روش اختیار کی ھے ۔ آپ کی ابتدا کی شاعری میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ھے ، حسن و عشق کی چاشنی دی گئی ھے لیکن آگے چل کر اس میں حقائق و معارف ، تصوّف اور فلسفہ کا بھی رنگ آگیا ھے ۔ علاوہ ازیں تغزل کی شان بھی موجود ھے جو اردو شاعری میں ایک خاص اور اھم شے تصور کی جاتی ھے ۔ آپ کی غزلوں کی تعداد قریب قریب اتنی ھی ھے جتنی کہ نظموں کی ۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ھے کہ شاعر نے اپنے خیالات میں ایک خاص پرواز پیدا کی ھے ۔ استعارات کا بر محل استعمال ھوا ھے ۔ شاعر کا معیار حقیقتاً بہت بلند ھے ۔ اپنے مطالب کو مشکل پیرایہ میں کہیں کہیں بیان کیا ھے جس کا آسانی سے سمجھنا دشوار ھوجاتا ھے ۔ اتنا ھوتے ھوئے بھی آپ کو غزل گوئی میں وہ درجہ نہیں حاصل ھوا جس پر ناز کیا جاسکے ۔ یا آپ اس حد تک نہیں پہنچے جس حد پر حضرات نظر لکھنوی ، جگر مرادآبادی ، فانی بدایونی ، حسرت موھانی اور اصغر گونڈوی پہنچ چکے ھیں اور جو اس زمانے میں باعث فخر خیال کیے جاتے ھیں ۔ ھم برق کی غزلوں کا مقابلہ شعراے مذکورہ سے ھرگز ھرگز نہیں کرسکتے کیونکہ مقابلہ کرتے وقت ھمیں ایک خاص کمی محسوس ھوتی ھے ۔

بهر کیف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی نظمیں غزلوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بلند پایہ رکھتی ہے۔ اب آپ کی غزلوں پر توجہ فرمائیے :-

ہم نہ کہتے تھے مریض غم کا حال اچھا نہیں
دیکھتے ہی غش تجھے اے چارہ ساز آہی گیا
عشق جب صادق ہوا تو بڑھ گیا عجز و نیاز
حسن جب کامل ہوا تو پھر ناز آہی گیا
کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہیے
لا تعین کس لیے محدود ہونا چاہیے
جوش ہمت کا تقاضا ہے یہ اک اک گام پر
صرف راہ منزل مقصود ہونا چاہیے

تیسرے اور چوتھے شعر میں کتنی بلند پروازی ہے۔ واقعی جو چیز لاتعین ہے اسے محدود کرنے سے کیا حاصل؟ اس لیے سجدے محض کعبے اور بتخانے ہی تک کوئی اہمیت نہ رکھیں گے۔ بقول بسمل الہ آبادی :-

"جس جا پہ جھکایا سر میں نے کعبہ تھا وہی بتخانہ تھا"

ہمت کا کیا تقاضا ہے، ہر ایک اس سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن شاعر نے ہمت کی کیا تشریح کی ہے، یہ واقعی داد طلب ہے :-

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں
خون انصاف کا کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں
حسن اور حسن میں قائم ہے مراتب کا لحاظ
وہ جفا کرتے ہیں ہم شکر جفا کرتے ہیں

شاعر نے کیا مراتب کا لحاظ رکھا ہے۔ معشوق کی جفا پر شکر جفا کرنا عشاق کا خاصہ ہی ہے۔ اس شعر میں تغزّل کی شان پائی جاتی ہے۔

داغ الفت کا اجالا خانۂ دل میں رہے روشنی اس شمع کی تاریک منزل میں رہے
برق حسن یار اتنی کس لیے ہے بیقرار وہ میری آنکھوں میں ٹھہرے وہ مرے دل میں رہے

دم زدن میں ہوا عالم فانی کا سفر　　کھل گیا راز کہ ہستی سے عدم دور نہیں
اس کے پرتو سے ہے جذبات کی دنیا آباد　　آنکھ سے دور ہے وہ دل سے مگر دور نہیں

ایک شعر میں شاعر نے اپنے متعلق یا اپنے کلام کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے:

گلزار میں ہے بلبل رنگیں نوا خموش　　پھیکا ہے رنگ برق سخنداں کے سامنے

آپ نے درد و حسرت کا کتنا اچھا مرقع پیش کیا ہے:

حسرت آلودہ نگاہیں لب پہ ہے مہر سکوت
برق درد عشق کی تصویر خاموشی میں ہے

پھر آپ کیا فرماتے ہیں:

لذت گویائی مستور خاموشی میں ہے
ایک محویت کا عالم خود فراموشی میں ہے
کھیل قسمت کے زمانہ کی دو رنگی دیکھیے
کوئی صرف غم ہے کوئی شغل مےنوشی میں ہے
خود حجابوں سے نہاں ہے اور جلوے بےحجاب
حسن مطلق تیری روپوشی بھی روپوشی میں ہے

تیسرا شعر کس غضب کا اور کس قدر حقیقت و معرفت سے بھرا ہوا ہے۔ خدا تو پوشیدہ ہے لیکن اس کے جلوے نمایاں ہیں۔ شاعر نے کیا حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔

آپ کا یہ شعر:

نگہ سے جان لینا اور اشارے سے جلا دینا
کرشمہ تیرا اک یہ بھی ہے چشم پرفسوں وہ بھی

ہندی شاعر بہاری کے اس دوہے سے کتنی مطابقت رکھتا ہے:

امی ہلاہل مد بھرے سویت سیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جیہ چتوت اکبار

آپ نے چند روزہ زندگی کا کیا صحیح نقشہ کھینچا ہے:

لیے ہیں ہستئی فانی میں سانس گنتی کے
شمار عمر دو روزہ تو کس حساب میں ہے

اب آپ کے حسب ذیل اشعار پر غور فرمایئے کتنے بلند ھیں:

دل جو صورت گر معنی کا صنم خانہ بنے
آنکھ جس شے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے
تا در یار پہنچتا ھے وہ خود رفتۂ شوق
اپنی ھستی میں جو اس راہ سے بیگانہ بنے
ظرف مے ٹوٹ کے بھی ھونے نہ پائے بے کار
ھو شکستہ کوئی شیشہ تو پیمانہ بنے

پبلک میں آپ کی قدر تو تھی ھی، راج درباروں میں بھی آپ کی کافی دھاک جمی ھوئی تھی۔ وھاں بھی آپ کی عزت و خاطر و مدارات ھوتی تھی۔ ۱۹۱۱ء کے دلی دربار کے موقع پر پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے ان کو ایک قصیدہ پر جسے انھوں نے اس موقع کے لیے لکھا تھا چاندی کا تمغہ اور سرٹیفکٹ ملا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں والئی ریاست نرسنگھ گڑھ سے آپ کو انعام مل چکا ھے۔ آپ دو بار پٹیالہ دربار میں بھی بلائے گئے تھے۔ آپ کی خوبیوں کا کہاں تک ذکر کیا جائے۔

«خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں»

غالب

(از آل احمد صاحب «سرور» ایم-اے، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

شاعر کیا کہتا ہے، کس طرح سے کہتا ہے اور کس کے لیے کہتا ہے، نقد و نظر کی ساری تفصیل کا اجمال یہی ہے - غالب کی شاعری کا مطالعہ ہمیں اسی نقطۂ نظر سے کرنا ہے -

اس سے پہلے غالب کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اب بھی لکھا جارہا ہے اور شاید آئندہ بھی لکھا جائے، غالب کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے - اس قدر داد تحقیق و تنقید کے بعد بھی «حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا» - نئے نئے پہلو روز سامنے آتے رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کے بہت سے بت بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں - مگر موضوع ابھی فرسودہ نہیں ہے - اس میں ایک ابدی تازگی ہے - ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس میں سیکڑوں پہلو ہیں - اس کی شعاعوں سے اہل نظر کا وہی عالم ہے جو پرتو خورشید سے شبنمستاں کا اس لیے ایک روشن اور واضح نقطۂ نظر کی تلاش ضروری ہے -

غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ عجیب و غریب تھا - باہر آگ لگ رہی تھی اور گھر میں کسی کو خبر نہ تھی - سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ‌گری تھا - خاندان کے مغل تھے اس لیے عیش امروز کو راحت فردا پر ترجیح دینا خمیر میں داخل تھا - باپ اور چچا نے ساری عمر لڑنے میں گزار دی، مگر کسی بلند نصب‌العین کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ پیشہ یہی تھا - غالب کا بچپن ننھیال میں بسر ہوا - شروع میں بہ تقاضائے سن خوب رنگ رلیاں کیں - اس زمانے کا ذکر انھوں نے بڑے

مزے لے لے کر کیا ہے - زوال آمادہ شرفا میں جو جو باتیں ہوتی ہیں غالب میں اس وقت سب موجود تھیں - دنیا کے لذائذ سے متمتع ہونا ' اپنی ذات کو آگے رکھنا ' اپنی دنیا الگ بنانا غالب نے اپنے ماحول سے سیکھا - شاعری کا ذوق رسمی نہ تھا ' فطری تھا ' ورنہ غالب غالب نہ ہوتے - ملا عبدالصمد سے انھوں نے فارسی پڑھی اور اس میں وہ ملکہ پیدا کرلیا کہ زبان‌دانوں کی ہمسری کرنے لگے - فارسی کے اس ذوق نے اور طبیعت کی افتاد نے « بیدل » کی طرف مائل کیا - بیدل عوام کا شاعر نہیں - غالب اس عمر میں بھی شاهراہ عام سے ہٹ کر چلنا چاہتے تھے - اپنی برتری کا احساس' حسب نسب پر فخر' عوام سے علیحدگی کی خواہش ' یہ سب باتیں شروع سے ان میں موجود تھیں - طبیعت فلسفہ کی طرف مائل تھی کیوں کہ تحلیل و تجزیہ کی قوت خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی اور تحلیلی انداز طبیعت کا قدرتی نتیجہ فلسفہ دانی ہے - غرض غالب نے جب شاعری شروع کی تو بیدل کا رنگ اختیار کیا - فارسی ترکیبیں' فارسی انداز بیان' نازک خیالی بلکہ خیال بندی مصنوعی اور بعض جگہ بےکیف دماغی ورزش ان سب کا پتہ پہلے دور کی شاعری میں ملتا ہے ' لیکن یہ کہہ کر اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا - غالب نے بہت جلد اس روش کو ترک کردیا اور نسخہ حمیدیہ میں ۱۸۲۱ع سے پہلے کے اشعار کی جو فہرست ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی کئی غزلیں اس عمر میں ایسی کہہ چکے تھے جن میں وہ بیدل کی غلامی سے آزاد نظر آتے ہیں ' لیکن یہ مشق غالب کے لیے ہر لحاظ سے مفید ثابت ہوئی - معنی آفرینی اور نازک خیالی کی کوشش جو آگے چل‌کر متاخرین شعرائے فارسی کے ڈھب پر ہوئی ' یہیں سے شروع ہوتی ہے - لفظ تراشی اور خلاقی فکر جس نے آگے چل کر بڑے بڑے گل کھلائے ہیں ' پہلے پہلے یہیں اپنا جلوہ دکھاتی ہے - فرق صرف یہ ہے کہ یہاں اس پر مصنوعی اور پرتکلف انداز بیان کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور آگے چل‌کر اس سے نفسیاتی حقایق کی تشریح میں مدد لی گئی ہے -

ادھر غالب کو اس وادی بےراہ کی کوتاہیوں کا احساس ہوا ادھر « ظہوری نے ان کے بازو پر تعویذ اور کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا

انھیں سکھایا"۔ تیموری دور کے متاخرین شعرائے فارسی سے غالب بہت متاثر ہوئے ہیں خصوصاً نظیری سے ۔ بیدل کی تقلید میں غالب خیالی مضامین تو باندھتے تھے مگر ان میں مصنوعی رنگ ہوتا تھا ۔ ان شعرا کی نازک خیالی و معنی آفرینی تغزل میں سمو کر انھوں نے لفظ اور معنی کا ایک نیا رشتہ دکھایا اور اپنے خاص رنگ تک انھیں کی دستگیری سے پہنچے ۔

اردو شعرا میں وہ میر اور ناسخ سے متاثر ہوئے ۔ آخر آخر میں باوجود اس قدر اظہار نفرت کے ذوق کا رنگ بھی ان کے کلام میں جھلکتا ہے ۔ میر کا اثر غالب پر بہت اچھا پڑا ۔ ان کی سادگی و پرکاری' میر کے رنگ میں ہے ۔ اس میں وہ سادگی' گھلاوٹ' سوز و گداز اور صداقت شعری موجود ہے جس کی وجہ سے میر کے نشتر مشہور ہیں ۔ میر کا فلسفۂ غم غالب کے فلسفۂ غم سے الگ ہے ۔ میر کے رنج و الم میں اگرچہ ایک مریض کی سی کیفیت ہے مگر اس کی بنیاد صداقت پر ہے ۔ غالب کا رنج و الم ایک قسم کی دماغی عیاشی ہے ۔ میر کی زندگی حسرت و حرماں میں گزری مگر غالب نے اپنی زندگی کے لیے حسرت و حرماں پیدا کیا ہے ۔ نتیجہ ظاہر ہے ۔ ناسخ کا اثر غالب پر منفی (Negative) ہے ۔ ناسخ اور ان کے ہوا خواہوں نے رعایت لفظی اور مثالیہ شاعری کے شوق میں جو بے اعتدالیاں کی تھیں غالب نے ان سے اپنا دامن بچایا ۔ ناسخ کا یہ رنگ شاہ نصیر کے واسطے سے دہلی تک پہنچا ۔ شاہ نصیر دہلی کے ناسخ ہیں ۔ ذوق' مومن' غالب تینوں نے یہیں سے رعایت لفظی کا شوق سیکھا ۔ مومن اور ذوق بہت دن اس کوچے میں رسوا ہوئے مگر غالب آئے بھی تو اس لیے کہ اس کی لغزشوں سے بچے رہیں ۔

ذوق :— پھرتا ہے سیل حوادث سے کہیں مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

مومن :— یاد آیا سوئے دشمن اس کا جانا گرم گرم
پانی پانی ہوگیا میں موج دریا دیکھ کر

غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں رعایت لفظی ضرور ہے مگر غور طلب امر

یہ ہے کہ کچھ اور بھی ہے یا نہیں :

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

اس کے علاوہ ان کی "آ بھی نہ سکوں" "جا بھی نہ سکوں" والی غزل کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اور ذوق میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ درباری دور میں غالب ذوق سے بھی متاثر ہوئے ۔ وہ دیکھتے تھے کہ ذوق کا رنگ مقبول ہے ۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کیوں ۔ انہیں محاورۂ ہندی سے نفرت تھی مگر غیر ارادی طور پر ان کے آخری دور میں رعنائی خیال کی بجائے لطف زبان زیادہ آ گیا ہے ۔ "اڑتی سی اک خبر ہے زبان طیور کی" اس کی ایک مثال ہے اور ایسی مثالیں اور بھی ہیں ۔

یہ ہیں وہ مختلف اثرات جو غالب کے یہاں ملتے ہیں ۔ ان سب کی رنگ آمیزی غالب کے کلام میں اپنی بہار دکھاتی ہے مگر یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ غالب مقلد نہیں ۔ ان کا اپنا رنگ ہے ۔ ہاں اس کی تعمیر جن متفرق عناصر سے ہوئی ہے ان کا ذکر ایک جگہ ضروری تھا ۔ اب ایک اور بات پر غور کرنا ہے ۔

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ غالب کس کے لیے کہتے تھے ۔ جہاں شاعری ذاتی جذبات کا نام ہو وہاں اور کچھ کہاں سے آئے ۔ غالب کا خیال شعر و شاعری کے بارے میں کیا تھا، وہ اپنے خطوط میں جابجا لکھتے ہیں ۔ "شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں" ۔ کبھی بتاتے ہیں کہ اس قوم کے شعرا کے یہاں "چیزے دگر" کا بھی پتہ ملتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شاعری کیوں کرتے تھے ۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جاتا تو شاید وہ اتنے ہی سراسیمہ ہوتے تھے جتنے کہ شہریار یا شہزاد ہوتے اگر ان سے دریافت کیا جاتا کہ "افسانہ" کسے کہتے ہیں ۔ میر نے تو اس سوال کا موقع ہی نہیں آنے دیا ۔ فرماتے ہیں :

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
میر

حسرت و حرماں کا وہ بھاری بوجھ جسے میر اپنی زندگی کہتے تھے کیسے برداشت ہوتا۔ اقبال سے اگر یہی سوال کیا جائے تو وہ کڑک کر یوں جواب دیں گے کہ شاعر دیدہ بینائے قوم ہے اور:

مبتلائے رنج کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ
اقبال

مگر غالب کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مشاہدۂ حق کی گفتگو کو بادہ و ساغر کہے بغیر نہ بنے مگر مشاہدۂ حق کی گفتگو تو صرف اسالیب سے تعلق رکھتی ہے نفس موضوع سے نہیں، اس کا تو اگر کوئی جواب ہے تو یہی ہے کہ:

اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہیے غالب

دوسرے الفاظ میں غالب شعر اس لیے کہتے تھے کہ کہہ سکتے تھے۔ وہ شعر اپنے لیے کہتے تھے اور اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے کہتے تھے۔ اس میں ان کے سخن فہم دوست بھی شامل تھے اور بس۔ والٹر سیوج لینڈر نے ایک جگہ لکھا ہے:

"There is joy in singing
When none hear beside the singer"

براؤننگ اور غالب دونوں کے دل میں ایسا ہی کوئی خیال ضرور تھا۔ جب ہی تو غالب کہتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب نے اپنے کلام سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی۔ بہادرشاہ، نصیرالدین حیدر، واجدعلی شاہ، آصفجاہ، انگریز ریزیڈنٹ، سکتر، ملکہ وکٹوریہ، گورنر جنرل ان سب کے غالب نے قصیدے لکھے اور ان سے امید بھی تھی کہ کچھ نہ کچھ حاصل ہوجائے مگر اس میں بھی انھوں نے کہیں اپنی شاعری کو ذلیل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی توہین کی۔ وہ انگریزوں کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے ان میں بھی وہی کاوش

کرتے تھے جو بہادر شاہ کے قصائد میں اور پھر زور مدح اور ستائش پر نہیں ہوتا تھا بلکہ عرض حال اور تشبیب پر ۔ مرزا تفتہ کو انھوں نے لکھا ہے کہ فارسی شعرا کی سی بھٹئی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔ « قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا » ۔ غالب ایک دنیا دار آدمی تھے ۔ قناعت ان میں نہ تھی ۔ وہ اپنے کمال سے شہرت اور منفعت دونوں حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ کوین پویٹ اور ملک الشعرائی کی خواہش اسی وجہ سے تھی ۔

یہ طے کرنے کے بعد کہ وہ کس کے لیے کہتے تھے ' اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا کہتے تھے ۔ حالی کی رائے ہے کہ شاہراہ عام سے بچنے کی خواہش میں وہ گمراہ نہیں ہوئے ۔ میر کی پیشین گوئی سب کو معلوم ہے ۔ غالب نے کس نئی صنف سخن کی بنیاد نہیں ڈالی' نہ کوئی نیا موضوع اردو شاعری کو بخشا ۔ انھوں نے جو تصرفات کیے وہ معنوی ہیں ۔ جس حالت میں انھوں نے اصناف سخن کو پایا ویسا ہی چھوڑا ۔ ان میں صورت کے لحاظ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ انھوں نے شعر و شاعری کی اندرونی دنیا میں انقلاب کردیا مگر بہ ظاہر اس کی صورت وہی رہی ۔ ان کی مینا وہی ہے مگر شراب دوسری ہے ۔ غزل جو ابتدائے شاعری کی محبوب ترین صنف تھی ان کی بھی منظور نظر رہی ۔ انھوں نے قصیدے بھی لکھے مثنویاں بھی لکھیں' قطعات و رباعیات بھی لکھیں ' تاریخیں بھی نکالیں اور مرثیہ بھی لکھا ۔ شہدائے کربلا کا مرثیہ نہیں بلکہ ذاتی حوادث پر مرثیہ ۔ ایک اپنے کسی محبوب کے مرنے پر' دوسرا عارف کی موت پر ۔ غرض انھوں نے سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر سب میں جدّت پیدا کی ۔ ان سے پہلے شعرا کی ساری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضامین فارسی میں اچھی طرح نظم ہوچکے ہیں وہی زیادہ بلند طور پر نظم کردیے جائیں ۔ انھوں نے یہ بھی کیا مگر اپنی عمارت کی بنیاد دوسری چیزوں پر رکھی ۔ اپنے ذاتی جذبات اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے بیان کیے ۔ ان کے اظہار میں انفرادیت کو ملحوظ رکھا ۔ کائنات کی وسیع فضاؤں میں سے ایک گوشہ انھوں نے اپنے لیے پسند کیا ۔ وہ جین آسٹن یا پروست کی طرح ساری

عمر Miniature Painting کرتے رہے مگر اپنے دائرے میں اس کا جواب نہیں ہوسکتا. یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ اس دائرے میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے وہ گویا ان کے تمام تجربات کا نچوڑ ہے اس میں زندگی کا ہر تار بیدار یا خوابیدہ موجود ہے اور فلسفہ، تصوف، نفسیاتی حقائق، ظرافت سب کا عکس یہاں ملتا ہے۔ ان پر تفصیلی بحث آگے چل کر کی جائے گی۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ وہ کس طرح کہتے تھے اور چونکہ ادب میں سارا کھیل کہنے کے انداز کا ہے اس لیے غالب کے کلام کی تمام خصوصیات اسی ذیل میں دیکھنی ہیں۔ مرزا سے پہلے رجحان یہی تھا کہ جو چیزیں بیان ہوچکی ہیں وہ زیادہ سادگی و صفائی سے بیان کی جائیں۔ محاورہ بندی کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی وہ اسی وجہ سے تھی۔ لیکن غالب کے کلام میں محاورہ نہیں پایا جاتا۔ اب بعض اشخاص اسے شعر کی جان سمجھتے ہیں اور جب تصوف، فلسفہ، سوز و گداز، لطافت، نزاکت اور اس قسم کے دوسرے رسمی عنوانات کے تحت میں کسی پر تنقید ہوتی ہے تو محاورہ بندی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ ذوق کی شاعری، محاورات و امثال سے بھری ہے مگر ذوق کے اچھے شعر اپنے محاوروں کی وجہ سے مشہور نہیں ہیں۔ داغ کی وہ شاعری جو زندہ رکھنے والی ہے اس زمانہ سے پہلے کی ہے جب انہیں، ہر محاورہ کو نظم کردینے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ محاوروں کی وجہ سے شعر بلند نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اس میں کوئی صداقت شعری ہے تو محاورہ اسے چمکا دیتا ہے۔ دراصل محاورہ بندی شعرا کے لیے اتنی مفید نہیں جتنی تشبیہات و استعارات کی فراوانی۔ تشبیہات و استعارات اسی لیے شعر میں استعمال ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے معنی آفرینی، حسن آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہوجاتا ہے۔ نئی زبان استعارات سے بنتی ہے۔ کم از کم اس کے سانچے ضرور اس سے تیار ہوتے ہیں۔ خیال کو نئی نئی راہیں ملتی ہیں، ذہنی فضا میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبان آگے قدم بڑھاتی ہے۔ عام طور پر تمام شعرا دو گروہوں میں منقسم ہوجاتے ہیں۔ ایک وہ جو زبان کو محفوظ کرنے والے ہیں۔ دوسرے وہ جو زبان کو آگے بڑھانے والے ہیں۔ یہاں زبان سے عوام کی بولی مراد

نہیں، بلکہ وہ زبان جو ادیب اور شاعر اپنے اظہار خیال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دونوں کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ورنہ ریختی گو شعرا کو کوئی ٹکے سیر بھی نہ پوچھتا۔ [میرے خیال میں زبان کو آگے بڑھانے والوں کی اہمیت زیادہ ہے۔ غالب اسی گروہ کے سرخیل ہیں۔ انھوں نے صنائع بدائع استعمال نہیں کیے بلکہ اظہار خیال کے لیے نئے نئے اسلوب نکالے۔]

«غالب کے قصر شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے»۔ اس جدت طرازی میں جدت تخئیل، جدت طرز ادا، جدت استعارات، جدت تشبیہات، جدت محاکات، جدت الفاظ سب آجاتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ نئے خیالات کم ہوتے ہیں، یا تو پچھلے خیالات میں اضافہ کرکے داد ایجاد دی جاتی ہے، یا خیال کے ایک پہلو کو بدل کر دوسرا پیش کیا جاتا ہے یا دو مختلف خیالات کی ترتیب و امتزاج سے ایک نیا پیکر خیالی پیدا کیا جاتا ہے/ غالب نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس کے علاوہ اکثر پامال خیال کو اپنی جگہ رکھ کر طرز ادا سے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے/ جدت ادا بھی اظہار خیال کی ترتیب یا بیان کا پیرایہ بدل دینے سے ہوتی ہے اور کبھی نئی تشبیہات و استعارات سے صہبائے کہن کو نئے شیشوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ بہت سی مثالوں کی ضرورت نہیں اس لیے کہ حالی، بجنوری اور دوسرے ناقدین نے اس پہلو پر کافی زور دیا ہے، چند پر اکتفا کی جاتی ہے:—

جدت تخئیل:—

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز — دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے واں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے یہاں — مہر گردوں ہے چراغ رہگزار بادباں
چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

جدت ادا:—

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب
بوئےگل، نالۂدل، دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار
آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں
دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

جدت تخئیل اور جدت ادا کے علاوہ غالب کی ترکیبوں اور تشبیہوں کی جدت بھی اہم ہے - اکرام کا خیال ہے کہ "مرزا تشبیہات و استعارات کے بادشاہ ہیں - ساری دنیا کی شاعری میں ان کی مثال ملنی مشکل ہے"- لطیف جیسا معترض بھی یہ تسلیم کرتا ہے: "بہ حیثیت ایک لفظی صنعتگر کے غالب تمام اردو شعرا میں ایک بلند مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے" - غالب کی تشبیہات و استعارات میں تشبیہات و استعارات کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں - معنی آفرینی، حسن آفرینی اور اختصار تینوں کی جھلک یہاں ملتی ہے - ان کی ترکیبیں بعض وقت ایک ایسے وسیع خیال کا چند لفظوں میں احاطہ کرلیتی ہیں جو بیان کیا جائے تو کئی سطروں میں ادا نہ ہو - حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ایک نئی زبان ایجاد کی، خیالات کے نئے سانچے بنائے اور نئی روشوں کی بنیاد ڈالی - تشبیہات و استعارات کی خاطر کہیں غالب نے شعر کی روح کا خون نہیں کیا - ہمیشہ اس سے خلاقی و حسن آفرینی میں مدد لی اور یہی مرزا کی مناسبت طبعی کی دلیل ہے - ان کی ترکیبیں کہیں کہیں ظرافت لیے ہوئے ہیں - ابتدائی دور میں یہ بیدل کے اثر سے استعمال ہوئی ہیں - بیضۂ طاؤس، بال طپیدن، کاغذ آتش زدہ، دام خیال، غبار شہر، یک الف بیش، یک الف کم کے علاوہ بجنوری نے ایک طویل فہرست دی ہے جن میں سے چند ملاحظہ ہوں - دام شنیدن، آتش خاموش، موج نگاہ، خودداری ساحل، دریائے بیتابی، وادی خیال، جنت خیال، فردوس گوش - تشبیہات کی بھی بجنوری نے ایک طویل فہرست دی ہے - ان میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں - چنانچہ بہار کو حنائے پائے خزاں سے، تسبیح کو دل صد عشاق سے، جوہر آئینہ کو طوطی بسمل سے، دام موج کو حلقہ صد کام نہنگ سے، تار اشک کو رشتۂ چشم سوزن سے، مماثل بیان

کرکے غالب نے الفاظ کو معانی کا پورا پورا بوجھ اٹھانے پر مجبور کردیا ہے۔ «آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے» ۔ ان کی لفظ تراشی، ان کی تشبیہات، سب ان کی قادرالکلامی کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ الفاظ سے اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح کوئی ماہر فن اپنے مسالے سے۔

غالب کی اس خصوصیت کی طرف تو توجہ بھی کی گئی ہے۔ لیکن جس چیز کی طرف کم توجہ ہوئی ہے وہ غالب کے مسلسل اشعار ہیں۔ غزل کے خلاف یہ اعتراض ظاہر ہے کہ اس میں ایک شعر کو دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور جو تصویر سامنے آتی ہے وہ منتشر، پریشان اور بےربط جذبات کی تصویر ہے۔ اس اعتراض میں بہت کچھ صداقت ہے چنانچہ اسی دور میں بعض شعرا نے کوشش کرکے مسلسل غزلیں لکھی ہیں جن میں «جوش» کا نام قابل ذکر ہے۔ رسالہ کلیم میں اردو غزل گوئی پر بہت سے اعتراضات کیے گئے تھے مگر ان میں اس بات کو فراموش کردیا گیا تھا کہ اردو کے تمام ممتاز شعرا اور خصوصاً غالب کے یہاں مسلسل اور مربوط تصویریں اکثر ملتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں اکثر قطعات موجود ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی غزلیں ایک مضمون کی ہیں۔ بعض کے اشعار میں کوئی نہ کوئی معنوی مناسبت پائی جاتی ہے اور بعض میں اچھے خاصے قطعات نظم ہوئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شب ہجوم سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا ۔۔۔ شعلۂ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا ۔۔۔ تھا پسند بزم وصل غیر بے تاب تھا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب ۔۔۔ دے بط مے کو دل ودست شنا موج شراب

غیر یوں کرتا ہے مری پرسش اس کے ہجر میں ۔۔۔ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوار دوست

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۔۔۔ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ۔۔۔ تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۔۔۔ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

ہرچند جاں گدازی تیر و عتاب ہے ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

درد سے میرے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جویائے زخم کاری ہے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس کے علاوہ ان غزلوں میں چاہے ردیف کی مناسبت سے ہی کیوں نہ ہو ایک معنوی تعلق ملتا ہے:

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی قابو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ان اشعار سے اگر ہم چاہیں تو غالب کے عشق و محبت کی ایک مسلسل داستان مرتب کرسکتے ہیں۔ ان میں عشق کے ابتدائی مراحل کا بھی ذکر ہے اور اس کی بازگشت کا بھی۔ شب فراق کی کیفیت بھی ہے اور وصل کی یاد بھی اور حسن و عشق دونوں کا مرثیہ بھی ہے۔ مگر اس تصویر خیالی کی تمام جزئیات بیان کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا غالب کے مختلف اشعار سے فلسفہ، تصوف اور ارتقا کا ایک مکمل نظریہ مرتب کرنا۔ بہر حال مسلسل اشعار کی ایک اور خصوصیت ہے جو کلام میں عام طور پر ملتی ہے۔ یہ جوش بیان ہے جن کی وجہ سے صاحب شعرالہند غالب کو حافظ کے ہم‌پایہ قرار دیتے ہیں۔ ایک مضمون بیان کرنے میں تو یہ جوش قدرتی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ بعض جگہ مختلف اشعار کے باوجود ان کی پوری پوری غزلوں میں بیان کی وجہ سے شعر اعجاز کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق — تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا — موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا میری گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے‌آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
ذرا کر زور سینے پر کہ تیر ہر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ
میرے دریا کی بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دور ساغر کی

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

یہ مثالیں محض یادداشت سے لی گئی ہیں ورنہ ایسے اشعار کی تعداد بہت ہے جہاں شاعر بہت جوش سے اظہار خیال کرتا ہے - اس کے علاوہ جہاں بندش خاص طور پر چست ہوگئی ہے اور دونوں مصرعوں میں ایک توازن پایا جاتا ہے وہاں شعر موسیقی کے لحاظ سے بھی بلند ہوجاتا ہے :-

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی قابو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لاف تمکیں فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم دُرد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

غالب کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے جو اگرچہ اچھے شعرا کے یہاں عموماً ہونی چاہیے لیکن جس کثرت سے غالب کے یہاں ملتی ہے دوسری جگہ نہیں، یہ ہے غالب کی بلاغت۔ بلاغت محض ایجاز و اختصار یا محذوفات کا نام نہیں بلکہ یہ دریا کو کوزے میں بند کردینے کا دوسرا نام ہے۔ غالب اپنے دل کے اندر ایک حشر جذبات چھپائے ہوئے تھے، خیالات کا ہجوم تھا اور الفاظ خیالات کے لیے رہنمائی کا کام دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دو مصرعوں کی چھوٹی سی دنیا میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ کہیں تو تشبیہات و استعارات سے اس بلاغت کے لطف کو دوبالا کیا ہے اور کہیں سیدھے سادے الفاظ میں وسیع سے وسیع مضامین کا احاطہ کرلیا ہے:-

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

غالب تیرا احوال سنا دیں گے ہم اس کو
وہ سن کے بلا لے یہ اجارا نہیں کرتے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لیے

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس قسم کے اشعار میں خوبی یہ ہے کہ جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ تخیل کے لیے جگہ چھوڑی ہے۔ یہ اور چیز ہے اور وہ محذوفات دوسرے ہیں جو اس قسم کے اشعار میں پائے جاتے ہیں:-

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مومن کے محذوفات بھی باوجود دل کش ہونے کے اسی قسم کے ہیں :-

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

عدو اس اوج پرشاکی ہے شاید غصہ آجائے ملادے خاک میں یہ تو بھی شکر امتحاں کیجے

غالب کے تصوف اور فلسفہ پر بہت زور دیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس دور میں ان کی مقبولیت کا باعث یہی ہے۔ یہ خیال بالکل صحیح نہیں۔ غالب کی مقبولیت کا باعث ان کا تکلف نہیں بلکہ اس کے نفسیاتی حقایق ہیں۔ وہ نہ فلسفی تھے نہ صوفی۔ ان کی طبیعت فلسفیانہ مضامین کی طرف ایک خاص وجہ سے مایل تھی اور تصوف سے دلچسپی بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ ان کا سارا فلسفہ اور تصوف ان کے فکر روشن کی کرشمہ سازی کا نام ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ان کے کلام سے فلسفہ اور تصوف کے جو مسلسل مضامین اخذ کیے جاتے ہیں وہ وہاں نہیں۔ دیکھنے والے اپنا عکس ان میں دیکھتے ہیں۔ شاعر کی تخلیقی قوتیں پڑھنے والوں کی تخلیقی قوتوں کو حرکت میں لاتی ہیں اور یہ پڑھنے والے اپنے رجحانات کے مطابق اس میں کوئی حسین خیال، کوئی اخلاقی نظریہ کوئی فلسفیانہ رمز پاتے ہیں۔ شعر تو دیا سلائی ہے جس سے پڑھنے والوں کی آتش بازی چھوٹتی ہے --- یہاں ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا --- غالب نے مادّہ، ہیولیٰ، آفرینش، ارتقا کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ ان کا اپنا نظریہ نہیں۔ انھوں نے مختلف خیالات و نظریات کو شعر کے پردے میں بیان کیا ہے۔ ان میں ایک ربط دیکھنا لاحاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی فلسفۂ زندگی بھی نہ تھا جسے وہ اپنی غزلوں میں پیش کرنا چاہتے ہوں۔ وہ نہ قنوطی تھے نہ رجائی نہ پیغامبر تھے نہ قوم پرست۔ ان کے کلام میں رنج و الم کی جو فراوانی ملتی ہے وہ کہیں تو ان کی ذاتی مایوسیوں کا پرتو ہے اور کہیں محض ایک آلۂ خیال (Fad)۔ ان کے خاص خاص رجحانات ان کے کلام سے نہیں، ان کے خطوط سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مضامین کی تکرار سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ ان کے مستقل تاثرات ہیں لیکن ان کی بھول بھلیاں میں ایک

واضح نقطۂ نظر کی کارفرمائی نہیں ملتی ۔ ان کی فطرت رجائی تھی اور ان کا ماحول قنوطی، ذہنی زندگی میں کئی تلخ حقایق سے دوچار ہونا پڑا تھا ۔ ان کے کلام میں اس کی کشمکش ضرور ملتی ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔

غالب صوفی نہ تھے ۔ انھیں تصوف کے اس حصہ سے ضرور دلچسپی تھی جہاں مومنین مختلف ملتوں کو مٹا کر ایمان کامل کی بنیاد ڈالتے ہیں، لیکن یہاں تک وہ اپنی آزاد منشی کی وجہ سے پہنچے تھے ۔ صوفیوں کے راستے نہیں ۔ وہ جس وجہ سے فرہاد کی تنگ ظرفی پر طنز کرتے تھے اسی وجہ سے بہشت پر استہزا کرتے، یہ سب ان کی بڑھی ہوئی خودی یا انانیت کا نتیجہ تھا اور اس میں سب سے الگ اپنا راستہ بنانے کی خواہش بھی شامل تھی ۔ مگر غالب کی یہ خوبی ہے کہ وہ ایک جام جہاں‌نما ہے اور اس کے کلام کی ایک سے زیادہ تفسیریں ہوسکتی ہیں ۔

یہاں جس خصوصیت پر زیادہ زور دینا ضروری ہے وہ غالب کی نفسیاتی گہرائی اور اس کی ظرافت طبعی ہے ۔ ان دونوں میں ایک اندرونی رشتہ بھی ہے ۔ اکرام نے ٹھیک لکھا ہے کہ اسی نفسیاتی ژرف بینی کی وجہ سے غالب غالب ہوئے ۔ ابتدا میں بیدل کی تقلید نے اس جوہر کو ابھرنے نہ دیا مگر اس رنگ سے بیزاری کی اصل وجہ یہ تھی کہ غالب اب فطرت انسانی کے نباض ہوگئے تھے اور انھیں بیدل کی خیالی اور مصنوعی دنیا سے دلچسپی کم ہوگئی تھی ۔ بیدل کی خلاقی سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی ۔ اس دور میں نفسیاتی حقایق سے خاص طور پر دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے ۔ یہی اس دور کا کارنامہ ہے ۔ اس لیے غالب کی نفسیاتی گہرائی خاص طور سے مقبول ہے ۔ غالب نے مناظر قدرت کی تصویریں نہیں کھینچیں ۔ انھوں نے صبح، شام، رات، گرمی، جاڑا، برسات، ریچھ، بندر، ہولی، دوالی کی کیفیات کو نظم نہیں کیا ۔ انھوں نے عاشق کے دل کی حالت اور معشوق کی اندرونی کیفیت نظم کی ۔ انھوں نے قلب کے اندر گھس کر دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا اور جذبات انسانی کی پردہ‌دری کی ۔ وہ خارجی حالات کے مصور غم نہیں، داخلی کیفیات کے مصور ہیں اور اس کی انھوں نے زندۂ جاوید مثالیں پیش کی ہیں :-

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا　　دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی　　دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے　　زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفائے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا　　غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

مت پوچھ کہ کیا حال ہے تیرا مرے پیچھے　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر　　دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچیے

اشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

اس نفسیاتی گہرائی کی وجہ سے ان میں وہ لطافت یا شگفتگی طبعی پائی جاتی ہے جو ظرافت کی اساس و بنیاد ہے۔ حالی غالب کو مرد ظریف کہتے ہیں۔ بجنوری

کے خیال میں غالب کے لب ہنسی سے نا آشنا لیکن ہنسی صرف « برنجی قہقہہ » کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی - یہ وہ چیز ہے جس سے سارا کلام دوآتشہ بن جاتا ہے بجنوری کہتے ہیں کہ «جو شخص زندگی کو دور سے دیکھتا ہے اور خود بے پروا رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے وہ اس میں شریک ہوتا ہے ' وہ نہیں ہنستا - غالب کی طبیعت میں رحم ہے ' وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں» - اس خوش عقیدگی کا کوئی علاج نہیں - ہنسنے کے لیے بے پروائی ضروری نہیں ' صرف ذرا بلندی ضروری ہے - اور یہ وہ بھی حاصل کرسکتا ہے جو زندگی میں شریک ہو ' غالب کے یہاں یہی بلندی (Aloofness) ملتی ہے - بار الم اور رنگ نشاط اٹھانے کے بعد «اصغر» بےحسی کا شکار ہوئے ' مگر غالب نے یہ سیکھا کہ سختی و سستی ' رنج و الم سب کو ہموار کریں - انھوں نے اپنے محبوب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا مقابلہ اگر عارف کے مرثیے سے کیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ غالب نے شعور فنی کے ساتھ نفسیاتی ژرف بینی اور اس کی وجہ سے ایک خاص قسم کی ظرافت میں کتنی ترقی کی تھی - وہ قوی احساسات و جذبات کے مالک تھے ' لیکن ان کی فہم و دانش اس سے بڑی قوی‌تر تھی - وہ جانتے تھے کہ :

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز تاب لائے ہی بنے گی غالب

وہ جذبات کی رو میں بہ کر اپنا دماغی توازن کھو نہیں بیٹھتے تھے - جوں جوں ذہنی زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی ہوتی جاتی تھی' جن واقعات پر وہ آنسو بہاتے تھے اب صرف مسکرا دیتے ' ان کی شوخی کی اصلی بنا ان کی جدت طرازی اور بات میں بات پیدا کرنے کی عادت تھی اور وہ اپنے متعلق بھی اشارے کیے بغیر نہ رہتے تھے :

سائل ہوئے تو عاشق اهل کرم ہوئے چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل‌لگی

تقریب کچھ تو بحر ملاقات چاہیے سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات

حالی اور بجنوری نے ان کے پہلودار اشعار پر بہت زور دیا ہے - حالی نے غالب کی چار خصوصیات بتائی ہیں - جدت مضامین و طرفگی خیالات، تشبیہات و استعارات، ظرافت اور پہلودار اشعار - پہلودار اشعار کی انھوں نے مثالیں بھی دی ہیں - بجنوری نے بھی اس خصوصیت کی بڑی تعریف کی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ "جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں، ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں" - لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب غالب کے جام جہاں نما ہونے کی وجہ سے ہے - خیال اکثر بلند اور لطیف ہوتا ہے اور الفاظ اس کا صرف ایک پہلو ہی ظاہر کرتے ہیں - دوسرے پہلوؤں کی طرف صرف ذہن ہی منتقل ہوسکتا ہے - ہاں غالب کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جو انھیں میر کے برابر لا کھڑا کرتی ہے، وہ ان کی سادگی و پُرکاری ہے - میر کا عام رنگ یہی ہے اور اس کی وجہ سے ان کی چھوٹی بحروں میں اشعار نشتر بن کر دل میں کھٹکتے ہیں - غالب کے آخری دور میں بہت سی غزلیں ایسی ہی ہیں - چند مثالیں میر و غالب کی اس مشترک خصوصیت کی ملاحظہ ہوں جنھیں دیکھ کر بجنوری کو ابن رشیق کا مشہور قول یاد آگیا تھا -

میر:— سارے عالم کو میں دکھا لایا قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا سب پہ جس بار نے گرانی کی

وصل و ہجراں کے جو دو منزل ہیں راہ عشق میں دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

غالب کی غزلوں کے مطلع ملاحظہ ہوں :—

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غرض دیوان غالب کے مطالعہ سے ایک زبردست شخصیت، اس کے تصورات، اس کی ذہنیت، اس کا رد عمل سب سامنے آجاتے ہیں ۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی اتنی قدر کیوں نہ ہوئی ۔ غالب نے اپنی ناقدری کا رونا بہت کچھ رویا ہے اور اس کا انھیں اتنا ہی صدمہ تھا جتنا مالی پریشانیوں یا پنشن نہ ملنے کا ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ " میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنیٰ کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجہ بلندی بخشی ہے ۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا " ۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ میرے دعویٰ پر یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں ۔ انھیں اگر کوئی قدردان مل جاتا تھا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے ۔ ان کے زمانے میں ان کی ویسی ہی قدر ہوئی جیسی شیکسپیر کی اس کے زمانے میں ہوئی ۔ یہ حشر ان تمام اشخاص کا ہوتا ہے جو اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتے ہیں ۔ غالب کے دور کی جو روح تھی وہ عام طور پر وہی تھی جس سے وہ بچنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اس میں یا تو شاہ نصیر کی سنگلاخ زمینیں تھیں یا ذوق و ظفر کی سادہ محاورہ بندی یا پھر مومن کی معاملہ بندی اور ناہمواری ۔ اس کے لیے غالب کی فطانت کو سمجھنا آسان کام نہ تھا ۔ تاہم غالب کے معاصرین نے غالب کی قدر اپنی بساط کے موافق کی ۔ شیفتہ کی رائے غالب کے متعلق دیکھنے کے قابل ہے ۔ خود ظفر نے جو ذوق کے مقلّد تھے ان کی قدر و منزلت کی اور استاد کے مرنے کے بعد انھیں اپنا استاد مقرر کیا ۔ اپنے زمانے میں بھی وہ ایک غیر معمولی شاعر سمجھے جاتے تھے ۔ مگر اس سے زیادہ ان کے دور سے امید رکھنی فضول ہے ۔ ان کی پوری قدر " یادگار غالب " کے بعد شروع ہوئی ۔

غالب کا رنگ ایک کامیاب رنگ ہے ۔ اس کی تقلید ان کے زمانے میں کسی نے نہ کی بلکہ ان کے مرنے کے بعد رامپور اور دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں اور

ہی رنگ رہا، مگر 'یادگار' کی اشاعت کے بعد سے غالب کا رنگ مقبول ہونا شروع ہوا۔ اقبال اردو کے تمام شعرا سے زیادہ غالب کے ممنون ہیں۔ دونوں میں وہی لفظی صنعت گری، رفعت تخیل، بلاغت، فلسفہ دانی، رواجی مذہب کے معاملہ میں آزاد خیالی ملتی ہے۔ اقبال اپنے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ غالب سے متاثر ہوئے ہیں۔ فانی غالب کے شاگرد ہیں اور غالب کی غزلوں پر بہت سی غزلیں انھوں نے لکھی ہیں۔ انھوں نے غالب کی طرح سوچنا چاہا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مگر ان کے یہاں غالب کی روح نہیں، اس سے اقبال زیادہ مستفید ہوئے ہیں۔ اصغر میں مومن و غالب دونوں کے رنگ کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی عارفانہ نگاہ اکثر غالب کے رموز کو برافگندہ نقاب دیکھتی ہے اور انھیں موضوعات پر اظہار خیال کرتی ہے۔ اصغر کی بعض شگفتہ ترکیبیں غالب کی مرہون منت ہیں۔ 'یادگار' نے غالب کو ملک سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد بجنوری نے غالب کے محاسن کو اجاگر کیا اور اپنے پر زور قلم سے غالب کی خامیوں کو بھی خوبی ثابت کیا۔ ان کی تنقید میں وہی رنگ ہے جو کولرج کی شیکسپیر پر تنقیدات میں ہے۔ دونوں کی تحسین تخلیق کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ دونوں اپنے ہیرو کی روح تک پہنچ گئے ہیں اور اکثر اس کے ساتھ پرواز کرتے ہیں مگر دونوں عقیدت کے جوش میں قوت فیصلہ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ بجنوری کی تنقید نے غالب کو تمام ملک سے روشناس کرایا۔ ان کے دیوان کی شرحیں شایع ہونے لگیں۔ نفیس ایڈیشن نکلے اور غالب کی وہ مشہور پیشین گوئی پوری ہوئی:

کوکبم را در عدم اوج قبولی بوده است   شهرت شعرم به گیتی بعد من خواهد شدن

اسی مقبولیت نے بڑھتے بڑھتے لکھنوی شعرا کے دلوں میں اثر کیا۔ جہاں غالب کے خیال کو میر کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی۔ عزیز، ثاقب، صفی ان سب کے یہاں غالب کا اثر پایا جاتا ہے۔ ان سب میں عزیز اس لحاظ سے سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

غرض کہ غالب کی مقبولیت ایک طرف تو ان کے رنگ کی تقلید میں ظاہر

ہوئی اور دوسری طرف ان کے حالات، ان کے کلام اور سوانح سے دلچسپی میں۔ یہ دونوں چیزیں اس وقت اپنے شباب پر ہیں۔ چنانچہ حال میں مہر، اکرام اور عرشی تینوں کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں وہ اسی مقبولیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے حالات، نقطۂ نظر، رد عمل وغیرہ سے دلچسپی کی وجہ سے ان کے خطوط اور فارسی کلام کو بھی دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں سے اردو خطوط کی خود بھی الگ اہمیت ہے اور لطیف جیسا ناقد بھی انھیں اس بنا پر اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کرتا ہے۔ مگر ان کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھی ان کی چھان بین کی گئی۔

ان کی اس مقبولیت کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بجنوری ان کے تنوع کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کونسا نغمہ ہے جو ان کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں۔ اکرام نے ان کی انسانیت پر زور دیا ہے۔ حالی ان کی ظرافت کے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں۔ فلسفی کو غالب کے یہاں کانٹ، ہیگل اور برگساں کی تعلیمات کا عکس ملتا ہے۔ صوفی ان میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ مشکل پسند طبائع ان کی دقیق اور پیچیدہ ترکیبوں پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ خود غالب سے متعلق نہیں، غالب کے دانا دوست شیفتہ، فضل الحق اور مرزا خانی کی وجہ سے ہے۔ یہ وہ حضرات تھے جنھوں نے مرزا کے کلام کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی اور مرزا کو انتخاب پر راضی کیا۔ نسخۂ حمیدیہ اب چھپ چکا ہے، اس کے علاوہ غیر مطبوعہ دیوان غالب کے اور اجزا بھی سامنے آگئے ہیں، ان میں بعض بہت اچھے اشعار موجود ہیں، مگر بہ حیثیت مجموعی غالب کا منتخب کلام ان کے طرز کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔" لوح سے تمت تک سو صفحے ہیں مگر ان میں کیا نہیں"۔ حالی کی نظر بھی شاید اسی طرف گئی تھی، 'یادگار' میں لکھتے ہیں کہ " مرزا کی موجودہ غزلیات گو بہ مقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل کیوں نہ ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے انتخابی اشعار سے کم نہیں، اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ گو کے کلام میں نکلنے کی امید نہیں ہے۔

چنانچه مرزا کی مقبولیت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یه ہے که ان کے کلام کا ان کی زندگی میں اور ان کے ایما سے انتخاب ہوگیا تھا، 'یادگار' نے انھیں عوام سے روشناس کرایا، بجنوری نے ان کی شہرت کو چار چاند لگائے، چنانچه بعد کے ناقدین اور تذکرہ نویس انھیں حضرات کے خوشه چیں ہیں۔

اب سوال یه رہ جاتا ہے که غالب کا مستقبل کیا ہے؟ اس کا جواب دینا آسان نہیں اس لیے که اس میں کلام غالب کی اچھائی اور برائی کے علاوہ دوسرے عناصر کا بھی لحاظ کرنا ہے۔ مثلاً فارسی زبان سے اجنبیت روز به روز بڑھتی جاتی ہے اور غالب کے اشعار کا پورا پورا مزا بغیر فارسی سے واقفیت کے حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے قیاس یه چاہتا ہے که آنے والی نسلیں ادب میں محض جمالیاتی نقطۂ نظر نه دیکھیں گی بلکه اپنے درد کا علاج بھی اس سے چاہیں گی، ان حالات کی روشنی میں غالب کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے که غالب بھی ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کرکے الماری کے سب سے اونچے تختہ پر جگه پائے مگر اس کے پڑھنے اور اس سے کیف حاصل کرنے کی نوبت نه آئے۔ غالب کے نقادوں نے اس اجنبیت کو بہت کچھ دور کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم ہمارا خیال یه ہے که شاعر غالب کے پاس اس حالت کے لیے کوئی علاج نہیں ہے ہاں غالب کے خطوط کی اہمیت شاید پہلے سے بھی زیادہ ہو۔ ایک زمانه وہ تھا جب غالب کی شاعری کی مقبولیت اور شہرت کی وجه سے ان کے خطوط بھی مقبول تھے، زمانه اپنا مذاق جلد جلد بدل دیتا ہے۔ ناممکن نہیں ہے اگر غالب کے خطوط آیندہ اور بھی مقبول ہوں اور ان کی مقبولیت کی وجه سے ان کا کلام بھی بے اعتنائی سے بچ جائے۔ یه بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے که اردو ادب میں ایک ایسا جامع صفات و حیثیات شخص موجود ہے جس کی کوئی نه کوئی چیز کسی نه کسی وجه سے اردو ادب میں ہمیشه مقبول رہے گی اور جس کے آئینه میں آنے والی نسلیں کوئی نه کوئی بات اپنی دلچسپی اور دل بستگی کی پا سکیں گی۔ حالی کا قول ہے که «لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع صفات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندستان کی خاک سے نہیں اٹھا»۔

مگر قیاس یہ ہے کہ فیضی اور خسرو دونوں سے زیادہ غالب کی شہرت باقی رہے گی۔ اور ان کی شخصیت، ان کی شاعری، ان کے خطوط، ان کی نثر، ان کی سیرت و عادات، ان سب کے گن گائے جاتے رہیں گے۔ غالب ذوق سے ناحق ناراض تھے۔ وہ بیچارہ تو بہت تھوڑی عمر میں مرگیا۔ شباب کے بدلے اسے موت ہی آئی، اس کا رنگ داغ سے آگے نہ بڑھا۔ غالب کی حیات تو حیات جاوداں ہے۔ وہ اس برادری میں شامل ہیں جن کی عمر پر موت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی ساری زندگی میں ایک ترقی پذیری ملتی ہے وہی ترقی پذیری جو ہمیں اقبال کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے ابتدائی کلام اور ان کے آخر زمانے کے کلام میں صاف فرق ہے۔ یہ ترقی پذیری ہر شاعر کے یہاں نہیں ہوتی۔ بہت سے مرنے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ غالب بوڑھے ہوتے جاتے تھے مگر ان کا کمال جوان ہو رہا تھا۔ اس جوانی کی بہار سے ہم اب تک مستفید ہو رہے ہیں۔

پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم
ساہتہ آچاریہ (استاد ادب)

(از اقبال ورما صاحب سحر ہتگامی)

اردو و ہندی کی جا و بےجا حمایت کرنے والے لوگ خواہ اپنی تحریر کو عربی و فارسی یا سنسکرت کی غیر ضروری ملاوٹ سے کتنا ہی بوجھل اور کٹھن بنا دینا پسند کریں اور اس کے لیے وہ خواہ علمی و ادبی زبان کو عوام کی بول چال سے کتنا ہی مختلف اور جداگانہ بتلائیں، پھر بھی ہر مصنف کی بالکل قدرتی طور پر یہ دلی خواہش ہوا کرتی ہے کہ اس کی ہر بات کو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ اور سمجھ سکیں جس سے جہاں ایک طرف پڑھنے والوں کے خیالات و احساسات میں ترقی ہو وہاں دوسری طرف لکھنے والے کی عزت و شہرت میں بھی معقول اضافہ کی امید ہوسکے۔ اس خواہش کا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو کبھی انکار نہیں ہوسکتا اور ایسی خواہش کی بہ دولت آج وہ تحریک کچھ نہ کچھ زور پکڑ رہی ہے جو اردو اور ہندی کو جتنا بھی ممکن ہو روز مرہ کے درجے پر لاکر ان دونوں زبانوں کو صرف ایک ہندستانی زبان کا روپ دینا چاہتی ہے۔ اس کوشش کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ بتلا دینا ابھی وقت سے پہلے کی بات ہوگی، مگر اس میں شبہہ نہیں کہ جس حد تک بھی کامیابی ہو سکےگی یا کامیابی کے ارادے میں وسعت و مضبوطی آسکےگی اسی حد تک نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے نازک مسئلہ کا بہت کچھ حل ہو سکےگا بلکہ اس سے بھی زیادہ مفید نتیجہ یہ نکلےگا کہ قوم کو بہ‌حیثیت مجموعی ان مدارج کے طے کرنے میں آسانی ہوگی جو اس کی معلومات میں بلندی لاسکیں گے اور اس طرح سمجھ میں ترقی ہونے کے ساتھ ہی اس کی علمی

قابلیت و لیاقت کی سطح برابر اونچی ہوتی اور اوپر اٹھتی ہوئی چلی جائے‌گی ۔ پھر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عوام کی اس واقفیت کی بہ دولت نہ صرف ایک عام ترقی کا نظارہ ہر سمت دکھائی دے‌گا بلکہ یکسانیت و یک‌جہتی کی وہ خوشگوار فضا پیدا ہوگی جو اعلی اور ادنیٰ کے فرق کو ایک حد تک مٹاتی ہوئی قوم کی اس بھاگ دوڑ میں کچھ نہ کچھ رکاوٹ ضرور ڈال دے‌گی جو آج اس کو باہمی ناچاقیوں کی طرف سرپٹ لیے جارہی ہے ۔

یہ ساری باتیں ایسی اہم ہیں جو کسی طرح نظرانداز نہیں کی جاسکتیں ۔ شکر ہے کہ آج ایسا ہو بھی نہیں رہا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ نہ سردست ہندو اپنی ہندی کو ہندستانی پر قربان کرنے کو تیار ہیں اور نہ مسلمان اپنی اردو کو ۔ نام کی مخالفت زبان سے کم نہیں ہے ، بالخصوص ہندؤں کو یہ اعتراض ہے کہ جب ہندی نام خود مسلمانوں کا دیا ہوا ہے تو اب ہندی کو ہندستانی کیوں کہا جائے ؟ بات سچ ہے ، لیکن سوچنا یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ملکی زبان کو ہندی نام دے کر اسی کی مدد سے اردو زبان تیار کی وہی اب اگر اس کو اردو الفاظ کے بڑھے ہوئے چلن کے اعتبار یا کسی اور خیال سے ہندستانی کہنا پسند کریں تو ہرج ہی کیا ہے ؟ آخر ہمارے ملک کا نام ہند بھی ہے اور ہندستان بھی ، پھر ہماری ملکی زبان بالکل یکساں طور پر ہندی بھی کہی جاسکتی ہے اور ہندستانی بھی ۔ مگر یہ نام و زبان کے جھگڑے کل کے کل انھیں تک محدود ہیں جو اہل زبان ہیں یا ویسا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ عوام سے تو کسی پوچھ گچھ کی ذرا بھی ضرورت نہیں اور نہ یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا بولتے اور کیا چاہتے ہیں اور کس میں ان کا بھلا ہے ۔ ان سے تو کسی قسم کے لگاؤ کا خیال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انھیں دین و ایمان کے نام پر اکسا کر اپنا کوئی نجی مطلب پورا کرنا ہوتا ہے اور اس طرح اپنے کو دھوکا دیتے ہوئے انھیں بھی دھوکے میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ بہرحال اسی بھلاوے میں پڑکر آج اس زبان کی مخالفت کی جارہی ہے جو ہماری کتنی ہی بڑی بڑی گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ مگر اس اَمر سے کسی قدر تسکین ہوتی ہے کہ اس مخالفت کے باوجود آج بھی زبان کے کتنے ہی

ہندو مسلمان سدھارک لارڈ مارلے کے اس قول کے مطابق کہ "کامیابی کی تاریخ ان لوگوں کی تاریخ ہے جو کم تعداد والے ہیں" اپنی 'رام دُھن' میں مست ہوکر اپنا راگ برابر آلاپے جارہے ہیں۔ ایسے ہی مستوں یا سدھارکوں میں ہمارے شرماجی بھی تھے جن کی پاک و مبارک یادگار میں یہ مضمون لکھا جارہا ہے۔

شرماجی نقاد تھے، اڈیٹر تھے اور مضمون‌نگار بھی۔ ان کی شہرت کی شروعات پہلی بات سے ہوئی، پھر دوسری نے اسے کچھ دور آگے بڑھایا۔ مگر میرے خیال سے مرحوم میں جو سب سے بڑا وصف تھا وہ ان کی زبان کی بے حد چستی، سادگی اور صفائی تھی اور اسی ایک خاص وصف کی بدولت ان کا نام اردو اور ہندی کی ادبی دنیا میں عرصہ تک قائم رہےگا۔ وہ لکھتے ہندی تھے مگر ان کی تحریر میں اردو کے الفاظ اور اشعار اس کثرت سے ہوتے تھے کہ واقعی روزمرہ کا آئینہ سا سامنے آجاتا تھا جس میں ہندستانی طرز تحریر کا عکس نظر آتا تھا۔ انھیں اپنی سیکھی ہوئی زبانوں پر پورا قابو تھا پس ان کی عبارت میں کوئی لفظ بےموقع یا بےربط نہ معلوم ہوتا تھا۔ یہی حال ان کی تقریر کا بھی تھا۔ ہندی کے ساتھ اردو برابر ملی جلی ہوتی تھی۔ مشکل ہندی کا مضحکہ اڑاتے تھے اور اردو کو ہندی ہی کا ایک بدلا ہوا روپ مانتے تھے۔ اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ ایک کامیاب ہندی نویس بننے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ لکھنے والا اردو زبان سے بھی واقف ہو، خواہ وہ نظم لکھتا ہو یا نثر۔ اگر لارڈ مارلے کی یہ بات سچ مان لی جائے کہ "کوئی شخص اپنی عام قابلیت کے تناسب سے شہرت نہیں پاتا بلکہ اس لیے کہ وہ کوئی ایسا کام کرتا یا ایسی بات کہتا ہے جس کا کرنا یا کہنا وقتی لحاظ سے ضروری تھا" تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مرحوم اس عزت و ناموری کے پورے حقدار تھے جو انھوں نے ایک وقتی زبان کی تحریک و اشاعت کے سلسلے میں حاصل کی۔

اگرچہ جب ۱۹۲۸ء میں مظفرپور میں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا تھا تو پنڈت جی نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ:— "ہندو مسلمانوں کو ہندی اور اردو کے لیے لڑتا دیکھ کر دہلی کی ایکتا پرشد (اتحادی انجمن) میں

لیڈروں نے یہ فتویٰ دیا ہے۔ . . . کہ نہ ہندی کہو نہ اردو، دونوں کا ایک نام ہو ہندستانی۔ اچھی بات ہے، پر اس سے کیا یہ جھگڑا مٹ جائےگا؟ پنچوں کا کہنا سر ماتھے پر، مگر پرنالہ تو وہیں بہےگا۔ بھولے بھالے ہندو بھائی بھلے ہی مان جائیں پر کیا مسلمان بھائی اسے قبول کریں‌گے؟ جب وہ صدیوں سے چلتے ہوئے اس ہندی نام کی مخالفت کرتے ہیں جسے میر تقی، انشا اور آزاد جیسے ودوانوں نے ٹھیک سمجھ کر استعمال کیا ہے، پھر وہ اردو کی جگہ ہندستانی کو کیسے دیں‌گے؟ آخر ہندی نام بھی تو ہندؤں کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ بھارت کی قومی زبان کا یہ نام تو مسلمانوں نے ہی رکھا تھا . . . . ہندستانی نام تو ہمارے حاکموں کے دماغ کی اپج ہے. . . . اگر یہ نیا نام دو جاتیوں کی ایکتا کا سادھن (ذریعہ) ہوتا تو وہ اسے پسند کرکے اپنی طرف سے کیوں پیش کرتے؟ . . . . سچ ہے:

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھردیں جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھردیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کردیں
(اکبر الہ‌آبادی)

. . . . گورنمنٹ نے اپنی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کا پتہ اسی طرح کئی بار دیا ہے. . . . ہندستانی نام سے ہندی اردو کا فرق دور نہ ہوگا بلکہ ایک تیسری زبان اور پیدا ہوجائےگی جسے سرکاری بولی کہنا درست ہوگا۔ اسٹینڈرڈ ٹایم کی طرح گورنمنٹ اسٹینڈرڈ بھاشا بھی چلانا چاہتی ہے. . . . اگر یہ چال چل گئی تو ہندی اردو ادب کا بالکل خاتمہ ہوجائےگا۔ اردو ہندی دونوں بحق سرکار ضبط ہو جائیں گی. . . . . .'[۱]

پھر بھی اس واقعہ کے تقریباً چار ہی سال بعد انھوں نے ہندستانی اکیڈمی یوپی (الہ‌آباد) کی فرمائش پر « ہندی، اردو اور ہندستانی » نام کی ہندی کتاب لکھی جو ۵، ۶، ۷ مارچ ۱۹۳۲ع کو اکیڈمی مذکور کے سالانہ جلسہ میں تقریر کے طور پر پڑھی گئی تھی اور جس کے لیے انھیں اکیڈمی کی جانب سے ایک ہزار روپیہ بھی

۱ یہ اقتباسات قریب قریب جوں کے توں نقل ہوئے ہیں، کہیں کہیں برائے نام ہی ہندی الفاظ اردو میں بدل دیے گئے ہیں۔ سحر

دیا گیا تھا ۔ کتاب بڑی عجلت میں مگر بڑی تحقیق سے لکھی گئی تھی جو ایک مہینہ کی دن رات کی محنت کے بعد پڑھے جانے کے ایک روز قبل ہی ۴ مارچ ۳۲ع کو ختم ہوئی تھی ۔ کتاب کس پایہ کی ہے ، اس کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ سر عبدالقادر جیسے مستند ادیب نے اس کی بڑی تعریف کی تھی ۔ یہ کتاب مرحوم کی آخری تصنیف ہے جو ھندستانی زبان کی حمایت میں بہت سادہ اور دل‌کش طریقہ پر لکھی گئی ہے ۔ اس کے آخری حصہ میں یہ تحریر ملتی ہے :— " شروع میں ھندی اردو دونوں ایک ہی تھیں ۔ بعد کو جب ویاکرن (قواعد)، پنگل (عروض)، رسم‌الخط اور طرز تحریر کے فرق وغیرہ کے سبب دو مختلف اطراف میں پڑ کر یہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہونے لگیں تو عوام کے سبھتے اور شکشا کے وچار سے ان کا بھید مٹا کر انھیں ایک کرنے کے لیے بھاشا کی ان دونوں شاخوں کا متحدہ نام ھندستانی رکھا گیا........ ھندی والے اردو ادب سے بہت کچھ سیکھ سکتے ھیں ، اسی طرح اردو والے ھندی کے خزانے سے فائدہ اٹھا سکتے ھیں ۔ اگر دونو فریق ایک دوسرے کے قریب پہنچ جائیں تو وہ غلط فہمیاں اپنے آپ ہی دور ھوجائیں جو ایک سے دوسرے کو دور کیے ھوئے ھیں ۔ ایسا ھونا کوئی مشکل بات نہیں ، صرف مضبوط ارادے اور ھمت کی ضرورت ہے " ۱

مرحوم کی اوپر والی دونوں تحریریں ظاھراً ایک دوسرے کی ضد ھیں ۔ وہ اس وقت زندہ نہیں کہ اس اختلاف کی کوئی معقول وجہ دریافت کی جاتی ۔ مگر قیاساً ایسا معلوم ھوتا ہے کہ پہلے ان کو ھندستانی کے نام سے چڑ تھی ، شاید اسی لیے کہ یہ نام ایک انگریز (ڈاکٹر جان گلکرائسٹ) کے دماغ سے نکلا تھا ۔ مگر انھیں جلد ہی اس غلطی کا احساس ھوگیا جو ان کی آخری تصنیف میں دور کردی گئی ۔ وہ بہ‌خوبی سمجھ گئے تھے کہ اردو ھندی کا یہ نام نیا انھیں پسند ھو یا نہ ھو ، پھر بھی وہ اپنی تحریر و تقریر میں اسی کے پیرو تھے اور اسی طرح وہ اپنے علمی پیام کو زیادہ

---

۱ یہ اقتباسات قریب قریب جوں کے توں نقل ھوئے ھیں ۔ کہیں کہیں برائے نام ھی ھندی الفاظ اردو میں بدل دیے گئے ھیں ۔ سحر

سے زیادہ ھندستانیوں کے کانوں میں ڈال کر ان کے دل نشیں کرا سکتے تھے۔ ایسی حالت میں کسی کام کو کرتے ہوئے اسی کے نام سے چڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ کام کی مشق و مہارت بہت پرانی ہوچکی تھی اور نام کا نیا پن اس میں کوئی خلل نہ ڈال سکتا تھا۔ پھر کام کے ساتھ نام کو مان لینے کے سوا اور چارہ ھی کیا تھا؟

مرحوم نے اپنی اسی کتاب میں جہاں ھندی اردو کی ابتدا میں ایک ھی ھونا کہا ھے وھاں ان کے بڑھتے ہوئے موجودہ فرق کو مٹا کر انھیں پھر ایک کرنے کی تدبیر بھی بتائی ھے۔ لکھتے ھیں :— «لفظوں کے استعمال میں جب تک بیچ کے راستہ کا سہارا نہ لیا جائےگا، میانہ روی اور اعتدال کی راہ پر نہ چلا جائےگا، تب تک ھندی اردو کا بھیانک ریت پر بڑھتا ہوا یہ بھید کبھی دور نہ ھوگا۔ الفاظ کا مناسب و موزوں استعمال ھی بھاشا کی کسوٹی ھے۔ اس بارہ میں ڈاکٹر گریرسن صاحب، مہامہوپادھیاے پنڈت گردھر شرما چترویدی، شمس العلما مولانا حالی، مولانا سلیم اور مولانا عبدالحق صاحب نے ھندی اردو والوں کو جو ٹھیک مشورہ دیا ھے وہ بہت ھی واجب اور وزنی ھے» † کہنا نہ ھوگا کہ یہ ان علم و ادب کے بزرگوں کے اسمائے گرامی

---

† مضمون ھذا کی تکمیل اور شرماجی کے مطلب کی تشریح کے لیے جن بڑے بڑے ادبی ماھروں کا حوالہ دیا گیا ھے ان کی رایوں کا درج کردینا بھی ضروری معلوم ھوتا ھے جو مختصراً یوں ھیں :—

ڈاکٹر گریرسن :— «میں زور کے ساتھ یہ صلاح دیتا ھوں کہ ھندی لکھنے والے جہاں تک ممکن ھو ٹھیٹھ لفظوں کا استعمال کریں۔ ادھار لیے ہوئے سنسکرت لفظوں کا جتنا ھی کم استعمال ھو اچھا ھے.... میں ھر شخص کو جو ھندی کی ترقی چاھتا ھے یہ صلاح بھی دوں گا کہ وہ پراکرت کا مطالعہ کرے، کیونکہ وہ ھندی کی ماں ھے۔ اگر آپ ماں کو جانتے ھیں تو بیٹی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ھیں....»

مہامہوپادھیائے پنڈت گردھر شرما چترویدی پرنسپل مہاراجہ کالج جےپور :— ضرورتاً ھندی بھاشا میں سنسکرت لفظوں کا لینا مفید و کارآمد ھے مگر ھندی کو بالکل سنسکرت ھی بنا دینا اچھا نہیں۔ زیادتی ھر جگہ منع ھے.... لکھنے والوں کو سدا درمیانی راستہ پکڑنا چاھیے۔ دوسرے صوبوں میں ھندی پرچار کا جیسے دھیان رکھنا ھے سب درجے کے لوگوں کو ایک بھاشا سمجھانے کا بھی اس سے کم دھیان نہیں رکھنا ھے۔ اس لیے بھاشا ایسی ھونی چاھیے جسے عوام بھی سمجھ سکیں۔ عام بول چال کی بھاشا سے چاھے قدرتاً اس میں فرق ھو مگر عام لوگوں کے سمجھنے کے قابل تو رھے....»

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۶۳

ھیں جن کی قیمتی باتوں کو ماننے اور ان پر چلتے ھوئے اردو اور ھندی کا فرق بہت کچھ مٹایا جاسکتا اور دونوں کو ھندستانی نامی ایک زبان کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ھے۔

اس فرق کو مٹانے کے متعلق مرحوم نے اپنی اسی آخری کتاب میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ھے:— "ھندی اردو کو دو جداگانہ حصوں میں منقسم کردینے کا خاص سبب رسم الخط کا فرق ھے۔۔۔۔یہ بھید دونوں زبانوں اور قوموں میں ایکتا نہیں ھونے دیتا۔ اگر یہ بھید کا بکھیڑا آڑے نہ آتا تو بھاشا میں اور اس کے سبب ھندو مسلمان جاتیوں میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۲

شمس العلما مولانا حالی (مقدمہ میں):— "اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ھی کافی نہیں ھے بلکہ یہ بھی ضرور ھے کہ عربی و فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور ھندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جئے۔ اردو زبان کی بنیاد۔۔۔ھندی بھاشا پر رکھی گئی ھے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ھندی سے ماخوذ ھے اور اردو شاعری کی بنیاد فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفید ھے، قائم ھوئی ھے۔ نیز اردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی و فارسی سے ماخوذ ھے۔ پس اردو زبان کا شاعر جو ھندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ھے یہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاھتا ھے اور جو عربی و فارسی سے نابلد ھے اور ھندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمل ھوتا ھے وہ ایک ایسی گاڑی ڈھیلتا ھے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔۔۔۔اردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ھے، اس لیے ان زبانوں سے بھی خیالات اخذ کرنے میں کمی نہ کریں۔۔۔۔"

مولانا وحیدالدین سلیم (وضع اصطلاحات میں):— مگر افسوس ھے کہ ھمارے زمانہ کے بعض غزل گو شاعر۔۔۔مستعمل اور مروج زبان میں سے چھیل چھیل کر بہت سے الفاظ تو نکالتے اور متروکات کا دایرہ وسیع کرتے جاتے ھیں لیکن ایسا کوئی سامان مہیا نہیں کرتے۔۔۔۔جس سے ھماری زبان میں ادائے مطالب و خیالات کی وسعت پیدا ھو اور اس کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی نصیب ھو۔ اگر کوئی شخص بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر کسی فارسی یا عربی لفظ کو کسی ھندی لفظ کے ساتھ جوڑ دیتا ھے یا فارسی زبان کے کسی سابقے یا لاحقے کو کسی ھندی لفظ کے ساتھ ملا دیتا ھے یا کسی ھندی سابقے یا لاحقے کو عربی یا فارسی لفظ کے شروع یا آخر میں لگادیتا ھے یا کوئی مصدر بناکر اس کے مشتقات سے کام لیتا ھے تو یہ نظم و انشا کے درمیان اس کا قلم پکڑ لیتے ھیں۔۔۔۔اور اس سے کسی گزشتہ شاعر کی سند کا مطالبہ کرتے ھیں اور فرماتے ھیں کہ جو الفاظ بولے بن چکے ھیں وہ سماعی ھیں ان پر قیاس

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۷۴

اتنا بڑا اور بھیانک بگاڑ کبھی نہ پیدا ہوتا۔ ہندی اردو ایک نہیں، ایک ہی رہتیں"۔
ہمارے لیے کون سا رسم الخط مناسب ہوگا اس کے لیے کتاب مذکور میں آگے کچھ رائیں درج ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

(۱) " واحد رسم الخط کی اشاعتی انجمن کے ایک انگریز وائس پریسیڈنٹ (نائب صدر) نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ دیو ناگری حروف کا ساری دنیا میں پرچار ہونا چاہیے، کیونکہ اس کے مانند سراپا مکمل کوئی دوسرا رسم الخط نہیں "۔

(۲) « مُجھے (اڈیٹر اردو کو) اکثر اردو کی قدیم کتابوں کے مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ پرانے الفاظ کے صحیح پڑھنے اور صحیح تلفظ کے دریافت کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ اگر لاطینی یا ناگری حروف میں یہ تحریریں ہوتیں تو اتنی دقت نہ ہوتی" »۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳

کرکے نئے الفاظ بنائے نہیں جاسکتے' حالانکہ وہ حضرت یہ خیال نہیں کرتے کہ جب کوئی ایسا ہی مخلوط لفظ.... یا نیا مصدر بنایا گیا تھا اور کسی شاعر نے اس کو اول اول استعمال کیا تھا تو ایسا ہی مطالبہ کرنے پر وہ اسی لفظ یا مصدر کی کوئی سند گزشتہ شعرا کے کلام سے پیش نہ کرسکتا تھا۔ اگر بالفرض وہ کوئی ایسا ہی دوسرا لفظ پیش کرتا جو بن کر مستعمل ہوچکا تھا تو اس سماعی لفظ کو قیاسی کیوں کر ثابت کرسکتا تھا؟۔ پھر یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر انہیں جیسے زبان و الفاظ کے قابض اس زمانہ میں موجود ہوتے اور ان کا اختیار نافذ ہوتا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہمارے بزرگ آج ہمارے لیے اردو زبان میں پچپن ہزار سے زیادہ الفاظ کا ذخیرہ چھوڑ جاتے.....»

مولانا عبدالحق صاحب (مقدمہ انتخاب کلام میر) :— «.....اگرچہ میر اور ان کے ہمعصر شعرا کے کلام میں فارسیت غالب ہے لیکن اس زمانہ میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جاتا ہے وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ ان بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کیا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا کرلیا اور صرف صرف و نحو کی خراط پر چڑھا کر اردو بنالیا۔ لیکن آج کل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مقدس الفاظ اردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس ہوجائیں۔ ان بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ ان کی تقلید کو ننگ سمجھتے اور ان کی کوششوں کو غلط العام سے تعبیر کرتے ہیں.....ایک دوسرا فریق جو فارسی عربی کے مقبول الفاظ نکال کر ان کی جگہ غیر مانوس اور ثقیل سنسکرت کے الفاظ ٹھونسنا چاہتا ہے اسی ناقہمی میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ہیں »۔

(«ہندی اردو اور ہندستانی» نامی کتاب سے)

اس میں شک نہیں کہ شرما جی ناگری یا ہندی رسم‌الخط کو بہترین سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہندؤں کی طرح مسلمان بھی ہندی لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کا چھٹا صوبائی اجلاس ۱۹۲۰ع میں مرادآباد میں ہوا تھا جہاں مرحوم نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں یہ کہا تھا:— " ہندی کے تعلق ہمارے مسلمان بھائیوں کا کچھ نہیں بہت کچھ فرض ہے۔ ہندی کی اُنّتی (ترقی) میں مسلمان بھائیوں کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ رسکھان، رحیم، رسلین وغیرہ بڑے بڑے شعرا پر ہندی ساہتیہ سدا ابھمان (فخر) کرتا رہے گا۔ ان کی ہندی رچنا کسی بھی ہندو کوی کی کوتا (شاعری) سے کم نہیں.......جو بھاشا ہندو مسلمانوں کو کبھی ایک دل بناتی تھی، جو ایکتا کا خاص ذریعہ ہے وہی ہمارے دُربھاگ سے آج ہندو مسلمانوں کے برودھ (عناد) کا ایک کارن بنا رہی ہے۔ مہاکوی (شاعر اعظم) اکبر نے کتنے پتے کی کہی ہے:—

وہ لطف اب ہندو و مسلماں میں کہاں   اغیار ان پر گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا، زباں کی کبھی بحث   ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤ زباں

.......بھاشا کے معاملہ میں.......کٹڑپن کا بھاؤ شوبھا نہیں دیتا۔ اورنگ زیب کا مذہبی تعصب مشہور ہے.......مگر بھاشا کے سمبندھ میں (متعلق) وہ بھی فراخ دل تھے۔ ان کے دربار میں ہندی کوی رہتے تھے۔ اورنگ زیب خود بھی ہندی کے پریمی تھے۔ سنسکرت میں بھی کچھ دخل تھا۔ اس کے ثبوت میں ان کی ایک تحریر پیش کرتا ہوں.......رقعات عالمگیری.......میں ایک رقعہ (نمبر ۹) بادشاہ زادہ محمد اعظم شاہ بہادر کے نام ہے۔ ان شاہزادے نے کہیں سے خاص آموں کی ڈالی بادشاہ کے پاس بھیجی اور ان آموں کے نام رکھنے کے لیے.......استدعا کی۔ جواب میں بادشاہ لکھتے ہیں:— "فرزند عالی‌جاہ۔ ڈالی انبہ مرسلۂ آن فرزند بذائقۂ پدر پیر خوش‌گوار آمد۔ برائے نام انبۂ گمنام استدعاء نمودہ اند۔ چون آن فرزند جودت طبع دارند رواداری تکلیف پدر پیر چرا می‌شوند۔ بہر حال سدھارس† ، رسنابلاس‡ ، نامیدہ شد۔" ڈالی لفظ فارسی کا نہیں ہے، پھر بھی اورنگ زیب جیسے زبردست منشی نے اس کی جگہ عربی یا

† سدھا=امرت۔ ‡ زبان نواز (رسنا=زبان)۔

فارسی لفظ گڑھ کر یا چن کر نہیں رکھا - جو بول چال میں تھا وہی رہنے دیا - آموں کے نام تو انھوں نے اس کمال کے رکھے ہیں کہ کیا کوئی رکھے گا.........آم ہندستان کا میوہ ہے - فارسی یا ترکی نام اس کے لیے مناسب نہیں - یہی سمجھ کر بادشاہ نے یہ رسیلے نام تجویز کیے "۔

شرما جی کی پیدائش ایک بالکل معمولی سے گاؤں نائک نگلا (چاندپور) ضلع بجنور میں ۱۸۷۷ع میں ہوئی تھی - ان کی تعلیم کی ابتدا دس گیارہ سال کی عمر میں دیوبانی سنسکرت سے ہوئی تھی جس کا مزید مطالعہ انھوں نے بعد کو اورینٹل کالج لاہور اور پھر اپنے گرو پنڈت کاشی ناتھ جی کے پاس بنارس میں کیا تھا - درمیان میں ہندی، اردو اور فارسی بھی پڑھتے جاتے تھے اور ان زبانوں میں بھی انھوں نے رفتہ رفتہ خاصی لیاقت حاصل کر لی تھی† - برج بھاشا اور پراکرت کا بھی انھیں اچھا گیان تھا - مگر یہ سب کچھ زیادہ‌تر ان کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ تھا - سر والٹر اسکاٹ کا قول ہے کہ "ہر شخص کی تعلیم کا بہترین حصہ وہ ہوتا ہے جسے وہ خود سیکھتا ہے"۔ شرما جی پر یہ بات پوری طرح پوری اترتی تھی - پڑھنے کی انھیں دھن سی تھی جس میں کسی اور بات کا خیال تک نہ ہوتا - وہ اپنی سدھ بدھ تک بھول جاتے تھے - اس کے ثبوت میں خود شرما جی کی ایک تحریر کا خلاصہ قریب قریب بالکل ہی انھیں کے الفاظ میں دیا جاتا ہے جس سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ ان کے لکھنے کا ڈھنگ کتنا سادہ، کتنا مزیدار اور ساتھ ہی کتنا برجستہ، بےساختہ اور شاعرانہ ہوتا تھا - دیکھیے:-

"یہ جون سنہ ۱۱ع کے شروع کی بات ہے.......اکبر کا دیوان پاکر دل دیوانہ خوشی سے مستانہ ہوکر ناچنے لگا.........میں ان دنوں جوالا پور مہاودیالہ میں تھا - دن میں پڑھنے کی فرصت نہ ملتی - گرمی کا بڑا دن پہاڑ کی طرح کٹتا نہ تھا......... جیوں تیوں کرکے.........رات آئی چائے پی کر لیمپ جلایا - کتاب ہاتھ میں اٹھائی -

† کہتے تھے مجھے انگریزی نہ جاننے کا بھی پچھتاوا نہیں ہے - اس کے مطالعہ میں جو وقت لگتا وہ میں نے سنسکرت کے مطالعہ میں لگایا - چاہتا تو انگریزی خوب پڑھ سکتا تھا مگر سنسکرت چھوڑ کر اس میں وقت برباد کرنا گوارا نہ ہوا -

پڑھنے بیٹھا ہی تھا کہ آئے ہوئے دوستوں کی منڈلی نے آگھیرا۔ اجی! رہنے بھی دو، اس گرمی میں پڑھنے بیٹھے ہو، کتاب کہیں بھاگی جاتی ہے، دن میں پڑھ لینا..... ایک صاحب اٹھے، لیمپ اٹھاکر دور رکھ آئے۔ دوسرے کتاب چھیننے لگے۔ برسوں کے بھوکے کے آگے سے بھلے آدمیوں نے پرسا ہوا تھال اٹھا لیا...... میں من میں منانے لگا...... بھگوتی دیوی نیند! کرپا کرو، انہیں لے کر سوجاؤ، میرا ادھار کرو! پر انہیں نیند کہاں؟ ایک بات ختم نہ ہوتی تھی کہ دوسری کا سلسلہ چھڑ جاتا تھا۔ رام رام کرکے دس بجے کے قریب نیند نے میری پکار سنی۔ وہ آئی اور ان کی آنکھوں میں چھا گئی۔ میں آہستہ سے اٹھا لیمپ لےکر اندر برآمدے میں جابیٹھا۔ گرمی کچھ کم نہ تھی۔ پسینے پر پسینے آرہے تھے۔ پنکھا جھلوں کہ کتاب پڑھوں؟ پتنگے کمبخت علیحدہ ناک میں دم کررہے تھے۔ مانو (گویا) سوتے والوں نے اپنا چارج پتنگوں کو دے دیا تھا... جھنڈ کے جھنڈ پروانے چمنی کی دیوار پر سر دے دے مار رہے تھے، لو سے لپٹنے کو جوجھ رہے تھے، گویا زبان حال سے اکبر کے اس شعر کا مطلب سنا رہے تھے:

فانوس کو پروانوں نے دیکھا تو یہ بولے کیوں ہم کو جلاتے ہو کہ جلنے نہیں دیتے

اور اس نہ جل سکنے کی جلن کو مجھ پر اتار رہے تھے! نہیں، سبق دے رہے تھے کہ سچی لگن ہے تو ہماری طرح لپٹ جاؤ کتاب سے۔ گرمی کا خیال نہ کرو، ہماری طرف مت دیکھو! آخر پڑھنے کی زبردست خواہش نے اس بگھن پر فتح پائی۔ میں محو ہوکر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے سمادھی (مراقبہ) سی ہوگئی۔ آنکھیں اور کتاب کے صفحے کھلے تھے، باقی حواس کا بیوپار بند تھا۔ بڑے سائز کی ۲۸۲ صفحے سے اوپر کی کتاب ایک آسن سے لیٹے لیٹے پڑھ گیا۔ پڑھتا تھا اور مستی کا ایک نشہ سا چڑھتا جاتا تھا۔ پنسل ہاتھ میں تھی، بڑھیا پدوں پر نشان کرتا جاتا تھا۔ ساری کتاب رنگ ڈالی۔ کھانڈ کی روٹی جدھر سے توڑی میٹھی نکلی۔ دل میں طرح طرح کے جذبات کا طوفان سا اٹھ رہا تھا... غالب کا یہ مشہور شعر اس وقت اکبر کی شاعری پر صادق آرہا تھا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

.... پڑھتے پڑھتے رات بیت گئی، سورج نکل آیا، پر میں ہوش میں نہ آیا۔ اسی مستی کی دھن میں پڑھتا رہا.... میں کتابوں کا کیڑا ہوں۔ جاڑے، گرمی اور برسات کی سیکڑوں راتیں محویت سے پڑھتے پڑھتے یونہی آنکھوں میں نکل گئی ہیں، پر اس رات کا سا.... آنند دو چار بار ہی کبھی ملا ہوگا۔ "†

اسی آنند کی غرض سے زیادہ سے زیادہ وقت تک جاگتے رہنے کے لیے انھوں نے چائے کا استعمال شروع کردیا تھا جو بڑھتے بڑھتے پانی کا پینا سا ہوگیا تھا۔ انھیں زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کا اثر صحت پر پڑا جو بالاخر ان کی بے وقت وفات کا سبب بن کر رہا۔ بیماری میں دوا کرتے تھے مگر پرہیز سے تو بالکل پرہیز ہی تھا!

ان کا پڑھنا بھی کوئی چلتاؤ پڑھنا نہیں، بلکہ ایک ودیارتھی کا پڑھنا تھا۔ ہر کتاب کو بڑے غور سے پڑھتے اور شروع سے آخر تک پڑھتے، ساتھ ہی پنسل سے نشان لگاتے اور حاشیہ پر نوٹ بھی لکھتے جاتے تھے۔ کچھ خاص خاص باتیں علیحدہ نوٹ بک میں بھی درج کرلیتے جو سدا ان کے ساتھ رہتی تھی۔ ہر زبان کی کتابیں خریدنے میں سیکڑوں روپیہ خرچ کردیتے۔ سنسکرت شاعری کی کتب کی بابت تو وہ کہتے تھے کہ اب تک ایسی کوئی کتاب ہندستان میں نہیں چھپی جو خریدی نہ گئی ہو۔ ان کی نجی لائبریری میں ہزاروں کتابیں موجود تھیں جن میں قلمی نسخے بھی کافی تعداد میں شامل تھے۔

ان کے والد پنڈت امراؤ سنگھ شرما آریہ سماجی تھے پس سپوت بیٹے کی پبلک زندگی کا آغاز بھی آریہ سماج کے اپدیشک کی حیثیت سے ہوا جس میں وہ اچھے مقرر اور بڑے حاضر جواب نکلے۔ ان کی تحریری قابلیت اس وقت سے ظاہر ہوئی جب انھوں نے ۱۹۰۴ع میں گوروکل کانگڑی کے ہفتہ وار 'ستیہ وادی' کی ایڈیٹری اپنے ذمہ لی۔ ۱۹۰۹ع میں وہ جوالا پور کے مہاودیالیہ میں آگئے جہاں ان کی عام قابلیت کا اظہار مختلف کاموں کی صورت میں ہوا۔ وہ وہاں کے سکرٹری، پروفیسر اور 'بھارت اودے' نامی اخبار کے اڈیٹر بھی تھے۔ انھوں نے مہاودیالیہ کی خدمت بڑی لگن سے کی۔ گھر میں تھوڑی زمینداری ہوتے ہوئے ان کی مالی حالت کچھ بہت اچھی نہ تھی، پھر بھی

† پدم پراگ نام مجموعۂ مضامین سے۔ سحر

ان کی یہ خدمت زیادہ تر آنریری تھی - تنخواہ تھی تو برائے نام - عرصہ تک صرف پچیس روپے ماہوار ملے' پھر پچاس ہوگئے - لیکن جس شخص نے اپنا ادبی شوق پورا کرنے میں اپنی ہزاروں کی جائداد تک بگاڑدی تھی اسے کام کے آگے دام کی پروا کب ہوسکتی تھی ؟ انھیں (اب ' رائے بہادر ') بابو شیام سندر داس نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے سبھا کی ہندی لغت کی تیاری کے سلسلہ میں ایک سو ماہوار پر طلب کیا' اسی طرح پنڈت مالوی جی نے بھی ہندو یونیورسٹی میں پروفیسری کے لیے بار بار بلایا مگر وہ کہیں بھی نہ گئے - وہ دل کے غنی اور بات کے دھنی تھے - نہ مہاودیالیہ انھیں چھوڑنا چاھتا تھا' نہ وہ مہاودیالیہ کو چھوڑنا چاھتے تھے - لارڈ بیکن کے قول کے مطابق یہ سمجھتے تھے کہ " علم کوئی بکری یا نفع کی دوکان نہیں بلکہ خالق کل کے ظہور اور انسانی تکالیف کے دفعیہ کے لیے ایک بورا پُرا بھنڈار ھے "- وہ مالی تکلیف کو تکلیف نہ سمجھتے تھے - ایک مرتبہ کسی رئیس نے امداد دینا چاھی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ " بیشک آپ کی امداد آپ کی دولت کے سمندر میں قطرہ سی ھے مگر میری غیرت کو ڈبونے کے لیے وہ قطرہ سمندر سے کم نہیں ھے "- انھوں نے نوکری کے لیے کبھی خوشامد نہ کی - انھیں اپنی آزادی کا سودا کرنا ذرا بھی پسند نہ تھا - مہاودیالیہ میں وہ اپنی مرضی سے کام کرتے ہوئے اپنے کو آزاد ھی سمجھتے تھے -

وہ صاف گو بھی تھے - آریہ سماج کے اثر نے اس جواھر کو اور بھی چمکا دیا تھا - علمیت تھی ھی آخر وہ قدرتاً تنقید نگاری کی طرف مائل ہوئے - ان کی تنقید موازنہ کے ساتھ ہوتی تھی اور ہندی میں وہ اس طرز تحریر کے موجد کہے جاتے ھیں - ان کا یہ وصف سب سے پہلے " ست سئی سنگھار " کی صورت میں نمایاں ہوا جس میں " بہاری ست سئی " کی شرح لکھنے پر پنڈت جوالا پرشاد مشر مرحوم کی خاصی خبر لی گئی تھی - پہلے کوئی ایک سال تک یہ تنقید قسط وار الہ آباد کے مشہور ہندی رسالہ سرسوتی میں چھپتی رہی پھر کتابی صورت میں بھی چھپ گئی تھی† - اس کے لکھنے میں جو سخت و ترش لہجہ اختیار کیا گیا ھے وہ پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا - ایسی باتوں کا کوئی

† میں نے اس کتاب کو ایک مدت ہوئی پڑھا تھا - یہ بات ۲۰ع کے پہلے کی ھے -　　سحر

اچھا اثر نہیں پڑتا ، خصوصاً جب وہی باتیں ایک دل‌کش اور زیادہ موثر طریقہ پر کہی جا سکیں ۔ مگر کچھ تو اس وقت ہندی میں تنقید نگاری کی ابتدا تھی اور کچھ شرما جی اپنی عادت سے مجبور تھے ۔ لکھنے پر آجاتے تو اپنے دوستوں تک کو نہ چھوڑتے تھے ۔ مگر ساتھ ہی یہ وصف بھی تھا کہ اوروں کا کہا سنا بھی خوشی سے سہہ لیتے تھے ۔ دل میں کدورت کا نام نہ تھا ۔ جب کبھی انھوں نے کچھ لکھا تو کسی کا دل دکھانے کی نیت سے نہیں ، بلکہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ۔

مرحوم میں یہ وصف بھی تھا کہ جب کوئی چیز پسند آجاتی تو دل کھول کر داد دیتے تھے ۔ آچاریہ پنڈت مہابیر پرشاد دویدی کی طرح اپنی طرف سے خط لکھ کر بھی داد دیتے اور نئے لکھنے والوں کی صورت میں ان کی قرار واقعی حوصلہ افزائی کرتے اور ضرورت پر انھیں اپنی بساط کے مطابق مالی مدد بھی دینے میں دریغ نہ کرتے تھے ۔ جب کہیں جاتے تو وہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے خود جاکر ملتے جس میں انھیں چھٹائی بڑائی کا مطلق خیال نہ ہوتا تھا ۔ ان کے پاس بھی ایسے لوگوں کا کافی مجمع رہتا تھا جن کی وہ چائے سے خاطر کرتے اور پہلے سب کو پلاکر پھر خود پیتے تھے ۔ یہی ان کا معمول تھا ۔ چائے سے زیادہ دل بہلاؤ کا مسالہ ان کی رس بھری باتوں میں تھا جنھیں سنتے ہوئے جی نہ اکتاتا تھا ۔ ان کی زندہ دلی کے متعلق یہاں ایک واقعہ کا ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ ہردوا گنج ضلع علی‌گڑھ کے رہنے والے ہندی کے نامور و کہنہ مشق شاعر پنڈت ناتھو رام شنکر شرما مرحوم سے ان کی دلی عقیدت تھی ۔ ایک مرتبہ ان کے مکان سے چلنے کو تیار ہوئے تو شاعر موصوف کے ایک رئیس دوست نے گلقند کھلادی جو بہت لذیذ تھی ۔ دوبارہ پھر پوچھے جانے پر پنڈت پدم سنگھ نے کہا کہ سفر کا معاملہ ہے ، کہیں زیادہ نہ ہوجائے ۔ رئیس صاحب نے فرمایا کہ جےپور کی بنی ہوئی ہے ، تھوڑی اور لیجیے ۔ غرض کہ اب کے پہلے سے بھی زیادہ کھلادی ۔ پدم سنگھ جی نے ایک بجے کی گاڑی سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بولے کہ اب آپ اس ٹرین سے نہ جاسکیں گے ، گلقند میں بھنگ تھی ۔ پدم سنگھ جی کی آنکھیں نشہ سے سرخ ہوگئیں مگر وہ اپنے ارادہ پر اٹل رہے ۔ اپنے ساتھی پنڈت جوالا دت شرما

سے کہا کہ ہم چلیں گے اسی ٹرین سے، رئیس صاحب کا مطلب نہ پورا ہونے دیں گے۔ جوالا دت جی کے پوچھنے پر کہا کہ حال تو اچھا نہیں ہے مگر مجھے اس سانپ کا منتر آتا ہے، ابھی ایک پیالہ چائے کا پی لوں گا۔ چنانچہ چائے پی، کھانا کھایا اور روانہ ہوگئے۔ مرادآباد پہنچ کر جوالا دت جی نے کہا کہ اگر آپ کے برابر میں نے گلقند کھا لی ہوتی تو مجھے کئی دنوں تک ہردواگنج ہی میں رہنا پڑتا اور شاید اسپتال کی نوبت بھی آجاتی۔ اس پر پدم سنگھ جی ہنس کر بولے :- "ساقی بےوقوف نہ تھا، آدمی کو پہچانتا تھا۔ میں تو اور بھی کھا سکتا تھا۔ بھنگ کی بات میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا"— آپ کے ساتھ چونا تمباکو کا بٹوا بھی رہا کرتا تھا جسے آپ مذاق میں "عیاری کا بٹوا" کہتے تھے۔

مگر وہ جتنے باتوں میں تیز تھے اتنے ہی لکھنے میں سست۔ ان سے کچھ لکھا لینا آسان نہ تھا، اور فرمایش پر تو کسی ایسے کام کا پورا ہونا اور بھی مشکل تھا۔ ہاں، لکھنے کے نام پر وہ خط لکھنا خوب جانتے تھے۔ خط کا جواب فوراً دیتے اور اپنی ڈاک کا انتظار بھی بڑے شوق سے کرتے تھے۔ ان کے خطوط بھی ان کی گفتگو کی طرح بہت دلچسپ ہوتے تھے جن میں اردو اشعار موقع موقع کے ساتھ کثرت سے آجایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے خطوں میں اردو یا ہندی نثر و نظم کے تعلق سے بہت سے نازک مسئلے بھی بڑی خوب صورتی سے حل کردیا کرتے تھے۔ ان کے خطوط کو بھی علم و ادب کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

وہ خود شاعر نہ تھے مگر شاعر کا دل و دماغ ضرور رکھتے تھے۔ انھیں ماضی و حال کے نامی گرامی شعرا سے بےحد محبت و عقیدت تھی اور اشعار بھی اس کثرت سے یاد تھے کہ بات بات میں ان کے منہ سے نکل پڑتے تھے۔ ذی‌حسی اور اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ اشعار پڑھتے ہوئے ان پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی تحریر بھی بڑی شاعرانہ ہوتی تھی جس کا ایک نمونہ ابھی دیا جا چکا ہے۔ ایک اور دیکھیے۔ اپنی پدم پراگ نامی ہندی کتاب (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) کے دیباچہ میں اپنے مضامین سے خطاب کرتے

ھوئے لکھتے ھیں :-

"اس سمے جی ٹھکانے نہیں ھے - دل کے ٹکڑے، جگر کے پارے جدا ھو رھے ھیں - ان کے آنے سے پہلے کا اور چلے جانے کے بعد کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ھے :-

وقت مجھ پر دو کٹھن گزرے ھیں ساری عمر میں
ان کے آجانے سے پہلے اور چلے جانے کے بعد

جو مدت سے چھپے پڑے تھے، اب چھپ کر باھر نکل رھے ھیں - بہت چُھپایا پر گاھکوں نے زبردستی چھین ھی لیا، کاغذ کے کونے سے کھینچ کر نمائش کے بازار میں لے ھی آئے! برسوں کا ساتھ چھوٹ رھا ھے - چھوڑنے کو جی نہیں چاھتا - ممتا (موہ) لپٹ رھی ھے - بےبسی کھڑی رو رھی ھے - بھوشیہ (مستقبل) کی چنتا بےچین کر رھی ھے کہ دیکھیے باھر نکلنے پر ان غریبوں کے ساتھ کیا سلوک ھو - آدر پائیں یا دُتکارے جائیں......اچھا تھا، ایک کونے میں پھٹے پرانے چیتھڑوں میں چھپے پڑے رھتے - نظر بد سے بچے ھوئے تھے - اسی میں کشل (خیر) تھی - چمکنے کا، نمایاں ھوکر نکلنے کا، چاؤ (چاہ) سو آفتوں میں پھنساتا ھے......میرے تھے، میرے پاس پڑے رھتے......بڑی آرزوؤں سے، منتوں سے بلایا تھا - نہ جانے تمھاری آرادھنا (تمنّاؤں) میں کتنی راتوں کو دن اور کتنے دنوں کو رات کرکے تمھارے درشن نصیب ھوئے تھے - دل کا خون سکھا سکھا کر، آنکھوں کے رھٹ سے سینچ سینچ کر تمھیں ھرا بھرا کیا تھا......اب جدا ھو رھے ھو، اتنے دنوں کا ساتھ چھوڑ رھے ھو، کس دل سے کہوں اور کیسے کہوں کہ جاؤ"۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں پدم پراگ سے ایک اور چھوٹا سا اقتباس درج کیا جاتا ھے جو مرحوم کے (؟) ایک "موقع شعر سے تعلق رکھتا ھے : "سب سے پہلے کان پور کے زمانہ (جنوری ۱۹۰۴ء کے پرچہ) میں میں نے ان (اکبر الہ آبادی) کی یہ کوتا (شاعری) پڑھی تھی....

فلک کے سامنے کیا مذھبی بہانہ چلے چلیں گے ھم بھی اسی رخ جدھر زمانہ چلے

ایک مرتبہ میں ڈیرہ دون گیا ھوا تھا - شام کے وقت پروفیسر پورن سنگھ جی سے ملنے کے لیے گیا - وہ نہ ملے -

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۸۳

سنسکرت میں گیتا اور قدیم ہندی شعرا میں انھیں تلسی اور بہاری سے دلی عقیدت تھی۔ زمانۂ حال کے ہندی شاعروں میں وہ پنڈت ناتھو رام شنکر شرما کو بہترین سمجھتے تھے اور پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیاے «ہری اودھ» اور بابو میتھلی سرن گپت کو بھی بہت مانتے تھے۔ فارسی میں حافظ، خیام، سعدی، مولانا روم وغیرہ اور اردو میں آزاد†، حالی اور اکبر کے بڑے مداح تھے۔ نثر میں خواجہ حسن نظامی کے بھی بہت قائل تھے۔ اردو شعرا میں اکبر کے تو وہ فدائی ہی تھے۔ کہتے تھے کہ «اردو اور ہندی ہی میں نہیں، بھارت کی کسی دوسری بھاشا میں بھی ایسا انقلابی شاعر بہت سمے سے نہیں ہوا»۔ اکبر سے شرما جی کا پہلا تعارف خط و کتابت کے ذریعہ ۱۹۱۲ع میں ہوا تھا۔ اس وقت سے اکبر کی زندگی میں اکثر الہ آباد جاتے اور ان کے درشن سے خود کو دھنیہ مانتے تھے۔ اکبر کے مرنے پر وہ کبھی کبھی ان کے مزار پر پھول چڑھاکر اپنی محبت کو تازہ کر آتے۔ ایسے موقعوں پر وہ بے اختیار رو دیتے۔ اکبر کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کہا کرتے تھے کہ اگر میرے دل کو کسی نے سمجھا ہے تو پنڈت جی نے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ «کبھی تو پنڈت جی میرے اشعار سے ایسے معنی نکالتے ہیں کہ خود مجھے تعجب کرنا پڑتا ہے»۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲

کچھ دیر انتظار کرکے چلا آیا۔ میں نے پنسل سے کاغذ کے ٹکڑے پر یہ شعر لکھا اور کمرے کے دروازے کی چک (چق) میں رکھ دیا:

نصیب ہو نہ سکی دولت قدمبوسی ادب سے چوم کے حضرت کا آستانہ چلے

.... اس کے بعد جب پروفیسر .... جی ملے تو کہتے تھے کہ «اس شعر کو پڑھ کر میں رات بھر بیقرار رہا۔ مزے لے لے کر بار بار پڑھتا اور جھومتا تھا۔ ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ تمام رات نیند نہ آئی۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی چل کر ملوں پر معلوم نہ تھا آپ کہاں ٹھہرے ہیں۔ آپ نے مجھے غیرحاضری کی یہ اچھی سزا دی»۔

† شرما جی کے مجموعۂ مضامین (پدم پراگ) میں آزاد پر ایک پورا مضمون ہی ملتا ہے جس کے ایک ضروری اقتباس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:—

«آزاد میں ایک ایسا نایاب وصف تھا جو دوسرے مسلمان لکھنے والوں میں نہیں پایا جاتا۔ ان میں

اکبر صاحب شرما جی کے کتنے بڑے قدرداں تھے' یہ خود ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ چند خطوں کی چند ضروری سطریں درج ذیل ہیں :-

(۱) "......آپ کا الطاف نامہ اس وقت پیش نظر ہے۔ ماشاءاللہ آپ کیا جیتی جاگتی اردو لکھتے ہیں......"

(۲) "......آپ کا عنایت نامہ ایسا ہے کہ اس کا جواب دو حرفوں میں دینا ستم ہے.....میرے بعض احباب آپ کی تحریر سن کر پھڑک گئے"۔

(۳) "....آپ کے خط کو آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں۔ مدت کے بعد عنایت نامہ آیا۔ بہت مسرت ہوئی۔ خدا کرے آپ کے درشن بھی نصیب ہوں......آپ کی قابلیت اور سخن فہمی نے مجھ کو آپ کا عاشق بنا دیا ہے......" (مورخہ ۲۲-۱-۱۸ ع)۔

(۴) "....آپ کا دیدار میرے لیے غذاے روح ہے۔ بیماری و ناتوانی سے ناچار ہوں ورنہ آپ ہی کے انسٹی ٹیوشن (مہاودیالیہ جوالاپور) میں دھونی رماتا......"۔

شرما جی کو بھی اکبر کا رنگ کچھ ایسا پسند آ گیا تھا کہ وہ ہندی کی ادبی دنیا کو اس سے اچھوتا نہ رکھ سکتے تھے۔ خود لکھتے ہیں :- "ہندی دنیا کو اکبر سے روشناس کرانے کی سعادت سب سے پہلے مجھ ہی کو نصیب ہوئی۔ جب میں نے اپنے مضامین میں اکبر اور دیگر اردو شعرا کے اشعار دینے شروع کیے تو خالص پنڈتاؤ (عالمانہ) ہندی کے کئی حمایتی بگڑ اٹھے تھے......مگر آگے چل کر یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۳

جوہر شناسی اور کشادہ دلی کا خاصہ تھا۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جگہ جگہ سنسکرت' بھاشا اور شعراے متعلقہ کی اور ساتھ ہی ہندی شاعری کی فراخ دلی سے تعریف کی ہے۔ اپنے تاریخ اردو والے مضمون میں ہندو، پارسی اور بدھ مت والوں کے نام ایسے بڑے آدر (احترام) سے لیے ہیں کہ (ایک) ہندو مصنف بھی اپنے دوسرے ساتھ والے ہندو مصنف کا نہیں لیتا"۔

رواج چل پڑا......اور اب تو اردو کی طویل نظمیں ہندی میں برابر چھپتی ہیں۔ (ترجمہ ہندی سے)

اس کا ذکر شرما جی نے اپنے کسی خط میں کیا ہوگا جس کے جواب میں جناب اکبر نے تحریر فرمایا تھا:

"آپ نے میرے ناچیز اشعار کی بڑی قدر کی کہ ہندی تصنیف میں ان کو داخل کیا......میں چاہتا ہوں کہ آیندہ ہندی کے خوبصورت اور سبک اور معنی خیز الفاظ کو زیادہ تر اردو میں داخل کروں۔ افسوس ہے کہ میں نے ہندی نہیں پڑھی۔ امید ہے کہ کوئی ذی علم دوست مدد دیں"۔

جس طرح شرما جی اکبر کے شیدائی تھے، ویسی ہی چاہت انھیں برج بھاشا کے قدیم شاعر بہاری لال کے ساتھ تھی۔ بہاری خصوصاً حسن و عشق کا شاعر ہے اور اس فن میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ شرما جی بھی عشقیہ شاعری (سنگار رس) کو اور قسم کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے بہاری کی مشہور و معروف کتاب "بہاری ست سئی" کی شرح لکھی ہے۔ ایک دوست کے دریافت کرنے پر کہا کہ "یہ رس (سنگار) نو رسوں * سے برتر و بالا ہے۔ ساہتہ (ادب) کا خاص رنگ (جزو) ہے۔ اور پھر بہاری کا کمال اتنا زبردست ہے کہ انھوں نے دوھا جیسے چھوٹے چھند میں 'گاگر میں ساگر' (کوزہ میں دریا) بھر دینے کا سا کام کیا ہے۔" اپنی اسی شرح کے طویل دیباچہ میں بھی لکھتے ہیں:— "بہاری کی شاعری میں جتنی جادو بیانی اور دل‌کشی ہے اسی قدر وہ کھری اور وزن دار بھی ہے......پہلے پرانے خیال کے 'کھوسٹ' اس پر جیسے لٹو تھے، آج نئی روشنی کے پروانے بھی ویسے ہی سو جان سے فدا ہیں۔ وقتاً فوقتاً کتنے ہی شعرا و علما نے اس پر نظم و نثر میں سنسکرت

* قدیم ہندی شعرا نے اپنی طبع آزمائی کے لیے نو رس (کیف) مانے ہیں جو ترتیب کے ساتھ ان امور سے تعلق رکھتے ہیں:— (۱) عشق (اسی میں بزمیہ شاعری بھی شامل ہے)، (۲) ظرافت یا طنز، (۳) رنج و الم، (۴) غیظ و غضب، (۵) ہمت و حوصلہ، (۶) خوف، (۷) نفرت، (۸) حیرت و استعجاب، (۹) معرفت۔

سحر

اور هندی میں شرحیں لکھیں مگر اس کی متانت ابھی ویسی هی برقرار هے۔ اس کے جوهر پوری طرح کھلنے میں نہیں آتے، گہرائی کی تھاہ نہیں ملتی۔ پہلے کی شرحوں سے پڑھنے والوں کی آسودگی نہ هوئی، نئی شرحیں بنیں پھر بھی چاہ یہی هے که اور بنیں"۔

اسی دیباچه میں مرحوم نے سنگار رس (عشقیه کیف) کے عام هندی شعرا کے حواله سے کچھ ایسی باتیں بھی کہه ڈالی هیں جو قابل غور هیں۔ فرماتے هیں:- "چاهے اپنی رائے میں اسے دیش کا 'ابھاگ' هی سمجھیے که همارے شعرا۔۔۔ایسی سندر بھاشا کا 'برا استعمال' ایسی بھرشت بات کے بیان کرنے میں کیوں کر گئے' مگر جو کرگئے سو کرگئے' جو هوگیا سو هوگیا۔ وہ سمے هی کچھ ایسا تھا' سماج کی پسند هی کچھ ایسی تھی اور اب دوبارہ ایسے شعرا یہاں پیدا هونے سے رهے جو موجودہ مہذب سوسائٹی کی پسند کے مطابق وقتی باتوں کی ایسی سندر' میٹھی' اونچی اور پھڑکتی هوئی جان‌دار اور پرکیف زبان میں بیان کرکے مردہ دلوں میں جان ڈال جائیں۔۔۔۔هماری بھاشا کی بہار بیت گئی۔ اب کبھی ختم نه هونے والی خزاں کے دن هیں۔۔۔۔جس بےکیف اور بےجان بھاشا میں نرس اور کان پھوڑ چھندوں کی آج کل پیدائش هورهی هے' اس سے پسندیدگی کا پرچار هوچکا' یه دل والے سماج کے دل میں گھر چکی! یه سوکھی ٹھنی ادب کی فضا میں بہت دن کھڑی نه رہ سکےگی۔۔۔۔اس کے خشک جسم میں قدیم علم و ادب کے رس کا پہنچنا بہت ضروری هے۔۔۔۔اگر اپنی زبان کو زینت دینا هے تو شعر و سخن کے اس پرانے باغ سے جسے هزاروں هوشیار مالیوں نے سیکڑوں برس تک دل کے خون سے سینچا هے' سدا بہار پھول چننے هی پڑیں گے"۔

ست‌سئی کی شرح کا یه دیباچه ۲۴۸ صفحوں میں هے اور ایسے ایسے کتنے هی انمول جواهرات سے بھرا پڑا هے۔ مولف کی بےساخته اور معنی خیز تحریر نے جا بجا وہ رنگینی پیدا کردی هے که دیکھتے اور سراهتے هی بنتی هے۔ مجموعی طور پر یه دیباچه ایک ادبی تنقید کی حیثیت رکھتا هے جس میں بہاری کے دوهوں کا سنسکرت' هندی' اردو اور فارسی کے نامور شعرا کے کلام کے ساتھ بڑی خوبی سے موازنه کرتے

ہوئے بہاری کو فوقیت دی گئی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک ایسا ہی موازنہ ملاحظہ ہو جو اردو اور فارسی سے تعلق رکھتا ہے:-

«ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے» (غالب)

....اس شعر کی مولانا حالی نے بڑی تعریف کی ہے۔ دیوان حالی کے مقدمے اور یادگار غالب میں اسے لےکر دکھایا ہے کہ یہ شعر شاعر کی نازک خیالی کا بڑھیا نمونہ ہے ....اس کے ساتھ ایک شعر شیخ سعدی کا یہ لکھا ہے:

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم

چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

....حالی کہتے ہیں کہ ان دو شعروں کا مطلب تو یہی ہے کہ کسی طرح اپنا دکھ یا درد معشوق پر ظاہر نہیں کیا جاسکتا مگر سعدی کے بیان میں یہ شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ ممکن ہے معشوق اپنے عاشق کی ظاہری بدحالی دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل دکھی ہے، کیوں کہ سعدی کے بیان سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے۔ مگر مرزا غالب کے بیان میں یہ شبہہ بھی نہیں رہتا۔ پھر بھی سعدی کے شعر کو مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہیے کیوں کہ وہ اس سے پہلے کا ہے۔ یہ تو ہوئی شیخ سعدی اور مرزا غالب کی بات، اب دیکھیے برج بھاشا کے....کوی راج (ملک‌الشعرا) بہاری‌لال اسی بات کو غالب سے پہلے کیسے اچھے اور نرالے ڈھنگ سے کہتے ہیں: جو واکے تن کی دسا دیکھیو چاہت آپ۔ تو بل نیک بلوکئے چل اوچک چپ چاپ * (دوھا) یعنی اگر آپ اس فراق‌زدہ کے بدن کی حالت دیکھنا چاہتے ہیں تو بلہاری، ذرا اچانک اور چپ چاپ چل کر دیکھیے۔ اگر آپ کے پہنچنے کی اسے خبر ہوگئی تو اس کی لاغری اور کمزوری دور ہوکر اسے صحت مل جائےگی، پھر اس کی جدائی سے پیدا ہوئی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ آپ کو نہ ہو سکےگا۔ اس لیے میری بنتی ہے کہ اچانک اور

* जो वाके तन की दसा देख्यो चाहत आप, तो बलि नैंकु बिलोकिये चलि औचक चुपचाप।

چپ چاپ چل کر اسے دیکھیے....' ہماری رائے میں یہ دوھا اوپر کے دونوں شعروں سے بہت بڑھ کر ہے - ان شعروں سے تو یہی پایا جاتا ہے کہ معشوق کے پہنچنے یا اسے دیکھنے پر ہی عاشق کی حالت بدل جاتی ہے مگر دوھے میں 'اوچک چپ چاپ' لفظوں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر اچانک اور چپ چاپ نہ چلے اور کسی طرح تمھارے چل پڑنے کی خبر بھی اس تک پہنچ گئی تو تمھارے پہنچنے سے پہلے' اس خوش‌خبری کے پہنچتے ہی اس کی حالت اور سے اور ہو جائےگی....» -

صرف دیباچہ ہی نہیں ' اسی قسم کا قابل قدر موازنہ ست سئی کی شرح میں بھی جاری رکھا گیا ہے جو متعدد کتب کے حوالہ سے مرتب ہوئی ہے - کل کتاب سے شرما جی کے وسیع مطالعہ اور زبردست علمی تبحر کا پتہ چلتا ہے - افسوس کہ وہ صرف ۱۲۶ دوھوں کی تشریح کرسکے جو یکم مارچ سے ۱۵ اپریل ۱۴ع تک کے قلیل وقت میں دریائے گنگا کے کنارے پر آھار ضلع بلند شہر میں لکھی گئی تھی - اگرچہ شرما جی وہاں یہ سوچ کر گئے تھے کہ کتاب کے کل سات سو سے زائد دوھوں کو ختم ہی کرکے اٹھوں‌گا مگر پھر وہ سلسلہ نہ اس وقت تک جاری رہ سکا اور نہ آگے کبھی لکھنے کی نوبت آئی - تاہم صرف ۱½ ماہ کے بہت تھوڑی مدت کو دیکھتے ہوئے جو کچھ ہوا بہت ہوا - یہ ادھوری شرح بھی اتنی اچھی سمجھی گئی کہ ۱۹۲۳ع میں ہندی ساھتہ سمیلن نے اس کے ادھورے پن کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنا 'منگلاپرشاد انعام' نامی بارہ سو روپے کا سالانہ انعام اول اول اسی کتاب کی نذر کرکے اپنی قدردانی اور جوھر شناسی کا ثبوت دیا تھا—

شرما جی کو مشاعروں اور کوی سمیلنوں (ہندی مشاعروں) سے بھی بڑی دل‌چسپی تھی مگر سمیلنوں میں انھیں اتنا لطف نہ آتا تھا جتنا مشاعروں میں - کہتے تھے کہ ہندی شعرا میں وہ دلی لگن اور محنت و مشقت کی عادت نہیں ہے جو شعرا کے لیے بہت لازمی ہے اور کوی سمیلنوں کو کامیاب بنانے کے لیے بہت ضروری ہے - یہ کامیابی اردو مشاعروں کو کیوں نصیب ہوئی ہے' اس پر مرحوم نے اپنی آل انڈیا ہندی ساھتہ سمیلن

مظفرپور کی صدارتی تقریر میں کچھ روشنی ڈالی ہوی - فرمایا تھا کہ "اردو شعرا نے حالی کے رنگ کو اپنا لیا ہے بلکہ اسے اور چمکا دیا ہے - اردو اخبارات میں دیش بھگتی (حب‌الوطنی) اور معرفت کی جو نظمیں نکلتی ہیں وہ پڑھنے والے۔۔۔کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، دل پر اثر کرتی ہیں، بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے - ہندی کی نئی رچناؤں (نظموں) میں یہ بات ابھی نہیں آئی۔۔۔اردو والے شعروں میں جذبات و خیالات کا نیا پن بھرتے ہیں مگر بھاشا اور ریت وہی پرانی ہی ہے - ان کی گاڑی کی رفتار بدل گئی ہے۔۔۔پر دھرا اور پہیے بدستور وہی ہیں" - †

ایک بات اور -- آج کل نئی ہندی میں بلا قید وزن یا ردیف و قافیہ نظمیں لکھنے کا رواج ترقی پا رہا ہے - انگریزی شاعری کی نقل میں یہ شوق بڑھتے بڑھتے اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ خشک نثر کی صورت اختیار کرتے ہوئے خبط کی حد تک جا پہنچی ہے - پرانی قیود کو بالکل مٹا دینے اور رسمی و رواجی بندش سے یک لخت آزاد ہوجانے کی دھن میں یہ خیال مطلقاً باقی نہیں کہ آخر قدیم شعرا نے جو طرز قایم کیا ہے اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت اور دور اندیشی تو ضرور ہے اور نثر و نظم میں کوئی امتیازی خصوصیت تو ہونی ہی چاہیے - شرما جی بھی اس امتیاز کے قائل تھے اور انھوں نے صوبائی ساہتہ سمیلن ۱۹۲۰ء کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں اس امر کے متعلق یوں فرمایا تھا :- "تک نہ ملی، قافیہ تنگ ہوگیا تو اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ بے‌تکی اڑانے لگے - جب سنسکرت میں بے‌تکی کوتا ہوتی

† دھرا اور پہیے کے متعلق شرما جی نے حالی کے مقدمہ کا ایک اقتباس بھی لیا ہے جو یوں ہے :- " آج کل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعرا نے کبھی نہیں باندھے تھے، ظاہر کیے جاتے ہیں - مگر چونکہ وہ اس خاص زبان میں جو شعرا کی کثرت استعمال سے کانوں پر رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں، انھیں الفاظ میں ظاہر کرائے جاتے ہیں اس لیے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے۔۔۔۔ ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی - گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیہ اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے" -

ھے ' انگریزی میں 'بلینک ورس' ھے تو پھر ھندی میں وہ کیوں نہ ھو؟ اچھا صاحب یہ بھی سہی ! بےتکی ھی سہی ' پر کچھ کہیے تو ! نرے شبد اڈمبر (لفظی نمائش) اور کوری تک بندی کا نام تو کوتا نہیں ھے - کوتا کا پران جو رس ھے اس کی کوئی بوند بھی آپ کے پیالے میں ھے یا نہیں ؟ . . . . چوٹ کھائے ھوئے دل سے جو کوتا نہیں نکلتی وہ سیاپے کی نائن کا رونا ھے " -

آج کل رمزیہ شاعری کا بھی زمانہ ھے - ھندی شعرا کے نو رسوں والی بات تو اب رخصت ھوگئی اور اس کے ساتھ وہ طرح طرح کی حالتوں اور کیفیتوں والی بات بھی جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو شاعری کے لطیف و موثر پیرایہ میں سامنے رکھتی ھوئی شاعری اور ندگی میں بہت کچھ مشابہت و مماثلت پیدا کردیتی تھی - البتہ اگر باقی ھے تو سنگاررس - انے شاعروں کا خواہ جس قدر مضحکہ اڑایا جائے اور ان کی شاعری کو عشقیہ کہہ کر چاھے جتنا بھی بدنام کیا جائے مگر سچ پوچھیے تو وھی حسن و عشق کا راگ آج بھی گایا جارھا ھے' ھاں آواز میں ایسی گنگناھٹ یا جھنجھناھٹ ضرور آگئی ھے کہ وہ کانوں میں پڑ کر دل و دماغ میں سرایت نہ کرسکے بلکہ دونوں کو ایک جمود کی سی حالت میں ڈال دے ! میں نے ایک مرتبہ نئی ھندی کی مشہور و معروف شاعرہ شریمتی مہادیوی ورما ایم - اے (پرنسپل مہلا ودیا پیٹھ الہ‌آباد) سے باتیں کرتے ھوئے پوچھا کہ آخر یہ رھسیہ واد (رمزیہ شاعری) کیا ھے؟ برجستہ جواب ملا کہ " وہ شاعری جو سمجھ میں نہ آئے " - خیر ' اسے کچھ مبالغہ بھی سمجھیے ' اگرچہ حال کے ھندی شعرا نے اسے کچھ ویسا ھی ضرور بنادیا ھے - فی زمانہ اس جدید نوعیت کی شاعری کو ھند کے مایۂ ناز و شہرۂ آفاق بنگالی شاعر ڈاکٹر ٹیگور نے رواج دیا جس کا عام تتبع ھندی شعرا نے بھی کیا اور اردو شعرا نے بھی' مگر آج جو صفائی اور کامیابی اردو میں نظر آتی ھے وہ ھندی میں قریب قریب مفقود ھے - شرما جی نے آل انڈیا ساھتہ سمیلن کی صدارت کرتے ھوئے اس پر بھی خیالات کا اظہار فرمایا تھا - ملاحظہ ھو :-

" رھسیہ واد ھو یا چھایا واد ' وہ سمجھ میں تو آنا ھی چاھیے - آخر اپنشدوں کا پرم رھسیہ (اعلٰے رمز) بھی تو سمجھ میں آتا ھے . . . . میں رھسیہ واد

کا پرم پریمی ھوں - اس کی کھوج میں رھتا ھوں - کہیں مل جاتا ھے تو وجد کی سی حالت میں پہنچ جاتا ھوں - سر دھنتا ھوں اور مزے لے لے کر پڑھتا ھوں - جی کھول کر داد دیتا ھوں - دوسروں کو سناتا ھوں - پر ھندی کی نوین (نئی) رچناؤں میں ایسا رھسیہ واد کم ، پیسے میں پائی سے بہت کم ، سو بھی کبھی کسی رچنا میں ملتا ھے اور وہ بھی اس درجہ کا نہیں جیسا اردو میں تصوف کا رنگ ھے - "

ظاھر ھے کہ شرما جی کو نہ کسی رسم و رواج سے اندھا لگاؤ تھا اور نہ وہ ' بلینک ورس ' یا ' رھسیہ واد ' سے کوئی ' بغض للّٰہی ' رکھتے تھے - وہ صرف یہ چاھتے تھے کہ شاعری واقعی شاعری ھو اور ایسے معنی مطلب کے ساتھ جو سہولت سے سمجھ میں آسکے † - دل کے چھپے ھوئے جذبات کو باھر لا کر ایک ایسی شکل میں پیش کرنا جو دیکھنے ، سننے اور سمجھنے کے لائق ھو ، یہی کسی لکھنے والے کا خاص کام ھونا چاھیے - شہرۂ آفاق انگریز نقاد میتھو آرنلڈ کا کہنا ھے کہ " شاعری اصل میں زندگی کی تنقید ھے اور شاعر کی عظمت کا دار و مدار اسی پر ھے کہ وہ خیالات کا خوبصورت اور زور دار طریقہ پر زندگی سے تعلق پیدا کرائے " - شعرا بھی بالعموم اس بات کو مانتے ھیں اور اسی پر چلنے کا دعوی تک کرتے ھیں مگر یہ سوچنے کی تکلیف نہیں اٹھاتے کہ جب ان کی بات سمجھ ھی میں نہ آئے گی تو آخر عام انسانی زندگی پر اس کا اثر ھی کیا اور کیسے پڑ سکے گا ؟ شرما جی کا بھی کم و بیش یہی خیال تھا اور جب انھوں نے ساھتہ سمیلن کے اجلاس میں وہ باتیں کہیں جو ابھی لکھی جاچکی ھیں تو بڑا شور شرابا ھوا - مگر سچ تو یہ ھے کہ نہ ان میں قدامت پسندی کا شائبہ تھا ، نہ نکتہ چینی یا عیب جوئی کا - وہ وقتی رجحان کو خوب سمجھتے تھے اور وقتی بات کے کہہ دینے میں لگی لپٹی روا نہ رکھتے تھے -

اب لگے ھاتھوں ترجمہ کے متعلق بھی شرما جی کے خیالات کا جائزہ انھیں کے شاعرانہ الفاظ میں لے لیجیے :- " اصل میں کوتا (شاعری) ترجمہ کرنے کی چیز ھے ھی نہیں - ترجمہ میں کوتا کی آدھے سے ادھک سندرتا نشٹ ھوجاتی ھے - ایک بھاشا کی کوتا دوسری بھاشا میں آکر کوتا نہیں رھتی - یہ شراب اپنے مٹکے سے نکلی اور

سر کہ ہوئی ۔ یہ راگ ایک گلے سے دوسرے گلے میں اترتے ہی بے سرا ہوجاتا ہے ۔ یہ عکس ایک درپن (آئینہ) سے دوسرے میں آیا اور پرچھائیں بن کر رہ گیا !" † ۔

جہاں تک مجھے علم ہے ، مرحوم کی تین کتابیں (۱) ست سئی سنگھار ، (۲) ست سئی کی شرح اور (۳) پدم پراگ ، ان کی زندگی میں شایع ہوگئی تھیں ۔ ان کے متفرق مضامین کی تعداد بہت زیادہ تھی جس کے لیے پدم پراگ کا دوسرا حصہ بھی چھپنے والا تھا ، مگر ان کی وفات کے بعد پھر اب تک کسی نے اس طرف توجہ نہ کی ۔ میں اس کو ادبی بدقسمتی سمجھتا ہوں جو نہ صرف مرحوم کے متعلق ایک مجرمانہ سہو ہے بلکہ جس سے علم و ادب کی دنیا میں بھی ایک کھٹکنے والی کمی محسوس ہو رہی ہے ۔ معلوم نہیں کہ اب تک اس کا مسودہ بھی کہیں محفوظ ہے یا نہیں ۔ میرے خیال میں تو مضامین کے علاوہ ان کے خطوط بھی اس قابل ہیں کہ زیادہ نہیں تو کم سے کم ایک انتخاب ہی کی صورت میں چھاپ دیے جائیں ۔

شرما جی اپنے وقت کے ماہوار ہندی رسالوں میں وشال بھارت (کلکتہ) کو بہترین مانتے تھے ۔ اخباروں میں پرتاپ (کانپور) کے متعلق ان کی رائے تھی کہ اس نے اپنے سابق اڈیٹر شریجت گنیش شنکر ودیارتھی کے زمانے میں اپنی آن بان خوب نباہی ۔ جہاں ان کی یہ ہدایت تھی کہ بلا معاوضہ ایک سطر بھی نہ دی جائے وہاں وہ خود یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کا ہر کام معاوضہ کے ساتھ ہو ۔ طلبا کو بڑے شوق سے پڑھاتے تھے اور ان سے کچھ لینا تو دور کی بات اپنے پاس سے انھیں کچھ دیتے رہنے میں بھی تامل نہ کرتے تھے ۔ وہ خود بہت سادہ زندگی گزارتے تھے ۔ سودیشی کے پریمی تھے اور اس "گاندھی جگ" کے بہت پہلے سے گھر کے کتے سوت کا گاڑھا پہنا کرتے تھے ۔ سیاسیات میں کوئی عملی حصہ نہ لیتے ہوئے لوکمانیہ تلک کو سب سے بڑھ کر مانتے تھے ۔ ساتھ ہی ہندو مہاسبھا کے بھی معتقد تھے ۔

وہ آریہ سماجی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو چند مقررہ اصولوں کے دائرہ میں محدود کردینا گوارا نہ کرسکتے تھے ۔ مذہبی معاملات میں سوامی دیانند سرسوتی

---

† اردو ترجمہ کی غرض سے صرف تین چار لفظ بدلے گئے ہیں ۔ سحر

سے تو انھیں قدرتاً بڑی گہری عقیدت تھی مگر ساتھ ھی وہ سوامی رام تیرتھ کو بھی بڑی بھگتی کی نگاہ سے دیکھتے اور کہا کرتے تھے کہ ان کا سا اعلیٰ کردار والا اور بلند خیال انسان دوسرا نہیں ملا۔ کسی مذہب کی برائی کرنا انھیں پسند نہ تھا۔ گنگا نہانے کا بھی شوق تھا اور وہ پاک و صاف مقاموں میں پاک و صاف ھوکر ھی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ جب کبھی بنارس جاتے تو اپنے گرو پنڈت کاشی‌ناتھ کی خدمت میں زمیں‌بوس ھوکر آداب بجا لاتے اور کچھ نہ کچھ نذر کی صورت میں بھی پیش کرتے۔ بزرگوں کا ادب اور عالموں کی عزت و توقیر کرنا اپنا مقدم فرض سمجھتے تھے۔ بہت سی باتوں میں قدیم آرین تہذیب کے پیرو ھوتے ھوئے وہ گوروکلوں کی موجودہ رفتار سے مطمئن نہ تھے۔ یہ سب تو تھا ھی، مگر سب سے بڑھکر یہ بات تھی کہ وہ سراپا ایک ادبی انسان تھے۔ ادب ھی ان کے گیان کی چیز تھی اور دھیان کی بھی۔ اسی کی پوجا تھی اور اسی کی تپسیا۔ وہ اسی کے لیے پیدا ھوئے، اسی کے لیے جیے اور اسی کے لیے مرے! یہی خاص وجہ تھی کہ وہ اتنے فراخ دل اور وسیع الخیال واقع ھوئے تھے۔

افسوس کہ علم و ادب کا ایسا زبردست اور بےلوث خادم صرف پچپن سال کی عمر میں موت کے بےدرد ھاتھوں ھم سے دفعتاً چھین لیا گیا۔ شرما جی ھندستانی اکیڈمی میں اپنی تقریر ختم کرکے اور معاوضہ لینے کے بعد ۲۰ مارچ ۱۹۳۲ع کو اپنے گاؤں پہنچے تھے۔ وھاں اس وقت پلیگ کا زور تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل‌کر گاؤں کے باھر بس رھے تھے۔ شرما جی سے بھی گھر چھوڑکر باھر بسنے کے لیے کہا گیا، مگر ان کا تقدیر پر اٹل بھروسا تھا جس کے آگے انھیں کسی خطرے کی پروا نہ تھی۔ ھاں، اس وقت انھیں فکر تھی تو صرف گاؤں والوں کی دوا دارو کی اور گاؤں میں ایک بار پہنچ جانے پر وہ خود کو اس خدمت سے محروم کیوں کر رکھ سکتے تھے؟ انھوں نے ۲۳ مارچ کو اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "گاؤں میں ابھی پلیگ کا زور کم نہیں ھوا........ میں جب تک گاؤں میں رھتا ھوں، وید حکیم بننا پڑتا ھے۔ گاؤں کے غریب لوگ دوا دارو کی امید سے آتے ھیں، انھیں چھوڑکر باھر جانے کو جی نہیں چاھتا۔

لمبے سفر سے تھک رہا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں اور جو ہوگا دیکھا جائےگا "۔

ہونا اور کیا تھا؟ وہ آرام کرنا چاہتے تھے۔ قدرت انھیں لمبا، ان کے سفر سے کئی گنا لمبا، آرام دینا چاہتی تھی۔ اسی کا سامان ہورہا تھا۔ ۲۷ مارچ کو وہ خود پلیگ میں مبتلا ہوئے اور اس کے ٹھیک گیارھویں دن ۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو صبح کے وقت ان کی روح ان کے جسم کو چھوڑکر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ ہمارا ملک اور خاص‌کر ہمارا صوبہ ایک ایسے عظیم شخص سے خالی ہوگیا جس نے اپنی تمام عمر ادبی خدمت میں گزارکر آخر عوام کی خدمت کرتے ہوئے اپنے آپ کو قربان کردیا!

مرنے کے دو روز قبل تک ان کے ہوش و حواس بالکل درست رہے اور علمی مطالعہ یا مشغلہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ دو ہی دن پہلے تک انھیں گیتا اور رامائن کا خیال نہ بھولا۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے رس مانگا۔ بیماری میں انار اور سنترہ کا رس دیا جاتا تھا، وہی لایا گیا۔ اس وقت شرما جی نے کہا کہ " اسے رس مت کہو، اس سے میری پیاس نہیں بجھتی۔ مجھے تو اب گیتا اور رامائن کا رس پلاؤ، اسی سے مجھے شانتی ملےگی۔ یہی وہ آخری الفاظ تھے جن میں مرحوم کی علم پرستی اور خوش رغبتی کا ملے جلے طور پر ایک عام اظہار ہوا تھا*۔

---

* اس مضمون کی تکمیل میں ذیل کی کتابوں اور رسالوں سے مدد لی گئی ہے جس کا دلی شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے:

پنڈت پدم سنگھ شرما کی لکھی ہوئی (۱) بھاری ست‌سئی کی شرح، (۲) پدم پراگ (مجموعۂ مضامین) اور (۳) ہندی، اردو اور ہندستانی (مطبوعہ ہندستانی اکیڈمی یو-پی، الہ‌آباد)، وشال بھارت (کلکتہ) کا پدم سنگھ شرما نمبر، سینک (آگرہ) کا پدم سنگھ شرما نمبر، مادھوری (لکھنؤ) وغیرہ۔

سحر ہتگامی

تبصرے

تبصرے

ادب

The Basic Words. English-Hindustani

Published for the Orthological Institute (India)
by the Times of India Press, Bombay.

یہ انگریزی کے بنیادی لفظوں کی لغت ہے، جسے ٹائمز آف انڈیا پریس بمبئی نے مسٹر اڈولف مائرز (Mr. Adolph Myers) کی نگرانی میں شایع کیا ہے۔ ۳۱۱ صفحوں کی کتاب ڈمائی سائز پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ طباعت اچھی ہے کتاب مجلد ہے۔ قیمت درج نہیں۔

مقدمہ میں مسٹر مائرز نے بتایا ہے کہ جو لوگ انگریزی سیکھنا چاہتے ہیں ان سے تین منزلیں طے کرائی جاتی ہیں: (۱) پہلی منزل میں بنیادی انگریزی کے ۸۵۰ لفظ اور ان سے جملے بنانے کی ترکیبیں بتائی جاتی ہیں۔ اس طرح مختلف مضامین کی کتابوں کے پڑھنے کی استعداد پیدا کرائی جاتی ہے۔ (۲) دوسری منزل میں بنیادی لفظوں اور محاوروں کو رواں کرانے کے لیے کثرت سے بنیادی انگریزی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس منزل میں زیر نظر لغت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور چونکہ یہ بنیادی زبان کے تمام محاوروں پر حاوی ہے اس لیے یہ "سونا ہی سونا ہے اس میں ذرا بھی کھوٹ نہیں"۔ لہذا دوسری لغتوں کی نسبت یہ بہت زیادہ کارآمد اور ضروری ہے۔ (۳) تیسری منزل معیاری انگریزی کی ہے۔ اس لغت کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔

مقدمے میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ « انگریزی کا ترجمہ « بنیادی ہندستانی » میں دیا گیا ہے اور وہ صرف ایک ہزار لفظوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک ہندستانی جاننے والا انھیں ضرور جانتا اور سمجھتا ہے » ۔ لیکن جس طرح بنیادی انگریزی کی کتابوں میں ہزار لفظوں کی مکمل فہرست شروع میں ایک ہی صفحے میں چھاپ دی جاتی ہے' بنیادی ہندستانی کے لفظوں کی کوئی فہرست اس کتاب میں نہیں ہے ۔

غرض کہ اس کتاب کا کام یہ ہے کہ جو لوگ بنیادی انگریزی سیکھنا چاہیں اور ہندستانی زبان سے واقف ہوں' وہ بہت آسانی سے انگریزی زبان سیکھ لیں اور اگر کوئی محاورہ یا لفظ ان کی سمجھ سے باہر ہو تو بلاتردد اس مختصر سی لغت میں انھیں مل جائے ۔ فی نفسہ یہ کام بہت اچھا تھا اور آسان انگریزی کو ہندستان میں پھیلانے کا ذریعہ بن سکتا تھا' لیکن بدقسمتی سے ہندستان کے ڈائرکٹر مسٹر مائرز ہندستانی زبان سے قطعی بےبہرہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اس کوشش کا نتیجہ سعیٔ لاحاصل معلوم ہوتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ اس لغت کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ ہندستانی زبان کے حدود کو متعین کرتی ۔ لیکن نگران کا یہ فرض اولین تھا کہ وہ جان لیتا کہ ہندستانی زبان کہتے کسے ہیں ؟ خود انگریزی زبان میں ہندستانی کی اتنی کافی کتابیں موجود ہیں کہ تھوڑی سی زحمت میں متعدد کتابیں اور لغتیں ڈائرکٹر صاحب ملاحظہ فرماسکتے تھے اور سمجھ سکتے تھے کہ اردو ہندی کا جھگڑا محض چند تنگ نظر اور رجعت پسند لوگوں تک محدود ہے ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ « ہندستانی » اس زبان کو کہتے ہیں جو شمالی ہندستان کے شہروں اور قصبوں کی عام زبان ہے اور ہزار سال سے بنتے سنورتے اس درجہ تک پہنچی ہے کہ گھر گھر بولی جاتی ہے اور جنوبی ہندستان میں بھی سمجھی جاتی ہے ۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ پھر ہندی کسے کہتے ہیں ' تو اس کا جواب بہت آسان ہے ۔ یعنی اگرچہ ہندستان کی ہر بولی ہندی ہے ' کوئی مشرقی (بنگالی ' اڑیہ ' آسامی) کوئی مغربی (برج ' پنجابی ' پشتو ' سندھی) اور کوئی جنوبی (تامل' تلنگی ' کنڑی' ملایلم) ۔ لیکن عرف عام میں اب ہندی بولیاں

دو ہی تسلیم کی جاتی ہیں - ایک برج بھاکھا جو سری کرشن جی کی سر زمین اور مہابھارت کی یاد دلاتی ہے اور دوسری اودھی جو رام چندر جی کی راجدھانی اجودھیا اور رامائن کی یادگار ہے - ان دونوں سر زمینوں میں جو بولیاں رائج ہیں وہ واقعۃً ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے بہت مقدس ہیں - لیکن ان میں کوئی لٹریچر نہیں ہے - اور دیہات کی ابتدائی اور معمولی ضروریات کے علاوہ کوئی ادبی یا تجارتی کام ان سے نہیں لیا جا سکتا - اس بولی کو جہاں بھی تمدنی ضروریات سے واسطہ پڑتا ہے یہ اردو ہوجاتی ہے -

اس کے علاوہ جس طرح دوسری ہندیوں کا لٹریچر اور شاعری صرف سنسکرت کے طرز بیان اور عروض تک محدود ہے اسی طرح برج اور اودھی بھی ایک تنگ اور مختصر دائرے میں عرصے تک رہنے کے بعد مردہ ہورہی ہیں - اس پر ستم یہ ہورہا ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کو فطری طریقہ پر ترقی کرنے کا موقع دیا جائے ان ہندی بولیوں کے دوست‌نما دشمن پھر اس کی گرامر کو پانی‌نی کے ویاکرن میں جکڑنا چاہتے ہیں اور فارسی کی پرکیف اور روح پرور نغمہ سنجیوں تک پہنچنے کا راستہ روکے کھڑے ہیں -

بعض کم علم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ فارسی مسلمانوں کی زبان ہے، حالانکہ وہ بھی اتنی ہی ہندی ہے جتنی سنسکرت سے نکلی ہوئی کوئی پراکرت ہوسکتی ہے - ہندستان کی زبانوں سے اس کا اتنا قریبی تعلق ہے کہ خود سنسکرت کا بھی باقی نہیں - مختلف ہندیوں اور بنگالی کی طرح فارسی میں تذکیر و تانیث کا جھگڑا نہیں ہے - لیکن سنسکرت میں ایک حد تک اور برج اور اودھی میں تو انتہائی طور پر یہ چیز موجود ہے - پھر اضافت کا جو طریقہ فارسی میں ہے وہی بنگالی برج اور اودھی میں ہے - سب پر طرہ یہ کہ افعال اور افعال میں مخصوص طور پر مضارع، جیسا فارسی میں ہے ویسا ہی ہندستان کی ہر مشرقی اور مغربی ہندی میں موجود ہے - مثلاً طرز تحریر کو چھوڑکر اگر ہم صرف طرز ادا پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ فارسی میں آید کو (آئے)، رود کو (روے)، خورد کو (خورے) کہتے ہیں اور یہ آج سے نہیں ہزار سال پہلے سے رائج ہے - بابا طاہر عریان کی رباعیات پنجاب سے شائع ہوچکی ہیں اور

اسی طرح لکھی گئی ہیں جس طرح شاعر انھیں بولتا تھا ۔ ملاحظہ ہو :

دلے عوشق بسونے چوب تر بے ۔ سرے سوز سرے خوننا بے ریزے
(دل عاشق بسان چوب تر بہ (باشد) سرے سوزد سرے خوننا بہ ریزد)

اب جو ناقص العلم ارتجاعی یہ چاہتے ہیں کہ الٹی گنگا بہائیں اور ہندستانی زبان کی گرامر بھی بدل دیں تو آئیں اور سب سے پہلے مضارع پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کریں تا کہ نتیجہ یہ ہو کہ حال و مستقبل دونوں برباد ہوجائیں ۔

بہر حال زیر نظر لغت میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک ایسی زبان تصنیف کی جائے جو ہندستان میں کہیں بولی نہیں جاتی ۔ یہ نہ ہندی ہے نہ اردو، نہ وہ عام زبان ہے جسے ہندستانی کہتے ہیں ۔ اس میں مسلسل یہ کوشش نمایاں ہے کہ ہندستانی زبان کے روزمرہ کے عام اور رائج لفظوں کو ترک کیا جائے اور ایسے سنسکرت لفظ لائے جائیں جو خود بنارسی ہندی تصنیف کرنے والے بھی نہیں بولنا چاہتے ۔ جہاں تک ہندستانی زبان کے محاورات کا تعلق ہے وہ بھی عجیب و غریب ہیں ۔

ترجمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہندستان کے کسی صاحب نے ترجمہ میں مدد دی ہے جن کا پیشہ غالباً وکالت ہے یا وکیلوں کی بہت زیادہ صحبت رہتی ہے اس لیے کہ انھوں نے جن لفظوں کو سب قومی (International) تسلیم کیا ہے وہ یورپ کے اعتبار سے بھی 'سب قومی' نہیں چہ جائیکہ ہندستان میں وہ سب کی سمجھ میں آجائیں ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے BAR کا ترجمہ « قانون والی سبھا » کیا ہے ۔ لیکن حاشا یہ لفظ یورپ میں اب اتنا ہی عام اور سب قومی ہے جتنا خیام و غالب کے زمانے میں تو کیا آج کل بھی ہندستان کے زندہ دلوں کی زبان پر یہ شعر جاری کردیتا ہے :

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق
داوری خواہم، مگر یا رب کرا داور کنم !

پھر ایک اور چیز دکن کی یاد دلاتی ہے، لفظوں کا تلفظ بھی وہی ہے جو وہاں رائج ہے ۔ مثلاً وہاں بیرسٹر کو بیارسٹر یا کیمیرا کو کیامرا، بیگ کو بیاگ لکھتے ہیں ۔

غلطیوں سے تو ہمیں زیادہ اختلاف نہیں، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے تصنیف کرے اور تاریخ ادبیات میں ایک نئے صنف سخن کے بانی کی حیثیت سے جگہ بنالے، لیکن اس کے کیا معنی کہ جو محاورے مستقل طور پر اپنی جگہ بناچکے ہیں اور بظاہر متضاد و معکوس معنوں پر حاوی معلوم ہوتے ہیں ان کی ضد میں آپ ایک نیا محاذ قائم کریں۔ لوگ نارنگی کو «رنگی» اور گاڑی کو «چلتی» کبھی نہ کہیں گے، خواہ ان کا لغوی مفہوم کتنا ہی معکوس ہو اور میاں کبیر داس کتنا ہی روئیں!:

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں یہ دیکھ کبیرا رویا

آپ فرماتے ہیں کہ آنکھ ڈالنا یا آنکھ مارنا محبت کی نظر کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کھنچنا بمعنی محبت و کشش بتاتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے کہ آخر کوئی کیوں بک گیا:

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

بنیادی انگریزی کے رائج کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ نہ صرف انڈوایرین بلکہ ہزاروں سامی لفظ مشرق سے مغرب تک کا سفر کرچکے ہیں۔ گرد راہ نے بعض کے خط و خال بالکل بدل دیے ہیں اور بعض اب تک اسی طرح قائم ہیں۔ جو لوگ لسانیات کی صوتی تبدیلیوں سے ذرا بھی واقف ہیں وہ نیچے لکھے ہوئے لفظوں کی اصلی صورت فورا پہچان لیں گے اور ہندستانی زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کی زبان حال سے داد دینے لگیں گے۔ کاش ترجمہ کرنے والوں نے ہندستانی زبان کا یہ پہلو نظر انداز نہ کیا ہوتا!

انگریزی				ہندستانی
ABCD	—	—	—	ابجد
EFG	***	***	HVZ	ہوز
H*J	H*Y	***	HTY	حطی
KLMN	****	****	****	کلمن
P	B	F	V	ف
QRST	****	****	****	قرشت

انگریزی				هندستانی
X	*	*	KSH	خص
ABLE	AABLE	QABEL	QABIL	قابل
ARCH	ARC	ARG	ARGG	ارگ
BABY	***	***	BABA	بابا
BAD	***	***	***	بد
BAND	***	***	***	بند
BASIN	*	*	BASAN	باسن
BE	B	BUDAN	BOODAN	بودن
BERRY	*	*	*	بیری
BIRD	PARD	*	PARIND	پرند
BODY	*	BADAN	*	بدن
BROTHER	*	(BHARATA)	*	برادر
By	*	*	BA..BE	به
CHALK	***	***	KHAAK	خاک
CHEMISTRY	*	AL-CHEMY	**	کیمیا
COME	C..OME	OME	OMAD	آمدن
COMMON	C..OMM	OME	AAM	عام
COTTON	*	*	*	قطن
COUGH	*	KAF	*	کف
CREDIT	CRED	QARAD	*	قرضه
CRIME	JRIME	JARAIM	(JURM)	جرم
CRY	QARA..A	**	(QARA..A)	قرأت
CUT	KAT	QAT		قطع ۔ کٹنا
DARK	DAREK	TAREK	TAREEK	تاریک
DAUGHTER	DOCHTAR	DUKHTAR	*	دختر

انگریزی				هندستانی
DEEP	DWEEP	DO..AAB	DO AAB	دوآب
DEGREE	DIJREE	DER JA	DAR JAH	درجه
DIS..COVER	COVER	KOFER	KAFAR	کفر
BITTER	PITTER	PITTA	PIT	پت
BOIL	BUBULA	*	U..BAAL	ابال
BONE	*	*	BONG	بونگ
BRAIN	PRAIN	PRAAN	*	پران
CARRIAGE CART CAR		GARRI	GARII	گاڑی
CRACK	*	*	TARAQ	ترقنا

انگریزی	هندستانی	انگریزی	هندستانی	انگریزی	هندستانی
Danger	ڈر	Door	در - دوار	Earth	ارض
Eye	عین - آنکھ	Father	پدر - پتا	Far	پار - پرے
Feather	پر	Finger	انگل	Flower	پھول
Fiction	فسانه	Foot	پد	Full	پُر - پورا
Go	گیا (جانا)	Grain	غلّه	Grass	گھاس
Grip	گرفت	Group	گروه	Guide	قائد
(H) . Hand	هاتھ	Had	هتھا - تھا	Heart	هردے
Here	یہاں	(I) Ice	یخ	In, Enter	اندر
Judge	جانچ	(K). Key	کنجی	Knot	گانٹھ
Jewel	جواهر	Knowledge	گیان	(L) Look	لکھنا (پوربی)
Laugh	لاف	Lip	لب	Love	لوبھ
Matter Material Metal	مادّه	Man	منش - مانس	Meat	ماس
Middle	منجھ - مدھے	Mother	ماتا - مادر	Mind	من
Mouth	منھ	Month	ماه	Mister	مرزا

ہندستانی	انگریزی	ہندستانی	انگریزی	ہندستانی	انگریزی
نہ - نہیں	No, Not	نارنج	Orange	ناتھ (نا)	Net
بر - اوپر	Over	پاپڑ	Paper	پیڑ	Pain
فرد - پرت	Part	پانا	Pay	پاستان	Past
پرش	Person	با-ران	-rain	بوند	Point
رسید	Receipt	ارز	Rice	راحت	Rest
راست	Right	رم (کردن)	Run	راہ	Road
زند	Sand	شخص	Sex	نشست	-seat
شرم	Shame	کرتا	S-kirt	چھوٹا	Short
ایسا	So	ستارہ	Star	صاف (کنندہ)	Soap
شکر	Sugar	صراط	Street	صوت	Sound
طال - طول	Tall	سپرلئی (پشتو)	Spring	(زمئی، زمستان)?	Summer
آواز	Voice	ترکیب	Trick	تو - تب	Then
نام	Name	جوان	Young	بول	Word

یہ تو صرف سطحی طور پر انگریزی کے چند صد لفظوں کا ہندستانی سے تقابل تھا۔ اگر پوری انگریزی لغت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم نہیں کیا کیا انکشاف ہوں۔

اب ہم ذیل میں اس لغت کے صرف حرف الف (A) پر نظر ڈالتے ہیں اور جو ترجمے مترجم صاحب نے دیے ہیں ان کے لیے ہندستانی زبان کے محاوروں کے مطابق ترجمے درج کرتے ہیں۔

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
A	ایک	کوئی - ذرا
A	....	ایک - کچھ
Give it a pull	اسے کھینچو	ذرا اسے کھینچو
ABLE	اچھا	قابل
enough	بس	کافی

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
be right ABOUT the facts	ٹھیک واقعے جاننا	واقعات کے متعلق صحیح معلومات رکھنا
goods ON ACCOUNT	حساب میں مال	سامان قرض لینا اور بہ اقساط ادا کرنا
ACID look	تیز نظر	غصہ کی نظر ، تیکھی چتون
Material	چیز	مادّہ
ADDITION	جوڑ - بڑھانا	میل - اضافہ
in addition to this	اس کے سوا	اس کے ساتھ ساتھ
ADVERTISEMENT	(وگیاپن)	(پرچار)
go AFTER a rat	چوھے کے پیچھے جانا	چوھے کا پیچھا کرنا
AFTER ALL they were young.	پھر بھی وہ بچے تھے	آخر وہ بچے ھی تو تھے
AFTER-taste	پیچھے کا مزہ	(اثر)
AGAINST	(وردھ)	خلاف - مقابلہ میں
fighting AGAINST an army.	فوج کے خلاف لڑنا	ایک پوری فوج سے لڑنا
AGREEMENT	میل - سمجھوتا	اتفاق - معاھدہ
come to an AGREEMENT.	سمجھوتا کرلینا	آپس میں طے کرلینا
A year	برس کو	سالانہ
un-Able	اچھا نہیں	ناقابل
trees	جھاڑ	درخت - پیڑ
ABOUT history	تاریخ پر کتاب	تاریخ کی کتاب
looking ABOUT for a place.	جگہ دیکھنا	جگہ تلاش کرنا
ACID	تیزاب - تیز	ترش - کھٹا (بھی)

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
ACROSS	پار	آر پار
ACT	(کریا)	(کرم)
a good ADDITION	اچھی چیز بڑھانا	ایک اچھا اضافہ
bad at ADDITION	جمع کرنے میں خراب	جمع کرنے میں کمزور
ADJUSTMENT	ٹھیک لگانا - برابر کرنا	ٹھیک کرنا - درست کرنا
Public attention.	اشتہار	عام توجہ
a picture AFTER Rambrandt.	رامبران کی کاپی	ایسی تصویر جس میں رامبران کی پیروی کی گئی ہو -
AFTER-thought	بعد کا خیال	بعد کی توجیہ
resting AGAINST the wall.	دیوار سے لگی ہوئی	دیوار کے سہارے
be AGAINST change.	بدلنے کے خلاف ہونا	تبدیلی کے . . . .
be in AGREEMENT with	ساتھ ہونا	اتفاق کرنا
AIRED	ہوا کرنا	ہوا دکھانا
(a) behaviour	چال	چلن
foolish AIRS	بے سمجھی کی چال	اِترانا
All	سب	سب - کُل
At ALL times	سدا	ہمیشہ
All in black	پورا کالا	کل سیاہ رنگ میں
All right	بالکل ٹھیک	درست - اچھا
for ALL that	ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے	باوجود ان کے
ALMOST a man	قریب قریب آدمی	تقریباً جوان

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
AMONG books	کتابوں میں ہونا	کتابیں پڑھتے ہوئے ہونا
make a division among	میں تقسیم کرنا	میں فرق (امتیاز) کرنا
AMOUNT	روپیہ - مقدار (پریمان)	رقم
AMUSEMENT	دلگی - مزہ (بڑے مزے کی شب وصل دلگی ہوگی)	تفریح - لطف
AND so on	اور اسی طرح	علی ہذاالقیاس
AND saw *him*	اور اسے دیکھا	اور اس سے ملا
looking at picture from different ANGLE	تصویر کو دوسرے خیال سے دیکھنا	تصویر کو دوسرے زاویہ سے دیکھنا
ANGRY	غصہ (کرودھ)	ناراض - خفا
ALL ANIMALS but man (s)	جانور	انسان کے علاوہ سب حیوان
ANSWERING to an account.	بیان کے جیسا ہونا	حلیہ یا تفصیل کے مطابق ہونا
ANYWHERE	کسی جگہ - کبھی بھی	کہیں - کہیں بھی
an APPARATUS, tax-control	ٹیکس کا آلہ	ٹیکس پر قابو رکھنے کا آلہ
cat is ARCHING its back	بلی اپنی پیٹھ کمان کیے ہوئے ہے	بلی اپنی پیٹھ اٹھائے (ابھارے) ہوئے ہے
AIR of interst	دلچسپی کی صورت	دلچسپی کا انداز
AIR-cushion	ہوا گدا	ہوائی گدی
All the day	پورا دن	دن بھر
All is quiet	ہر چیز چپ ہے	بالکل خاموشی ہے
All but one are bad.	ایک کے سوا باقی سے خراب ہیں	سوائے خدا کے سب گنہگار ہیں
AFTER-all	پھر بھی	بہرحال

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
All the same	پھر بھی	یکساں ۔ باوجودیکہ ۔ تاہم
AMMONIA	امونیا (سب قومی)	نوشادر
AMONG one's friends	دوستوں میں ہونا	دوستوں کی صحبت میں
we have 5 s. AMONG us.	ہمارے بیچ میں ۵ شلنگ ہیں	ہم سب کے پاس ملاکر ۵ شلنگ ہیں
no AMOUNT of interst will be of any use.	کتنی بھی دلچسپی کام کی نہ ہوگی	کتنی ہی دلچسپی ہو سب بےکار ہے
AMUSEMENT of Public.	پبلک کا مزہ (دلگی)	پبلک کی دلبستگی(تفریح)
AND then he said	اور تب اس نے کہا	پھر بولا
POINT of view	خیال	زاویہ نظر
Right angles	سیدھا کونا	کھڑا زاویہ
ANIMALS	جانور	جاندار ۔ حیوان
ANSWERING a bell	گھنٹی کا جواب دینا	بلانے کی گھنٹی سن کر ملازم کا جواب دینا
He is not ANY wiser	اس کو کچھ سمجھ نہیں آئی	اسے کوئی تجربہ حاصل نہ ہوا
APPRATUS	(ینتر)	(جنتر)
ARCHER	(کمانی)	تیرانداز
ARGUMENT	بحث	دلیل
a good ARGUMENT	ایک اچھا سبب	ایک عمدہ دلیل
with open ARMS	بازو پھیلائے ہوئے	خندہ پیشانی سے
an ARMY of boys	لڑکوں کی ایک فوج	لڑکوں کا گروہ

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
looked on AS a man	آدمی سمجھ کر	اگر بحیثیت انسان کے دیکھا جائے
it SEEMS	ایسا دکھائی دیتا ھے	ایسا معلوم ھوتا ھے
AS if	جیسے کہ	گویا کہ
AT	میں	پر
AT his request	اس کی مانگ پر	اس کی طلب پر
AT night	رات میں	رات کو
they were BAD AT (Languages)	وہ زبان میں خراب تھے	زبانوں کے سیکھنے میں وہ کمزور تھے
,, ,, GOOD AT ,,	" " " اچھے تھے	" " " اچھے تھے
,, ,, QUICK AT ,,	" " " تیز تھے	" " " تیز تھے
,, ,, SLOW AT ,,	" " " سست تھے	" " " سست تھے
,, ,, EXPERT AT ,,	" " " استاد تھے	وہ زبانوں کے ماھر تھے
,, ,, WORKING AT ,,	وہ زبان پر کام کررھے تھے	وہ زبانوں کی تحقیق کررھے تھے
AT a run	ایک بھاگ میں	ایک دوڑ میں
AT pleasure	جب خوشی ھو	جب جی چاھے
a new line of ATTACK	حملہ کی نئی چال	حملہ کی نئی ترتیب
wounded in the ATTEMPT	کوشش میں زخم آگیا	کوشش کے دوران میں زخمی ھوگیا
Attraction	کھنچاؤ (کھینچنا)	کشش
their ATTRACTION to one another	ان کا ایک دوسرے سے کھنچاؤ	ایک دوسرے سے (محبت) و کشش

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
Higher Authority	بڑے حاکم	حاکم بالا (اعلیٰ)
AUTOMATIC	سب قومی - آپ چالو	خود رو
WIDE-AWAKE	بہت جاگا ہوا	چوکنّا
his ARGUMENT was	اس کی بحث یہ تھی	اس کی دلیل یہ تھی
nation in ARMS	ہتیار سے تیار قوم	قوم جو لڑائی کے لیے تیار ہو
ART	گن - کام (ویدھی)	فن - ہنر (گُن) سلیقہ
AS an example	جیساکہ	مثلاً - جیسے
so as to	اس لیے کہ	تاکہ
ASBESTOS	(سب قومی) ؟	(کوئی دھات ہے)
AT 4	چار پر	چار بجے
AT war	لڑائی پر	جنگ میں
At times	کسی کسی وقت	کبھی کبھی
knowledge at first hand	پہلے آدمی سے علم	تازہ معلومات
have a GO AT	کوئی کام کرنا	حملہ کرنا
3 AT a time	ایک وقت میں تین	ایک ہی دفعہ میں تین تین
get AT details	تفصیل کا کھوج لگانا	تفصیلات تک پہنچنا
AT tables	میزوں پر	دسترخوان پر کھانے کی حالت میں
AT sea	سمندر میں........	حیرت و تعجب میں ہونا
make EYES AT	آنکھ ڈالنا - آنکھ مارنا	محبت سے دیکھنا
ATTEMPT	(پریتن)	(پرجتن)

انگریزی	ترجمہ	تصحیح
Attention	خیال	توجہ
She has no ATTRACTION off the stage	اسٹیج سے باہر اس میں کوئی کھنچاؤ نہیں	اسٹیج سے باہر اس میں کوئی کشش نہیں
Authority	استاد ۔ حاکم	ماہر ۔ بااختیار
an AUTHORITY on the Great War.	بڑی لڑائی کا استاد (یا) بڑی لڑائی پر سند	جنگ عظیم کا عالم
Awake	جاگا ہوا	بیدار، جاگتا ہوا، جاگتا

اب تک ہم نے صرف حرف (A) کی جدول پر نظر ڈالی ہے ۔ پوری کتاب کو (Z) تک درست کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ایک نئی کتاب لکھ دی جائے، جو نہ تو ضروری ہے، نہ اس رسالے میں اس کی گنجائش ہوسکتی ہے ۔ لیکن قارئین " اردو " پر ظلم ہوگا اگر صرف خشک علمی مباحث ہی ہمیشہ پیش کیے جائیں اور وہ ان مطائبات سے محروم رہ جائیں جو غالباً غیر ارادی طور پر اس لغت میں پیدا ہوگئے ہیں ۔

یہ چیزیں کچھ زیادہ عجیب نہیں ہیں ۔ عام رواج کے خلاف یا فطری اصولوں کے " وِرُدھ " جب کبھی کوئی ادبی کوشش کی جاتی ہے تو نہ جانے کیوں ہمارے اعصاب پر ایک خاص اثر پڑتا ہے ۔ اگر یہ اثر اس انداز سے پڑے کہ دماغ میں پے در پے مخصوص لہریں پیدا ہونے لگیں تو اکثر آنتوں میں بل پڑجاتے ہیں اور حلق سے عجیب غریب آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں ۔ یہ اعصابی مظاہرہ جس میں دل و دماغ کا بھی اشتراک ہوتا ہے صرف انسانوں تک محدود ہے جس کی وجہ سے عہد حاضر کے ماہرین نفسیات نے ارسطو کی قدیم تعریف کو مسترد کردیا ہے اور انسان و حیوان میں تمیز کرنے والی چیز " عقل " نہیں بلکہ صرف " ہنسی " کو قرار دیا ہے ۔ آپ خود غور فرمائیں تو معلوم ہوجائے گا کہ جانور اکثر روتے ہوئے پائے گئے ہیں، لیکن ہنسنے والا جانور سوائے انسان کے اب تک کوئی نہیں ملا ۔

شاعر کپلنگ (Kipling) نے بنگالیوں کی انگریزی کو بابو انگلش کا نام دیا تھا - یہ انگریزی زبان کی ادبیات میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے - اس نے جو جو کاوشیں اس صنف زبان کو سمجھانے میں کی ہیں وہ قابل داد ہیں اور عرصہ ہوا کتابی صورت میں شائع بھی ہوچکی ہیں - یہ کتاب آپ کی دسترس سے باہر ہو تو رابنسن کروسو (Robinson Crusoe) میں فرائی ڈے کی زبان پڑھ لیجیے لیکن اگر آپ یہ زحمتیں نہیں اٹھانا چاہتے تو مندرجہ ذیل الفاظ اور جملوں ہی سے لطف اٹھائیے اور کبھی کبھی اس زبان میں بولنے اور ترجمہ کرنے کی بھی کوشش کیجیے - یہ خیال رہے کہ یہ ڈکشنری زیادہ تر آپ کو ترجمہ کرنے میں مدد دینے کے لیے تیار کی گئی ہے - لفظی ترجمہ کی وہ صنف اس جدید کوشش سے بالکل الگ شے ہے جسے اب ہم گلابی اردو سے موسوم کرتے ہیں - نہ یہ اس قسم کا بالکل لفظی ترجمہ ہے جو کبھی کبھی اسکولوں کے شریر لڑکے تفریحاً کرتے رہتے ہیں - مثلاً کمبل کا ترجمہ (کم = تھوڑا = Less) ' (بل = طاقت = Power) Less - power - " چکر کھانے " کا ترجمہ Eating Circles - یا " لا لا دل سکھ رائے چاندنی چوک میں مرگئے " کا ترجمہ :- Bring bring Heart-Comfort-Opinion Moonlight-square in die went .

بلکہ نیچے لکھے ہوئے ترجمے اس ہندستانی زبان کا نمونہ ہیں جو بقول مترجم " ہندستان کے اُتر میں " (یعنی نیپال ' تبت ' چین وغیرہ میں) " عام میل جول اور بات چیت کا ذریعہ ...... ہے " اس لیے ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے اگر ان ملکوں کے لوگ اتنی بھی ہندستانی بول لیتے ہیں - (دیکھیے " بیسک ہندستانی " پہلی کتاب - پہلی سطر " مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا پریس - بمبئی)- بہر حال ہم چند نمونے درج ذیل کرتے ہیں - افسوس ہے کہ ہم پوری کتاب پر تنقید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے - صرف ساٹھ صفحوں تک سرسری نظر میں جو کچھ مل گیا ہے وہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے حاضر ہے :-

(نوٹ) شروع سطر میں جو عدد دیا گیا ہے وہ اس صفحہ کا نشان ہے جس میں یہ لفظ یا فقرہ مل سکتا ہے :-

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
(۱۷) بچے کو روگ ہے	بچہ بیمار ہے
بچہ کی گاڑی	چھوٹی گاڑی
کتاب کی پیٹھ	کتاب کی پشت
پھر روپیہ لے لینا	روپیہ واپس پانا
پیچھے کی جگہ	دُم - پچھلا حصہ - بعد والا
پیچھے کا دروازہ	خفیہ طریقے - پوشیدہ ترکیبیں
پھر آنا	واپس آنا - لوٹ آنا
پیچھے سے آواز دینا (یا نکالنا)	آواز کو اصلی حالت پر واپس لانا یا آواز کے جواب میں آواز دینا
(۱۸) بہت برا قرضہ	ایسا قرضہ جس کے واپس ملنے کی امید نہ ہو
ایک خراب کتاب	ایک بری کتاب
کل دودھ خراب ہوجائے گا	کل دودھ کھانے کے قابل نہ رہے گا
پینے کے سبب سے اور بھی خراب	پینے کے لیے تو اور بھی برا
زبان میں خراب	جو شخص زبانیں سیکھنے میں دقت محسوس کرے (یا) زبانیں سیکھنے میں ہیٹا
بیاگ پائپ	بیگ پائپ یا بین
وزن - کانٹا	ترازو - کانٹا
(۱۹) خیال برابر نہ رکھنا	اپنا توازن کھودینا
لڑکی کے پاس ایک گولا ہے	لڑکی کے پاس گیند ہے
بار - قانون والوں کی سبھا	میخانہ - بھٹی - (بار)

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
(۲۰) نہانے کی جگہ	حمام - غسلخانہ
(۲۱) یا یہ کہو	یعنی
سندر - (نہ سندر)	حسن - (قبح) خوبصورت - بدصورت
اپنے قاعدے کے سبب سے اچھا	اپنے قواعد کے اعتبار سے بہترین
(۲۲) ندی کی تہہ گہری ہے	دریا گہرا ہے
جج کے آگے	جج کے سامنے - جج کے روبرو
(۲۳) ان کے عجیب عجیب ایمان تھے	اُن کے عجیب عجیب عقیدے تھے
(۲۴) واقعے کے بیچ کا وقت	واقعات کے درمیان کا زمانہ (وقفہ)
چڑیا نظری (Bird's eye view)	سرسری نظر - عام نظر
(۲۵) جنم جگہ (Birth place)	جائے ولادت - پیدائش کی جگہ - جنم بھوم
جنم نمبر (Birth rate)	تعداد پیدائش
جنم حق	پیدائشی حق
(۲۶) کاٹ سے زخم	دانت مارنے کا زخم
کالی چڑیا	کوئل
دھات کی کالی پالش	جستۂ سیاہ (جو پنسلوں میں ہوتا ہے)
(۲۷) رکت	لہو (خون)
(۲۸) مرا ہوا	مردہ - نعش - لاش
اچھا بدن رکھنا	تندرست بدن
(۲۹) جگہ لینا	(ریل یا کسی اور جگہ کے) ٹکٹ خرید کر نشستوں کو محفوظ کرنا
(۳۰) اس کے بالکل بھیجا (دماغ) نہیں ہے	وہ ذرا بھی عقل نہیں رکھتا
(۳۱) روٹی اور مکھن	دال بھات
سانس ٹوٹ جانا	سانس پھول جانا (چڑھ جانا) بیدم ہوجانا

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
(۳۲) برابر نہ سونا	اچٹی ہوئی نیند
یہ آدمی ناس ہوگیا	وہ آدمی برباد ہوگیا
روٹی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی	روٹی سڑ گئی
(۳۳) بہن کا مرد	بہنوئی ۔ برادر نسبتی
اپنے بالوں میں برش کرنا	اپنے بالوں میں کنگھی کرنا (سنوارنا)
(۳۴) غصہ کرنا	خفگی کی شدت ۔ غصے کا زور
بجلی کا گولا	بلب (Bulb) ۔ بجلی بتی
(۳۵) تمھیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے	تم سے مطلب ! تمھارا اجارہ ! تم ہوتے کون ہو !
آدمیوں کے دماغ نہ ہو تو وہ جانور جیسے ہیں	انسان بھی حیوان ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ انسان کے عقل ہوتی ہے
(۳۶) چھاچھ	خالص دودھ (جس سے مکھن نہ نکالا گیا ہو)
انشورنس ہونے سے	بیمے (انشورنس) کی وجہ سے محفوظ
(۳۷) کل آجاؤ	کل تک آجاؤ
(۳۸) کافی خانہ ۔ کیلنڈر	قہوہ خانہ ۔ جنتری
(۳۹) کرایہ پہلے دے کر بکس بھیجو (Carriage forward)	پیشگی کرایہ نہ دے کر بکس بھیجو (محصول طلب)
پہلا سبب	خالق ۔ پروردگار
(۴۰) ڈوور کی چاکی پہاڑی	ڈوور کی خاکی (یا کھریا مٹی کی) چٹانیں
(۴۱) پیسے	ریزگاری
(۴۲) بڑا (Chief)	سردار ۔ چیف
(۴۳) چرچ ایک انتظام ہے	"چرچ" مذہبی گروہ بندی کے نظام کا بھی نام ہے ۔
۔ چرچ میں نوکر ہونا	پادری بن جانا

کیا ترجمہ کیا گیا ہے	کیا ہونا چاہیے
کام کے بعد بالکل صاف کردینا	کام کے بعد چیزوں کو درست کرنا
(۴۴) الگ رہنا	بچ نکلنا
(۴۵) رنگ کا نیا کوٹ کاکٹیل - کوناک (؟ ؟)	کسی چیز پر نیا رنگ پھیرنا (شراب کی قسمیں)
(۴۶) ٹھنڈ ہونا	زکام ہوجانا
(۴۷) یہ میری آس کے برابر آتا ہے	یہ میری امیدوں کے مطابق ہے
(۴۸) میرا لڑکا مجھے سکھ دیتا ہے	میرا لڑکا میری راحت کا باعث ہے
(۴۹) وہ جلسوں میں ساتھی کے لیے جاتی تھی	وہ جلسوں میں اس لیے جاتی تھی کہ وہاں لطف صحبت حاصل ہوتا تھا
(۵۰) پیچ والے خیال کا آدمی	سنکی آدمی - خبطی
(۵۱) جاننا	ہوشیار ہونا
(۵۲) کھانا اچھا ہے	کھانا اچھا پکا ہے
(۵۳) دیس میں کھیت	دیہات کا کھیت
(۵۴) آڑ میں ہوجاؤ	(فوجی اصطلاح) کسی چیز کی آڑ لینا
(۵۵) ساکھ پر	قرض دینا (جس میں باقساط روپیہ ادا ہو)
(۵۶) چالو - دھار	رائج - رواں - لہر
(۵۷) روٹی کاٹی گئی	روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے
(۵۸) بیٹے کی عورت (استری)	بہو - (یعنی پوت کی جورو!)
(۵۹) میرا پاؤں سوکھ گیا ہے	میرا پاؤں سن ہوگیا ہے
(۶۰) اس کی آس کی موت	اس کی امیدوں کی پامالی (پر پانی پھرجانا)

تفریح کی ایک حد ہوتی ہے - غالباً ساٹھ صفحوں کی اس ادبی داستان سننے کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش نہ ہوگی کہ اس افسانے کا انجام کیا ہوا -

بنیادی انگریزی جیتی یا بنیادی ہندستانی ؟ یا دونوں

«ہندستان کے اثر» میں رائج ہوگئیں ؟! - (م-ا-خ)

نظم اردو

مصنفہ جناب سید ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی - تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ - صفحات ۱۲۰ + ۴۵ - قیمت دو روپے - ناشر : مصنف ۱٦ کنٹونمنٹ روڈ، لکھنؤ -

کتاب کے شروع میں بہت سے مشاہیر ادیبوں کی رائیں، کشفی صاحب کی تحریر بہ طور تعارف، پیش لفظ اور مصنف کا دیباچہ ہیں - ناطق صاحب خود ملک کے مشہور ادیبوں میں سے ہیں - یہ تحریریں اس مہتم بالشان تصنیف کی وقعت کا اعتراف ہیں۔

ناطق صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ملک کے ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے - اصل کتاب مسدس کی صنف میں ہے اور قریباً ہر بند پر اور کہیں کہیں ہر مصرع کے موضوع پر مفصل حاشیہ ہے - یہ حاشیہ بہ جائے خود ایک علیحدہ کتاب کا حکم رکھتا ہے جسے اردو اور اس کے متعلقات کے بارے میں واقفیت کا گراں قدر ذخیرہ کہنا چاہیے -

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اردو نظم میں مسلسل اور مربوط کلام کی گنجایش اور استعداد نہیں - زیر نظر تصنیف اس خیال کی زبردست تردید ہے - جس تسلسل اور وضاحت سے اردو کی سوانح‌عمری اس نظم میں بیان کی گئی ہے ہر اہل ذوق سے خراج تحسین طلب کرتی ہے - حواشی کے علاوہ جن کا ذکر ابھی آچکا ہے، اس کتاب کی ترتیب میں ایک نہایت پسندیدہ طریق برتا گیا ہے - اصل نظم کا صرف ایک بند بائیں طرف کے صفحہ پر ہے اور اسی صفحہ کے بائیں کنارے پر نمونہ کے طور پر ان شاعروں کے دو چار شعر دے دیے ہیں جن کا ذکر بند میں آیا - حواشی نے داہنی طرف کے پورے صفحہ پر قبضہ کیا ہوا ہے - گویا ایک کتاب میں تین کتابیں مشتمل ہیں -

اس پیچیدہ مسئلہ کو کہ اردو کہاں پیدا ہوئی اس طرح نبٹاتے ہیں :-

دہلوی بازار اردو میں خریدار زباں دکھنی دربار تغلق میں گہر بار زباں
عہد محمودی سے ہے پنجاب سرکار زباں بودھ تک پہنچے بہاری لے کے زنّار زباں

اک مورخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی ملک میں تاریخ سے "پہلے زباں پیدا ہوئی

(بند کے چاروں مصرعوں پر مفصل نوٹ ہیں) - آج کل ہر معاملے میں ملّی اور سیاسی پخ نکالی جاتی ہے اور اس زبان اور کلچر کی ذرا پروا نہیں کی جاتی جو ہمارے ہندو اور مسلمانوں کے بزرگوں نے صدیوں کی کوشش سے پیدا کی تھی - لوگ رواداری اور باہمی اتحاد کو معاشرت سے نادانستہ خارج کررہے ہیں - اسی ضمن میں فرماتے ہیں :-

میل میں صبح عرب سے کب تھی شام ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم
دلربائی کو بتان ہند پہنچے تا حرم
ہوگئے تھے ایک مل‌کر کعبہ و بیت‌الصنم

منسلک آپس میں تھے شیخ و برھمن اس طرح
ہم بغل ہم‌دوش ہو چولی سے دامن جس طرح

(اس بند کا حاشیہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے)- جو لوگ زبان، کلچر اور معاشرت کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہیں، غلطی پر ہیں - اور اداروں کی طرح بعض حضرات مقامی اور صوبائی تفریق و امتیاز اور مرکز و غیر مرکز کے پھیر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں ناطق صاحب اس سے بالاتر معلوم ہوتے ہیں - وہ اردو میں لکھنؤ کے اجتہاد کو یا اسے جو چاہے کہیے مصحفی سے منسوب کرتے ہیں - چنانچہ لکھا ہے :-

لکھنؤ میں راہ اک نکلی نئی تعلیم کی
مصحفی نے اک نظام خاص کی تنظیم کی
ان کے شاگردوں نے جو تنسیخ یا ترمیم کی
ملک کے ہر ناظم و ناثر نے وہ تسلیم کی

صاف ہوکر اب زباں کے شعلے دلکش ہوگئے
جملہ منسوخاتِ ناسخ نذرِ آتش ہوگئے

ناطق صاحب آج کل کی زبانی جنگ زرگری سے متاثر تھے جب انھوں نے اس نظم کو ختم کیا۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ ملک کے ہر بھی خواہ کے ایسے ہی احساسات ہونے چاہییں ۔ کہتے ہیں :

آج کل پینتیس کروڑ افراد میں اردو زباں
اس طرح ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں

لیکن اگر یہ بتیس یا ان میں سے کئی دانت اس زبان کا قیمہ کرسکتے ہیں تو یاد رہے کہ وطن کا منہ زبان کے بغیر رہ‌جائے گا۔ وہ گونگا ہوجائے گا۔ ہم ناطق صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اردو کسی کے منہ کا نوالہ نہیں ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ برادران وطن اجتماعی طور پر سیدھے راستے پر آجائیں گے اور فضا صاف ہوجائے گی۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ یہ کتاب چونکہ زبان کے متعلق بے شمار واقعات اور کوایف پر حاوی ہے اس لیے کہیں سہو ہوجانا بڑی بات نہیں۔ جیسے صفحہ ۴۲ میں امیرخسرو کا مولد پنجاب لکھا ہے۔ یہ مغالطہ یوں ہوا کہ وہ پٹیالی کو جو ان کا مولد ہے پٹیالہ سمجھ‌کر پنجاب لکھ گئے۔ پٹیالی ضلع ایٹہ قسمت آگرہ کا ایک مشہور قصبہ ہے جس کی وضاحت قدرت‌اللہ شوق نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں کردی تھی۔ امیرخسرو منصبی حیثیت سے ملتان ضرور گئے تھے۔ اسی طرح اردو کے سب سے پہلے شعر کا معاملہ وغیرہ ہے۔

شروع میں مصنف نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں اردو شاعری پر تبصرہ ہے اور اس کے بعد قدیم دکنی شعرا کے کلام سے کچھ کچھ اشعار انتخاب کے طور پر لکھے ہیں۔ یہ اشعار اکثر غلط نقل کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے فاضل مصنف کو جگہ جگہ یہ لکھنا پڑا ہے کہ یہ مصرع ناموزوں ہے' یہ شعر مہمل ہے' اس لفظ کے معنے سمجھ میں نہیں آئے۔ وجہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے بعض ایسے حضرات کی تالیفات کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے جو نہ تو اس زبان کو جانتے ہیں اور نہ قلمی کتابوں کو صحیح پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے غلط سلط جو سمجھ میں آیا لکھ دیا۔

چوں کہ اصل تصانیف حکیم صاحب کی نظر سے نہیں گزریں اور انھوں نے دوسروں کی تالیفات پر اعتماد کیا اس لیے یہ غلطیاں واقع ہوئیں ورنہ اصل میں نہ کوئی مصرع غیر موزوں ہے اور نہ کوئی شعر مہمل ہے اور نہ کوئی لفظ ایسا ہے جو بےمعنی ہو - مثال کے طور پر ہم صرف چند اشعار یہاں لکھتے ہیں کیوں کہ اس تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب غلط اشعار کی صحت کی جائے - مناسب یہ تھا کہ جناب حکیم صاحب ساتھ ساتھ ان ماخذوں کا حوالہ بھی دے دیتے جہاں سے یہ کلام نقل کیا گیا ہے - کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کی غلطی مصنف کے سر تھپ جاتی ہے -

ملے ہر حال آکر اجدھا دو
ہوئی دو دھرتے لٹ پٹ بلا دو (ص ۲۷)

حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ " دوسرا مصرعہ اس زمانے کے لحاظ سے بھی ناموزوں ہے"- حقیقت یہ ہے کہ لکھنے والا سمجھا نہیں - یہ لفظ " دو دھر " نہیں بلکہ " دو دھیر " ہے جس کے معنے ہیں دونوں جانب - اب مصرع موزوں ہوجاتا ہے -

" دلیری سوں دیراں ہات میں ہات
ملائے گرز اور ہور شمشیر کے سات (ص ۲۸)

بہت زیادہ ضعف نظم اور اشعار میں ہے - یہاں تک کہ بےمعنی ہوگئے ہیں " - یہ ضعف نظم و معنی محض لفظ دیران کی وجہ سے ہوا - یہ بےمعنی لفظ ہے - اصل میں ہے " دیے ان " - اب معنے صاف ہوگئے - جن صاحب نے اصل قلمی سے نقل کیا وہ صحیح نہیں پڑھ سکے اور بےسمجھے ایک غلط لفظ لکھ دیا -

" زہے مجلس آرائے فن دلفریب
دیانیہ کی یوں مجالس کوں زیب " (ص ۲۸)

دلفریب فن کی صفت ہے - اضافت نہیں رکھی قدیم دکنی شعرا اس کی پابندی نہیں کرتے تھے - " نیہ " کے معنے دل کے نہیں ' محبت اور عشق کے ہیں -

" دسیں ہر ورق بیچ کے خوش چمن
ہر اک بات میں سمیں پھول بن " (ص ۲۸)

حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ " مصرع اولیٰ میں کے زائد ہے' ...... مصرع ثانی ناموزوں ہے' - شعر بہت غلط نقل کیا گیا ہے - یہ " کے " نہیں بلکہ " کئی " ہے اور " کئی " قدیم دکنی لہجے میں " فع " کے وزن پر ہے دوسرا مصرع یوں ہے :

" ہر یک بیت میں کئی سو ہے پھولین "

" ہریک گرچہ مصرع اچھے یک نہال
دل عارفاں کرے طوبیٰ مثال "		(ص ۲۹)

دوسرا مصرع ناموزوں نہیں - غلط نقل کیا گیا ہے - اصل میں یوں ہے :

ولے عارفاں کن ہے طوبیٰ مثال

اب شعر بھی بامعنی ہوگیا اور پہلے مصرع میں " اگرچہ " پر جو اعتراض تھا وہ بھی باقی نہیں رہا -

نہیں شاخ اچھی گرچہ ہریک چمن
جمی ہیں معانی کے میویاں سوں بن		(ص ۲۹)

شعر کی موجودہ صورت میں حکیم صاحب کا یہ فرمانا کہ مصرع اول بے معنی ہے اور " جمی ہیں " (دوسرے مصرع میں) کچھ جمتا نہیں " بالکل صحیح ہے - لیکن شعر بالکل غلط نقل کیا گیا ہے - صحیح شعر یوں ہے :

ننھی شاخ اچھے گرچہ ہریک بچن
خمی ہے معانی کے میویاں سوں پن		(ص ۲۹)

یعنے اگرچہ ہر قول (یا مصرع) ایک ننھی سی شاخ ہے لیکن وہ معانی کے میووں سے جھکی پڑتی ہے -

اے پنچھی پیارے سخن آغاز کر
حمد سوں حق کی بلند آواز کر		(ص ۳۲)

مصرع اولیٰ ناموزوں نہیں ہے - قدیم دکنی تلفظ کے مطابق پنچھی میں ن غنہ ہے - اب پڑھیے مصرع موزوں ہوجائے گا -

لگے مارنے جب سراباں کی موج
جلے جو کدھن تب حرارت کی فوج		(ص ۳۹)

حکیم صاحب کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے " جو کدھن کیا چیز ہے خدا معلوم " جلے بھی غلط ہے - اس میں شاعر کا کوئی قصور نہیں اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے پڑھنے والے ایسے کوڑھ مغز ہوں گے - اصل مصرع یوں ہے :

" چلی چوکدھن تب حرارت کی فوج "

چوکدھن کے معنے ہیں چاروں سمت سے -

غرض اس قسم کے اکثر شعر غلط لکھے گئے ہیں اور اس وجہ سے شعر مہمل اور بے معنی نظر آتے ہیں - اس میں فاضل مصنف نظم اردو کا کوئی قصور نہیں - وہ ماخذ ہی ناقص اور غلط ہیں جہاں سے یہ اقتباسات کیے گئے ہیں -

اسی طرح شعرا کے حالات اور تصانیف کے سنین وغیرہ میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں - سلطان محمد قلی قطب شاہ کے متعلق لکھا ہے کہ اردو میں ان کا تخلص قطب اور فارسی میں معانی ہے - یہ صحیح نہیں - اردو اور فارسی دونوں میں ان کا تخلص قطب ہے - میری نظر سے ان کا اردو اور فارسی کلیات گزرا ہے ، کہیں معانی تخلص نہیں کیا - ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متعلق لکھا ہے : "خود بادشاہ اردو شعر کہنے لگا اور نثر میں ایک کتاب فن موسیقی پر نورس نامہ کے نام سے ایسی لکھی کہ ظہوری کے مقدمے نے اسے سند دوام لکھ دی" - نورس نامہ نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہے اور اس کی زبان بھی اردو نہیں -

افضل کے متعلق لکھا ہے " مولف شہ پارہ نے بارہ ماسہ والے افضل کو جھنجھانوی لکھا ہے اور " پنجاب میں اردو " کے مصنف نے لکھا ہے - جھنجھانہ پنجاب کا ایک قصبہ ہے " - "پنجاب میں اردو" کے مصنف نے جھنجانہ کو پنجاب کا قصبہ کہیں نہیں لکھا - معلوم نہیں حکیم صاحب کو یہ اطلاع کہاں سے ملی - وہ اس کے متعلق لکھتے ہیں " میرٹھ کے قریب جھنجانہ یا جھنجنہ ایک پرانی بستی ہے" (پنجاب میں اردو ص ۱۷۹) جھنجانہ ضلع مظفرنگر کا قصبہ ہے اور میرٹھ سے قریب ہے -

اس قسم کی بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے وہ قابل اعتماد نہیں -

آخر میں ہم حکیم ناطق صاحب کو ان کی وسیع تحقیقات اور اسے فصیح اور سلیس نظم کا جامہ پہنانے پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہر اہل وطن اس تصنیف سے مستفید ہوگا۔

مذہب و اخلاق

فہم قرآن

ندوۃالمصنفین (قرول باغ، دھلی) کے علمی کاموں کا رسالہ اردو میں پہلے ذکر آچکا ہے۔ یہ اس ادارے کی چھٹی کتاب، مولوی سعید احمد صاحب ایم۔ اے کی تالیف ہے اور پاکیزہ خط میں بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ کتاب کے ابتدائی ابواب میں فہم قرآن مجید کی شرائط کی بحث اور بعض جدید تعلیم یافتہ حضرات کی تردید کی گئی ہے جس میں مناظرے کا رنگ غالب ہے لیکن آگے چل کر تدوین حدیث اور محدثین کرام کے حالات لکھے ہیں جو کتاب کا نہایت مفید حصہ ہے اور اسے پڑھنے سے جامد مولویت اور تقلید کے اکثر نظریوں کی از خود اصلاح ہوجاتی ہے۔ ضخامت ۱۹۴ صفحے۔ قیمت مجلد دو روپیہ، غیر مجلد ڈیڑھ روپیہ۔

غلامان اسلام

ندوۃالمصنفین کے سلسلے کی ساتویں کتاب جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اسلام نے غلاموں کا رتبہ کس درجہ بلند کیا اور ان میں کیسے کیسے جلیل القدر اہل علم و فضل پیدا ہوئے جن کو ملت اسلامی آج تک اپنے سب سے محبوب و محترم بزرگوں میں شمار کرتی ہے۔ کتاب میں ایسے چھہتر مشاہیر کے حالات نہایت مستند کتابوں سے جمع کیے گئے ہیں جن کا مطالعہ خود مسلمانوں کے واسطے دین و اخلاق

کا بہترین سبق ہے۔ یہ زیادہ‌تر ابتدائی دو تین صدی کے اہل علم حضرات ہیں اور ابھی بعد کے نامور غلام خصوصاً ملوک و امرا کے حالات لکھنے کی نوبت نہیں آئی جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر لائق مولف مولانا سعید احمد صاحب ایم۔ اے حسب وعدہ اس سلسلے کو انتہا تک پہنچادیں۔ کتاب ۵۳۰ صفحات پر بہت عمدہ چھاپی گئی ہے اور اگر مغرب کے تحقیق و تنقید کے معیار کے مطابق نہ مانی جائے تو بھی کچھ شک نہیں کہ مفید معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ صحت نامے کے باوجود کتابت کی چھوٹی موٹی غلطیاں رہ گئی ہیں جو اردو خوانوں کے واسطے دشواری کا موجب ہوں گی۔ بہرحال کتاب قابل قدر ہے۔ مجلد کی قیمت پانچ اور غیر مجلد کی ساڑھے چار روپیہ۔ ندوۃالمصنفین قرول باغ دہلی سے دستیاب ہوگی۔

اخلاق اور فلسفہ اخلاق

ندوۃالمصنفین (قرول باغ، دہلی) کے سلسلہ مطبوعات کی آٹھویں کتاب۔ مولفہ مولانا حفظ‌الرحمن صاحب سہواروی۔ ضخامت تقریباً ساڑھے پانسو صفحات۔ بڑی کتابی تقطیع قیمت غیر مجلد چار روپیہ آٹھ آنے مجلد پانچ روپیہ۔

دیباچے میں لائق مولف لکھتے ہیں کہ اردو میں اسلامی اخلاق اور جدید مغربی فلسفۂ اخلاق پر علیحدہ علیحدہ کتابیں تو موجود ہیں، لیکن «وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلے میں ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ایک جانب جدید اکتشافات علمی کا مفید ذخیرہ محفوظ ہو اور زبردستی کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے ان کے ساتھ معاندانہ روش اختیار نہ کی جائے اور دوسری جانب اسلامی اخلاقی تعلیم کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ صرف حسن ظن کی بنا پر نہیں بلکہ علمی دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی برتری واضح ہوجائے»۔ اس عمدہ مقصد کے لیے فاضل مولف نے مصری عالم شیخ محمد امین کی کتاب‌الاخلاق کو پسند فرمایا اور اپنے «تالیفی عطر کے لیے اسی کو زمین بنایا»۔

کتاب اچھے کاغذ پر خوش‌خط اور بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ ابتدائی تین حصوں میں قدیم و جدید فلاسفہ کے نظریات پر بحث کی گئی ہے جن میں بعض

مباحث خوب مفصل اور دل‌چسپ ھیں اور بعض نسبتہً مجمل معلوم ھوتے ھیں ۔ لائق مولف مغرب کے جدید فلاسفہ سے کچھ بہت زیادہ واقف نہیں ھیں لیکن اسلامی فلاسفہ کے بیان کو بھی کسی خاص اصول کے ساتھ ھر عنوان کے تحت میں تفصیل سے جمع کرنے کی بجائے حسب پسند ان کے مختلف اقوال و عقائد کو جگہ جگہ ملخصاً لکھنے پر اکتفا کی گئی ھے ۔ آخری یعنی چوتھے حصے میں شاید کتاب کی طوالت سے گھبرا کر فاضل مولف نے بظاھر اختصار سے کام لیا ھے اور "علمی دلائل و براھین کی روشنی میں" اسلامی تعلیمات کی برتری واضح کرنے کا نیک ارادہ ھمارے خیال میں حسب دلخواہ پورا نہیں ھوسکا ھے ۔ مولف کی محنت اور حسن نیت میں کچھ کلام نہیں اور خود موضوع کی وسعت کتاب کی کسی تشنگی کا معقول عذر ھوسکتی ھے ۔ قدیم تعلیم‌یافتہ حضرات سے مغربی معیار تحقیق کے مطابق تالیف و تصنیف کی توقع رکھنا بھی ناموزوں معلوم ھوتا ھے ۔ البتہ ھم سفارش کریں گے کہ کتاب پر احتیاط سے نظر ڈال کر ایک صحت‌نامہ اس میں چسپاں کرادیا جائے ۔

سیاسیات

مبادیٔ سیاسیات

تالیف پروفیسر ھارون خان صاحب شروانی (صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) جس میں سیاسیات (جدید) کے تمام ضروری مسائل ، یعنی حکومت کی قسمیں ، حدود عمل ، قانون ساز مجالس ، بین‌الاقوامی قوانین وغیرہ کی حقیقت سمجھائی گئی ھے ۔ طلبہ اور عام اردو خواں حضرات کے لیے بہت مفید کتاب ھے ۔ پہلے دو حصوں میں شایع ھوئی تھی اور اب مکتبہ جامعہ ملیہ (دھلی) نے ایک مجلّد کی صورت میں چھوٹی تقطیع کے ۶۰۷ صفحات پر شایع کیا ھے ۔ جو نسخہ ھمیں تبصرے کے لیے بھیجا گیا ھے اس میں اصطلاحات کی فہرستیں بلکہ فہرست مضامین تک نظر نہیں آئی ۔ غالباً شیرازہ بندی میں یہ ورق چھوٹ گئے ۔

متفرق

سوانح عمری

(یعنی بیگم شیخ عبداللہ کی زندگی کے حالات) تصنیف خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب سکرٹری زنانہ کالج، علی گڑھ۔

جناب شیخ صاحب نے اس مختصر کتاب میں اپنی مرحومہ بیگم کے حالات زندگی کو بہت محبت اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کے تعلیمی کاموں کے سلسلے میں علی گڑھ کے زنانہ کالج کی ابتدا اور ترقی کے حالات بھی آگئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں بیگم مرحومہ کی تصویر دی ہے۔ کتاب مرحومہ کی بہت اچھی یادگار ہے۔

چند سالنامے

ساقی کا سالنامہ حسب معمول بہت ضخیم اور دلچسپ ہے۔ پورے پون تین سو صفحے اور باسٹھ نثر کے مضامین اور کچھ نظمیں ہیں۔ نثر کا پلہ ہر لحاظ سے بھاری ہے اور اس میں ہر قسم کے مضامین ہیں، ادبی، علمی، مزاحیہ اور فسانے وغیرہ۔ اور ان میں سے اکثر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ساقی دھلی کا بہترین رسالہ ہے اور اردو کی قابل قدر خدمت کررہا ہے۔

ادبی دنیا خوب ترقی کررہا ہے۔ اس کا سالنامہ بھی طرح طرح کے مضامین سے معمور ہے۔ چودہ افسانے اور ڈرامے، اکیس علمی اور ادبی مضامین اور ۵۸ نظمیں اور چار رنگین تصویریں ہیں۔ پورا مجموعہ گلزار معلوم ہوتا ہے۔ رسالے کے اڈیٹر بڑی محنت سے اسے مرتب کرتے ہیں اور اسی میں اس کی مقبولیت ہے۔

باسمہٖ

غالب* کا فن اور اس کا نفسیاتی پس منظر

(از سید اختر احمد اختر اورینوی ایم ۔ اے)

ماحول اور توارث کا اثر ہر زندہ چیز پر پڑتا ھے ۔ ادب بھی ایک زندہ حقیقت ھے ۔ اس کی تخلیق بطن حیات سے ھوتی ھے اور حیات ھی کی گود میں یہ بڑھتا، پروان چڑھتا اور پھولتا پھلتا ھے ۔ ادب کی پیدائش دھڑکتے ھوئے دل، بیدار حواس، چونکے ھوئے جذبات، ھوشیار تخیلات، دوررس ادراک اور فکر پرور، قادر و متوازن دماغ کی رھین منت ھے ۔ اور یہی زندگی کے آثار ھیں ۔ لہذا ادب بھی ایک زندہ، رواں دواں اور ترقی پذیر قوت ھے ۔ کسی قوم کا ادب اس کی تاریخ کا ایک نہایت ھی اھم اور جان‌دار پہلو ھے ۔

کسی دور کے ادب کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس دور کو سمجھنا ضروری ھے ۔ یعنی اس دور اور ادوار ماقبل کے میلانات زندگی کا مطالعہ لازمی ھے ۔ ایک دور کی روایات دوسرے دور پر اثر ڈالتی ھیں اور جدید رجحانات بھی پیدا ھوتے رھتے ھیں ۔ یہ دلیل حیات ھے اور اسی طرح ارتقا کی منزلیں طے ھوتی رھتی ھیں ۔ بعض دفعہ یہ میلانات نو تدریجی طور پر نمودار ھونے کی بجائے اچانک انقلابی طور پر ظہور پذیر ھوتے ھیں ۔ مگر بغیر اسباب و علل کے نہیں ۔ ھاں یہ اسباب و علل سطح کے نیچے دھاروں کی شکل میں ارتقا کی کڑیوں کو نظروں سے پوشیدہ رہ کر مکمل کرتی رھتی ھیں ۔

* اس تحت میں اردو شاعری کے منفیانہ میلانات اور اس کے مثبتی رد عمل کو پیش کیا جائے گا ۔ اختر

گہری نگاہیں ان چھپی ہوئی موجوں کی حرکت بھی دیکھ لیتی ہیں ۔ «بحر و بر کی سرگوشی» سننے والے کان ، «جنبش مژگان عالم» کو محسوس کرنے والی آنکھیں اور «قلب ہستی کی ضربیں» گن لینے والی روح انقلابی میلانات کے سربستہ رازوں سے آگاہ ہوجاتی ہیں ۔ علم الحیات [Biology] سے بھی اس کے شواہد ملتے ہیں کہ تدریجی ارتقا کے ساتھ زندگی میں اچانک نمودار ہونے والے مظاہر بھی پائے جاتے ہیں ۔ اس مظاہرے کو Mutation («بداعت») کہتے ہیں ۔ زندگی کا یہ قانون ادب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ۔ مذکورہ بالا باریک بینی کے ساتھ ادب و فن میں توارث اور ماحول کے اثرات کے مطالعہ سے اس کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے ۔

انسان کے اکثر و بیشتر اعمال و افعال سماجی ہیں ۔ ادب و فن بھی بلاشبہ ایک سماجی عمل ہے ۔ اس کی آفرینش تو ہمیشہ عمرانی اثرات کے ماتحت ہوتی ہے اور اس کی نمائش و معیار قدر بھی صحیح و متوازن حالات میں ہمیشہ معاشری قانون کے ماتحت ہے ۔ کسی خاص عہد اور عہد ماقبل کے مدنی، سیاسی ، اقتصادی اور ثقافتی میلانات فن کار کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کرتے ہیں اور توارث ، تجربات و مشاہدات کے ذریعہ اس کی نفسی زندگی کا جز بن جاتے ہیں ۔ انھیں نفسی کوائف کا اظہار صناعت و فن کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس طرح بہت سے فن کار مل کر اس عہد کا ادبی و صناعتی رجحان قایم کردیتے ہیں جو اپنے وقت پر خود بھی توارث و روایات کے ذریعہ منتقل ہوجاتا ہے ۔ مگر انسان کی نفسی زندگی کی حیرت کاریاں عجیب ہیں ۔ وراثت ، روایت ، تجربہ، مشاہدہ ، تخئیل و ادراک اور احساس و جذبہ کی قسم قسم کی آمیزش و ترکیب سے نئے نئے نفسی قماش (Pattern) بنتے رہتے ہیں ۔ نفس کی بھٹی میں پڑکر خارجی تجربات و مشاہدات وقت گزرنے پر داخلی کوائف بن جاتے ہیں ۔ اسی نفسی نیرنگی کی کارگاہ سے جدت اور انوکھاپن پیدا ہوتا ہے ۔ اسی کا نام انفرادی تخلیق ہے اور اسی اصل سے نئے ادبی رجحانات کی شاخیں جنم لیتی ہیں ۔ ادب و فن کی تخلیق کی یہ نفسی بنیاد وجدان (Intution) کہلاتی ہے ۔ اس کا بھی امکان پایا جاتا ہے کہ یہ نفسی جولانی (Psychic Dynamism) عالم ظاہر کے ماورا

آفاقی و کائیناتی قوتوں (Cosmic Energy) کو بھی اپنی طرف کھینچتی اور ان سے اثر قبول کرتی ھو ۔ یہ عمل ادب و صناعت کا الہامی محرک ھوتا ھے اور انقلابی میلانات کی آفرینش میں ممد و معاون بنتا ھے ۔ یہ تحریک جدت (Originality) کو چار چاند لگاتی ھے ۔ اس الہامی محرک کو سروش غیبی کہتے ھیں ۔

آتے ھیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ ، نوائے سروش ھے

انگریز شاعر میتھوآرنلڈ کا «خانہ بدوش عالم*» [Scholar Gypsy] اسی سماوی روشنی کے انتظار کی سختیاں برداشت کرتا رھا ۔ مگر یہ الہامی روشنی اسی فن کار کی رھنمائی کرتی ھے جس میں استعداد فطری پائی جائے ۔ سروش غیبی کا نزول ایک جلایافتہ نفسی صلاحیّت پر منحصر ھے ۔ بیچارے آرنلڈ کے حصے میں یہ چیز کبھی نہیں آئی اور غالب اس سے فیضیاب ھوا ۔ ع : ایں سعادت بزور بازو نیست ۔ تاھم کسب و ریاضت نزول سروش کے امکان میں اضافہ کردیتی ھے ۔ یہ عطائے وھبی ان فن کاروں کے حصہ میں آتی ھے جو بحر حیات کے شناور و غواص ھیں ۔ سبکساران ساحل اس فیضان سماوی سے محروم ھی رھتے ھیں ۔

میں اس مقالے کے ذریعہ غالب کے فن اور اس کے ماحول کو پیش کرنا چاھتا ھوں ۔ نیز میں عہد ماقبل و مابعد سے دور غالب کا تعلق ظاھر کروںگا ۔ غالب کی ھستی اردو ادب میں کئی حیثیت سے نہایت ھی جاذب نظر اور دل‌کش ھے ۔ غالب کی شاعری میں ایک عام ناظر ادب کو بھی اچانک طور پر کچھ باتیں ایسی نظر آنے لگتی ھیں جو اس سے قبل نہ تھیں ۔ غالب کی شخصیت اور اس کی شاعری میں حرکت اور روانی کا احساس ھونے لگتا ھے ۔ اس کی دنیا وسیع‌تر معلوم ھوتی ھے اور اس میں تنوع اور بلندی کی جھلک ھے ۔ تاھم غالب ماضی سے کافی حد تک وابستہ بھی ھے ۔

اردو ادب و شاعری کے مطالعہ سے پتا چلتا ھے کہ اس کے راہ ارتقا میں تین مخصوص منزلیں ملتی ھیں ۔ ان تین منزلوں کا نام فی‌الحال ھم لوگ یہ رکھیں گے—غالب سے

* دیکھو آرنلڈ کی نظم Scholar Gypsy ۔

پہلے ، غالب ۔ اور غالب کے بعد ۔ ان تین منازل ادب کا جایزہ لینا ہم لوگوں کے پیش نظر ہے ۔ کسی عصر کی خصوصیات کے یہ معنی ہیں کہ اس عصر کے فن‌کاروں کی اکثریت اپنے بیشتر کارناموں میں ان خصوصیات کی حامل ہے ۔ کسی عہد کو اس کے میلان عام کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ غالب سے پہلے کی شاعری رنگ برنگ کے منفیانہ انداز نظر کو پیش کرتی ہے یعنی بالعموم شاعروں کے تجربات و مشاہدات حیات کا رد عمل منفیانہ ہے ۔ غالب کے بعد کی شاعری مثبتی کیفیات کی آئینہ‌دار ہے ۔ پہلے دور میں جمود ہے یا ماتم و گریز ، فریب ہے یا تصنع اور ثانی الذکر میں حرکت و عمل اور اقدام ، حقیقت اور جرأت کے میلانات پائے جاتے ہیں ۔ پہلے دور کی شاعری میں حد سے زیادہ داخلیت ہے یا پر فریب خارجیت ۔ کچھوے کی طرح خول میں گھسے رہنا اور اکثر و بیشتر ، گریز و فرار کی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ آل احمد سرور نے بہت خوبصورتی سے اس عہد کی شاعری کے متعلق کہا ہے کہ وہ مرثیہ اور قصیدے کے اندر محدود ہے ۔ «مرثیہ اپنا اور قصیدہ دوسروں کا» ۔ اس کے برخلاف غالب کے بعد کے عہد میں اگر مرثیہ ہے بھی تو وہ سب کا ہے اور قصیدہ کسی کا بھی نہیں ۔ اس سب کے مرثیے میں ماتم نہیں بلکہ اظہار حقیقت اور خاموش پیام ہے ۔ عہد ماقبل و مابعد غالب کے درمیان خود غالب کا عہد ہے ۔ غالب کے اکثر ہم‌عصر اپنی ذہنیت اور اندازنظر کی وجہ سے عہد گزشتہ ہی کی گونج ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب خود ایک عہد ہے ۔ غالب کے دائرے میں انیس و دبیر بھی شامل ہیں ۔ جنھوں نے خاص صنف مرثیہ میں بھی رزمیہ انداز داخل کیا ۔ غالب کا عہد منفی و مثبت رجحانات کی آمیزش اور ان کی کشمکش کا میدان پیکار ہے ۔ غالب ، انیس و دبیر میں مثبت و منفی دونوں میلانات پائے جاتے ہیں ۔ یہاں پر فن کاری کے متعلق گفتگو نہیں ، انداز نظر کے متعلق ہے ۔ غرض غالب ایک عبوری دور کی پیداوار تھا ۔ متضاد رجحانات کی کشمکش غالب میں بہت زیادہ نمایاں ہے کیونکہ غالب کے حواس اور ادراک انیس و دبیر سے زیادہ بیدار تھے ۔ غالب کا شعور زیادہ زندہ تھا ۔

ولی کی پیدایش ۱۰۷۹ھ تقریباً (۱۶۶۹ع) میں ہوئی ۔ اورنگ‌زیب عالمگیر ۱۶۵۸ع ہی میں دہلی میں تخت نشین ہوچکا تھا ۔ دکن میں اس وقت بیجاپور اور گولکنڈا کی سلطنتیں تھیں مگر مرہٹے بھی طاقت پکڑ رہے تھے ۔ ۱۶۸۶ع میں اورنگ‌زیب نے قلمرو دکن کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا ۔ ولی کا انتقال ۱۱۵۵ھ تقریباً (۱۷۴۴ع) میں ہوا ۔ یہ محمد شاہ کا عہد تھا (۱۷۱۹-۴۸ع) ۔ ولی دکنی قریباً پچاس سال کی عمر میں عہد محمد شاہی میں ہی دہلی وارد ہوا تھا :

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سے

ولی کے جیتے جی نظام‌الملک نے سلطنت دکن کی بنیاد ڈال دی تھی ۔ ہر چند کہ مرہٹے سلطنت بیجاپور و گولکنڈا سے بر سر پرخاش رہتے تھے اور مغلیہ لشکر نے بھی دکن پر یلغار کی تھی ، تاہم چونکہ یہ ولی کی ابتدائے عمر تھی ، کہا جا سکتا ہے کہ ولی کی بیشتر زندگی آرام و اطمینان ہی سے گزری ۔ دلی حملۂ نادر و ابدالی کا شکار بھی بنی مگر ولی کی عمر کے آخری ایام میں دکن نظام‌الملک کے ماتحت نسبتاً امن میں تھا ۔ قوم کی اخلاقی حالت بھی ہنوز ایسی پتلی نہیں ہوئی تھی اور یاس کے بادل ابھی چھائے نہ تھے ۔ لہذا ولی کے یہاں مثبتی رجحان بھی پایا جاتا ہے ۔ اگر اردو شاعری فارسی شاعری کی نقالی پر قایم نہ ہوتی تو ولی کے فن میں کافی جان پڑجاتی اور اس کے مثبتی عناصر زیادہ چمک جاتے ۔ ولی کی غزلوں میں وافر طور پر نشاط حیات کی جھلک ہے ۔ مگر ولی کی شاعری بہت ہی محدود قسم کی ہے ۔ ولی ہروقت محو رخ یار رہتا ہے :

تیرے لب کے حقوق ہیں مجھ پر
کیوں بھلادوں میں دل سے حق نمک

ولی زندگی بھر معشوق کا «حق نمک» ہی ادا کرتا رہا ۔ اور اس انفعالی قسم کے عشق کا نتیجہ ہے کہ :

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولی نے دلی آکر بزم اردو کو چمکادیا - مگر یہ بزم نادر کے قتل عام ، درّانی کے حملے ، جاٹوں ، مرہٹوں اور روہیلوں کی بغاوتوں اور لوٹ کھسوٹ کے درمیان برپا ہوتی رہی - اردو شاعری ایک زوال پذیر قوم کی گود میں پروان چڑھی - نتیجہ ؟ وہی منفیانہ رجحانات کی بہتات - ولی کے بعد عام طور پر ہند والوں کے لیے زندگی بھاری ہوگئی تھی - شاہ عالم کی آنکھوں کے ساتھ ہندستان کی قسمت بھی تاریک ہوگئی - اس بدبخت ملک کی خانہ جنگیاں اور اغیار کی ریشہ دوانیاں اس سانحہ کے بعد اپنی انتہا کو پہنچ گئیں - اورنگ‌زیب کو اپنی قوم کی زوال پذیری کا احساس ہوگیا تھا مگر اس کے کیے صرف یہ ہوسکا کہ وقت کچھ ٹل گیا - پہلے کسی قوم کے بنیادی اخلاق کمزور ہوکر فنا ہوجاتے ہیں تب اس کی اقتصادی ، سیاسی اور عمرانی و تمدنی دیواریں متزلزل ہونے لگتی ہیں اور بالاخر گر کر پاش پاش ہوجاتی ہیں - اگر اس دور انحطاط و زوال کی تصویر دیکھنی ہو تو میر اور سودا کی نظمیں «شہر آشوب» ملاحظہ فرمائیے :

چار لچّے ہیں مستعد بر کار دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار لوٹ سے کچھ ہے گرمئ بازار

لال خیمہ جو ہے سپہر اساس پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس رعب کرلیجئے یہیں سے قیاس
قصہ کوتاہ رئیس ہے عیاش

اور اس کا منطقی نتیجہ ملاحظہ ہو :

پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر

مشکل اپنی ہوئی جو بودوباش آئے لشکر میں ہم برائے تلاش

اور—

آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش ہے لب ناں پہ سو جگہ پر خاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

ایسی فضا میں جہاں ہر سو ذلت و پستی، انحطاط و زوال، بدامنی اور افلاس کے بھوت منڈلا رہے ہوں اور دور تک زندگی بداماں رد عمل کے آثار بھی نظر نہ آتے ہوں ذی حس شعرا "عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ" کے تخیل میں پناہ لیتے ہیں۔ میر کہتا ہے:

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

اس دور کی اردو شاعری کو ادبی روایات بھی اسی نوع کی ملیں۔ دھلی کی تہذیب پر فارسی کا اثر تھا۔ فارسی کے پرفریب قصائد اور صوفیانہ یا رندانہ غزلیں ھی میراث شاعری تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلی کے اکثر شعرا نے پرالم داخلیت میں پناہ لی۔ میر آہ آہ ہوکر رہ گئے:

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

درد نے روحانیت و صوفیت کی دنیا کی طرف ہجرت کی مگر وہاں بھی اسے کیا ملا:

دیکھنے کو رہے ترستے ہم　　نہ کیا رحم تونے پر نہ کیا

اور:

کچھ دل ھی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل
ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے کا شکستہ دل

درد کا دل پر درد بھی آخر کار چیخ اٹھتا ہے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

سودا اپنی فطرت شخصی کے لحاظ سے زندہ دل انسان تھا۔ اس کی طبیعت نشاط حیات کی طرف نمایاں طور پر مائل تھی لیکن باوجود اس کے وہ بھی اپنے دور کے منفیانہ اثرات سے بچ نہ سکا۔ اس کی نشاط پسندی نے قصیدوں میں ایک پر تصنع غیرحقیقی بہجت کی شکل اختیار کی۔ اس کی طبیعت کی شگفتگی جب ہجو کے میدان میں ظاہر ہوئی تو شگفتگی باقی نہ رہی بلکہ ایک غیر متوازن چڑچڑاپن ہوکر رہ گئی۔

سودا کی ہجووں میں فن‌کارانہ اعتدال عام طور پر نہیں پایا جاتا ۔ حالانکہ ہجو صناعانہ حسن کے ساتھ صداقت کو پیش کرکے اخلاق آموزی کا ایک نیا اور دلچسپ اسلوب نکال سکتی ہے ۔

معیار کی پستی ملاحظہ ہو :—

سن بے الو پہنچ کے بنگالے　　مادہ سگ آپ کو تو بنوالے
اتنے شاگرد ڈھونڈتا ہے عبث　　سگ سے اک آکے تو گرہ کھالے
ایسے شاگردوں سے کہیں بہتر　　نکل آویں گے بھونکنے والے

سودا کی پر جوش طبیعت محض بکھر کر رہ گئی ۔ قصیدہ ، ہجو ، غزل ہر میدان میں منفیانہ میلانات عصر نے اپنا رنگ جماکر چھوڑا ۔ سودا بوقلمونیٔ حیات کے مشاہدے کی طرف زیادہ مائل تھا ۔ اچھے ماحول میں اس بات کا امکان تھا کہ وہ زندگی کے مثبتی جلووں کو پیش کرتا ۔ سودا جب آپ بیتی بھی پیش کرتا ہے تو اس میں خارجی تصویر کشی ہوتی ہے ۔ پروفیسر کلیم‌الدین نے لکھا ہے : "....جس طرح وہ (سودا) مظاہرات سے آشنا تھے اسی طرح وہ باطنی کوائف کے بھی اسرار سے واقف تھے ۔ مگر تماشائی کی حیثیت سے...." بات یہ ہے کہ سودا کے خارجی تجربات و مشاہدات اس کے نفسی کوائف نہ بن سکے ۔ اس کی غزلیں چھچلی ندی کی طرح ہیں جس میں اس کی شخصیت کی گہرائی مفقود ہے ۔ اور اس جوئے کم آب میں بھی اس عہد کے سیاہ بادل منعکس نظر آتے ہیں :

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لخت جگر بھی

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

میر کے یہاں داخلی اور خارجی کیفیات کی ہم‌آہنگی ملاحظہ ہو :

کہا ہیں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

گلشن دلی میں خزاں آجانے کے بعد لکھنؤ کا چمن آباد ہوا ۔ بلبلان دهلی بهی اڑ اڑ کر اس طرف کو سدهارے ۔ مگر خیابان لکھنؤ کی لاله‌کاریاں محض مصنوعی تهیں ۔ وهاں کی تہذیب میں انحطاط و زوال کی سب سے بهیانک شکل سحر آفریں تهی یعنی فریب نشاط ۔ لکھنؤ کے سراب آسا سیاسی عروج کے دور میں هندستان ذلت ، نکبت ، شکست اور استیلائے اغیار کی انتهائی منزلیں طے کر رها تها ۔ بنگال سے پنجاب اور همالہ کی ترائیوں سے لے کر میسور اور ٹراونکور تک خانہ جنگیاں اور برادر کشی کی بےحیائیاں رونما هو رهی تهیں ۔ ٹهگوں اور پنڈاریوں کا دور دورہ تها ۔ ایسے پر فتن زمانے میں ملک کی اقتصادی حالت عام طور پر پست و زبوں هوگئی ۔ فیض‌آباد اور لکھنؤ میں تهوڑی سی ظاهرا چمک دمک تهی اور اسی پر لکھنؤ کے بانکے مرمٹے تهے ۔ لکھنؤ کی تہذیب بلند اخلاقی قدور سے فیضیاب نہ تهی ۔ وہ کوڑھ کے ناسوروں سے بهرے هوئے جسم پر ایک ریشمی لبادے کی طرح تهی ۔ جیسے افیون کها کر احساس درد وقتی طور پر غائب هوجاتا هے ۔ لکھنؤ کی محفل عشرت بهی تسکین نہیں فریب تسکین تهی ۔ اس تمدن کے مظاهر ـــ چنگ و رباب ، حسن لب بام ، کنکوے مرغ بازی ، بٹیروں کی پالی ، کج کلہی ، افیون ، اندرسبها ، سوز و ماتم اور آہ و بکا ۔ مگر سوز برائے نام اور ساز بهر آرام ۔ لکھنؤ کی آرام طلبی میں ایرانیت کی بد ترین روح کار فرما تهی ۔ یعنی « خیامیت » ۔

حدیث مطرب و می گو و راز دهر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معما را (حافظ)

اهل لکھنؤ اپنی ذلت و خواری کے متعلق سوچنا بهی پسند نہیں کرتے تهے ۔ اس فریب نشاط نے لکھنؤ اسکول کی اردو شاعری پر بهی اپنا مهلک اثر کیا ۔ یہ شاعری ایک مرصع نیام کی طرح هے جس کے اندر تلوار نہیں ۔ دهلی اسکول کی شاعری میں منفیانہ داخلیت تهی ۔ دبستان لکھنؤ میں مریضانہ خارجیت نظر فریب هوئی ۔ مصحفی کی شاعری میں یہ دونوں رنگ جهلکتے هیں ۔ دلی کی داخلیت کا اثر بهی لکھنؤ

کی شاعری پر پڑا لیکن جلد ہی مٹ کر رہ گیا ۔ آتش کے کلام میں تھوڑی داخلیت پائی جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف شعرائے دہلی کے مذاق کو لکھنؤ کی آب و ہوا نے کافی بگاڑا :

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئ رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے اجی بیٹھے رہو
ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اکتایا ہوا (جرأت)

زوال کی اسفل منزلوں میں یہ زیست سے اکتائے ہوئے لوگ بازاری تعشق سے افیون کا مصرف لیتے تھے ۔ اس عہد کی تمثیل مکمل ناسخ ہے ۔ فریب نشاط کے ساتھ بے حس مریضانہ تصنع کی جادوگری دیکھنی ہو تو کلام ناسخ ملاحظہ ہو :

نہ میرے پاؤں ہوں زنجیر کے کبھی شاکی
جو اس کی کاکل پیچاں کی ہاتھ میں لٹ ہو
نسیم آہ کے جھونکے سے کھول دوں دم میں
بھڑا ہوا تیرے دروازے کا اگر پٹ ہو
ہجوم رکھتے ہیں جانباز یوں ترے آگے
جواریوں کا دوالی کو جیسے جمگھٹ ہو

شاعری میں داخلیت اور خارجیت دونوں صحت‌مندانہ طور پر بھی برتی جاسکتی ہیں ۔ ایک متوازن فطرت شاعر ان دونوں رجحانات طبع کا خوشگوار امتزاج ہوتا ہے ۔ غالب کے پہلے اردو شاعری کی داخلی اور خارجی دونوں صورتیں منفیانہ میلانات کی حامل تھیں ۔ ہم لوگ دیکھیں گے کہ غالب کے بعد مثبتی اثرات پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے ۔ جس کی تکمیل اقبال کی شاعری میں ہوئی ۔

غالب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے میں عرض کرچکا ہوں، غالب کے عصر مابعد کو بھی سمجھنا ضروری ہے ۔ اس کے قبل کہ میں اس دور پر سرسری ،

نظر ڈالوں میں مومن اور ذوق کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں :

ذوق تو خیر ایک دم توڑتی ہوئی تہذیب کا وابستۂ داماں تھا ۔ اس کی فطرت میں صداقت اور جوش نام کو نہ تھا ۔ حیرت تو یہ ہے کہ مومن حضرت سیداحمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کرنے کے باوجود، حضرت اسمعیل شہید کی صحبت میں رہ کر اور ایک پر جوش و ولولہ فطرت کا مالک ہوکر بھی «شب ہجران»، «حال تباہ»، «شب دراز» اور «خواب ناز» کے گیت گاتا رہا ۔

ذوق کی شاعری میں ایک بے جان سی وضعداری اور رکھ رکھاؤ ہے، سرد و بےدم محبت کی تھکادینے والی رٹ ہے، اور ایک تھکی ہوئی پیش پا افتادہ اخلاق‌آموزی کی ناکام سی بےمقصد کوشش ہے ۔ ذوق کی شاعری ایک ایسے قلت خون کے مریض کی طرح ہے جس کا چلو بھر خون بھی اب خشک ہورہا ہو ۔ ملاحظہ ہو :

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو یہ عمر رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو
تمہاری راہ میں ملتے ہیں خاک میں لاکھوں اس آرزو میں کہ تم اپنا خاک پا سمجھو
نہیں ہے کم زر خالص سے زردیٔ رخسار تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

«زردیٔ رخسار» کو «زر خالص» سمجھنے والی ذہنیت میں زندگی کا خون کہاں ۔ اس خون کی کمی کا نتیجہ دیکھیے :

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

اس فرار و گریز سے تو کہیں بہتر ظفر کی شاعری* ہے جو کم از کم ایک انفعالی احتجاج تو ہے ۔ ایک اضطراب، ایک شور و شیون تو ہے :

جو خزاں ہوئی وہ بہار ہوں، جو اتر گیا وہ خمار ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

---

* یہیں سے یہ نکتہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر کی شاعری میں ذوق کا ہاتھ نہیں ۔ ہاں بعض غزلیں الحاقی ہوسکتی ہیں ۔ اختر

مرا حال قابل دید ہے ' نہ تو آس ہے نہ امید ہے
مری گھٹ کے حسرتیں مر گئیں ' میں ان حسرتوں کا مزار ہوں

ولی دکنی سراپائے محبوب میں گم تھا ' میر واردات محبت سے دل گرفتہ اور مومن معاملات عشق میں محو۔

مومن کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ چیز ہے۔ مومن پر نئے مذہبی اثرات کا پرتو پڑا تھا۔ اس کی شاعری میں بھی اس کی ایک گریزاں سی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر ان مذہبی میلانات نے اس کے دل میں ہنگامہ آرائی نہ کی۔ ایک آدھ مثنوی اور چند اشعار غزل میں ایک سطحی جوش نظر آتا ہے اور بس۔ ملاحظہ ہو :

عنایت کر مجھے آشوبگاہ حشر غم اک دل
کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شور قیامت کا
فروغ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر
کہ خرمن پھونک دیوے ہستیٔ اہل ضلالت کا
خدایا لشکر اسلام* تک پہنچا کہ آپہنچا
لبوں پر دم ' بلا ہے جوش خوں شوق شہادت کا

مثنویوں کے نام ملاحظہ ہوں : (۱) شکایت ستم (۲) قصۂ غم (۳) حسین مغموم (۴) آہ و زارۂ مظلوم وغیرہ۔ مومن کی اکثر مثنویاں بھی منفیانہ داخلی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ چند مثنویوں میں حمد ' نعت ' مناجات اور جہاد کے مضامین ہیں۔ « مثنوی جہادیہ » سے پتہ چلتا ہے کہ زمانہ کروٹ بدل رہا ہے اور اب اردو شاعری میں منفیانہ میلانات کم سے کم ہوتے جائیں گے۔ مگر خود مومن ان میلانات سے نجات حاصل نہ کرسکا۔ عشق کا بھوت اس پر بری طرح سوار تھا۔ مومن کی شاعری میں عشق کا نشاط نہیں بلکہ بوالہوسی کی لذت اور تلخ کامیاں ہیں۔ مومن

* لشکر اسلام سے مراد وہ فوج ہے جو بسرکردگی حضرت سیداحمد بریلوی رحمۃاللہعلیہ سکھوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئی تھی (سنہ۱۲۴۲ھ)۔ اس جہاد میں صوبہ بہار پیش پیش تھا۔ صادق پوری (عظیم آبادی) خاندان نے اس تحریک پر اپنے کو قربان کردیا۔ اختر

کو اپنے ہلاک بت کافر ہونے کی کمزوری کا ایک مجبورسا احساس تھا ۔ حمد کے مضمون کے تحت کہتا ہے :

وہ حافظ کہ آتش سے خس کو بچادے   تپ عشق سے بوالہوس کو بچادے
وہ قادر کہ گر چاہے اس کا کرم   مٹادے مرے دل سے عشق صنم

یہاں بھی عشق کے مضمون سے نجات نہیں ۔

ایک تنقید نگار لکھتا ہے : "... مومن کی دنیا بھی محدود ہے ۔ غالب و سودا کی دنیا کی طرح وسیع و فراخ نہیں ۔ مومن کبھی اس تنگ دنیا سے باہر ہونا بھی نہیں چاہتے ۔" "عشق صنم" مومن کے لیے بیک وقت زہر بھی ہے اور تریاق بھی ۔ وہ اس مے نوش کی طرح ہے جسے شراب ہلاک کر رہی ہو ، مگر وہ شراب نہ پیے تو اس کا دم نکل جائے :

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

غزلیات اور قصیدوں کے ساتھ مثنویاں اور مرثیے بھی اپنے عصر کے رجحانات سے بری نہیں ۔ عہد ماقبل غالب کی تعمیر و تشکیل میں تین نمایاں اثرات کارفرما ہیں ۔ اول فارسی ادبی روایات کا اثر خصوصاً ایرانی دور انحطاط و انتشار کی روایات ۔ دوم دور جاگیرداری اور خود مختارانہ حکومت کا عام اثر ۔ سوم زوال پذیر تمدن ، دم توڑتی ہوئی سیاست اور فنا ہونے والے نظام اقتصاد کا خاص اثر ۔ ۱۸۵۷ ع کی سیاسی کشمکش سے ٹھیک ایک سو سال پہلے ۱۷۵۷ ع میں جنگ پلاسی کا معرکہ برپا ہوا ۔ یہ انگریزوں کی سیاسی فتوحات کا سنگ‌بنیاد تھا اور اس کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام اقتصاد کی شکست و ریخت اور صنعتی سرمایہ‌داری کی فتح و استیلا کا پیش خیمہ تھی ۔ یہ اثرات اتنے قوی تھے اور ملک و ملت کے نفسیاتی و اخلاقی قوی اتنے مضمحل ہوچکے تھے کہ کسی بنیادی مثبق ردعمل کی امید بھی نہ تھی ۔ سارے معاشرہ پر اور اس سماج کی ادبی پیداوار پر یاس و قنوط کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں ۔ اغیار کے مکمل عروج کے بعد جب ملک نے کروٹ بدلی تو کسی انقلاب کا فوری موقعہ باقی نہ تھا ۔

۱۸۵۷ ع کے بعد صرف اتنا ہوا کہ ہم حقیقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے، اور ملک کے متوسط طبقے کو اپنی پستی کا احساس ہونے لگا ۔ اس کے قبل چند امرا اور جاگیردار تو برسرپیکار تھے لیکن سماج میں عام طور پر خود فریبی اور فرار و گریز کی ہوا چل رہی تھی ۔

اردو مثنویوں میں بھی فرار و گریز کی یہی روح کار فرما تھی اور فرار و گریز نتیجہ تھا اوپر بیان کیے ہوئے سہ‌گانہ اثرات کا ۔ یہ گریز عشق کے ایک ایسے غیر ارضی عالم کی طرف ہوتی تھی جس کی تعمیر میں مافوق‌الفطری عناصر ترکیب پائے ہوئے تھے ۔ جن، پری، دیو، سحر، معجزہ وغیرہ ۔ "سحرالبیان" اور "گلزار نسیم" میں طرز کے سوا کوئی خاص فرق نہیں ۔ دونوں مثنویاں حقیقت سے منہ چھپاتی ہیں ۔ راسخ عظیم‌آبادی کی مثنوی میں اچانک ایک مثبتی چنگاری بھڑکی ہے مگر یہ شعلہ بن نہ پائی ۔ یہ مثنوی بھی میر کی مثنوی شعلۂ عشق کی طرح آتش سرد ہے ۔ راسخ کا ایک اخگر تپاں ملاحظہ ہو ـــ شکوۂ فلک ہے، مگر جان‌دار :

پہنچی ہے کارد استخواں تک　　بے مہر ہے آسماں کہاں تک
جینا دشوار ہوگیا ہے　　میرا تو چھری تلے گلا ہے
کیا کہئے خمیدہ آسماں کو　　گر ہاتھ چلے تو اس کماں کو
یاں تک کھینچوں کہ ٹوٹ جاوے　　کب تک صدمے کوئی اٹھاوے

مرزا شوق کی مثنویوں میں ہیں تو وہی لوازم عشق مگر اس میں فضا غیر ارضی نہیں ۔ یہاں مافوق‌الفطری عناصر کا فقدان حقیقت نگاری کی طرف میلان کی دلیل ہے ۔ یہ تبدیلی بدلتے ہوئے زمانے کی کار فرمائی ہے اور بہت ہی قابل توجہ ۔

غالب کے بعد چند در چند وجوہات کی بنا پر اردو شاعری میں مثبتی رجحانات جلوہ فرما نظر آنے لگے ۔ اس مثبتی اثر کا نتیجہ پنڈت برجموہن کیفی کی مثنوی "جگ بیتی" ہے ۔ فن‌کارانہ نقایص سے قطع نظر :

"ہے واقعیت اس میں، حقیقت کا بیان ہے　　انسان کی شرافت کا ضلالت کا بیان ہے"

اس میں فرار و گریز کی مخالفت پائی جاتی ہے اور اس کے اندر ایک مثبتی پیام ہے ۔

اردو مرثیوں کی ابتدا محض نوحہ، بین اور سوز سے ہوئی۔ مرثیے میں بھی زندگی اور زندگی کو حرکت میں لانے والے عناصر پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ مگر دکن، دلی اور لکھنؤ و عظیم آباد کے ابتدائی مرثیہ نگاروں کے یہاں یاس و قنوط اور گریہ و ماتم کے سوا کچھ نہیں:

دلوں پر محبوں کی حالت عجب ہے　　مصیبت ہے، ماتم ہے، غم ہے، تعب ہے
شہ تشنہ لب کا کسے غم سنائیے　　یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ تشنہ لب ہے

اس خالص منفیانہ رنگ میں میر ضمیر استاد دبیر نے تبدیلی کی یعنی انھوں نے سب سے پہلے مرثیے میں رزمیہ رنگ بھی بھرا۔ دبیر و انیس اور شاد عظیم آبادی* نے اس انداز کو تکمیل تک پہنچایا۔ مرثیے میں رزمیہ کیفیات کی آمیزش ایک ایسے جذباتی مطالبے کے سبب سے ہوئی جو ہر چند کہ غیر شعوری تھا، پھر بھی عام معاشری تبدیلی کا پرتو اور مثبتی میلان لیے ہوئے تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مراثی سے منفیانہ رنگ مٹ گیا۔ سچ پوچھیے تو ان پر یہ آخرالذکر رنگ ہی غالب رہا:

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہو، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو　　(انیس)

لیکن اصل نیت مصائب اہل بیت کو بیان کرکے سامعین میں رقت ہی پیدا کرنی ہوتی ہے اور یہ رونا رلانا جوش عمل کو ابھارتا نہیں بلکہ اس پر ایک رسمی افسردگی اور چند کمزور کپکپیوں میں ختم ہوجانے والی بے عملی طاری رہتی ہے۔ جوش کی نظم "ذاکر سے خطاب" مروجہ مرثیوں کے خلاف ایک خالص مثبتی احتجاج ہے۔ یہ شہادت حسینؑ کے موضوع سے ایک ولولہ خیز رزمیہ کی تعمیر کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

* میں شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری پر انشاءاللہ جلد ایک مبسوط مقالہ لکھوں گا۔ شاد نے اس فن میں بہت سی جدتیں کی ہیں۔ 　اختر

اب ہم لوگ عہد غالب تک پہنچ گئے ہیں ۔ ہم نے دیکھا کہ غالب سے پہلے اردو شاعری میں منفیانہ میلانات کی بہتات ہے ۔ صرف ایک عظیم‌المرتبت شاعر اس یاس انگیز میلان سے بچ گیا لیکن بالکل پاک بھی نہ رہ سکا ۔ نظیر اکبرآبادی* نے جوش حیات کا خزانہ زندگی کی ایسی سطح پر دریافت کیا جس سے اردو شعرا محروم تھے ۔ میں نے نظیر پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نظیر کی شاعری میں زندگی اور زندگی کی امنگوں کی روشنی بھی نظر آتی ہے ۔ نظیر کو یہ روشنی عوام‌الناس کی صحبت سے ملی تھی ---- میر، سوز، درد، سودا وغیرہ بے جا انفرادیت کی بھول بھلیوں میں چکر کھاتے رہے اور نظیر اجتماعی زندگی کے سبزہ‌زاروں میں کلیلیں کرتا پھرا ----" ۔ "مگر وہ اپنے زمانے کے اثرات سے دامن کشاں نہ رہ سکا ---- نظیر کبھی زندگی کے ہنگاموں، اس کے حرص و آز اور اس کے تضاد کا علاج موت کے تصور میں ڈھونڈتا ہے یا تیاگ میں ----" ۔ "وہ ترک دنیا کا قایل نہیں اور نہ وہ ماورائیت کو پسند کرتا ہے ۔ وہ اسی دنیا میں ہر حال میں خوش رہنا چاہتا ہے ---" یہی نظیر کا تیاگ ہے ۔ "اس کا سب سے زیادہ رچا ہوا رنگ قلندرانہ لطف اندوزی میں نظر آتا ہے" ۔ "نظیر موت کا خوف دلاکر بے عملی پیدا کرنی نہیں چاہتا بلکہ وہ بے جا تکبر اور غلط حرص و ہوس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے" ۔

نظیر ایک استثنا ہے اور منار ہدایت بھی ۔ اردو شاعری کے موجودہ دور میں بھی شعرا کی ایک کافی تعداد یاس و قنوط کی شکار اور فرار و گریز کی طرف مائل ہے ۔ ان شعرا کو نظیر کے سرچشمہ سے فایدہ اٹھانا چاہیے ۔ اگر وہ لوگ نظیر، اقبال اور جوش کا مطالعہ اپنی ذاتی سمجھ بوجھ کی روشنی میں کریں تو اردو شاعری کا مستقبل روشن ہوسکتا ہے ۔

بہر حال میں قبل عرض کرچکا ہوں کہ کسی دور کی خصوصیات کے یہ معنی ہیں کہ اس دور کے اکثر فن کار اپنے بیشتر کارناموں میں ان خصوصیات کو پیش کرتے ہیں ۔

* تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "نظیر کی شاعری پر ایک عمومی تبصرہ" نگار (لکھنؤ) نظیر نمبر ۱۹۴۰ء جنوری ۔ اختر اورینوی

سب سے زیادہ نمایاں بات ۱۸۵۷ ع کی حرکت میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ طبقۂ وسطیٰ اور عوام سے کافی تعلق رکھتی تھی۔ یہ پلاسی، سرنگاپٹم، علی وال اور کرکی کی جنگوں کی طرح صرف امرائے کبار کی تحریک نہ تھی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ تحریک مذکورہ کئی صوبوں میں پھیل گئی تھی اور اس کا امکان پایا جاتا تھا کہ یہ ہندستان گیر حیثیت اختیار کر لے۔

تاریخ کی ایک کتاب میں ۱۸۵۷ع کی تحریک کے اسباب یوں بیان کیے گئے ہیں:-

(۱) ریلوے، تلغراف، دخانی جہاز، انگریزی تعلیم کی اشاعت وغیرہ وغیرہ اختراعات نے لوگوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ لوگ رفتہ رفتہ عیسائی بنالیے جائیں گے۔

(۲) سپاہی سمندر پار جاکر اپنی ذات کھونی نہیں چاہتے تھے۔

(۳) ہندو اور مسلمان سپاہی گائے اور سؤر کی چربی کے کارتوس کے رواج کو مذہب پر حملہ سمجھتے تھے۔

(۴) ملک میں ایک پیشگوئی شائع تھی کہ جنگ پلاسی کے سو برس بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہوجائے گی۔

(۵) جن کی زمینیں اور ریاستیں چھن گئی تھیں ان لوگوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ یہ انقلاب ناکام بنگال، بہار، صوبہ متحدہ، متوسط ہند اور دہلی میں برپا ہوا۔

نظر غور سے اگر دیکھا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ ریلوے، تلغراف، دخانی جہاز اور انگریزی تعلیم یہ سب مذہب سے زیادہ مروجہ نظام اقتصاد کے لیے مہلک تھے۔ ملک کے نفس اجتماعی نے جدید تبدیلیوں کے خلاف رگ مقابلہ کو بھڑکانے کے لیے خطرات پر ایک مذہبی رنگ بھی دے دیا۔ بہر حال ۱۸۵۷ع کی حرکت نے سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی جذبات کو بھڑکایا۔ یہ اس عہد کے اجتماعی کشاکش کے سلسلے کا ایک نمایاں، وسیع اور اہم تصادم تھا۔ چونکہ اس تحریک کا کوئی واضح نصب العین نہ تھا اور اس میں مثبت و منفی دونوں پہلو تھے، لہذا اس نے ناکامیابی کا منہ دیکھا۔ ملک میں اطمینان اور بےاطمینانی دونوں تھیں، انگریزوں کا تسلط

باعث رحمت بھی تھا اور وجہ زحمت بھی ۔ لہذا ملک پر نامکمل یاس طاری تھا اور نہ یہاں پوری امید تھی ۔ ۱۸۵۷ع کی تحریک اپنے اندر نراجی عنصر رکھنے کی وجہ سے غدر بھی کہلاسکتی ہے اور اپنی قوت اقدام اور ہندستان گیر ملی و قومی رنگ رکھنے کے سبب سعئ آزادی بھی ۔

یہ خارجی مظاہر اس عہد کی نفسی حالت کے آئینہ‌دار تھے۔ غالب کی پیدائش ۱۷۹۷ع میں ہوئی اور وفات ۱۸۶۹ع میں۔ غرض وہ اسی تذبذب کے ماحول میں زندگی بسر کرتا رہا اور چونکہ وہ حساس تھا اور اس کی ذہنی قوت کافی جان‌دار تھی ، اس خارجی ماحول نے اس کی داخلی زندگی کو بہت متاثر کیا ۔ غیر شعوری طور پر غالب کی شاعری میں بھی تضاد ، کشمکش ، ہیجان ، تصادم اور تشکیک پیدا ہوئی ۔ غالب سے پہلے یاس و حسرت ہی کا دور دورہ تھا ۔ اس عہد کا نمائندۂ خاص میر ہے ۔ غالب کے عہد میں امید و ناامیدی دونوں تھیں ۔ اس کا مظہر اتم خود غالب ہے۔ غالب کے بعد امید تازہ کے آثار نظر آئے اس کا پیغامبر اقبال ہے ۔

۱۸۵۷ع کی تحریک کی ناکامیابی کے بعد ملک کو اپنی حالت کا صحیح اندازہ ہوا ۔ انگریزوں کے ساتھ تاریخ و اقتصاد کی ارتقائی قوتیں تھیں۔ اس سیلاب کا روکنا گویا ناممکن تھا ۔ زندگی کی نئی موج یورپ سے نکل کر ایشیا کو منقلب کررہی تھی ۔ شکست کے بعد پہلے تو داروگیر ہوئی اور پھر ایک سناٹا سا چھا گیا ۔ جب ذرا ہوش آیا تو حقیقت و واقعیت کی روشنی میں ملک نے اپنا جائزہ لیا ۔

اردو شاعری میں سب سے پہلے مثبتی میلان سرسید گروپ کے ایک فرد نے پیدا کیا ۔ یعنی حالی‡ نے ۔ اس مثبتی میلان کی ابتدا ایک جزی حقیقت بینی اور واقعیت پسندی سے ہوتی ہے ۔

غالب کے فن کے پس منظر سے واقف ہونے کے بعد آئیے ہم لوگ اس کا اور اس کے فن کا براہ راست جائزہ لیں۔

‡ اس مقالہ کی دوسری قسط انشاءاللہ « اردو شاعری کے مثبتی میلانات » ہوگی ۔ اختر اورینوی

لہذا نظیر کی رجائیت کے باوجود ہم دور ماقبل غالب کو منفیانہ عہد ہی کہیں گے۔ خود غالب منفی و مثبت میلان کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ غالب کی روح تشکیک کی شکار ہے۔

اب آئیے مثبت میلان کے پیدا کرنے والے اسباب کا جائزہ لیا جائے۔

۱۷۳۸ء میں حملۂ نادر کے بعد ہندستان میں طوائف‌الملوکی چھائی ہوئی تھی۔ راجپوتانہ میں راجپوتوں نے سر اٹھایا، بھرتپور میں جاٹوں نے غدر مچایا، نیپال میں گورکھے سر چڑھے، پنجاب میں سکھوں نے فتنہ برپا کیا، مہاراشٹر اور اس کے اطراف میں مرہٹوں نے قیامت اٹھائی۔ حیدرآباد، رہیلکھنڈ، اودھ اور بنگال میں نوابوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ الگ بنائیں، مغل بادشاہ گوبر گنیش بنا۔ لال قلعے میں گلدستہ طاق نسیاں ہوگیا۔ یہ نوخیز ریاستیں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں اور دو شاطران مغرب ان شطرنج کے مہروں کو چل کر بساط ہند پر اپنی بازی جیتنے کی فکر میں تھے۔ انگلینڈ اور فرانس کی شاطرانہ آویزشیں اور ہندی ریاستوں کی خانہ‌جنگیاں، تہذیب، کلچر اور ادب و فن کے لیے سخت ناسازگار تھیں۔ شعرا جو زیادہ‌تر طبقۂ وسطیٰ سے تعلق رکھتے تھے، سخت بے چین اور ستم ہائے روزگار کے اسیر تھے۔ اردو شاعری اس ماحول میں اور فارسی ادبی روایات کے ماتحت جیسی کچھ بن گئی آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔

۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دی اور ۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی طاقت بالکل فنا ہوگئی۔ اس کے بعد انگریز ہندستان پر حاوی ہوگئے۔ ہندستان کے اکثر حصوں میں امن ہوگیا۔ لیکن فضا بالکل ساکن نہ تھی۔ ۱۸۴۹ء میں سکھا شاہی ختم ہوئی، پنجاب پر بھی انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ ۱۸۵۳ء میں جھانسی، ناگپور، برار اور ۱۸۵۶ء میں اودھ برطانیہ کی حکومت کے دائرہ میں داخل ہوئے۔ انگریزوں کی عملداری میں مغربی تہذیب و تمدن اور ادب و فن کے اثرات ملک پر پڑنے لگے۔ ۱۸۳۲ء میں فارسی دربار سے ہٹی اور مقامی زبانوں نے اس کی جگہ لی۔

فورٹ ولیم کالج کھلا۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم بنی۔ کالجوں کی دھوم مچی۔ نہریں،

ریلوے ، بجلی ، تار اور ڈاکخانے قایم ہوئے ۔ اخبارات نکلے اور کتابیں شایع ہونی شروع ہوئیں ۔ غرض زندگی نے ایک کروٹ بدلی اور نئے قدور اور نصب العینوں سے واقف ہونے لگی ۔ یہ زندگی کے مثبتی رجحانات تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ اردو شاعری کو متاثر کیا ۔ ان مثبتی تبدیلیوں کے ساتھ ایک خلفشار بھی معاشرہ پر طاری تھا ۔ جدید و قدیم کی ذھنی ، نیم سیاسی ، ثقافتی اور سب سے بڑھ کر اقتصادی کشمکش ملک میں ھر جگہ پائی جاتی تھی ۔ پرانا نظام بکھر کر نیا نظام قایم ہورہا تھا ۔ پرانی جاگیرداری مٹ رھی تھی ۔ نئی زمینداریاں اور ریاستیں انگریزی "سرمایہ‌دارانہ آمریت" کے سایہ میں اور اسی رنگ میں رنگی ہوئی قایم ہورھی تھیں ۔ صنعتی سرمایہ‌داری کلکتہ ، بمبئی اور مدراس سے نکل کر ملک میں پھیل رھی تھی ۔ پرانے شریف و رئیس طبقے خصوصاً طبقۂ وسطی سے قریب والا طبقۂ اعلی اور طبقۂ وسطی دونوں بےچینی اور بے اطمینانی کے شکار ہورہے تھے ۔ امرائے کبار یا تو جنگ کرکے فنا ہوچکے تھے یا سلطنت برطانیہ کے فرزند ارجمند بن گئے تھے ۔ طبقۂ ادنی بھی زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ سے نہ بچ سکا ۔ پرانے اقتصادی نظام کی شکست و ریخت کے بعد جب نیا نظام قایم ہونے لگا تو یہ طبقہ اپنے کو ان تبدیلیوں کے ساتھ جلد ھم آھنگ نہ کرسکا ، لہذا معاشی بد حالی کا شکار ہوا ۔ ملک میں قحط اور وبائیں پے بہ پے انھیں غیر متوازن حالات کے سبب نمودار ہوتی رھیں ۔ غرض دولت انگلشیہ کے ارجمند فرزندوں ، زمانہ ساز نو دولتوں اور ان کے متوسلین کے علاوہ ملک کے اکثر لوگ کم و بیش پریشانی ، تصادم و کشاکش اور ذھنی کوفت میں مبتلا تھے ۔ ایک طرف امن و امان کی نعمت تھی ، ترقی کے مواقع تھے ، طوائف‌الملوکی اور مرہٹہ گردی سے نجات ملی تھی ، زندگی انداز نو سے مسکرارھی تھی ۔ تعلیم و تعلم عام ہورھا تھا اور دوسری جانب قدیم آسانیوں ، رعایتوں ، زندگی کے مزوں سے محرومی ، پرانے قدور اور نصب العینوں سے مہجوری اور بہتوں کے لئے ناسازگاریاں و ناکامیاں تھیں ۔ اس کشاکش کی ایک نمایاں بھبھک ۱۸۵۷ع کی سعئ ناکام تھی ۔ ۱۸۵۷ ع کی کوشش انقلاب چند در چند وجوہ کی بنا پر ایک انوکھی اور تحت‌السطح موجوں کا پتا دینے والی حرکت تھی ۔

کی ایک گہرے ذاتی نفسی تجربے کے بعد عکاسی کرتا ہے۔ فن فطرت و ماحول کی ایک تخلیق جدید ہوتا ہے۔ صناعت بلاشبہ فن‌کار کے مشاہدات و تجربات کی تصویر ہے لیکن اس تصویر میں صناع کے خون دل کا رنگ ہوتا ہے۔ آرٹ تنقید حیات ہے لہذا یہ صرف آواز بازگشت نہیں۔ یہ تنقید فن‌کار کی نفسی شخصیت کا اظہار کرتی ہے۔ بےروح مظاہر خارجی نفس کے اندر داخلی زندگی حاصل کرتے ہیں اور صناع کی مسیحا نفسی سے پھر خارج میں جلوہ‌گر ہوتے ہیں۔ صنعت و فن کی ایسی جلوہ‌گری میں صرف سرد حقیقت و صداقت کی رونمائی نہیں ہوتی بلکہ صداقت جان‌دار ہوکر برافگندہ نقاب نظر آتی ہے۔ یہ زندہ صداقت سرد و بےروح صداقتوں سے کہیں زیادہ حسین و خوبصورت ہوتی ہے۔ غرض صناعت میں صداقت و حسن و حیات کا امتزاج کامل ہوتا ہے۔ یہ اقانیم ثلاثہ فن‌کار کے دل میں ترکیب پاتے ہیں۔

«نگاہ کی عکس فروشی» کافی نہیں۔ «خیال کی آئینہ‌سازی» اگر مدد کو نہ آئے تو پھر نگار خانۂ فن کی تخلیق ناممکن ہوجائے۔ تجربات و مشاہدات خارجی صناع کے دل میں ایک طوفان اٹھاتے ہیں اور نفسی کیمیا کے اثر سے اس طوفان کا جز بن جاتے ہیں۔ یہ تلاطم اس سبب سے برپا ہوتا ہے کہ فن‌کار کا دل بےحد نازک اور حساس ہے۔ وہ ایک زندہ «برق‌پیما» ہے جسے مہیجات خارجی مرتعش کرتے ہیں:

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے

«صہبائے فکر» میں نگاہ کی عکس فروشی کا پرتو ہوتا ہے اور جب اس سے «آبگینۂ دل» میں «گداز» پیدا ہوجاتا ہے تو ظاہر ہے کہ مشاہدات و تجربات خارجی کوائف قلبی کے ساتھ مرکب ہوکر جزو دل بن جاتے ہیں۔ جب دل میں گداز پیدا ہوگیا تو پھر خارجی مظاہر داخلی زندگی ضرور حاصل کرلیں گے۔ اور اگر گداز پیدا نہ ہو تو پھر فن بےروح اور محض فطرت و ماحول کی نقالی ہوکر رہ جاتا ہے، «ایجاد» و اختراع و تخلیق نہیں بن پاتا۔ جس طرح تیزاب سونے کو گھلا کر خود بھی تیزاب نہیں رہتا بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نیا مرکب پیدا ہوتا ہے اسی طرح گداز دل سے مشاہدات و تجربات اپنی فطری حالت میں نہیں رہتے بلکہ ایک جدید

انداز میں ترکیب پاکر حیات تازہ حاصل کرتے ہیں - یہی ایک فنکار کی خلاقی ہے اور یہی اس کی الوہیّت - یہی وجہ ہے کہ فن میں فنکار کی نفسی شخصیت جھلکتی ہے - مگر فن کو فنکار کی محض نفسی یعنی داخلی تصویر نہیں ہونا چاہیے - صناعت نہ خارجی مظاہر و آثار کا فوٹو ہے اور نہ داخلی نفسی کوائف کی آئینہ‌دار - وہ دونوں کا ایک مرکب ہے - فن میں اگر نری خارجیت ہو تو ــــــ

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اور اگر نری داخلیت ہو تو پھر "عالم تمام حلقۂ دام خیال" محسوس ہونے لگتا ہے - اب یہ انداز خیال پر منحصر ہے کہ عالم ہست و بود کیسا نظر آتا ہے - غالب اس بےراہ روی سے بچ نہیں سکا - فنکار کی غیر جانب داری اور بلندی یہی ہے کہ وہ اپنی داخلی کیفیات کی رو میں بہہ نہ جائے - خارجیت میں اٹکے رہنا "سبکساری ساحل" ہے اور داخلیت میں ڈوب جانا "غرق دریا" ہوجانا ہے - صناع بحر حیات میں اپنے دل کے سفینہ کو "بیم موج و گرداب" سے گزارتا ہوا سلامتئ منزل کی طرف لے جاتا ہے - یہی معیار فن ہے اور بڑے فنکار اس پر پورے اترتے ہیں -

غالب ایک فنکار کی طرح اپنے عہد اور ماحول سے متاثر ہوا تھا - وہ اپنے ماحول کی بےکیف ترجمانی نہیں کرتا - خارجی مہیجات نفسی تجربہ کی شکل اختیار کرتے ہیں اور اس کے بعد غالب کے فن میں منعکس ہوتے ہیں - اس انعکاس میں داخلی رنگ بہت زیادہ ہے اور یہی غالب کی کمزوری ہے -

میں نے اس مقالے کی ابتدا میں نفسی شخصیت کا تجزیہ کرکے بتایا تھا کہ فنکار کی داخلی ہستی وراثت، روایات اور پہلے کے تجربات کے امتزاج سے بنتی ہے - داخلی یعنی نفسی شخصیت ہی خارجی مشاہدات و تجربات کو نفسی تجربے کی حیثیت دےکر ادراک کے سپرد کرتی ہے - فنکار کا ادراک و شعور اپنی قوت تمیز و انتخاب سے کام لےکر فن کے ذریعۂ اظہار (Medium) اور طرز ادا (Technique) کی مدد سے ان تجربوں کو منعکس کرتا ہے - "طرز ادا" ہی "واسطۂ اظہار" کو اس طرح برتتا ہے کہ "شاعرانہ صداقت" اور "شاعرانہ حسن" کے قانون کے اندر رہتے ہوئے حیات پر تنقید ہوجائے -

غالب کی اپنی انفرادی زندگی بھی کشاکش میں گزری۔ وہ حیات کے نشیب و فراز کا ذاتی تجربہ رکھتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے: "۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں ہے۔ اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا اوڑھنا' بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھالیا ..."۔

اس تُرک سلجوقی کی فطرت میں ایک طرف خودداری بلکہ اکڑ بھی تھی اور دوسری طرف شہ کا مصاحب بن کر اتراتا بھی تھا۔ ایک جانب انگریزوں سے ھاتھ تک ملانے میں عار اور دوسری طرف لاٹ صاحب بہادر کی خدمت میں قصیدے گزرانتا اور افسروں کی خوشامدیں بھی کرتا تھا۔ غالب اس عہد کی نمائندہ سیرت کا مالک تھا۔ ھاں غالب کی شخصیت میں جوش حیات، علوئے تخیل اور منفرد بننے کا جذبہ اوسط سے بہت زیادہ تھا اور اس کے کردار کی قماش میں مزاح و طنز کے چند چمکیلے دھاگے بہت ھی دلچسپ تھے۔

غالب نے تحریک ۱۸۵۷ء کو دیکھا اور اس سے نیز اس کے نتائج سے متاثر بھی ہوا۔ کہتا ہے: "۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پھر دن چڑھے وہ فوجی باغی میرٹھ سے دلی آئے تھے یا خود قہر الٰہی کا پے در پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت دلی ممتاز ہے ورنہ سرتاسر قلمرو ھند میں فتنہ و بلا کا دروازہ باز ہے ..."۔ پھر لکھتا ہے: "مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاھور میں معاوضۂ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ ... سرکار سے ہوگا...... اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل ہے۔ اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔

جو احکام دلی میں آئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے، نہ املاک رکھتے تھے، نہ پنشن رکھتے تھے، وغیرہ وغیرہ اور ——

بس کہ فعال ما یُرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا آب انسان کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک ۔۔۔ تشنۂ خون ہے ہر مسلماں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ ۔۔۔ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ۔۔۔ ماجرا دیدۂ ہائے گریاں کا

غالب اپنے سماجی، سیاسی و اقتصادی ماحول سے متاثر ہوا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس تاثر کا رد عمل نہایت ہی صاف اور واضح انداز میں ہوا اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ غالب نے اپنے فن کو اس رد عمل کا ایک خاص ذریعۂ اظہار بنایا۔ جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب نے غالب کے اشعار کی سیاسی تعبیریں کی ہیں، میرے خیال میں یہ نقد غالب کا صحیح طریقہ نہیں۔

غالب سب سے پہلے ایک غزل گو شاعر ہے۔ وہ کاروبار حسن و عشق کا رازداں ہے اور اسی نوع کے واردات کا نغمہ سنج۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ:

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

اور اس نے غزل کے کوزے میں مضامین کے دریا بند کرنے کی کافی کوشش بھی کی۔ غالب کے فن میں واردات محبت کے علاوہ دوسرے تجربات زندگی کی بھی جھلک ہے۔ مگر یہ جلوہ افروزی کس طرح ہوتی ہے اس کی وضاحت لازم ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ غالب کے بہت سے اشعار محض رسمی اور پر تصنع ہیں۔ یہ حیات کی آئینہ داری نہیں کرتے۔ غالب کہتا ہے:-

فریب صنعت ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

فن کار محض گنبد کی صدا نہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کا صرف ایک غیر جانب دار ترجمان نہیں۔ وہ ماحول اور فطرت کی فقط نقالی نہیں کرتا بلکہ وہ مظاہر و مشہود

غالب کے فن میں بھی اس کے ماحول کی پیش‌کش صداقت و حسن و حیات کے مثلث کے اندر ہوتی ہے۔ لیکن غالب کے بہت سے ایسے تجربات ہیں جو نفس کی گہرائیوں میں نہیں اترسکے اور اپنی سطحیت کے عالم ہی میں لباس شعر میں رونما ہوگئے۔ اکثر ان سطحی اور رسمی خیالات کو آرائش ظاہری کے رنگین و مرصع لباس کے اندر پر وقار اور اہم بنانے کی سعیٔ ناکام کی گئی ہے۔ فی‌الحال ایسے اشعار سے قطع‌نظر ہمیں غالب کے اصلی واردات کا جائزہ لینا ہے۔

قبل ہم نے دیکھا کہ غالب کا اجتماعی اور ذاتی ماحول ایک عالم تذبذب و کشاکش ہے۔ اسی ماحول کا عکس غالب کی نفسی شخصیت پر پڑتا ہے اور اس شخصیت سے اثر پذیر ہوکر اس کے فن میں دوبارہ منعکس ہوتا ہے۔ غالب کی نفسی شخصیت کی تشکیل و تعمیر بھی اصولاً قومی، عمرانی، ثقافتی اور ادبی وراثت و روایات اور اس کے پہلے کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے امتزاج سے ہوئی۔ اسی وجہ سے ہم نے غالب کے فن کی تفہیم کی خاطر اس کی قومی، عمرانی، ثقافتی و ادبی وراثت روایات کا جائزہ لیا، نیز ہم نے اس کے ذاتی اور اجتماعی ماحول پر بھی نظر کی۔ غالب کے پہلے منفیانہ رجحانات کی بہتات ہے اور غالب کے عہد میں منفی و مثبت کی ایک کشمکش کا جو پوری طور پر واضح نہیں ہوئی، پائی جاتی ہے۔

غالب کے فن میں ہم اسی تذبذب و کشاکش کو منعکس پاتے ہیں۔ یہاں منفی میلان کے ساتھ مثبت میلان بھی پایا جاتا ہے۔ مثبتی میلانات کی جھلک صرف غالب کے ماحول میں ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اس کی عمرانی و ادبی روایات کی فضائے بعید میں بھی رجائیت اقدام اور نشاط عمل کے جلوے پائے جاتے ہیں۔ ہم نے غالب کی اردو روایات شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے جس میں یاس و قنوط کی کارفرمائی ہے۔ مگر غالب فارسی شاعری سے بھی بہت زیادہ متاثر ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں فارسیت ہی کا زیادہ اثر ہے۔ غالب کے طرز ادا سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ وہ فارسی کا بھی بہت بڑا شاعر ہے۔ فارسی شاعری کی روایات میں بھی قنوطیت کے ساتھ رجائیت پائی جاتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے اردو شاعری فارسی

شاعری کے منفیانہ رجحانات سے ھی اثر پذیر ہوئی مگر خود غالب نے فارسی شاعری کے مثبتی اور منفیانہ میلانات دونوں سے اثر قبول کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
بجنگ باج ستانان شاخسارے را تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
بصلح بال فشانان صبحگاھی را ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم
ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

فارسی شاعری کے رجائی و مثبتی عناصر پر اس مقالہ میں سرسری نظر کا بھی موقعہ نہیں ۔ اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایرانی قومیت کے دور احیا کی شاعری میں مثبتی عناصر پائے جاتے ھیں ۔ جس ادب میں سعدی، فردوسی اور رومی کا سرمایہ ہو اسے اس کے دور انحطاط کی شاعری کے ہوتے ہوئے صرف قنوطی ادب نہیں کہہ سکتے ۔

غالب کی شخصیت کی تعمیر میں فارسی شاعری کے مثبتی و رجائی عنصر نے بھی کچھ حصہ لیا تھا ۔ اس کے ادبی روایت کے علاوہ غالب کی عمرانی روایت بھی اپنے منبع و مصدر میں رجائیت اور جوش عمل سے بھری ہوئی ہے ۔ غالب ماوراُالنہر کا ترک سلجوقی تھا ۔ اسے اپنے ”پیشۂ آبا“ پر فخر تھا ۔ سلجوقیوں کی تعمیری روایات سے ایک عالم واقف ہے ۔ وہ ایک پرجوش و آزاد قوم کا فرد تھا ۔ زمانہ کی نامساعدت نے اس کے دادا کو ھندستان پہنچادیا ۔ جہاں انحطاط و زوال کی گھٹائیں خیمہ‌زن تھیں ۔

غرض غالب کی شخصیت اور شاعری کے پس منظر میں بھی یاس و قنوط، فرار و گریز کے ساتھ رجائیت و تفاول، اقدام و عمل پائے جاتے ھیں ۔ اور یہی دو متضاد میلانات اس کے متذبذب ماحول میں زمانہ کی ہم آہنگی کے سبب اس کے فن کے ذریعہ چہرہ نمائی کرتے ھیں ۔ دبے ہوئے میلانات کا ابھر آنا حالات کی سازگاری پر منحصر ہے ۔

غالب سے پہلے کی اردو شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کا فن بدیع‌المثال معلوم ہوتا ہے ۔ واقعی اردو شاعری کے ارتقا میں غالب کا فن ”بداعت“ (Mutation) کی ایک مثال ہے اور اس بداعت نے آئندہ آنے والے انقلابی میلانات کو کافی متاثر کیا ہے ۔

جس طرح علم‌الحیات† نے حیاتیاتی میدان میں «بداعت» کے اسباب و علل کو منظر عام پر لارکھا ہے۔ اسی طرح عمرانی و ادبی «بداعت» کے اسباب و وجوہ کو منکشف کیا جاسکتا ہے۔ انجلز (Engels) نے قانون «بداعت» کو عمرانیات میں بھی برت کر دکھایا ہے۔ میں نے اسے غالب کی ادبی بداعت کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ «بداعت» ایک عام قانون حیات ہے۔ آہستہ خرام ارتقا کی زنجیر میں کہیں کہیں «بداعت» کی انوکھی کڑیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اردو شاعری کی زنجیر میں غالب کا فن اسی قسم کی ایک انوکھی کڑی ہے۔

میرے ایک بزرگ مٹی کے معاصر (پٹنہ) میں رقم طراز ہیں کہ—«غالب میں جو انقلابیت ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ اپنے اور زمانے کے حالات سے ان میں ایک قسم کی بےچینی اور بےاطمینانی پائی جاتی ہے۔ اور زمانہ جو رنگ بدل رہا اور طبقہ خاص کو جس کے وہ خود ایک ممتاز رکن ہیں ان تمام آسانیوں، رعایتوں اور زندگی کے مزوں سے جو ان کے لیے مخصوص تھے محروم کر رہا ہے۔ یہ ان کے لیے سخت تکلیف‌دہ اور سوہان روح ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ان حالات میں ان کے اندر انقلاب پیدا کرنے کا جذبہ ہو وہ صرف اس دنیا سے بھاگ کر کسی امن و سکون کی جگہ پناہ لینا چاہتے ہیں:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم‌سخن کوئی نہ ہو اور ہم‌زباں کوئی نہ ہو

یہ بالکل صحیح ہے کہ غالب کے اندر بےچینی اور بےاطمینانی پائی جاتی ہے اور یہ بھی درست کہ اس میں زمانہ ستیزی اور عملی انقلابیت کی روح نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس کے اندر حالات کو بدلنے اور «قاعدۂ آسمان» کو منقلب کردینے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ یہ نصف صداقت ہے کہ غالب کے اندر صرف فرار و گریز کا جذبہ موج زن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دُبدھے میں مبتلا ہے۔ ہر چند کہ اس کے اندر

† میں نے (Mutation) کا ترجمہ «بداعت» کیا ہے۔ اس قانون کے تفصیلی علم کے لیے ملاحظہ ہو قانون منڈل (Mendel's Law) آپ بائلوجی کی کسی اچھی کتاب سے استفادہ فرماسکتے ہیں۔ اختر

پیکار و جنگ کا جوش واضح نہیں ہوا۔ پھر بھی وہ اسی دنیا اور اسی سماج میں رہ کر تمنائے رنگ و بو کو کامیاب بنانا چاہتا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب مقابلے کے جوش کو دبائے ہوئے ہے:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اس ساری غزل میں ایک نفسی دباؤ اور اضطراب خاموش کا اظہار ہے۔ غالب، میر کی طرح کبھی جل بجھ کر راکھ نہیں ہوا۔ جس غزل کا مطلع ہے:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس میں ایک جاگا ہوا اور بیقرار جذبۂ جستجو و استفہام پایا جاتا ہے۔ یہ دلیل زندگی ہے۔ غالب کے ذہن و ادراک، تخیل و جذبہ، حواس و احساس سے پسپائی آشکار نہیں ہوتی وہ زندگی کو چھونا، دیکھنا، برتنا اور سمجھنا چاہتا ہے:

شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟ نگۂ چشم سرمہ سا کیا ہے؟

اگر ایک طرف غالب کہتا ہے کہ:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

تو کبھی وہ یہ ارادہ بھی رکھتا ہے کہ:

بجنگ باج ستانان شاخسارے را تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم

حقیقت یہ ہے کہ غالب امید و ناامیدی کے درمیان کشمکش میں گرفتار ہے۔ غالب کے اس مثبتی رجحان کو علامہ اقبال نے بھی محسوس کیا تھا۔ غالب فلک مشتری† پر یہی نغمہ گاتا ہے۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ غالب میں منفیانہ رنگ مثبتی رنگ سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اور دونوں کا اتار چڑھاؤ غیر منقطع ہے:

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

† ملاحظہ ہو جاوید نامہ از علامہ اقبال۔ فلک مشتری صفحہ ۱۳۶۔

آئیے ذرا غالب کی تمناؤں کے خاکستر کو کریدیں ۔ شاید وہاں بھی ہمیں کچھ تپتی ہوئی چنگاریاں مل جائیں :

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم‌سخن کوئی نہ ہو اور ہم‌زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

شاعر اپنی «محرومیٔ قسمت» سے افسردہ ہوکر ایسی دنیا بسانی چاہتا ہے جہاں کم از کم «مردم گزیدگی» سے اسے نجات حاصل ہوجائے ۔ مگر اس دل برداشتگی کے اندر بھی محبت کرنے والے لوگوں کے درمیان رہنے کی آرزو کروٹیں لے رہی ہے ۔ تیسرے شعر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تنہائی اور بےکسی کو پیش کرکے سماج کے ہم‌دردانہ جذبات کو اکسانا چاہتا ہے ۔ اسے تیمارداری کی ضرورت کا احساس ہے اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جب وہ مرجائے تو اس پر لوگ آنسو بہائیں ۔ وہ ہمسایہ اور پاسبان کا بھی آرزومند ہے اور ہم‌سخن و ہم‌زبان کا بھی ۔ اس قطعہ میں نفرت و غصہ یا سخت بیزاری کا جذبہ نام کو بھی نہیں ۔ صحیح معنوں میں غالب اس معاشرہ سے بھاگنا چاہتا ہی نہیں ۔ وہ دنیا اور سماج میں ابھی دل‌کشی پاتا ہے ۔ وہ صرف مہجوری اور بے اعتنائی سے دلگیر و دردمند ہے ۔ «کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ!» ع :

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

اس مصرع کو دوبارہ پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب تیاگ اور خانہ ویرانی کا قائل نہیں ۔ «بے در و دیوار» کے منفیانہ پہلو کے ساتھ «گھر بنایا چاہیے» کا مثبتی پہلو زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے ۔ اس سارے قطع کا طرز بیان ایسا ہے جس

سے فرار اور استقرار دونوں ظاہر ہوتا ہے۔ غالب کی اصل کیفیت اس کے اس مصرع سے معلوم ہوتی ہے:

وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

شاعر کی "حسرت تعمیر" کبھی پوری نہ ہوئی:

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے   ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

مگر اس کی شمع آرزو بجھ بجھ کر جلتی رہی:

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں، انتظار ساغر کھینچ

ایک طرف یہ حال ہے:-

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے   تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور — ہوگئیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگ ناگہانی اور ہے

دوسرا رخ ملاحظہ ہو:-

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب   لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی   فتنۂ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

ان دو متضاد کیفیات کے درمیان توازن یا جدلیاتی ارتقا (Dialectic Evolution) نہیں پایا جاتا ۔ کبھی تضاد ترقی کی طرف لے جاتا ہے اور کبھی شوریدگی اور پریشانی کی طرف ۔ اول‌الذکر حالت اقبال میں پائی جاتی ہے اور ثانی‌الذکر غالب میں ۔ ع :

ہے دل شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب

اس تصادم و کشاکش کا نتیجہ یہ ہے کہ غالب زندگی ہی کو کبھی قید و مصیبت سمجھنے لگتا ہے اور کبھی یہ کہ :

« بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے »

اور حقیقت یہ ہے کہ حیات نہ باطل ہے اور نہ محض لعب و لہو ۔ غالب کی «خودی» میں بھی اسی سبب سے ایک بھڑکے ہوئے جانور کی سی وحشت اور ابہام پایا جاتا ہے ۔ اقبال کی خودی واضح اور متمدن ہے ۔ غالب کی خودی مبہم اور وحشیانہ ہے ۔ اقبال اسے «خودی کی نامسلمانی» کہتا ہے ، ملاحظہ ہو :

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

تیسرے شعر میں منفیانہ کیفیت شروع ہوگئی ہے ۔ خودی جب بھٹک جائے تو خود بھی فنا ہوجاتی ہے ۔ حال یہ ہوجاتا ہے :

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ «ہے» ۔ نہیں ہے

میر کہتا ہے :

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

میر داخلی اور ذاتی کیفیت کو پیش کرتا ہے اور غالب اپنے تجربے میں سارے عالم کو شریک کرلینا چاہتا ہے ۔ بہرحال تجربہ ایک ہی ہے ۔ نفیء خودی ۔ خودی کا ابہام ملاحظہ ہو :

ہنگامۂ زبونیء ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

غالب کی زندگی ہوش اور بے ہوشی کے دو راہے پر ہے :

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

خمار ایک درمیانی حالت ہے ۔

اصل یہ ہے کہ غالب ایک رومانی (Romantic) شاعر ہے ۔ وہ اپنے ماحول سے مطمئن نہیں اور اسے بدلنا چاہتا ہے مگر بدل نہیں پاتا لہذا کبھی تو اس ماحول سے تنگ آکر اسے چھوڑ جانا چاہتا ہے اور کبھی وہیں ٹھہر کر انتظار کرتا ہے ۔ کبھی مقابلہ کی رگ بھی پھڑکتی ہے مگر دعوت عمل کا جوش نہیں پیدا ہوتا ۔ یہ چیز غالب کے بعد اردو شاعری میں پیدا ہوئی ۔ اس کے پہلے یاس و حسرت یا فریب کے سوا کچھ نہ تھا ۔ مگر غالب کی تمناؤں میں جان ہے اور اس کے حوصلے بہت بلند ہیں ۔ وہ یہ جانتا ہے کہ : « فتنۂ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے » اور اسی سبب سے وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ :

منظر اک بلندی پر اور ہم بناسکتے عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

اور کہتا ہے :

مئے عشرت کی خواہش ساقئ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دوچار جام واژگوں وہ بھی

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب؟
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کے تکرار کیا کریں

غالب نے اپنے ہاتھ سے ایک اپنی تصویر کھینچی ہے - دیکھیے :-

پیدا نہیں ہے اصل تگ و تاز جستجو — مانند موج آب زبان بریدہ ہوں
میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں
ہوں گرمئ نشاط تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

غالب کی آنکھ کھلی ہوئی ہے - اس کی آرزوئیں بیدار ہیں اور گلشن دعوت تماشا دے رہا ہے - وہ آغوش چمن میں ہے مگر دم بھر کا مہمان - شبنم کے قطروں کی طرح - لیکن وہ ہستیء ناپائدار کے باوجود تگ و تاز جستجو سے باز نہیں آیا - وہ بے قرار ہے تو اس لیے کہ اس تگ و تاز کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا - تاہم وہ ناامید نہیں - وہ اپنی تخیل کی کارفرمائی سے ایک اچھوتی دنیا بساتا ہے اور اسی کی بہار کے تصور سے سرشار ہوکر نغمہ پیرا ہوتا ہے -

اسی تصور میں کچھ اور رنگ بھی جھلکتے ہیں مگر کسی میں فرار و گریز کی زردی نہیں - صرف تمنا اور یاس کی کشمکش نظر آتی ہے - کبھی اک دردمندانہ بیزاری اور کبھی اپنی کمزوری کا احساس پایا جاتا ہے -

میں بہت قبل عرض کرچکا ہوں کہ غالب کی غزل گوئی کی بنیاد اصلی واردات حسن و عشق ہی ہے - لیکن وہ نہ تو شیش محل میں بیٹھ کر عشق کرتا ہے اور نہ دنیا سے الگ تھلگ ہوکر ایک ماتم خانۂ محبت تعمیر کرتا ہے - وہ اپنی محبت کو ایک سماجی ماحول عطا کرتا ہے - غالب محبت کرتے وقت دنیا کی طرف سے آنکھیں موند نہیں لیتا - اس کی غزلوں کی « فضا » میں صرف فراق و وصال ، رقیب و درباں ، چارہ گر و ندیم ، محبوب و خلوت ناز ہی نہیں بلکہ زندگی کے اور بھی مظاہر ہیں - اس کے تغزل کی مثال ایک نگینہ کی سی ہے جو زندگی کی انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے - غالب کے تجربات حسن و عشق اس کے دوسرے تجربات کو متاثر کرتے ہیں اور خود بھی ان کا اثر قبول کرتے ہیں - غرض غالب کے مشاہدات حسن اور واردات عشق ایک « ارضیہ » (Setting) کے اندر پائے جاتے ہیں - غالب کے عام تجربات حیات کی نوعیت کو جان لینے کے بعد اس کے تجربات حسن و عشق کی کیفیت کو بھی سمجھا

جاسکتا ہے۔ جس طرح اس کے عام تجربات زندگی میں مثبت و منفی عناصر پائے جاتے ہیں اسی طرح اس کے اس خاص تجربے میں بھی متضاد و متصادم میلانات ملتے ہیں۔ غالب کے رسمی اشعار کو علیحدہ کرکے اگر دیکھا جائے تو اس کے تغزل میں یاس و نشاط دونوں پائے جاتے ہیں۔ میرا مطالعہ یہ ہے کہ غالب کے یاس انگیز و نشاط آفریں تجربات عشق نے اس کے دوسرے تجربات حیات کو اپنے رنگ میں اتنا نہیں رنگا جتنا خود ان تجربات نے اس کی محبت کی دنیا پر اپنا رنگ چڑھایا ہے۔ یعنی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ چونکہ غالب کے عام تجربات حیات یاس و امید کا ایک آمیختہ تھے اس کے تجربات محبت بھی اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ مومن کی محبت اس کی زندگی پر چھائی ہوئی تھی اور یہی سب کچھ تھی۔ مگر غالب کی محبت اس کی حیات کا ایک جزو ہے خواہ کسی قدر ہی اہم کیوں نہ ہو:

گو میں رہا رہین ستم‌ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اور کبھی یہ بھی کہ:

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

آئیے ذرا غالب کے تجربات حسن و عشق کی کشاکش و تذبذب دیکھیں:

« مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے » والی غزل میں ایک خاص جوش حیات پایا جاتا ہے۔ اس غزل میں عشق نہ ایک پیشہ کے رنگ میں پیش ہوا ہے، نہ ایک مرض کی شکل میں۔ یہاں عشق ایک مطالبۂ زندگی ہے اور حسن مرئی و محسوس:

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال   صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو   سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

ہر چند کہ یہاں غالب کے تجربے میں رفعت نہیں تاہم یہ ذہنی علالت سے محفوظ ہے۔

غالب کی واردات محبت میں صرف پسپائی نہیں پائی جاتی۔ نشاط محبت کے ساتھ ناامیدیاں بھی ہیں مگر عزم و ارادہ اور مصائب کے مقابلہ کی روح بالکل مٹتی نظر نہیں آتی۔ ہاں غالب اکثر کاروبار حسن و عشق کو ہی غم روزگار سے پناہ حاصل کرنے کی ایک سبیل بناتا ہے۔ لیکن زمانہ اسے کبھی اس قابل بھی نہیں رہنے دیتا:

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

غالب کا اصل مقام محبت میں یہ ہے ۔ وہی تذبذب :

آج ہم اپنی پریشانئ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اور :

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعئی بے حاصل میں ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

غالب کی نامرادیاں اور ناامیدیاں ملاحظہ ہوں :

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا ' مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
میں نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

خزاں کیا ؟ فصل گل کہتے ہیں کس کو ؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ۔ قفس ہے ۔ اور ماتم بال و پر کا ہے
وفائے دلبراں ہے اتفاقی ' ورنہ اے ہمدم !
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

آئیے اب ذرا غالب کی رجائیت ملاحظہ فرمائیے :—

وہ نیشتر سہی ، پر دل میں جب اتر جائے نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے
نہیں ذریعۂ راحت ، جراحت پیکاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو ، نگار تو ہے روانئ روش و مستئ ادا کہئے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو ، بہار تو ہے طراوت چمن و خوبئ ہوا کہئے

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا ، شکوۂ بیداد نہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجر بید نہیں

غالب کے فن میں مزاح لطیف ، بذلہ سنجی ، شوخی و ظرافت ، طنز و مضحکہ بھی قابل مطالعہ عناصر ہیں - یہ چیزیں بھی اس کی خاص نفسی کیفیت کی آئینہ‌دار ہیں - مزاح ، ظرافت و طنز مختلف کیفیات نفسی کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں - کبھی ان میں یاس و قنوط اور سوز و درد پایا جاتا ہے - کبھی نشاط و خوش دلی ، امنگ اور رجائیت جلوہ‌گر ہوتی ہے - کبھی تلخی کا اثر پایا جاتا ہے ، گاہ خوش‌گوار اصلاحی تنقید جھلکتی ہے اور گہ تشکیک و تذبذب -

غالب کے مزاح میں یاس و درد کے ساتھ زندہ دلی اور نشاط کی کارفرمائی بھی ہے - اس کے یہاں طنز بھی ہے مگر تلخی نہیں - اس کی ظرافت میں خوش‌گوار اثباتی تنقید بھی ملتی ہے اور کچھ تشکیک اور تذبذب کی رونمائی بھی ہے -

میر کی مثنویوں [برسات میں گھر کی حالت اور شہر آشوب] میں مزاح کے ساتھ درد و سوز (Pathos) اور یاس و قنوط کی دل‌گیری ہے - ہنسی ہے مگر گریہ آلود - غالب کے یہاں بھی اس نوع کا مزاح لطیف پایا جاتا ہے - ملاحظہ ہو :—

اگا ہے ، گھر میں ہر سو سبزہ ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر - جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اس قسم کے خندۂ دردناک اور المیہ سے بہت قربت ہے - مندرجۂ ذیل دو اشعار سے مزاحیہ موقع بھی ظاہر ہوتا ہے اور الم انگیزی بھی ٹپکتی ہے :

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اور : رو میں ہے رخش عمر - کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دوسرے شعر میں "جون گلپن" (Jhon Gilpin) کا سا نقشہ ہے مگر پر الم -

غالب کی ظرافت اور طنز بھی لطیف ہوتے ہیں - اس میں سودا کی سی تلخی نہیں پائی جاتی - اگر غالب ہجو بھی کرتا ہے تو نہایت ملیح - اس کی بذلہ سنجی میں وحشت نہیں پائی جاتی :

پوچھ مت، رسوائی انداز استغنائے حسن　　دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا

ترے وعدے پر جئیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اس طعنہ میں کتنا اثباتی رنگ جھلکتا ہے :

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے، خدا نہ کردہ، تجھے بےوفا کہوں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیء فرشتہ ہماری جناب میں

اس شعر کا بھی اثباتی رنگ آپ نے غور فرمایا ہوگا۔ اس کے طنز میں جارحانہ تنقید پائی جاتی ہے لیکن لطافت کے ساتھ۔ اسی نوع کا ایک طنز لطیف ہے۔ ملاحظہ ہو:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے۔ یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

طنز و ظرافت کے مثبتی میلان کا عروج اکبر الہ‌آبادی کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ میر، سودا، انشا، غالب، اکبر الہ‌آبادی اور اقبال کے مزاح و ظرافت کا سلسلہ‌وار مطالعہ بہت ہی نظر افروز ثابت ہوتا ہے۔

اب ذرا غالب کے ہجویہ اشعار دیکھیے۔ وہی لطافت یہاں بھی ہے:

کہاں مےخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا، کہ ہم نکلے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلاسکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

غالب کی تشکیک ملاحظہ ہو۔ ظرافت و تشکیک کا امتزاج کامیاب:

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو۔ یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب اپنی خندہ آفریں حالت پر بھی ہنس سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے:

ہولیے کیوں نامہ‌بر کے ساتھ ساتھ　یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھادیا کہ یوں

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

نوشتہ بالا اشعار کے مطالعہ سے غالب کے مزاحیہ رنگ کے دو مختلف 'رنگ' آپ کو صاف نظر آئے ہوں گے۔ ایک میں درد کی ملونی ہے تو دوسرے میں نشاط کی آمیزش۔

اب تک غالب کے بارے میں جتنا علم حاصل کیا جاچکا ہے۔ اس کی روشنی میں اس کے طرز (Style) کا مطالعہ دل چسپ اور حقیقت افروز ہوگا۔ ایک ناقد کہتا ہے کہ "تجربات اور ان کے ذریعۂ اظہار میں تعلق روح و جسد کا ہے، جسم و لباس کا نہیں"۔ ظاہر ہے کہ جب حقیقت یہ ہے تو روح کے کوائف کا جسم پر نمایاں و محسوس اثر لازمی ہے۔ خارجی تجربے نفسی تجربے کی زندگی حاصل کرنے کے بعد ذریعۂ اظہار کی وساطت سے فن کی شکل میں جلوہ‌گر ہوتے ہیں۔ طرز ادا کا مسئلہ اصل میں نفسی حالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ لہذا طرز میں نفسی حالت کا انعکاس ضروری ہے۔

غالب کا طرز ہمیں اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ ہرچند کہ "میر و درد کی طرح ان کا کوئی خاص انداز بیان نہیں۔ وہ کم از کم تین طرز سے اظہار خیالات کرتے ہیں"۔ تاہم غالب کے کلام میں ایک خاص تیور و آہنگ پایا جاتا ہے جو منفرد ہے۔ اس آہنگ میں اس کی شخصیت کی گونج ہوتی ہے۔ غالب کے طرز کی ناہمواری میرے خیال میں اس کی ناہموار نفسی کیفیت کے سبب ہے۔ اس کی نفسی کشاکش صرف اس کے خیالات ہی میں منعکس نہیں ہوتی بلکہ اس کے طرز میں بھی جھلکتی ہے۔ چونکہ غالب کی نفسی حالت میں تضاد و تصادم پایا جاتا ہے لہذا اس کے طرز بیان میں بھی تضاد و اختلاف ہے۔

غالب کا ایک رنگ یہ ہے جس میں سادگی کے ساتھ دل‌کشی پائی جاتی ہے۔ یہ سہل ممتنع کی مثال ہے۔ اس میں صبح صادق کی سی روشنی اور لطافت کے جلوے

ہیں - اس طرز میں عبادت صباحی کی سی سپردگی، گداز اور اثر ہے - عرض نغمہ کے وقت مندر سے اٹھنے والی شفاف، دھیمی مگر واضح موسیقی - نغمے کی اس نرم آنچ میں حدت سے زیادہ اس کا نور محسوس ہوتا ہے - سماعت فرمائیے :-

درد منت کش دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الہی یہ ماجرا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی؟

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا

طرز بالا کی تعمیر میں غالب، میر کی روایات سے کافی فیض یاب ہوا ہے - اسی رنگ میں ایک دو 'شیڈ' کی زیادتی سے سادگی و پرکاری کا امتزاج بھی اس نے پیدا کیا ہے - ملاحظہ ہو :-

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا　　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

میر کے یہاں بھی رنگ کی یہ ہلکی سی تیزی نظر آتی ہے ۔ اس کے دونوں 'شیڈ' ملاحظہ ہوں :

هستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اک اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

اور دوسرا 'شیڈ' :

اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں کنج قفس رہی
میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے کے پاس — آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی
جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے
فرصت رہی جو میر بھی سو یک نفس رہی

طرز کی اس مشابہت کے باوجود پوری غزلوں کے مطالعہ سے غالب اپنے خاص تیور، خیالات اور آھنگ سے پہچانا جاسکتا ہے ۔ میر سراسر درد اور ماتم ہے ۔ غالب گداز و سپردگی سوز و نالہ کے عالم میں بھی اپنی خودداری اور بالیدگی کو مکمل طور پر فراموش نہیں کرتا۔

میر اور غالب دونوں کے یہاں 'شیڈ' کی تیزی فارسی ترکیبوں سے پیدا کی گئی ہے مثلاً ۔ «نقش وفا» ۔ «وجہ تسلی» ۔ «شرمندۂ معنی» ۔ «خانہ زاد زلف» ۔ «گرفتار وفا» ۔ «کنج قفس» ۔ «پا شکستہ» ۔ «صدائے جرس» ۔ وغیرہ ۔

غالب کے طرز کے دوسرے قطب کی دریافت سے مندرجۂ ذیل رنگ ظاہر ہوتا ہے :

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا
بہ فیض بے دلی ۔ نومیدی جاوید ۔ آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

هوائے سیر گل - آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا
جراحت تحفہ ، الماس ارمغاں ، داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غمخوار جان دردمند آیا

شب - خمار شوق ساقی ، رستخیزاندازہ تھا   تا محیط بادہ ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

ہے نـاز مفلساں زر از دست رفتہ پر   ہوں گل فروش شوخیٔ داغ کہن ہنوز

سرشک سر بہ صحرا دادہ ، نورالعین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ ، برخوردار بستر ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد   جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

دل - خون شدۂ کشمکش حسرت دیدار   آئینہ بہ دست بت بد مست حنا ہے

اس طرز میں ایک آدھ لفظ کے علاوہ سارے الفاظ ، فارسی اور عربی کے ہیں - ترکیبیں اور بندشیں فارسی کی اور انداز بیاں بھی مستعار - بلند آہنگ الفاظ اور شاندار ترکیبوں کی سطح کے نیچے بیشتر کھوکھلے خیالات ہیں - ڈھول کا پول کھل جانے کے بعد ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے - اس طرز میں تصنع کے سبب سطحیت ، رسمیت اور لغویت کے کھپنے کی گنجائش کسی اور دوسری طرز سے زیادہ ہے - غالب کے اکثر بیہودہ اور نـاکارہ اشعار اسی مغلّق ، مفرّس اور بلند بانگ طرز میں پائے جاتے ہیں - اس کی تخلیق کچھ تو فارسیت کے اثر سے ہوئی (حالانکہ اس کا گنجلک انداز بیان فارسی تغزّل کے لیے بھی ننگ ہے) لیکن اصل سبب غالب کی غیر مطمئن ، مضطرب اور مذبذب نفسی کیفیت ہے - غالب میں زندگی کی نمود ہے - اس کی خواہش بڑھنے ، پھولنے پھلنے اور چھاجانے کی ہے - مگر زمانہ اس نمو اور ارتقا کے لیے سازگار نہیں - نتیجہ یہ کہ غالب کی طبیعت میں ایک ایسا احساس برتری پایا جاتا ہے جسے کم تری کا خوف دامن گیر ہے - اس پر تصنع اور رعب دار طرز کی نمائش ، ٹھاٹ اور پر وقار چم و خم ایک ایسی بناوٹ ہے جس میں انوکھا ، اونچا اور لاثانی بننے کی خواہش

بے چینی سے اپنے پاؤں پٹک رہی ہے' اور اپنی گردن برات کے زیور سے لدے ہوئے گھوڑوں کی طرح تانے ہوئے ہے۔

اوپر بیان کیے ہوئے دونوں متضاد طرز کے قطبین کے وسط میں ایک اور طرز خط استوا کی طرح اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تیسرا متوسط طرز پہلے طرز کے دوسرے شیڈ میں کچھ اور تیزی پیدا کردینے سے وجود میں آیا ہے۔ اس طرز کی اپنی مستقل انفرادیت ہے۔ ملاحظہ ہو:

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کے لیے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

دیکھو مجھے! جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو! جو گوش حقیقت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

داغ فـراق صحبت شب کی جلی هـوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس آخرالذکر طرز کے امکانات بہت وسیع هیں - اس کے ذریعہ جدت اور تخلیق نو کی آرزو کامیاب و بارور نظر آتی ہے - غالب اس خاص قماش (Pattern) کے فن کارانہ استعمال سے بہت اچھے اچھے اختراعی نمونے (Design) پیدا کرتا ہے - اول الذکر طرز کی سادگی اگر روح میں گھلاوٹ پیدا کرتی ہے تو آخرالذکر طرز تخیل و ادراک میں وسعت اور آبادی کے احساس کو وجود میں لاتا ہے - پہلا طرز احساسات، واردات اور کوائف نفسی کا ایک شفاف انعکاس ہے اور تیسرا طرز شاداب ترکیبوں، زندہ تشبیہوں اور فکر انگیز استعارات کی مدد سے واردات و کوائف پر اشکال و صور کا اضافہ کرتا ہے - "سیر چراغاں" - "نالہ‌هائے شرربار" - "صد هزار نمکداں" - "(ساقی به جلوه) دشمن ایمان و آگہی" - " (مطرب به نغمه) رهزن تمکین و هوش" - "داماں باغباں" - "کف گل فروش" - "جنت نگاه" - "فردوس گوش" - "گلستان تسلی" "چشم و چراغ صحرا" - "پندار کا صنم کده" - "جلوه‌هائے معانی" - "مغنئ آتش نفس" - "جلوۂ برق فنا" وغیرہ وغیرہ - یہ سب ایک زندہ بتخانۂ تصور همارے سامنے پیش کرتے هیں - اس نوع کی فن‌کاری کو عجمیت کہتے هیں - ایران اور هندستان کا پرکار و صورت آفریں دماغ یونانی تخیل سے اس بارے میں مشابہت رکھتا ہے اور سامی دماغ کے عبرانی اور عربی نمونوں سے مغائرت - مگر "عجمیت" اور "یونانیت" (Hellenison) طرز ادا و ترکیب اظہار (Technique) میں ایک دوسرے سے جدا جدا هیں - "یونانیت" 'واقعیت' و نفاست پر زور دیتی ہے اور "عجمیت" ندرت و 'مثالیت' پر - غالب کی شخصیت اور اس کے فن میں عجمیت نمایاں نظر آتی ہے -

اگر غالب میں تذبذب و کشاکش کی جگہ استقامت و استواری هوتی تو وہ اسی آخری خوبصورت طرز کو اختیار کرتا - اسی طرز کی امکانات سے لبریز روایات کی بنیاد پر اقبال نے اپنے فن کی عمارت کھڑی کی -

آسماں هوگا سحر کے نور سے آئینہ‌پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا هوجائے گی
(اقبال)

سر سید کے ایک مخالف

(مولوی علی بخش خاں شرر)

(از : آل احمد سرور صاحب ایم - اے لکچرار اردو ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سر سید کو آج اپنے زمانے کا سب سے بڑا مدبر اور مصلح سمجھا جاتا ہے - جو بیداری اور روشنی ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں وہ سر سید ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے - سر سید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قوم میں پہلے «احساس زیاں» پیدا کیا اور پھر اس احساس سے کام لے کر زمانہ کی رفتار پر چلنا سکھایا - بادشاہت کی تال تلیوں میں پڑے پڑے جس سماجی زندگی میں کثافت آگئی تھی اس میں وقتی ضروریات کی حرکت اور روانی پیدا کی - انتشار اور بے مرکزی کے خلاف جد و جہد کر کے لوگوں کو ایک نصب العین کی طرف بلایا - جس رسم و رواج کا نام مذہب رکھ دیا گیا تھا اس کا بت توڑا جس چیز کو باعث ذلت سمجھا جاتا تھا اسے عزت کی چیز بتایا اور جو نقطۂ نظر اس وقت عام طور پر کارفرما تھا ، اسے یک قلم بدل کر ایک نیا اور جدید تصور قائم کیا -

آج ہم اس کا پورا پورا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں کہ انھیں اپنے راستے میں کیا کیا مشکلیں پیش آئیں ، کن کن لوگوں سے انھیں سابقہ پڑا - وہ کس پائے کے تھے اور ان کی مخالفت کے اسباب کیا تھے ؟ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ سر سید کے جتنے مخالف تھے وہ یا تو تنگ نظر تھے یا خود غرض - ہمیں سر سید اپنے زمانے کے ایک دیو پیکر شخص نظر آتے ہیں جو بونوں میں گھر گیا ہو اور جس پر ہر طرف سے برابر وار ہو رہے ہوں - ہم سمجھتے ہیں کہ سر سید قوم کو آگے بڑھانا چاہتے تھے

مگر کچھ سرپھرے ایسے بھی تھے جو اسے پیچھے کی طرف لوٹانے میں مصروف تھے' جو زمانے کی رفتار کے خلاف کام کررهے تھے - انھیں شکست هوئی اور سر سید کامیاب هوئے - شکست و فتح تو مسلّم هے لیکن لڑائی ایسی یک طرفه نهیں تهی جیسی که هم سمجھتے هیں - سر سید کے مخالفوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نیک نیتی سے یه سمجھتے تھے که سر سید کا نقطۂ نظر غلط هے - جو علوم مشرقیه کے فاضل اور اپنے زمانه کے مستند عالم تھے - جو ترقی اور تعلیم کے مخالف نهیں تھے بلکه اس ذهنیت کے خلاف تھے جس کی رو سے سائنس کے نئے نظریے ناقابل تردید تھے اس لیے قرآن کی تعلیمات کو ان کے مطابق قرار دینا عین ایمان تها اور اسلام کے قوانین کو مغرب اور مغربی علوم کے مطابق ٹھیرانا ضروری تها - ایسے مخالفوں میں سید الحاج مولوی علی بخش خاں شرر بدایونی بھی تھے' جن کے حالات اور کارنامے میں مختصر طور پر آپ کے سامنے پیش کرنے کی اجازت چاهتا هوں - حالی نے حیات جاوید میں کئی جگه ان کا نام لیا هے مگر ان کے متعلق کچھ نهیں لکھا - رساله تهذیب الاخلاق میں ان کی مخالفت کا ذکر هے مگر اس کے علاوه اور کچھ نهیں - چنانچه حالات کے لیے بدایوں کی بعض پرانی کتابوں خصوصاً اکمل التاریخ اور تذکرۃالواصلین سے مدد لینی پڑی اور بهت سی کام کی باتیں وهاں کے بعض بزرگوں سے معلوم هوئیں - ان سب کا حواله اپنی اپنی جگه موجود هے -

مولوی علی بخش خاں شرر بدایوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے - مصنف اکمل التاریخ کے بیان کے مطابق ۱۲۳۷ھ میں پیدا هوئے - ان کے والد مولوی سلطان بخش تھے جن کے چھ لڑکے هوئے محمد بخش' علی بخش' احمد بخش' محمود بخش' نثار بخش' سعید بخش - محمد بخش صدرالصدور اور سر سید کے ایک سفر کا ذکر حالی نے حیات جاوید میں کیا هے - یه مولوی علی بخش کے بڑے بھائی تھے - دونوں نے ابتدائی تعلیم مولانا فیض احمد سے حاصل کی تهی جو اس زمانے میں بدایوں کے مشهور عالم اور شاه عین الحق عبدالمجید کے بھانجے تھے - شاه عین الحق عبدالمجید حضرت اچھے میاں صاحب مارهروی کے خلیفه اور منظور نظر تھے اور دونوں

بھائی انھیں کے مرید ہوئے ۔ اپنے پیر سے دونوں کو بڑی ارادت و عقیدت تھی جس کا اندازہ مولوی علی بخش کے اس شعر سے ہوتا ہے :

مرتے ہیں اس پر مجیدی دفن ہوں در کے قریب
بعد مردن بھی نہ چھوٹے اتصال عین حق

مولوی محمدبخش اور مولوی علی‌بخش دونوں نے درسیات کی تکمیل کی اور پھر سرکاری ملازمت شروع کی جس میں ترقی کرکے صدرالصدور کے عہدے تک پہنچے ۔ سر سید بھی اس عہدے پر فایز تھے ۔ مولوی محمدبخش کو کتب‌بینی کا زیادہ موقع نہیں ملا مگر مولوی علی‌بخش نے ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود یہ مشغلہ جاری رکھا ۔ خود کری محنت اور خرچ سے ایک قابل قدر ذخیرہ عربی ' فارسی اور اردو کی کتابوں کا جمع کیا جو ان کے مرنے کے بعد بہت جلد منتشر ہوگیا ۔ زیادہ‌تر کتابیں مذہبی تھیں مگر شعرا کے دیوان بھی بہت سے تھے ۔ ایک دفعہ اپنے ایک بھائی سے یہ سن کر کہ کانپور میں حاجی امدادالعلی کا کتب‌خانہ فروخت ہو رہا ہے ۔ تمام کام کی کتابیں خریدنے کے لیے انھیں لکھا مگر اتفاق سے بھائی صاحب اس گوں کے نہ تھے اور کام کی کتابوں سے مطلب قانونی کتابیں سمجھے جن کا نہ کتب‌خانہ میں پتہ تھا نہ علی‌بخش‌خاں کو ان کی ضرورت تھی ۔ جب مولوی علی‌بخش اٹاوے میں تھے تو اس وقت مولوی مہدی‌علی (محسن الملک) نائب تحصیلدار تھے ۔ دونوں میں بڑا ربط و ضبط ہوگیا ۔ اس ربط و ضبط کی یادگار آیات بیّنات ہے جس کے متعلق ایک روایت ہے کہ اس کا پہلا حصہ مولوی علی‌بخش نے لکھا تھا مگر اس کی تصدیق نہ ہوسکی ۔ شروع شروع میں مولوی مہدی‌علی سر سید سے مذہبی خیالات سے اختلاف رکھتے تھے جیسا کہ انھوں نے کئی جگہ اپنے خطوط اور تصانیف میں لکھا ہے اس کی ایک وجہ مولوی علی‌بخش کا اثر تھا ۔ رفتہ رفتہ یہ اثر کم ہوتا گیا اور سر سید کا رنگ چڑھتا گیا تاآنکہ سر سید کی حمایت اور اپنے پرانے دوست کی مخالفت میں محسن الملک نے بھی قلم اٹھایا ۔ اٹاوہ کے علاوہ مولوی علی‌بخش علی‌گڈھ ۔ بنارس ۔ غازی‌پور ۔ گورکھپور میں بھی رہے ۔ تہذیب‌الاخلاق کے مطالعہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔

سر سید سے مخالفت غالباً غازی‌پور کے قیام سے شروع ہوئی جب دونوں غازی‌پور میں تھے۔ سر سید نے ایک مدرسہ انگریزی کی تعلیم کے لیے قایم کیا جو اب وکٹوریا گورنمنٹ ھائی اسکول کے نام سے مشہور ھے۔ مولوی علی‌بخش نے ایک مدرسہ عربی کی تعلیم کے لیے جاری کیا جو اب چشمۂ رحمت کالج کہلاتا ھے۔ جب اخبار تہذیب‌الاخلاق جاری ھوا تو اس میں مذھبی اصلاح پر بہت زور دیا گیا اور سر سید کے کئی مضمون اس طرح کے نکلے کہ قدامت پرست طبقہ میں ھل‌چل مچ گئی۔ سر سید کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاھیے اور ان تمام باتوں کو ترک کردینا چاھیے جو دراصل رسوم سے تعلق رکھتی ھیں مگر مذھب کا جز بن گئی ھے۔ سر سید جس خاندان میں پیدا ھوئے تھے وہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ غلام‌علی کا معتقد تھا۔ انھوں نے ھوش سنبھالا تو شاہ اسمعیل شہید کی تصانیف دیکھیں جن میں آزادی کی روح موجود تھی۔ مولوی علی‌بخش جس گھرانے کے مرید تھے وہ وھابی فرقے کے خلاف تھا اور ھر قسم کی جدت کو بدعت کہہ کر پکارتا تھا۔ یہیں سے دونوں کا اختلاف شروع ھوتا ھے۔ مولوی علی‌بخش اب تک وھابیوں اور غیرمقلدوں اور آریوں اور شیعوں کے رد میں مصروف تھے۔ سر سید کے مضامین میں انھیں ایک نیا فتنہ نظر آیا۔ یہ نیچریت کا فتنہ تھا جسے روکنے کی انھوں نے پوری کوشش کی لیکن جو ان کی ساری کوششوں کے باوجود نہ رک سکا۔

اخبار تہذیب الاخلاق جلد سوم نمبر ۵ مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۸۹ ھ میں سر سید نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان 'آدم کی سرگزشت' تھا۔ اس مضمون میں سر سید نے اپنے مخصوص سقراطی انداز میں خدا، انسان، شیطان، جبر و قدر، خیر و شر پر ایک حکیمانہ نظر ڈالی اور سوال و جواب کے پیرائے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شیطان اور جنت کے قصہ سے انسان کے مختلف قوی کی کشمکش مراد ھے جسے انبیا نے اس زمانے کے علم و عقل کو دیکھتے ھوئے تمثیلوں کے پیرائے میں بیان کیا تھا شجر ممنوعہ دراصل علم و عقل کا دوسرا نام تھا کیونکہ جب تک اس کا مزا نہ ملا تھا انسان اپنی حالت سے خبردار نہ تھا لیکن اسے چکھتے ھی اپنے پیروں پر کھڑا ھونے کے قابل

ہوگیا اور اپنی جنت آپ تعمیر کرنے پر مامور ہوا ۔ "آدم نے کہا کہ تمھاری اور تمام دنیا کی سمجھ میں آجانے کے لایق تو اسی بات کو موسیٰ اور محمدؐ نے بہت اچھی تمثیل سے بتایا ھے انھوں نے ملکی قویٰ کا نام فرشتہ رکھا ھے اور اس دشمن دوست نما قوت کا نام شیطان اور اس قوت کا نام جو مجھ میں تھی پر میرے کام میں نہ تھی درخت اور اس وقت یا حالت کا نام جب میں اس قوت کو کام میں لانے کے لایق ہوا اس درخت کا مزا چکھنا رکھا ھے اور اس مشکل عقدے کو تمثیلوں سے حل کر کر بیان کیا ھے"۔

اس مضمون کے جواب میں مولوی علی بخش نے ایک کتاب لکھی جس کا نام شہاب ثاقب ھے۔ یہ کتاب جنوری ۱۸۷۳ع مطابق (۱۲۸۹ھ) میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی ۔ دیباچہ میں لکھتے ھیں کہ " سید احمدخاں صاحب بہادر نے تہذیب الاخلاق میں خلاف قرآن و حدیث و جمہور اھل اسلام کے ایک تقریر جدید لکھی ھے جس میں وجود حقیقی ابلیس سے اور اکثر مضامین آیات بیّنات سے انکار کیا ھے اور اس تحریر کا نام 'سرگزشت آدم' رکھا ھے گویا زبان آدم خیالی سے تفسیر آیات قرآنی کی بیان کی گئی ھے اور حتی المقدور بہت فکر کی ھے جس سے مجازی معنی تمام آیات کے قرار پاسکیں"۔ مولوی صاحب کا کہنا یہ ھے کہ سر سید کا استدلال صحیح نہیں کیونکہ اگر ہر وجود کو ہم خارجی تسلیم کرنے سے انکار کردیں جیسا کہ شیطان کے متعلق سر سید نے کیا ھے تو سورج کے متعلق وہ خیال جو انھوں نے قبول کرکے اپنی سند میں پیش کیا ھے باطل ھوجائے گا اور شق صدر اور وجود افلاک و بیت المعمور و براق و انہار جنت سب کے متعلق تاویلیں کرنی پڑیں گی ۔ حالانکہ تبیین الکلام میں سر سید نے افلاک وغیرہ کے وجود کو تسلیم کیا تھا ۔ اس سلسلہ میں ایک جگہ مولوی علی بخش نے سر سید کی اس قسم کی تاویلوں پر جو اعتراض کیا ھے وہ بہت کچھ صحیح ھے ۔ "ممکن ھے آیندہ بذریعہ کسی ایجاد دوربین کے حکماء یورپ وجود افلاک کے قائل ہوجاویں تو یہ تفسیر آیات بیّنات قرآنی کی جو اب کی گئی ھے کہاں جائے گی گویا یہ نتیجہ نکلے گا کہ قرآن شریف کے معنی بیان کرنا منحصر ٹھہرا اھل یورپ کی مرضی پر 'جدھر وہاں

کی ہوا پھرے ادھر یہاں ایمان بھی پھرنے لگے"۔ مولوی علی بخش نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہیئت جدید اور قدیم میں جو فرق ہوگیا ہے اس سے قرآن کے کسی نظریے کی تکذیب لازم نہیں آتی۔ اس کے بعد وجود خارجی کی بحث کو لیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ قرآن کریم میں جن و انس کا ذکر اس قدر صاف صاف بیان ہوا ہے کہ اسے دوسرے معنوں میں سے ہی نہیں کہتے اور اسی طرح شیطان کے متعلق اس قدر صریح اشارے ہیں کہ انھیں کسی دوسری طرح بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آگے چل کر مولوی علی بخش نے لفظ نیچر پر بحث کی ہے اور "قانون فطرت" میں جو فریب پوشیدہ ہے اسے ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "جناب نے خطبات احمدیہ میں دعوی کیا ہے کہ جو مذہب مطابق و موافق نیچر کے نہ ہو وہ غلط ہے لہذا میری گزارش ہے کہ نیچر کے عقاید تو پہلے بیان کردیجیے اور یہ بھی ضرور ارشاد کیجیے کہ نیچرسٹ فلاسفہ میں باہم اختلافات اقوال میں ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو حضور کے مقتدیٰ اور مسلّم کون کون کلیم ہیں اور کس کس کتاب نیچر پر حضور کو اطمینان ہے"۔

'اختتام سال ۱۲۸۹ھ اور شروع سال ۱۲۹۰ھ' کے عنوان سے جو مضمون سر سید نے تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے اس میں اپنا اور اپنے مخالفوں کا بڑے پر لطف انداز سے ذکر کیا ہے۔ دو صاحبان کے نام اس میں موجود ہیں۔ ایک مولوی سید امدادالعلی اور دوسرے مفتی سعداللہ۔ مولوی سید امدادالعلی نے کانپور سے سر سید کی مخالفت میں اور تہذیب الاخلاق کے جواب میں 'نورالآفاق' جاری کیا تھا اور مفتی سعداللہ نے سر سید کی تکفیر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔ تیسرے کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔ "مگر جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتووں کے دیکھنے کے ہم مشتاق ہیں۔ سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ماجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے"۔ یہ اشارہ مولوی علی بخش صاحب کی طرف ہے جو اس زمانہ میں حج کو گئے تھے اور جن کے متعلق تہذیب الاخلاق میں ایک خط درج ہے کہ زمانہ قیام حجاز میں انھیں سب سے زیادہ فکر سر سید کے کفر کے فتوے

حاصل کرنے کی تھی ۔ (یہ خط چونکہ سر سید کے ایک مداح کا لکھا ہوا ہے اس لیے اس میں بعض رائیں بالکل صحیح نہیں معلوم ہوتیں) ۔

۱۵ جمادی‌الاول ۱۲۹۰ھ کے تہذیب‌الاخلاق میں مولوی علی‌بخش خاں صاحب کا ایک خط بنام مولوی سید مہدی‌علی صاحب شایع ہوا ہے ۔ اس خط کا ضروری حصہ یہ ہے :—

« سیدنا و مولانا ۔ تسلیم ۔ میں ایک اپنے دل کی بات بعد مدت ظاہر کرکے مشورہ چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مدرسۃالعلوم کے باب میں انواع و اقسام کی رائیں میری نظر سے گزرتی جاتی ہیں مگر میں نے اپنی رائے اس وقت تک اس خاص امر میں نہیں ظاہر کی ہے ۔ اب کہ سید محمود صاحب کی رائے میں نے دیکھی تو وہ شبہ کسی قدر رفع ہوا کہ غالباً ہماری مذہبی کتابوں میں اصلاح کی نہ ٹھیرے گی اور دینیات میں شاید دست اندازی ہوکر ملت نیچریہ کی تعلیم نہ ہوگی چونکہ میں اس قدر امر میں سید احمد خاں صاحب سے مخالف نہیں ہوں کہ ہماری قوم کو علوم جدیدہ کی تحصیل ضرور ہے اور تعلیم موجودہ غیر کافی ہے ۔ صدرا ، میبذی ، شرح چغمنی ، کتب معقولات وغیرہ سے اب کام نہیں چلتا ہے لہذا اگر کوئی مدرسہ ایسا قایم ہو کہ اس میں علوم جدیدہ انگریزی سے ترجمہ ہوکر پڑھائے جاویں تو ہمدردی قومی کا پورا نتیجہ نکلے‌گا مگر پھر بھی تحصیل فقہ و حدیث و تفسیر میں ہرگز خلل نہ آنے پائے گا مگر چند امور ابھی میرے جی میں کھٹکتے ہیں جن سے میں خود بھی چندہ دینے سے باز رہا ہوں اور اپنے احباب سے بھی فرمایش کرنے سے معذور رہا تھا اگر آپ بھی محبت کی نظر سے سچ سچ اصلی حالات سے میری خاطر جمع کردیں تو خوب ہو » ۔

آگے چل کر ایک جگہ یہ فقرہ قابل غور ہے :—

« سید صاحب آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں سید احمد خاں صاحب کا ہر بات میں مخالف ہوں ، ہرگز نہیں ۔ میرے نزدیک امور دنیوی میں جس قدر ترویج علوم جدیدہ میں وہ ساعی ہوتے ہیں بظاہر مجھ کو اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ ہاں ابتدا میں جو وضع طالب علموں کی اور اصلاح کتب دینی کی ان کی رائے میں دیکھی تھی تو مجھ کو بڑا خطرہ

پیدا ہوا تھا اب تو کچھ دوسرا ڈھنگ سید محمود ڈالا چاہتے ہیں۔ جس سے امید ہے کہ دست‌اندازی عقاید اسلام و کتب مذہبی بھی نہ ہوگی۔ اب میں اپنے شبہات بیان کرکے آپ سے رائے لینا چاہتا ہوں....... « مجھ کو اس وقت بلکہ مدت سے سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں سید احمد خاں صاحب ایک شخص لایق اور نامور اور معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہونا ان کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خود رائی سے مذہبی دست اندازی و انقلاب دین ایسا ان کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہوگئی اور تمام قوم کو ان سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے ان کے خیالات مذہبی سے ہے نہ ان کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے »۔

جو شبہات مولوی علی‌بخش صاحب نے ظاہر کیے تھے وہ کئی قسم کے تھے: اول‌تو کافی سرمایہ جمع نہ ہونے کی صورت میں انھیں اندیشہ تھا کہ چندہ دینے والوں کا روپیہ ضایع جائےگا، دوسرے ان کا خیال تھا کہ مدرسۃالعلوم کی کمیٹی تہذیب‌الاخلاق کے خیالات کی تعلیم دینے لگےگی، تیسرے انھیں اندیشہ تھا کہ طلبا کے لباس میں تبدیلی ہوجائےگی اور وہ اسلامی نہ رہےگا۔ سر سید نے ان سب باتوں کا مختصر جواب دینے کے بعد مولوی علی‌بخش صاحب سے درخواست کی کہ وہ بھی مدرسۃالعلوم کی کمیٹی میں شریک ہوجائیں تاکہ اپنی مرضی کے مطابق دینی تعلیم کا انتظام کرسکیں۔ اس کے علاوہ اپنے اور تہذیب‌الاخلاق کے متعلق بھی کچھ لکھا اور مولوی صاحب کے اعتراضات کا جواب دیا۔ چند ضروری اقتباس یہ ہیں:-

« میری یہ رائے ہے کہ علوم جدیدہ ہندستان میں اور تمام اسلامی ممالک میں روز بہ روز پھیلتے جاویں گے اگر کوئی ہزار تدبیریں ان کے روکنے کی کرے رک نہیں سکتے اور یہ بھی میں اپنی رائے میں (خواہ وہ غلط ہو یا صحیح) یقین سمجھتا ہوں کہ جب وہ علوم بہ‌خوبی پھیل جاویں گے تو تمام مذاہب کے اور نیز مذہب اسلام کے سرسبز و شاداب پودے جل کر برباد ہوجائیں گے اور ان علوم کے سامنے صرف اس مذہب کا پودا سرسبز و شاداب رہےگا جس نے بہ‌خوبی ان علوم کا مقابلہ کیا ہوگا اور یا تو ان علوم کے

مسایل نے مخالف اسلام کو ڈھادیا ہوگا یا خود اسلام کے مسایل کو ان علوم کے مطابق کر دکھایا ہوگا "۔

" جو لوگ لکھے پڑھے ہیں (میں اپنے تئیں لکھے پڑھوں میں نہیں سمجھتا) وہ حال کے علوم جدیدہ کا مقابلہ کریں اور اسلام کی حمایت میں کھڑے ہوں اور مثل علمائے سابق کے یا تو مسایل حکمت جدیدہ کو باطل کردیں یا مسایل اسلام کو ان سے مطابق کردیں کہ اس زمانہ میں یہی صورت حمایت اور حفاظت اسلام کی ہے "۔

اس کے بعد سر سید نے اپنا نظریہ بابت کواکب و آسمان اور وجود خارجی غیر محسوس پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے قرآن کے مطابق کرکے دکھانے کی وجہ سے انسان کو مرتد و نیچرسٹ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا۔ خاتمہ میں یہ جملہ خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے :-

" پس اب ان سب باتوں پر خیال فرما کر تہذیب‌الاخلاق کی نسبت اور میری نسبت جو رائے چاہیں قایم کریں مگر اتنا ضرور یاد رکھیں کہ بہت جلد زمانہ آنے والا ہے جو لوگ سمجھیں گے کہ میری کتاب خطبات احمدیہ اور میرا تہذیب‌الاخلاق مسلمانوں کے لیے کیسی رحمت تھا "۔

اس کے بعد نئے سال کے شروع میں (یعنی اختتام سال ۱۲۹۰ھ و شروع سال ۱۲۹۱ھ) جو مضمون سر سید نے لکھا ہے اس میں بھی خندہ گل و نالہ بلبل کا ذکر کیا ہے اور مولوی امدادالعلی اور مولوی علی بخش صاحب پر نہایت لطیف طنز کی ہے۔

" اس سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی‌بخش خاں بہادر نے (جو امید ہے اب تک حاجی بھی ہوگئے ہوں گے اور انشاء اللہ تعالی آیندہ سے ان کو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے ہیں جن میں سے ایک کا نام شہاب ثاقب اور دوسرے کا تائیدالاسلام "۔

شہاب ثاقب کا ذکر اوپر ہوچکا، تائیدالاسلام بھی مطبع نول‌کشور لکھنؤ میں نومبر ۱۸۷۳ مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۰ھ میں چھپی۔ ۲۰۲ صفحہ کا رسالہ ہے جو بڑے سایز اور معمولی کاغذ پر چھپا ہے (شہاب ثاقب کا سایز اور کاغذ بھی یہی ہے

مگر اس کے صفحات کم ہیں یعنی ۱۳۶) ۔ اس میں سر سید کے مذہبی خیالات کا جواب اور تہذیب‌الاخلاق سے لے کر ان کے خلافیات کا انتخاب کیا گیا ہے اور اس سے کسی قدر معتقدات سر سید کے مستنبط کیے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہیئت جدیدہ اور تبریدالاسلام کے خلاف بھی لکھا گیا ہے ۔ کتاب کے شروع میں یہ خیال پھر دھرایا گیا ہے کہ سر سید کے اعتقاد میں کوئی حدیث قابل وثوق نہیں ہے اور مفسرین محدثین و کتب فقہ کا ماننا ضروری نہیں اور قرآن شریف کی ایسی تاویل کرنی چاہیے کہ جس سے کوئی آیندہ مقولات اہل یورپ اور فلاسفہ جدیدہ اور نیچرل مذہب کے خلاف نہ ہونے پاویں ۔ اس کے بعد سر سید کے اس خط کا جواب ہے جو انھوں نے تہذیب‌الاخلاق کے ذریعے سے مولوی صاحب کو دیا تھا ۔ سر سید نے لکھا تھا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں وہ اس خیال سے کرتا ہوں کہ اسلام پر سے معترضوں کے اعتراضات کو رد کروں ۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے سر سید کی تحریرات کے اقتباس خطبات احمدیہ اور تہذیب الاخلاق سے پیش کر کے دعویٰ کیا ہے کہ سر سید کا مذہب نیچر یا قانون قدرت ہے اور اگر اسلام اس کے مطابق نہ ہو تو وہ اسلام نہیں ۔ سر سید نے اس کے جواب میں ایک طویل مضمون 'دافع ارتہان' کے نام سے تہذیب‌الاخلاق میں لکھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مولوی علی بخش نے نتایج اخذ کرنے میں ایمانداری سے کام نہیں لیا اور عقاید کے بیان میں جا بجا اتہام بھی کیا ہے ۔ یہ مضمون سر سید کی انشا کا بہت عمدہ نمونہ ہے ۔

غرض مذہبی عقاید میں دونوں کا اختلاف تو باقی رہا البتہ مدرسۃالعلوم کی کمیٹی میں شرکت کرنے کی جو دعوت سر سید نے مولوی صاحب کو دی تھی اس کی داستان ذرا دلچسپ ہے ۔ مولوی علی بخش صاحب نے تائیدالاسلام میں لکھا ہے کہ انھوں نے مدرسۃالعلوم کے متعلق سر سید کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ تہذیب‌الاخلاق میں شایع کردیا جائے ۔ وہاں تو وہ شایع نہ ہوا لیکن اودھ اخبار میں ضرور شایع ہوا ۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ مدرسۃالعلوم کی مذہبی کمیٹی

سر سید یا خزینۃالبضاعۃ کے ماتحت نہ ہو بلکہ وہ قوم کے مسلّم علما پر مشتمل ہو۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق مورخہ ۱۵ رجب ۱۲۹۱ صفحہ ۱۱۴ لغایت ۱۲۱ میں جو روداد مدرسۃالعلوم کی کمیٹی کی درج ہے اس میں جابجا اس خط کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ کمیٹی ۵ اگست ۱۸۷۳ء کو ہوئی تھی۔

مولوی علی بخش کا مطالبہ یہ تھا کہ "اس اطمینان کی میرے نزدیک صرف یہ صورت ہے کہ آپ اور کمیٹی خزینۃالبضاعۃ مذہبی تعلیم میں مداخلت نہ کرے بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے اور اس کے اختیار میں تمام امور متعلقہ تعلیم مذہبی کے چھوڑے جائیں اور اس کمیٹی کے وے لوگ ممبر ہوں جن پر تمام اہل اسلام کو اطمینان ہو اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دیں اس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اس کی آمدنی جائز صرف مذہبی تعلیم میں خرچ کی جائے اور جب ممبران کمیٹی مذہبی اس کی آمدنی میں گنجایش دیکھیں اور تعلیم مذہبی شروع کرنا چاہیں تو ان کو ایسا اختیار حاصل رہے"۔

یہ خط جلسہ میں پیش ہوا اور خود سر سید کی کوشش سے یہ سفارش منظور کی گئی اور اس کے مطابق ایک اطلاع اس زمانہ کے علما کی خدمت میں بھیجی گئی تاکہ اہل سنت و الجماعت والوں کے لیے دینی کمیٹی منتخب کریں۔ شیعہ حضرات نے علیحدہ کمیٹی کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اس فہرست میں سر سید کے کئی مخالفوں مثلاً مولوی حاجی سید امدادالعلی ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ، حاجی مولوی علی بخش خاں صاحب سب آرڈینیٹ جج گورکھپور، مولوی عبدالقادر صاحب رئیس بدایوں اور بہت سے دوسرے حضرات کے نام تھے۔

مگر آگے چل کر یکم محرم الحرام ۱۲۹۲ھ کے پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ "کھنڈت" پڑ گئی اور نہ حاجی امدادالعلی شریک ہوسکے نہ حاجی علی بخش۔ حاجی امدادالعلی نے تو شرکت سے اس وجہ سے انکار کیا کہ جب تک اپنے عقاید سے تم توبہ نہیں کرتے ہم تمھارے ساتھ نہیں ہوسکتے۔ حاجی علی بخش کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ مولوی مشتاق حسین (وقارالملک) نے یکم شعبان ۱۲۹۲ھ

کے پرچے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حاجی علی بخش صاحب نے اخباروں میں منتشر کرادیا کہ سید احمد خاں نے ان سے وعدہ‌خلافی کی اس لیے انھوں نے آٹھ سو روپیہ کے چندے کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنا ضروری نہ رہا۔ مولوی مشتاق‌حسین صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی علی بخش صاحب مذہبی تعلیم کی کمیٹی کو خزینۃالبضاعۃ سے علیحدہ اور اپنے اختیار میں چاہتے تھے۔ سر سید نے تو اس کا وعدہ کرلیا تھا مگر کمیٹی کے تمام ممبر اس پر راضی نہ ہوئے کہ ایک فرد واحد کو سارا اختیار سپرد کردیا جائے اور اس مخالفت کی اطلاع حاجی صاحب کو ہوگئی تھی اور انھوں نے جب آٹھ سو کے چندے کا وعدہ کیا تو بھی انھیں اس کا علم تھا، اس لیے اس کی ادایگی ہر حال میں انھیں لازم آتی تھی۔

بہر حال اس کے بعد تہذیب‌الاخلاق میں کوئی "چھیڑچھاڑ" نہیں ملتی۔ یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ آٹھ سو روپیہ سر سید کو بھیج دیے گئے یا نہیں۔

یہ سب اس زمانے کے قصے ہیں جب موصوف ملازمت کے سلسلے میں تھے۔ جب پنشن ملی اور گھر آئے تو دوسرے اشغال کا بھی موقع ملا۔ شاعری وہ پہلے سے کرتے تھے مگر اب تک اس کے لیے زیادہ وقت نہ مل سکا تھا۔ اکمل‌التاریخ کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت عین‌الحق عبدالمجید صاحب کا انتقال ۱۲۶۳ ھ میں ہوا۔ حاجی علی بخش صاحب انھیں کے مرید تھے۔ ان کی زندگی میں انھیں کے پاس اپنا عشقیہ دیوان لے گئے۔ انھوں نے دیکھ کر فرمایا کہ "نفس خوش ہوا مگر روح جب خوش ہوتی جب یہ قابلیت نعت شریف میں صرف کرتے" مرشد کا یہ قول دل کو لگ گیا، دیوان چھپ چکا تھا مگر اس کی سب کاپیاں ضایع کردیں چنانچہ اس کا کوئی پتہ نہ لگ سکا۔ بڑی تلاش سے اس کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ لگا جو ناقص ہے اس میں بہت سے اشعار بیچ بیچ سے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ غالباً کئی کاتبوں نے نقل کی ہے اس لیے کہ خط مختلف ہے اور کچا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ اس کے بعد بہت سے اشعار بڑھائے گئے ہوں گے اور کئی غزلوں کا اضافہ کیا ہوگا۔ ان کی ایک بیاض کا بھی پتہ چلا ہے اور اس میں جو اشعار اپنے دیے ہیں وہ دیوان کے اس نسخے میں نہیں ہیں۔ اس سے اور بھی

یقین ہوتا ہے کہ نسخہ بیاض کے مرتب ہونے سے بہت پہلے کا ہے۔

قلمی نسخہ میں بڑے سایز کے ۱۳۹ صفحے ہیں۔ ایک صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں جو کہیں کہیں چھوٹی ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نقل کرنے والے سے اشعار پڑھے نہیں گئے یا بعد میں یہاں شعر بڑھانا مقصود تھا۔ شروع میں ایک غزل حمد میں، ۵ نعت میں، ایک منقبت مولا علی میں، ایک منقبت غوث اعظم میں، ایک اپنے پیر کی شان میں ہے، اس کے بعد مروجہ دستور کے موافق غزلیں ہیں۔ مطلع اول یہ ہے:

خوب موزوں وصف چشم و ابروئے جاناں ہوا
صاد کے لایق ہمارا مطلع دیوان ہوا

مشکل مشکل قافیے اور لمبی یا ٹیڑھی ردیفیں بھی استعمال کی گئی ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:

دل ٹھنڈا، جوڑا سانپ کا، خیال نقش پا، چوکھٹ کا، تبسم زیر لب، تار نظر سرخ، زنار بلند، کہکشاں بالائے سر، شمشیر توڑ، تل کے برابر، نظر انداز، سو سو کوس، حباب شیشہ میں، تین بجیں، شمشیریں دو، طاق میں غنچہ۔

ان کے علاوہ چھوٹی بحریں اور آسان ردیفیں بھی بہت ہیں۔ غرض دیوان اس زمانے کے دوسرے دیوانوں کی طرح ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ غالب کی اکثر غزلوں پر طرح طرح غزلیں ملتی ہیں۔ مصنف اکمل التاریخ نے لکھا ہے کہ مرزا غالب سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی۔ اس کا کوئی اور ثبوت نہیں مل سکا، مگر غالب کی غزلوں سے یہ بہت پھیکی ہیں، ان میں ذوق کا رنگ زیادہ ہے۔ غزلوں کے بعد دو مناجاتیں ہیں جن میں ارض پاک تک پہنچنے کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہے۔

کلام کا عام رنگ اس زمانہ کا سا ہے۔ یعنی ناسخ کی رعایت لفظی، ذوق کے محاورے، جرأت کی معاملہ بندی، شاہ نصیر کی مشکل ردیفیں، سب کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اشعار صاف اور سادے ہیں اور ان میں تغزل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ صرف ردیف الف سے سرسری نظر سے کچھ انتخاب پیش کیا

جاتا ھے۔اس میں جدید مذاق کی رعایت ملحوظ نہیں بلکہ ان کے رنگ کے اشعار لیے گئے ھیں:

پابوس مل گیا ھے رسول کریم کا پایہ بلند تب تو ھے عرش عظیم کا

جو بیٹھی تیرے دامن پر تو پھر اٹھنا ھوا مشکل
اثر باقی ھے میری خاک میں بھی ناتوانی کا

دامن مژگاں میں رھتا تھا ذرا سا طفل اشک
رفتہ رفتہ پاؤں پھیلانے تو اک طوفاں ھوا

ھوئی یہ غش کی حالت میکدے میں اس کے آتے ھی
گرا گردن کے بل شیشہ شراب ارغوانی کا

قطرے عرق کے تیرے رخ آتشیں پہ ھیں
پانی میں آج دیکھا ھے شعلہ دبا ھوا
اے جوش جنوں چاھے جدھر کھینچ کے لے چل
ھاں اب تو ترے ھاتھ میں دامن ھے ھمارا

رفتہ رفتہ کاکلوں کا آتا جاتا ھے خیال
چڑھ چلا ھے زھر مجھ کو تھوڑا تھوڑا سانپ کا
داب لی ھونٹوں میں بھیگی زلف اس نے وقت غسل
زھر ناحق آب حیواں میں نچوڑا سانپ کا

نقش پا ھوتا ھے پامال خلایق اے شرر
ضعف سے ھم ھوگئے ھیں پائمال نقش پا

ھجر میں درد دل زار نے سونے نہ دیا
وصل میں حیرت دیدار نے سونے نہ دیا

قبر میں بھی تو کھلی رہ گئیں آنکھیں میری
چین سے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا
دھوم نالوں سے یہاں تک تو مچائی ہے شرر
بخت خفتہ کو دل زار نے سونے نہ دیا

چشم ساقی کو ذرا دیکھتے ہی ٹوٹ گیا
دل نازک بھی مگر توبۂ مستاں ہوگا
رخصت جاں سے دم نزع ڈراتے ہیں لوگ
اور نہ رخصت جاناں سے تو آساں ہوگا
کیا اثر ہے مری افسردگئ خاطر کا
گل بھی تربت پہ نہ میری کبھی خنداں ہوگا
جاتی ہے عالم بالا کی طرف تیغ نگاہ
گنبد چرخ میں بھی گنج شہیداں ہوگا
مےکشی غیر سے ٹھیری ہے وہاں اے ناصح
آج سمجھاؤ وہاں جا کے تو احساں ہوگا
داغ سینہ کے بہت تم نے چھپائے ہیں شرر
حال کھل جائےگا جب چاک گریباں ہوگا

خاکساروں سے کیوں مکدر ہے　　تیرے دل کے غبار نے مارا

مسکرا کر آپ نے دیکھا جو تھا اس کی طرف
غنچہ اتنی بات پر جامہ سے باہر ہوگیا
چمن میں کھل گئے الماس دندان اس گل تر کے
کلیجہ کٹ گیا بس گل کا غنچہ نے لہو تھوکا

محرم پہ اس کے عطر جو تم نے لگا دیا　　کیا لطف ہے حباب پہ روغن چڑھا دیا

کیا زلف کو رہتی ہے پریشانی خاطر قصہ جو سنا ہے مری آشفتہ‌سری کا

شرمندگی سے وصل میں مرنا پڑا شرر
زندہ میں ہائے کیوں شب ہجراں میں رہ گیا

ہے فکر کہ پھر مشق جفا کس پہ کریں گے مرنا بھی مرا ان کو گوارا نہیں ہوتا
دست بوسی کی تمنا نہ گئی بعد فنا مہندی ہونے لگی خاک شہدا سے پیدا

جا بجا جس میں تماشا رقص بسمل کا نہ ہو کوچہ قاتل میں ایسا رہ‌گزر کوئی نہ تھا

آ پڑی ہے زلف چشم مست پر ابر مے خانے کے اوپر چھا گیا

عشقیہ دیوان کے علاوہ آپ کے چار نعتیہ دیوان بھی ہیں - مگر یہ انھوں نے اپنے بھتیجے مولوی حامد بخش کے نام سے چھپوائے ہیں اور اس میں حامد تخلص رکھا ہے- یہ کوئی نئی عبرت نہیں ہے اور بڑی بہت سی مثالیں اس قسم کی ملتی ہیں - نعت میں یہ رنگ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور بعض بعض اشعار محسن کاکوروی کے پائے گئے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ عشقیہ رنگ رسمی تھا لیکن نعت میں وہ عقیدت موجود تھی جس کی وجہ سے کلام میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور صرف رعایت لفظی یا محبوب کے خال و خد کا ذکر نہیں ہے - شرر کے نعتیہ کلام کے متعلق یہاں زیادہ لکھنے کی گنجایش نہیں ' وہ اس زمانے کے نعتیہ اشعار کو دیکھتے ہوئے کافی بلند ہے اور اس لیے اس پر مستقل ایک مضمون ہونا چاہیے - یہاں صرف چند اشعار نقل کرنا کافی ہوگا :

میرے گناہوں کی یہ سیاہی ابر کرم ہے دھونے والا
یاد جو آیا خار مدینہ پھوٹ کے رویا دل کا چھالا

اٹھا غلاف روضۂ خیرالبشر سے خوب جھالر الجھ گئی مرے تار نظر سے خوب

جو گیسوئے شہ پر نظر جائے گی شب‌قدر جی سے اتر جائے گی
نہ توڑ آہ دل رشتہ کہکشاں کہ تسبیح رنج بکھر جائے گی

ایک دیوان کا نام گلزار نظم حامد ہے ۔ اس کی تاریخ یہ ہے :—

۱۳۰۱

تاریخ پہ بھی کیوں نہ ہر اک گرم ثنا ہو یہ نامۂ اعمال خرابات ہے میرا

۱۳۰۱

ایک دیوان مدح رسول اکرم کے نام سے ہے ۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ بےنقط ہے ۔ ۱۶ صفحے ہیں، ان میں ایک قصیدہ، دو خمسے، متعدد رباعیات اور غزلیں شامل ہیں ۔ یہ سب بےنقط ہیں ۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے :

وہ حمد و مدح کا ہردم ہمارا کام ہوا کہ ایک لال و گہر مطلع کلام ہوا

خمسہ کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے :

کہو کس طرح ہو الم ہم کو کل کا کہ ہوگا مددگار وہ ہر عمل کا
الم دور ہوگا ہر اک صدمہ ہلکا اگر ہوگا ڈر ہم کو سوء عمل کا
مددگار ہوگا وہ سرور ہمارا

قصیدے کا ایک مطلع ملاحظہ ہو :

سر اسرار احد اصل اصول اول ماہر علم حمد، اعلم و اعلیٰ اکمل

غرض ان مثالوں سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھیں شاعری میں کس قدر قدرت حاصل تھی اور اس زمانے میں جتنی چیزیں اچھی سمجھی جاتی تھیں، ان سب کو کتنی اچھی طرح برت سکتے تھے ۔

ان کے ادبی ذوق کا سب سے اچھا اندازہ ان کی ایک بیاض سے ہوتا ہے جس میں متقدمین و متاخرین کے اشعار کا انتخاب ملتا ہے ۔ یہ بیاض مجلد ہے ۔ متوسط سایز، کاغذ جابجا کرم‌خوردہ، سیاہی روشن اور خط پختہ ۔ غالباً خود انھیں کا لکھا ہوا ۔ اس میں بہت سے مشہور شعرا کا نام آگیا ہے لیکن بعض گمنام ہیں ۔ بعض شعرا کا انتخاب طویل ہے ۔ بعض کا صرف ایک ایک شعر ہے ۔ انتخاب عام طور پر اچھا ہے ۔ سب سے زیادہ صفحے ناسخ کی نذر کیے ہیں ۔ میر، سودا، جرات، آتش، نصیر دہلوی، ذوق، مومن، ان سب اساتذہ کے کافی اشعار ہیں ۔ غالب کا انتخاب بھی سات صفحوں میں آیا ہے ۔

آخر میں اپنے کلام کا بھی انتخاب دیا ہے اور ۲۳ صفحے اس کی نذر کیے ہیں۔ ناموں میں کوئی خاص ترتیب نہیں معلوم ہوتی مثلاً شروع آتش سے کیا ہے اور آخر میں مومن کے اشعار ہیں۔ بیچ میں کچھ صفحے چھوٹے ہوئے بھی ہیں جو غالباً بعد میں بھرے جاتے۔ سب سے آخر میں چند نسخے بھی درج ہیں۔

حسب ذیل شعرا کا انتخاب بیاض میں ملتا ہے :-

آتش ، میر تقی ، مولوی فضل رسول مست ، مہدی علی ذکی ، سلیمان شکوہ ، رسول بخش حشر ، نظام الدین ناطق ، معین الدین معین ، فقیر محمد خاں گویا ، الہی بخش معروف ، اسداللہ خاں غالب ، امام بخش ناسخ ، علی اوسط رشک ، نیر ، کاظم علی قیس ، سید ، امان علی سحر ، محمد رضا برق ، سودا ، آزاد ، آشوب ، آشفتہ ، اثر ، احسان ، احسن ، اسد ، افسوس ، الفت ، امیر ، امین ، امانت ، انجام ، بقا ، بہادر ، سباک ، بیدار ، تپاں ، تاباں ، تاب ، تجلی ، تسکین ، تصور ، تنہا ، جرات ، جوش ، حاتم ، حجام ، حسرت ، حسن ، حسین ، حشمت ، حفیظ ، حیدر ، خادم ، خرد ، خیال ، داغ ، داوور ، درد ، دل سوز ، دلھن بیگم ، دیوانہ ، ذوق ، راسخ ، رغبت ، رفاقت ، رنگین ، رنج ، سجاد ، سرور ، سوز ، شہراب ، شاد ، شوق ، شور ، شہیدی ، شیفتہ ، صفا ، صاحب ، صفدر ، ضیا ، طالب ، طاہر ، ظفر ، عارف ، عاصی ، عاشق ، عاشقی ، عزلت ، عزیز ، عشرت ، عظیم ، علی ، فدا ، فدوی ، فریاد ، فراق ، فغاں ، قایم ، قاسم ، قابل ، قدرت ، قلندر ، کلیم ، کمال ، گنا بیگم ، کوثر ، محزوں ، مایل ، مبشر ، مصحفی ، مرزا اظہر ، معنی ، مقصود ، منشی ، مست ، موزوں ، مومن خاں ، مہر ، ناظم ، نثار ، نجات ، نزاکت ، نظیر ، نعمت ، نکہت ، نوا ، واقف ، وحشت ، وزیر ، وصال ، ولی ، ہوس ، یاس ، یقین ، حقیر ، غافل ، اسیر ، انشا ، معرفت ، یاس ، حیدری ، ملک حسین خاں ، عاصی ، عاص فضل رحمانی ، شعور ، نصیر دہلوی ، فدا ، فضل رسول مست ، شیو لال شوق ، گوبند سہائے ضرف ، علی بخش شرر ، گرم۔

غرض کل ۱۵۳ شعرا کا انتخاب ہے مگر چونکہ مولوی فضل رسول مست کا نام تین جگہ آیا ہے اس لیے ۱۵۱ سمجھنا چاہیے۔ یہ بیاض اس کی مستحق ہے کہ اسے علیحدہ تمام شعرا کے حالات کے ساتھ شایع کیا جائے۔

مولوی علی بخش کا انتقال ۱۷ رجب ۱۳۰۲ کو ہوا۔ سید الحاج در بہشت رسید
۱۳۰۲ ھ
سے تاریخ نکلتی ہے۔ اپنے پیر کے مزار کے قریب جو آستانہ قادریہ میں ہے اور درگاہ کہلاتا ہے، دفن ہوئے۔

عام حالات و عادات

سید الحاج کا مزاج ذرا تیز تھا، وضع سادہ تھی۔ کرتا، پایجامہ بڑھیا۔ کرتا بہت نیچا ہوتا، داڑھی لمبی۔ اس مکان میں رہتے تھے جس میں اب مولوی یعقوب بخش راغب رہتے ہیں۔ دوپہر میں شاعری کرتے، ہر تازہ نظم رات کو اپنے نعت خوانوں سے پڑھوا کر سنتے۔ خرچ اچھا اور اجلا تھا۔ چار سو روپیہ پنشن ملتی تھی جس میں سے ۲۰۰ روپیہ بیوی کو دے دیتے تھے اور باقی ۲۰۰ خود خرچ کرتے۔ کوئی سوداگر آتا تو خالی نہ جاتا۔ علم جفر میں بڑا کمال تھا چنانچہ آپ کے کئی قصے مشہور ہیں جن کے بیان کرنے کی یہاں گنجایش نہیں۔ آخر عمر میں اس کی طرف سے توجہ ہٹالی تھی۔ اپنے پیر اور ان کے سارے خاندان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ خان صاحب کا خطاب سرکار سے عطا ہوا تھا۔

خاتمہ

غرض مولوی علی بخش اپنے زمانے کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ مذہبی آدمی تھے اور تصوف رگ رگ میں رچا ہوا تھا۔ سر سید کی عقیدت انھیں پسند نہ آئی، اس وجہ سے ان کی مخالفت کی۔ وہ مدرسۃ العلوم کے خلاف نہ تھے لیکن انھیں یہ اندیشہ تھا کہ سر سید کے عقاید کا اثر اس پر ضرور پڑے گا اس لیے وہ دینی تعلیم کا سب انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ سر سید کے عقاید مذہبی سے بھی انھیں اختلاف تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس عقیدت کی روشنی میں جو مغربی علوم نے ہمیں بخشی ہیں اسلام کو جانچنا صحیح نہیں کیونکہ اس طرح اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام تصانیف میں اس پر زور دیا ہے کہ علما و مفسرین کو برا کہنا صحیح نہیں اور ہر خرابی کا الزام ان کے سر پر رکھنا درست نہیں ہوسکتا۔ سر سید جس چیز کو ترقی کہتے تھے، مولوی علی بخش صاحب کے خیال میں وہ بے دینی اور آزاد خیالی تھی۔

اس لڑائی میں اس وقت سر سید کو فتح ہوئی۔ بدایوں کے ایک مشہور فاضل اور ادیب سید محفوظ علی صاحب ناقل ہیں کہ زمانہ طالب علمی وہ اور مولوی شکور بخش جو مولوی علی بخش کے حقیقی بھتیجے تھے ساتھ رہتے تھے اور ساتھ پڑھتے تھے۔ اس وقت سر سید زندہ تھے اور ان دونوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ایک دفعہ پنجاب سے کچھ لوگ علی گڑھ دیکھنے آئے اور سر سید کے ساتھ ٹھیرے۔ سر سید نے ان دونوں طالب علموں کو اس موقع پر اپنے مکان پر بلایا اور اپنے مہمانوں سے خاص طور سے ملایا اور مولوی شکور بخش کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ اس شخص کے بھتیجے ہیں جو اپنی زندگی بھر میرا مخالف رہا مگر آج یہ بھی میرے ہی مدرسے میں پڑھنے آئے ہیں۔ اس مدرسہ میں جس کی ان کے چچا نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ تو بتاؤ کہ آخر میں جیتا یا مولوی علی بخش، فتح کس کے ہاتھ رہی۔

ظاہر ہے کہ اس وقت سر سید کو فتح ہوئی اور یہی مناسب تھا۔ سر سید نے یہ خوب سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی حالت اس وقت تک نہیں سنبھل سکتی جب تک ان میں مغربی تعلیم عام نہ ہو اور یہ اس وقت ہوسکتا تھا جب ان کے مذہبی خیالات اصلاح پا جائیں۔ ان خیالات کی اصلاح کی انھوں نے زندگی بھر کوشش کی۔ ان کی تفسیر اس وجہ سے لکھی گئی تھی کہ وہ ایک نئی تفسیر کی ضرورت کمی سے محسوس کرتے تھے۔ آج جب کہ ہم سر سید کے خلوص، ان کی دوراندیشی، ان کی محنت اور کوشش کی بہار دیکھ رہے گو ان کے نقطہ نظر سے ہمیں پوری طرح اتفاق نہیں، ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ان اشخاص کا نام بھی فراموش نہ کریں جو نیک نیتی سے سر سید کی مخالفت کرتے تھے۔ سر سید کا سابقہ جاہلوں یا نادانوں سے نہیں تھا، ان کے مقابلے میں بڑے بڑے عالم اور فاضل تھے اور انھوں نے انھیں راضی کرنے کی بڑی بڑی کوششیں کیں۔ مولوی علی بخش تو دینی کمیٹی میں شامل ہوتے ہوتے رہ گئے لیکن مولوی امدادالعلی کی خاطر سر سید نے تہذیب‌الاخلاق بند کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اگرچہ اس کی اصلی وجہ مصروفیت ہی کیوں نہ رہی ہو۔ آخر یہ پرچہ تہذیب‌الاخلاق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولوی امداد العلی صاحب کو بھی خوش کرنا چاہتے تھے——سر سید کے مخالفوں کا درجہ معلوم ہوجائے تو سر سید کی عظمت اور بھی واضح ہوجاتی ہے۔

مولانا برکت اللہ مرحوم

(از جناب عبدالرحمن صدیقی صاحب، ایم۔ ایل۔ اے، سابق میئر کلکتہ)

ہندستان انہیں بھول گیا ہو لیکن وہ کبھی ہندستان کو نہیں بھولے۔ ہندستانی حلقوں میں خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہوں «مولانا» کہلائے اور غیر ہندی حلقوں میں پروفیسر، حتیٰ کہ ترک اور عرب بھی انہیں پروفیسر ہی کہتے تھے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا بھوپالی تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ تلاش کرنے پر بھی بھوپال میں نہ تو کوئی رشتہ‌دار ملا اور نہ کسی سے مولانا کے خاندان اور گھرانے کا پتہ چلا۔ ایک شب میلان (Milan) کی گالیریا (Galleria) میں خود انھوں نے فرمایا تھا کہ دراصل میں فتح پور کا رہنے والا ہوں۔ چھوٹی عمر میں بھوپال آگیا تھا۔ تعلیم وہیں ہوئی۔ یا تو مولانا کے والد ریاست میں کسی عہدے پر مامور تھے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ پرانے وقت کے رواج کے مطابق کم عمری ہی میں بھوپال جسے نواب صدیق حسن خاں نے اسلامی علوم کا مرکز بنادیا تھا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہوں۔ جو کچھ ہوا ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے تعلیم بھوپال ہی میں حاصل کی اور اسی کو اپنا وطن سمجھتے رہے اور اکثر عربی مضامین میں اپنے نام کے بعد «البھوفالی» خود ہی لکھا کرتے تھے۔

سولہ یا سترہ سال کی چھوٹی عمر میں دستار فضیلت حاصل کی۔ حافظ قرآن اور حافظ صحاح ستّہ تھے۔ تفسیر اچھی جانتے تھے۔ عربی کے نہ صرف ادیب ہی تھے بلکہ خلاف معمول اس زبان میں گفتگو بھی کرلیتے تھے۔ اپنے ہم سبق طلبا سے بہت آگے اور بہت اونچے درجے پر تھے۔ ممکن تھا کہ سند حاصل کرنے کے بعد ریاست کے کسی دفتر میں نوکری کرلیتے اور زندگی کے دن اوروں کی طرح گم‌نامی میں بسر کرتے لیکن

ان کی طبیعت میں ولولہ تھا۔ انگریزی پڑھ کر پادریوں سے بحث مباحثہ کرنے اور اسلام پر جو غلط اعتراضات کیے جاتے تھے ان کے جواب دینے کا شوق تھا۔ مگر مفلسی اسے پورا کرنے میں آڑے آتی تھی۔ لیکن جوئندہ یابندہ۔ دربار کے ایک افسر کے چھوٹے بھائی بمبئی میں تھے۔ جب افسر صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا انگریزی پڑھنی چاہتے ہیں انہیں بمبئی روانہ کردیا اور اپنے بھائی کو ہدایت کردی کہ مولانا کی انگریزی تعلیم کا انتظام کردیا جائے۔

اب مولانا کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ انگریزی کس طرح اور کہاں پڑھی جائے اس پر غور ہی ہو رہا تھا کہ خود مولانا نے کھیت واڑی کے محلے میں ولسن (Wilson) ہائی اسکول میں پہلے درجے میں نام داخل کرالیا۔ چھوٹے چھوٹے ہندو پارسی لڑکوں میں بڑی عمر کا ایک طالب علم جس کی داڑھی مونچھ بھی کچھ کچھ نکل آئی تھی انوکھا ضرور معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر مولانا نے اس کی بالکل پروا نہ کی۔ برابر مدرسے جاتے رہے اور اپنا سبق سناتے رہے۔

ایک دن پادری اسکاٹ صاحب مدرسے کا معائنہ کرنے آئے مولانا کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئے۔ حالات دریافت کرنے کے بعد اپنے ساتھ لے گئے اور فرمایا کہ میں تمہیں انگریزی پڑھاؤں گا تم مجھے اردو سکھاؤ۔ سال ڈیڑھ سال میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ میٹریکولیشن کے درجے میں داخل کرلیے گئے اور پہلے ہی سال یونیورسٹی کے امتحان میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ بد قسمتی سے اور مضامین میں تو کامیاب ہوگئے لیکن انگریزی کے پرچے میں کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ دوسرے سال پھر پوری محنت کرکے امتحان میں شریک ہوئے اور اب کی مرتبہ پھر ناکامیابی سے دو چار ہونا پڑا۔ شاید پھر کوشش کرتے لیکن انگلستان سے مسٹر عبداللہ کویلیم (Quilliam) کے مسلمان ہونے کی خبر ہندستان پہنچ چکی تھی۔ سلطان عبدالحمید نے انہیں جزائر بریطانیہ کا شیخ الاسلام مقرر کیا اور انگلستان میں تبلیغ اسلام کی تجویزوں پر غور ہونے لگا۔ ان واقعات سے ہندستان میں کھلبلی پڑگئی اور ہر مسلمان کے دل میں اسلامی جوش ابل پڑا۔ کویلیم کے قبول اسلام نے مولانا کو بھی بے چین کردیا۔ انگلستان پہنچ کر وہاں کے شیخ الاسلام

کا ھاتھ بٹانے کی دھن دماغ میں سما گئی - اپنے میزبان سے جو راقم‌الحروف کے والد تھے، کہا کہ اگر جہاز کے کرائے کا انتظام ھوجائے تو ولایت میں روٹی کا انتظام میں خود کرلوں گا - والد اکیلے اس ذمہ‌داری کو اپنے سر نہ لے سکتے تھے - لیکن ایک میمن سیٹھ صاحب نے جب مولانا کے ولایت جانے کے ارادے کو سنا تو آدھا خرچ دینے کا وعدہ کیا - والد صاحب بھی تیار ھوگئے اور مولانا سفر کی تیاریوں میں مشغول ھوگئے - بریلی سے مولوی ریاض‌الدین صاحب مدیر "الریاض" بھی اسی مہم پر ولایت جارھے تھے - ان کا اور مولانا کا ساتھ ھوگیا اور دونوں ۱۸۹۰ ع میں ایک ھی جہاز پر سوار ھوکر انگلستان روانہ ھوگئے -

لندن پہنچے - وھاں سے لورپول (Liverpool) کوبلیم صاحب سے ملنے گئے کیونکہ یہ اسی شہر میں سولی‌سٹر (Solicitor) کا کام کرتے تھے - ایک ھی ملاقات میں اصلی صورت حالات معلوم ھوگئی - عبداللہ کوبلیم نے جب پیشے میں زیادہ کامیابی نہ دیکھی تو اسلام کو ذریعہ معاش اور سلطان المعظم اور عالم اسلام سے روپے اینٹھنے کا آلہ بنایا - بعد میں اس کا بھانڈا پوری طور سے پھوٹا - سولی‌سٹروں کی فہرست سے نام خارج کردیا گیا - برسوں ادھر ادھر مارا مارا پھرا - آٹھ دس برس ھوئے لندن میں انتقال ھوا - نام بدل دیا تھا - مسلمانوں کے جلسوں میں شریک ھوکر ترکی، ممالک اسلامی اور ھندستان کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتا تھا - مولانا اور ریاض‌الدین صاحب پژمردہ خاطر اور رنجیدہ لندن واپس لوٹے - ایک چھوٹی سی کتاب جس میں اصول دین اور وضو نماز کی ھدایات تھیں "رھنمائے مسلم" (مسلم گائیڈ) کے نام سے لکھی اور مفت شائع کی - جب تک والد زندہ رھے اس وقت تک مولانا کی مالی امداد برابر کرتے رھے لیکن ۱۸۹۳ ع میں ان کے انتقال کے بعد سے مولانا بےیار و مددگار ھوگئے - ریاض‌الدین صاحب تھوڑے ھی عرصے کے بعد واپس چلے آئے تھے لیکن فقیری میں بھی مولانا ھمت نہ ھارے اور جس کام کے لیے وطن چھوڑا تھا وہ اپنی طاقت کے مطابق کرتے رھے - سول سروس کے امیدواروں کو عربی پڑھا کر، برٹش میوزیم میں یورپ کے ادبا کو عربی اور فارسی سے انگریزی میں ترجمے کرکے اور اخبارات اور رسالوں میں

مضامین لکھ کر گزراوقات کرتے رہے - جی - ڈبلیو - ایم گبز (G.W.M. Gibbs) جن کے نام سے گبز میموریئیل سیریز (Gibbs' Memorial Series) کی نہایت عمدہ کتابیں عربی اور فارسی کی شائع ہو رہی ہیں- اسی زمانے میں اپنی معرکۃالارا کتاب ترکی شاعری پر لکھ رہے تھے - اس کتاب کا مقدمہ جس میں عروض و قوافی پر عالمانہ بحث کی گئی ہے مولانا کی مدد سے لکھا گیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر مولانا کی مدد نہ ہوتی تو یہ مضمون لکھا ہی نہ جاتا - مشہور مورخ اسٹینلی لین پول (Stanley Lane-Poole) کے ساتھ بھی کام کیا - گبز کے مرنے پر مولانا پھر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے - کئی برس عسرت اور مصیبت میں کاٹے - مستقل آمدنی کی صورت پیدا نہ ہوئی لیکن گزر ہوجاتی تھی - محمد علی کو بھی مولانا کی شاگردی کا شرف ملا تھا- سول سروس کے امتحان میں عربی کے پرچے کی تیاری مولانا ہی کی مدد سے انھوں نے کی تھی -

ایک امریکی سیاح مسٹر الکزانڈر ویب (Alexander Webb) ۱۹۰۵ یا ۱۹۰۶ میں انگلستان آئے - یہ مسلمان ہوچکے تھے اور ان کا اسلامی نام محمد تھا - مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی - ان کے علم، ان کی صداقت اور ذوق خدمت اسلام سے متاثر ہوئے اور امریکا آنے کی دعوت دی تاکہ دونوں مل کر نمایاں اور بڑے پیمانے پر کام کریں - مولانا ان کے ساتھ امریکا تشریف لے گئے - محمد الکزانڈر ویب کے ساتھ دینی خدمات انجام دیتے رہے لیکن امریکا کی آزاد اور جمہوریت کی فضا میں سیاسیات کا چسکا بھی لگا - ہندستان اور دنیائے اسلام کے مصائب اور ان کی آزادی پر مضامین لکھنے لگے - فورم (Forum) نامی مشہور رسالے میں بھی ان کے مقالے شایع ہوئے - جب موقع ملتا ہندستان کی وکالت ضرور کرتے - بدقسمتی سے مسٹر ویب کا انتقال ہوگیا - مولانا اکیلے رہ گئے - ویب جیسے ہمدرد اور ساتھی کی رفاقت سے کام میں بھی خلل پڑگیا - کہاں جائیں اور کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا - موقع پا کر باہر نکل آنا چاہتے تھے کہ معلوم ہوا کہ ٹوکیو کی یونیورسٹی اردو زبان کے پڑھانے کے لیے ایک شعبہ کھول رہی ہے اور استاد کی تلاش کررہی ہے - مولانا نے عرضی بھیجی - جگہ مل گئی اور ۱۹۰۸ میں جاپان پہنچ گئے -

درس و تدریس کے علاوہ ٹوکیو میں تبلیغ کا کام بھی شروع کردیا۔ چار پانچ جاپانی حضرات نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس کامیابی نے مولانا کے حوصلے بلند کردیے۔ ایک چھوٹی سی انجمن قائم کی اور اپنے جاپانی احباب کی وساطت سے مغول، ترکستانی اور چینی مسلمانوں سے تعلقات قائم کرنے اور ان میں اخوّت و ترقی کی تحریک کے پھیلانے میں مشغول ہوگئے۔ انگریزی زبان میں اسلامک (Islamic) فریٹرنیٹی (Fraternity) یعنی اخوت اسلامیہ کے نام سے ایک ہفتہوار اخبار بھی جاری کردیا۔ اس اخبار کا اثر دور دور پہنچا۔ فیلی‌پین، جاوا، ملایا اور چین کے مسلمان اس کی آواز سے جاگے۔ جگہ جگہ انجمنیں برپا ہوئیں اور ان میں قومی مسائل پر گفتگو ہونے لگی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ روسی، ڈاندیزی اور انگریزی حکومتوں کے نمائندوں نے اس تحریک میں اپنے لیے خطرہ دیکھا۔ سب نے مل‌کر یا ان میں سے ایک یا دو نے جاپانی حکومت سے شکایت کی۔ مولانا کے تقرر کی پہلی میعاد ختم ہونے آئی تھی، دوبارہ تقرر نہ کیا جائے اس پر اصرار ہوا۔ حکومت نے کمزوری دکھلائی اور مولانا کا دوبارہ تقرر نہ ہوسکا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا جنون کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی قوموں کی برسوں کی رقابتیں اپنا اپنا رنگ دکھانے والی تھیں اور تمام عالم مشرق اور مغرب ایک قیامت صغریٰ میں سے گزرنے والے تھے۔ آسٹریا کا شہزادہ سربستان کی سرحد پر سارایےوو (Saraievo) کے مقام پر جولائی ۱۹۱۴ع میں قتل ہوا اور اگست کی چوتھی تاریخ تک یورپ کی تمام بڑی بڑی حکومتیں جنگ میں شریک ہوگئیں۔ جاپان میں مولانا کی زندگی تلخ ہو ہی چکی تھی۔ کام مقامی دوستوں کے سپرد کرکے کالی‌فورنیا چلے گئے۔ یہ مقام اس وقت ہندی انقلابیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ مل کر جنگ سے کس طرح فائدہ اٹھایا جائے اور وطن کو غلامی سے کس طرح نکالا جائے اس کی تدابیر کے سوچنے اور ان کو عمل میں لانے کے لیے ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ اس دور میں موصوف کی قابلیت اور جذبۂ ایمانی نے وہ وہ خدمات ان کے ہاتھوں کرائیں اور ایسے ایسے کارنامے ان سے انجام دلوائے

کہ عقل دنگ رہ جاتی ھے۔ عمر ساٹھ سے اوپر ھوچکی تھی لیکن سینکڑوں نوجوانوں سے مولانا زیادہ چست و چاق تھے۔ دن رات کام کرتے تھے۔ ایک جوش تھا جو کسی طرح تھمتا ھی نہ تھا۔

غدر پارٹی والوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ ان کے نمائندے ھوکر برلین کے ھندی انقلابیوں کے ساتھ جو جرمنی میں تھے مل کر کام کریں۔ امریکا اس وقت تک جنگ میں شریک نہیں ھوا تھا۔ چنانچہ ایک امریکانی جہاز پر سوار ھوکر شروع ۱۹۱۵ع میں ناروے کے رستے برلین پہنچ گئے۔ وھاں کے ھندیوں نے خیر مقدم کیا اور راجہ مہندر پرتاب سنگھ کی صدارت میں جو موقتی حکومت قایم ھوئی تھی اس کے وزیر امور خارجہ مقرر کیے گئے۔

جرمن حکومت سے پیام و کلام ھونے لگے۔ دونوں حکومتوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد جس میں ھندی اور جرمن شریک ھوں افغانستان بھیجا جائے تاکہ امیر حبیب اللہ خاں کو غیر جانب‌داری سے ھٹا کر جنگ میں جرمنی اور ترکی کے ساتھ شریک کرادے۔

وفد کا جرمن رئیس فون ھن‌تیگ (Von Hentig) مقرر ھوا اور ھندی رئیس مولانا۔ یہ لوگ ترکی سے عراق گئے اور وھاں سے ایران۔ آگے چل کر رستہ بند ھوگیا کیونکہ مرو (Mero) کی جانب سے روسی اور کوئٹہ کی جانب سے انگریزی افواج بڑھ رھی تھیں اور تجویز یہ تھی کہ دونوں ایک جگہ مل جائیں اور ایران اور افغانستان کے درمیان ناکہ بندی کردیں تاکہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی ادھر سے ادھر آجا نہ سکے۔ حالانکہ ایران اور افغانستان دونوں غیر جانب‌دار تھے۔ فون ھن‌تیگ نے فیصلہ کیا کہ روسی اور انگریزی افواج کے بیچ سے نکل کر کابل پہنچنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ھے اور اس نے مشورہ دیا کہ وفد واپس لوٹ جائے۔ مولانا نے اس کی مخالفت کی۔ اس وجہ سے کہ شمال سے روسی اور جنوب سے انگریز علاوہ ناکہ بندی کے ایک لشکری سڑک بھی بنا رھے تھے جو کوئٹہ اور مرو کو جوڑ دیتی۔ یہ سڑک ابھی پوری نہیں ھوئی تھی۔ بیچ کے دونوں سروں میں پچاس ساٹھ میل کا فاصلہ رہ گیا تھا جو ابھی بنا نہ تھا۔ اور اس پر ناکہ بندی اور پہرہ زیادہ سخت بھی نہ تھا۔ مولانا نے اصرار کیا کہ اس ٹکڑے

سے گزرکر منزل مقصود تک پہنچنا ممکن ھے - فون ھن‌تیگ نے مولانا کی رائے سے اتفاق کیا - ظاھری اعلان تو یہ کیا کہ وفد واپس ھو رھا ھے لیکن پوشیدہ احکام یہ دیے گئے کہ موقع پاکر افغانستان کی سرحد کی طرف آگے بڑھنا ھے - آس پاس کے گاؤں میں رستہ دکھلانے والا کوئی رھبر بھی نہ لیا کیونکہ جاسوسی کا شبہہ تھا - مولانا نے نقشے دیکھنے شروع کیے - ان کی ھیئت‌دانی بھی بےحد کام آئی - گھوڑے پر آگے آگے تاروں سے رستہ درست کرتے ھوئے اندھیری رات میں بلا خوف و خطر اپنے تمام ساتھیوں سمیت صحیح و سالم افغانی حدود میں داخل ھوگئے - ھرات ھوتے ھوئے شادمان اور کامران کابل پہنچ گئے - وفد اپنے اصلی مقصد میں کامیاب نہ ھوسکا - امیرحبیب‌اللہ خاں نے خاطر تواضع بہت کی لیکن شرکت جنگ سے انکار کیا - فون ھن‌تیگ تو واپس چلا گیا لیکن امیر نے مولانا کو روک لیا - مصلحت بھی تھی کہ یہ ٹھہر جائیں - امیر کی دعوت قبول کی - دو ڈھائی سال برابر اور متواتر کابل میں رھے - امیر اھم امور میں برابر مشورہ لیا کرتا تھا اور اس پر اکثر عمل بھی کرتا تھا -

کابل کے دوران قیام ھی میں روسی انقلاب ھوا - جرمنوں سے برست لیٹووسک (Brest-Litovsk) میں صلح ھوئی - حکومت کا مرکز پیٹرس‌بورگ (Petersburg) سے ھٹ کر موسکو آیا - نئی حکومت نے ایشیائی ملکوں اور درباروں سے تعلقات کے نئے اصول کا اعلان کیا - روسی سفیر متعین ھوکر کابل آیا اور نئے صلح‌نامے کی گفت و شنید ھونے لگی - مولانا کے کارناموں میں یہ بھی ایک تاریخی اور عظیم‌الشان کارنامہ ھے کہ جو صلح‌نامہ تیار ھوا اس کی اصل عبارت فارسی زبان میں لکھی گئی اور یہ مولانا کے قلم کی تھی - روسی زبان میں ترجمہ اس فارسی مسودے سے کیا گیا لیکن دستخط فارسی دستاویز پر ھوئے تھے -

افغانستان کی سیاسی ھوا میں اب مولانا کا دم گھٹنے لگا - جو شخص دنیا کی سیاست میں حصہ لے چکا ھو اس کے لیے ھمالیہ اور ھندوکش کے درمیان کی گھاٹیاں بہت تنگ تھیں - آخرکار افغانستان کو خیرباد کہہ کر موسکو چلے گئے - اگر زیادہ ٹھہرتے تو ان کا حشر بھی وھی ھوتا جو مولانا عبیداللہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کا ھوا -

لے‌نین (Lenin) اور چی‌چےرین (Chicherine) سے دوستانہ تعلقات قایم ہوگئے لیکن موسکو کے ہندی حضرات کی آپس کی خانہ‌جنگیوں سے عاجز آکر روس بھی چھوڑا اور ۱۹۲۳ء میں برلین (Berlin) آگئے۔ لے‌نین نے روکنے کی کوشش ضرور کی لیکن مولانا اس قدر خاطر برگشتہ ہوگئے تھے کہ نہ رکے۔ لے‌نین کہا کرتا تھا کہ پروفیسر برکت‌اللہ کی شخصیت روزانہ سیاسی قصے جھگڑوں سے بالاتر ہے۔ ایسے اشخاص کا تو کسی قوم میں یا ملک میں موجود ہونا ہی اس قوم یا ملک کے لیے باعث برکت و رحمت ہے۔ لے‌نین مولانا کو اپنے ساتھ رکھ کر وسط ایشیا اور مسلم حکومتوں کے ساتھ روسی سیاست پر مشورہ اور ہدایت لینا چاہتا تھا۔ مولانا نہ تو بولشےویکی (Bolsheviky) تھے اور نہ کومونیسٹ (Communist)۔ برسوں کے دیس نکالے کے باوجود ہندی اور مسلم رہے۔ زندگی بھر کبھی کسی غیرہندی یا غیرمسلم شخص، گروہ یا حکومت سے اپنے لیے ایک پائی تک نہ لی۔ موسکو کی حکومت سے اگر مشاہرہ یا کسی اور صورت سے مالی امداد لینا اپنی آزادیٔ رائے کو فروخت کرنا تھا اور یہ مولانا کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔ اخراجات کی تنگی بھی ستانے لگی تھی۔ یورپ کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوکر اپنے ہندی اور مسلم احباب سے تعلقات قایم کرکے ان امیدوں کو پھر سے تازہ کرنا تھا جو خاک میں مل گئی تھیں۔ از سر نو ایک نیا لائحہ عمل نئے حالات میں تیار کرنا تھا۔

برلین کے ہندستانیوں کی حالت ناگفتہ‌بہ تھی۔ جس درخت پر یہ لوگ ہندی بیل چڑھانی چاہتے تھے وہ درخت ہی کھوکھلا ہوگیا تھا۔ اور یہ بیل خشک ہوگئی تھی۔ جرمنی کی تباہی کا اخلاقی اثر ہندیوں پر بہت برا پڑا تھا۔ ایک دوسرے کے درپئے آزار ہوگئے تھے۔ مولانا نے ثالث بالخیر بن کر دوستی قایم کرنے کی پوری کوشش کی لیکن رائگاں گئی۔ کچھ عرصے کے بعد برلین چھوڑ کر فرانس میں رہنے کا فیصلہ کیا اور پیرس چلے گئے۔

لوزان کی کانفرنس ہونے والی تھی۔ انقرہ کے حضرات سلطنت اور خلافت دونوں سے عاجز آگئے تھے اور خوف تھا کہ شاید کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھیں جس سے

عالم اسلام کو نقصان پہنچ جائے - مولانا نے مسئلہ خلافت پر ایک عالمانہ مضمون لکھا اور اسے زعمائے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے نمائندوں میں تقسیم کیا - دوران کانفرنس میں برابر لوزان میں رہے اور ترکوں اور عربوں میں دوستانہ تعلقات قایم کرنے میں کوشاں رہے - روسی وفد جس کا رئیس چیچیرین (Chicherine) تھا اس سے بھی ملتے رہے اور ترکی اور روس کے درمیان اگر کوئی گتھی پیدا ہوجاتی تو اسے سلجھاتے رہے - پیرس لوٹ کر طبیعت نے پھر جوش کھایا - عربی میں ایک پرچہ الاصلاح کے نام سے ہر ہفتے شائع کرنا شروع کیا - طونس، الجزائر، مراکش اور ریف کے مسلمانوں میں اس پرچے کی اچھی شہرت ہوئی - آتے جاتے ہندی، مصری، مغربی اور دیگر ممالک کے مسافر مولانا سے ملتے رہے - پیرس اب مولانا کی وجہ سے ایک چھوٹا سا مرکز بن گیا - جہاں پیرس کی اور خوبیاں بیان کی جاتی ھیں ایک یہ بھی ھے کہ اس انقلابی شہر میں دنیا بھر کی قومی تحریکیں آ کر پناہ گزیں ہوتی ھیں - فرانسیسی حکومت نے تو کچھ نہ کیا لیکن ایک بیرونی حکومت کی دوستانہ شکایت پر ایک دن پولیس مولانا کے مکان پر آئی - انھیں اور ان کے کپڑے، کتابیں اور دوسرے اسباب کو گاڑی میں بھر کے ریل میں سوار کردیا - اور جب تک کہ سویٹزرلینڈ کی حد میں گاڑی نہیں پہنچی اس وقت تک پولیس والے نے ساتھ نہ چھوڑا - سین گالن (St Gallen) میں ان کا ایک دوست رهتا تھا اس کے پاس چلے گئے اور اب کیا کیا جائے اس پر غور و فکر کرنے لگے -

نچلے بیٹھنے والے آدمی تو تھے ھی نہیں - ذیابطس کی شکایت پیدا ہوگئی تھی اور بائیں کندھے میں عصبی درد بھی ستانے لگا تھا اس پر بھی قومی اور اسلامی خدمت کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے - ان دنوں طرابلس الغرب کے چند قوم پرست اپنے هم وطنوں کے مظالم کی شکایت کرنے رومہ آئے ہوئے تھے - ان کی درخواست پر مولانا رومہ تشریف لے گئے - ان کے آلام اور مصائب کی داستان سنی اور سینیور مسولینی (Signor Musoolini) سے ملاقات کرکے نہایت موثر طریقے پر ان کی وکالت کی - اور وعدہ لیا کہ عربوں کو اب ستایا نہ جائے گا -

مولانا کی موجودگی سے فائدہ اٹھاکر سینیور مسولینی نے اپنے سکریٹری سینیور کونتارینی (Signor Contarini) کو ان کے پاس بھیجا اور ایک تجارتی تجویز میں ان سے مدد چاہی - اطالیہ والوں کی خواہش تھی کہ ہندی تاجروں سے براہ راست تعلق پیدا کرکے جرمنی اور آسٹریا کی تجارت کو جو جنگ کے بعد بند ہوگئی تھی اطالیہ کی طرف رجوع کردیں - مولانا کو تجویز پسند آئی اور امداد کرنے کا وعدہ کیا - اطالیہ کے مشہور تجارتی ایوان لیگ لومباردیا (League Lombardia) نے ایک کڑوڑ لیرے (Lire) کے سرمایہ سے ایک کمپنی رجسٹر کی جس کا رئیس بادشاہ کا رشتہ دار ڈیوک چزارے (Duke Cezare) مقرر کیا گیا - اطالیہ کے بڑے بڑے کارخانےدار، تاجر اور بنک اس میں شریک تھے - سینیور آنسالدو (Signor Ansaldo) مسولینی جو پوپولو دیطالیہ (Popolod'Italia) کے مدیر تھے اس کمپنی میں اپنے بھائی کی نمائندگی کرتے تھے - روپیہ جمع ہوگیا - میلان میں دفتر کھول دیا گیا لیکن جس اثر نے انھیں جاپان سے نکالا، پیرس سے نکالا اسی نے اس تجویز کو بھی تباہ کیا اور مولانا مہینوں کی محنت کے بعد ناکام اسویٹزرلینڈ واپس آگئے -

۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خان صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب بغرض علاج تشریف لے گئے - جنیوا (Geneva) میں تقریباً ایک مہینہ رہے - مولانا بھی تشریف لے آئے - روزانہ صحبت رہتی تھی اور بڑی بڑی بحثیں ہوا کرتی تھیں - شیام جی کرشنا ورما صاحب اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس زمانہ میں وہیں تھے - ایک روز چائے پر حکیم صاحب نے دریافت کیا کہ ورما جی آپ کی عمر کیا ہے - فرمایا کہ صاحب ٹھیک تاریخ اور برس تو میں نہیں بتلا سکتا لیکن یوں سمجھیے کہ جب میں ننگا بھاگتا پھرتا تھا تو آپ کے مہاتما جی کی ماں انھیں دودھ پلاتی تھی - حکیم صاحب کو یہ بیان اس قدر پسند آیا کہ اکثر یاد کرکے ہنسا کرتے تھے - حکیم صاحب نے مولانا کا علاج کیا اور ہندستان لوٹ کر دوا بھی بھیجی - راقم الحروف کی عرض پر حکیم صاحب نے مولانا کو ہندستان لوٹنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور امید ہے اجازت مل جائے گی - خیال یہ تھا کہ مولانا کو ہندستان لاکر علی گڑھ میں دینیات کا پروفیسر بنادیا جائے - مولانا نے اس تجویز کے

قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ جس وقت تک ہندستان آزاد نہ ہوگا میں واپس نہ جاؤں گا۔

کچھ عرصے کے بعد میرے اصرار پر راضی ہوگئے کہ یورپ میں کوئی ایک مقام پسند کرکے وہاں رہیں اور اپنی زندگی کے حالات لکھیں۔ اطالیہ کے ساحل پر سان ریمو (San Remo) پسند کیا۔ شرایط یہ طے ہوئیں کہ میں اخراجات کا ہی ذمہ نہ لوں بلکہ ایک سکریٹری کی تنخواہ کا بھی جسے مولانا حالات لکھوا دیا کریں اور وہ ٹائپ کرکے انھیں دے دیا کرے۔ مولانا مسودہ کو صحیح کرکے مجھے بھیج دیا کریں اور میں اس کے چھپوانے کا انتظام کروں۔ یہ مولانا سے میری آخری ملاقات تھی۔ میں ہندستان آیا اور وہ سین گانس چلے گئے۔ میں نے احباب کی مدد سے مولانا کے اخراجات کا انتظام کرلیا اور خوش تھا کہ یورپ لوٹ کر اب مولانا سے ان کی سوانح ضرور لکھا لوں گا۔ بمبئی میں شوکت علی صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ڈاک آئی۔ شوکت صاحب خطوط پڑھنے لگے۔ بہت سے اخبار بھی آئے تھے ان میں سب سے اوپر جو اخبار تھا اسے میں نے اٹھایا۔ یہ لالہ لاجپت رائے کا اردو اخبار «ملاپ» تھا۔ پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا کہ ہمارا کالی‌فورنیا کا مخبر اطلاع دیتا ہے کہ مشہور وطن پرست پروفیسر برکت‌اللہ کا انتقال ہوگیا۔ خبر پڑھ کر جو اثر میرے دل پر ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ مجھ سے پورا وعدہ کرنے کے بعد مولانا کالی‌فورنیا کیوں گئے اور ایسی کون سی بات تھی جس نے ان کو اتنے دور دراز کے سفر کرنے پر مجبور کیا۔ یورپ لوٹنے پر معلوم ہوا کہ راجہ موہیندر پرتاب سنگھ ان سے ملے اور انھیں اپنے ساتھ امریکا لے گئے اور کالی‌فورنیا میں انھیں تہ خاک کردیا۔ سیاست کا نشہ برا ہوتا ہے۔ کہاں سان ریمو کی خاموش زندگی اور کہاں کالی‌فورنیا کی پر شورش فضا۔ ان کی مٹی وہیں کی تھی اور اسی میں جا کر پیوند ہوگئے۔

یہ سنی‌سنائی داستان اس غرض سے قلم بند کی گئی ہے کہ ہندستان مولانا کو بھول نہ جائے اور کبھی کبھار ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا رہے۔ حالات اور

واقعات قلم بند کرنے میں ممکن ہے کہیں کہیں لغزش ہوگئی ہو لیکن سلسلہ‌وار غالباً پہلی ہی بار لکھے گئے ہیں۔ شاید کوئی زیادہ واقف کار ان میں اضافہ کردے۔ کابل کے اور برلن کے ساتھی ابھی زندہ ہیں۔ سنا ہے کہ فون ہن‌تیگ (Von Hentig) نے ایران کے سفر کے حالات کتاب کی صورت میں جرمن زبان میں شائع کیے ہیں۔ سر مائیکل اوڈوایر (Sir Michall O'Dwyer) نے بھی اپنی کتاب میں مولانا کی کابل کی کہانی دوسرے پہلو اور دوسرے نقطۂ نظر سے بیان کی ہے۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں کا سیاسی مطمح نظر اور اس کے حصول کا طریقہ اور اس پر عمل درست تھا یا نہیں اس سے بحث نہیں۔ دھن کے پکے تھے۔ جو بات دل میں ٹھان لی تھی اس پر اڑے رہے اور اسی کے لیے جان تک قربان کردی۔

وفاداری به شرط استواری اصل ایمان ہے۔

مولانا نے اسی پر عمل کیا۔ زندگی بھر شاید کسی سے غصے میں بات کی ہوگی۔ ناراضگی کے اظہار کا سب سے سخت جملہ "بڑا ہی خبیث ہے" ہوتا تھا۔ خوش حالی کبھی نصیب نہ ہوئی لیکن ہر حال میں قانع اور صابر رہا کرتے تھے۔

بلند پایہ شاعر تھے۔ زیادہ تر کلام فارسی میں تھا۔ انگریزی ملک‌الشعرا لارڈ ٹینی‌سن (Lord Tennyson) کی سال‌گرہ کے موقع پر قصیدہ لکھا تھا جو اس نے بےحد پسند کیا۔ یادداشت غضب کی تھی۔ رومہ (Roma) سے فلارنس (Florence) کی گاڑی آپےنین (Appenine) کے پہاڑ میں سے گزرتی ہے۔ صبح کا وقت تھا اور منظر نہایت خوبصورت۔ میں اوپر کے بسترے پر سو رہا تھا کہ گنگنانے کی آواز آئی۔ آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ہاتھ ہلا ہلا کر فارسی اشعار پڑھ رہے ہیں۔ سلام کیا۔ فرمایا نیچے آؤ۔ منظر دیکھو اور نظم سنو۔ شاہ ایران ۱۹۰۰ء میں پیرس کی مشہور نمایش دیکھنے یورپ گیا تھا۔ کچھ دن کے لیے لندن میں بھی شاہی مہمان رہا۔ مولانا نے قصیدہ پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ لندن میں وقت نہ ملا۔ شاہ نے بروکسل (Bruxelles) پایہ تخت بلجیم میں بلایا۔ قصیدہ سنا۔ شاہ کے آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اشعار تو یاد نہیں لیکن مضمون یہ تھا کہ عالم اسلام اور ایران کی حالت تباہ ہے۔

تو ہے پیرس میں جو کچھ دیکھا اسے اپنے وطن لوٹ کر وھاں بھی قایم کر۔ ترقی کے سامان جمع کر اور ایران کی شان دوبالا کردے۔ مولانا اشعار پڑھتے گئے اور میں گنتا گیا ۹۲ اشعار سنانے کے بعد فرمایا کہ بھائی زمانہ گزر گیا، اب یادداشت بھی پہلے کی سی نہیں رھی۔ سوال کرنے پر جواب ملا کہ قصیدے میں کل اشعار ۱۲۰ تھے۔ بات چیت کرتے وقت ھاتھ بہت ھلاتے تھے۔ سڑک پر چلتے ھوئے اگر کوئی اہم نکتہ ذھن میں آجاتا فوراً رک جاتے چھڑی کو کہنی کے پاس لٹکا لیتے اور دونوں ھاتھوں سے اپنا مطلب جوش و خروش سے ادا کرتے۔ مذھبی مسائل کا سمجھانا مولانا کا حق تھا۔ نہ صرف قرآن اور حدیث بلکہ فلاطون اور ارسطو سے لے کر موجود زمانے کے فلاسفہ کے اقوال کی روشنی اس خوبی سے سمجھاتے تھے کہ سننے والا حیران ھوجاتا تھا۔ معلوم ھوتا تھا کہ ایک دریا بہہ رھا ھے جو چاھے فیض حاصل کرے۔

اگر مذھبی رجحان طبیعت والے انھیں فرشتہ کہتے تو سیاسی احباب انھیں سچا قوم پرست، قابل اعتماد شریک کار اور پکا دوست سمجھتے تھے۔ انگریزی محاورے میں ایسے شخص کو انسانوں کا بادشاہ اور ترکی میں «تاتلی» میٹھا اور شیریں آدمی کہتے ھیں۔ میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں صرف یہی کہہ سکتا ھوں کہ بڑے اچھے آدمی تھے۔ ایسے آدمیوں کا وجود قوم اور ملت کے لیے باعث شرف اور برکت ھوا کرتا ھے۔

اللہ تعالی انھیں جنت نصیب کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

مقدمہ

(ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی - پوسٹ گریجویٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا)

یہ کتاب دراصل تاریخ دکن امجدیہ مصنفہ ابوالفتح ضیاءالدین محمد المعروف بہ سید امجد حسین بن سید اشرف الحسینی الایازی خطیب جامع مسجد و عیدگاہ ایلچپور کے باب چہارم "دربیان سلطنت شاہان بہمنیہ" کا فارسی نثر سے اردو نظم میں ترجمہ ہے جو امیرالامرا سالار جنگ مختارالملک بہادر کے عہد وزارت ممالک محروسہ سرکار عالی میں تصنیف ہوئی - جب نواب خورشید جاہ بہادر برار تشریف لے گئے تو مصنف نے جناب نواب صاحب بہادر موصوف سے طباعت کتاب ھذا کی درخواست کی جسے جناب نے قبول فرمایا اور آپ کے حکم مبارک سے بنام "تاریخ دکن بہ لقب ریاض الرحمن المعروف بتاریخ امجدیہ" ایلچپور کے مطبع خورشیدیہ میں ۱۲۸۷ھ میں طبع ہوئی -

مکمل تاریخ امجدیہ گیارہ ابواب اور ایک خاتمہ (مشتمل بر سہ فصل) کا مجموعہ ہے - پورا مسودہ بڑی تقطیع کے ۷۲۵ صفحات پر ہے اور ان میں باب متعلقہ سلطنت بہمنیہ پر ساٹھ صفحات سے اوپر لکھے ہیں جن کا ترجمہ اردو نظم میں برار کے کسی شاعر سہیل نے کیا ہے جو ایک مخطوطہ کی صورت میں اتفاق سے دکن کالج پوسٹ گریجویٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا میں ملا - یہ ان مخطوطات میں شامل تھا جو ستارا کے تاریخی میوزیم سے یہاں لاکر رکھے گئے ہیں - اسے انجمن ترقی اردو اپنی طرف سے بہ اجازت ڈائریکٹر صاحب دکن کالج (ڈاکٹر ایرج جہانگیر تارا پور والا) شائع کرنے کا فخر حاصل کرتی ہے -

اسی تاریخ منظومہ کا ایک اور نامکمل نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں ہے

جس کے متعلق فہرست نگار مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ کا خیال ہے کہ یہ اصل مسودہ مصنف کا ہے[1]۔ جب ہم اس مطبوعہ تفصیل کا مقابلہ اپنے نسخہ سے کرتے ہیں تو ہمارا نسخہ ابتدا ہی میں کسی قدر مختلف معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس میں سلطنت بہمنیہ کے حکمرانوں پر لکھنے سے پیشتر ایک عنوان "ذکر سلطنت محمود غزنوی" قائم کیا ہے جو ہمارے نسخہ میں نہیں ہے پھر اس کے بعد مصنف نے سلاطین بہمنیہ کے حالات کو شروع کیا ہے اس حصے کا پہلا شعر یہ ہے جس سے ہمارے نسخہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے :

دلا کر رقم حمد رب کریم — کہ ہے ذات جس کی رحیم و رحیم

شاعر سہیل کے متعلق پونا میں کچھ دستیاب نہیں ہوسکا مگر شاعر حمد، نعت پیغمبر اور بیان معراج کے خاتمہ پر کچھ اپنے متعلق بیان کرتا ہے ۔ ان اشعار سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ تحریر کتاب کے وقت وہ اپنی جوانی گزار چکا ہے اور اگرچہ کچھ مایوس نظر آتا ہے مگر پھر بھی ہمیشہ گوشہ نشین رہ کر علمی کاموں سے مشغلہ رکھتا ہے :

زمانہ کے دیکھے فراز و نشیب — یہاں تک کہ اب آ گیا وقت شیب
نہیں کوئی بھی اب ہمارا وطن — مگر دور گردوں ہے اپنا وطن
کوئی علم سے بڑھ کے دولت نہیں — کسی فن میں یہ جاہ و عزت نہیں
ہوا ہوں جو سب سے کنارہ گزیں — تو علم سخن ہے میرا ہم نشیں
ہنر کوئی اور اس سے بڑھ کر نہیں — کوئی علم سے بڑھ کے جوہر نہیں

اس کے بعد وہ صراحتاً بیان کرتا ہے کہ اس نے تاریخ امجدی کے حصہ بہمنی کا نثر سے اردو نظم میں ترجمہ کیا بلکہ ذیل کے اشعار سے یہ بھی واضح ہوگا کہ اس نے محض حصہ بہمنی کو ہی نظم کرنا پسند کیا ممکن ہے بعد میں اس نے اس کے دیگر حصص کا ترجمہ کیا جو ابھی تک ایک مسودہ کی صورت میں جامعہ عثمانیہ میں نامکمل موجود ہے :

سلاطین گزرے ہیں جو بہمنی — ہے تقویم پارینہ یہ اے غنی

---

[1] "تفصیلی فہرست مخطوطات کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن"۔ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری مطبوعہ ۱۹۲۹ع ۔ صفحہ ۱۰۱-۹۹ ۔

ہے تاریخ مطبوع جو اک امجدی وہ ہی نثر میں اور بھی فارسی
کیا نظم اردو میں اس کو تمام کہ ہوں مستفیض اس سے سب خاص و عام

اب یہاں سے اصل موضوع «بیان سلطنت و حکومت سلاطین بہمنی» کے عنوان سے حسن بہمنی بانیٔ سلطنت بہمنی کا یوں ذکر شروع کرتا ہے:

حسن بہمنی جو ہوئے بادشاہ تو گلبرگہ ان کا ہوا تخت گاہ
تواریخ میں اس طرح ہے لکھا حسن کی تھی یہ حالت ابتدا
برہمن تھا دھلی میں قانون گوئی منجم بھی تھا اور قانون گوئی
مگر عہد وہ شاہ تغلق کا تھا برہمن ملازم تھا شہزادہ کا
ملازم تھا اس بہمنی کا حسن پریشان، گرفتار رنج و محن

ان میں سے شعر سوم توجہ خاص کا محتاج ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حسن بانیء سلطنت بہمنیہ اس سے قبل دھلی میں ایک برہمن قانون گوئی اور منجم کا ملازم تھا جہاں سے اس کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ یہاں مشہور کنکو یا کانکو کی بجائے «قانون گوئی» لکھا ہے اگرچہ مزید دلچسپی اور تحقیق کے لائق ہے مگر ہمارے مورخین نے اس روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اور اس کی ذمہ داری ابوالقاسم فرشتہ پر ہے جس نے خود «حسن کانگوی بہمنی۱» لکھا اور آگے چل کر اس کے آقا کو «کانگو پنڈت» تعبیر کیا ہے۔ نہ معلوم فرشتہ نے «بہمن» کو کیسے برہمن تصور کرلیا حالانکہ زمانۂ وسطی کے مصنفین نے کہیں بھی لفظ برہمن کو «بہمن» نہیں لکھا۔ فرخی محمود غزنوی کی فتح سومنات کے ضمن میں لکھتا ہے:

برھمنان را چنداں کہ دید سر ببرید بریدہ بہ سر آن کز ھدی بتابد سر

اور جب شیخ سعدی نے سومنات کی زیارت کی تو یوں کہا (بوستاں) :

بہ نرمی بپرسیدم ای برہمن عجب دارم از کار ای بقصۂ من

کتب ذیل میں جن میں بعض معاصرانہ حیثیت بھی رکھتی ہیں حسن بہمنی کا بیان ملتا ہے:-

۱ - ضیاء برنی	تاریخ فیروز شاہی	«حسن کانگو»	صفحہ ۵۲۰

۱-۲ تاریخ فرشتہ - نول کشور مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۳ع صفحہ ۲۷۳ و ۲۷۸

۲ - شمس سراج عفیف	تاریخ فیروز شاهی	« حسن گانگو »	صفحه ۲۲۴
۳ - حاجی الدبیر	ظفر الواله	« حسن گانگو »	صفحه ۱۵۹
۴ - سید علی طباطبا	برهان مآثر	« حسن شاہ گنگوتی »	صفحه ۱۲-۱۱
۵ - خواجه نظام‌الدین احمد	طبقات اکبری	« حسن گانگو »	صفحه ۲۲۱

مگر هفت اقلیم مصنفه امین رازی میں بجائے حسن گانگو کے « حسن کاکویه » از جمله ملازمان سلطان محمد تغلق لکھا ھے[1] یعنی اسے کیکاوس کی طرف منسوب کیا ھے - اتنے شواهد کے بعد شاید یه سوال اٹھ جاتا ھے که لفظ بہمن سے مراد « برهمن » تھی - ان متذکرہ بالا ماخذ میں سے ایک دو میں اس کا مکمل شجرہ نسب اسفندیار تک عیون التواریخ اور بہمن نامه کے حوالے سے نقل کیا ھے افسوس ھے که آج یه کتب ناپید هیں - غرض که ان شواهد سے واضح هوجاتا ھے که حسن دراصل ایرانی الاصل تھا اور اسی وجه سے ابتدا سے هی عوام میں بنام « بہمن » مشہور تھا - مگر لفظ گانگو جو مختلف صورتیں اختیار کرچکا ھے اور ابتدا سے هی اس کے نام کا حصه بن چکا ھے خاص کر ان ایام میں جب که وہ دهلی میں مقیم تھا -

اس باب میں هم اب ایک اور همعصر مستند سند سے استفادہ کرسکتے هیں جس کے مصنف کو دکنی هونے کا بھی شرف حاصل ھے - یعنی « فتوح السلاطین - شاهنامه هند » تصنیف مولانا عصامی[2] سے، جس نے « جلوس سلطان علاءالدین و الدینا ابو المظفر بہمن شاہ السلطان اید ملکه و سلطانه » کے عنوان کے تحت یوں کہا ھے :

۱۰۲۹۵ بر آن شاہ میمون و فرخنده چهر علا دین لقب که مهره از سپهر
۱۰۲۹۶ بسیرت فریدون و بہمن بنام شده کنیش بو المظفر مدام

اور اسی کتاب کے اخیر میں ایک اور عنوان « دعائے دولت خلیفه بر حق علاءالدین و الدنیا ابو المظفر بہمن شاہ السلطان » قائم کیا ھے اور اس کے چند اشعار ملاحظه هوں :

۱۱۳۱۵ که بعد از فریدون فرخ نژاد ترا دید در کوشش عدل و داد

---

۱ رساله تاریخ مرتبه حکیم شمس‌الله قادری حیدرآباد دکن - جنوری ۱۹۲۹ صفحه ۵۳ -

۲ « فتوح السلاطین یعنی شاهنامه هند » عصامی - مرتبه ڈاکٹر آغا مهدی حسین آگرہ - صفحه ۶ - ۵۷۳ - ۵۲۵ -

۱۱۳۱۶ ترا زاں علاءالدین آمد لقب که بر تر شدی از شہاں در نسب

اور اتفاق سے یہی نام و لقب یعنی «سلطان علاء الدنیا و الدین ابو المظفر بہمن شاہ» اس زمانہ میں کتبات مسجد گلبرگہ میں[1] جو ۷۵۴ھ میں تعمیر ہوئی اور اس بادشاہ کے سکوں پر بھی ملتا ہے[2] اور یہ سب سے زیادہ صحیح اور معتبر شہادتیں ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص مختلف مراحل زندگی طے کرنے کے بعد اور مختلف نام و لقب اختیار کرنے کے بعد آخرکار اسلامی سلطنت دکن کی بنا رکھتا ہے جو قدرت نے اس کے لیے ودیعت کی تھی جہاں اس کے لیے موقع تھا کہ وہ اپنے ان فروعی اور عارضی القابوں اور ناموں سے اعراض کرکے جو اس کے ساتھ اس کی مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے اپنا اصل آبائی نام و نسب اختیار کرے جو آج ہمیں اس کے کتبات اور خود جاری‌کردہ سکوں میں اور عصامی کے متذکرہ بالا اشعار میں ملتا ہے۔ اور اسی کو صحیح اور اصل تصور کرنا چاہیے۔

اسی منظومہ تاریخ بہمنی میں منجملہ اور امور کے خواجہ محمود گاواں کا واقعہ ہمیں محتاج وضاحت نظر آیا اگرچہ اس مختصر سے مقدمہ کے بے ضرورت طویل ہونے کا اندیشہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب خواجہ نے اپنے حسن قابلیت اور تدبیر سے نام و عزت پیدا کرلی اور اصلاح ملک کی طرف توجہ کی جس کی وجہ سے اس کے معاصرین کے اقتدار میں فرق آتا تھا تو انھوں نے اس کے خلاف ایک سازش تجویز کی کہ ایک خط خواجہ کی مہر لگاکر اسی کی طرف سے رائے نرسنہا کے نام تیار کرکے بادشاہ کے روبرو پیش کردیا جائے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یہ رائے نرسنہا ملک درمیان تلنگانہ اور کنڑہ قیام کرکے بیجانگر کے اکثر حصہ کو اپنے تصرف میں لے چکا تھا[3]۔ اس جعلی خط میں اپنے ولی نعمت بادشاہ کے خلاف فوج کشی کرنے کے لیے دعوت دی اور یہی

۱ ایپگرافیا انڈومسلمیکا ۸-۱۹۰۷ع ۔ کتاب مسجد گلبرگہ از میجر ہیگ۔ صفحہ ۱ ۔
۲ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن ۱۹۳۵ع مضمون مسٹر اسپیٹ ۔ مسکوکات بہمنی صفحہ ۲۸۸ ۔
۳ برہان مآثر ۔ صفحہ ۱۲۶ ۔

سخاوی نے اپنی کتاب «الضوء الامع فی حزن التاسع» میں لکھا ہے[1]۔ رائے نرسنہا کی بجائے بعض تاریخوں میں اور زیر نظر ترجمے میں رائے اوڑیسہ کا نام لکھا ہے جو غلط ہے:

یہ رائے اوڑیسہ کا تھا خط رقم کہ خواجہ کی مہر اس پہ تھی مرتسم

اور بادشاہ کے روبرو جب اس خط کو پیش کیا گیا تو بادشاہ آگ بگولا ہوگیا اور خواجہ کو طلب کیا جب خواجہ حاضر ہوا تو بادشاہ اس وقت شراب کے نشے میں چور نہ تھا جیسا کہ بعض نے لکھا ہے بلکہ جلاب[2] کی دوا پینے کے بہانے خلوت میں آگیا جہاں خواجہ کی بیگناہ شہادت ۸۸۶ھ میں وقوع میں آئی۔

آخر میں اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ اردو منظومہ مسودہ تاریخ بہمنی دراصل اپنی تاریخی حیثیت سے تاریخ فرشتہ پر مبنی ہے جیسا کہ محمودشاہ کے بیان کے آخر میں ذیل کا شعر لکھا ہے جس میں لفظ قاسم سے مراد ابوالقاسم فرشتہ ہے:

لکھا ہے یہ قاسم نے اس شہ کا حال فراغت طلب تھا خفیف‌الخیال

تاریخ کو شاعر نے عہدکلیم‌اللہ کے عہد پر یوں ختم کیا ہے:

گئی دولت بہمنی جو گزر ہوئے طائفے پنچ پھر جلوہ گر

قطب شاہ و عادل نظام و عماد
بریدی تھے بیدر میں فرحان و شاد

یعنی یہ سلطنت بہمنی آخر ان پانچ دکنی سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی اور ان کے ختم ہونے کے بعد مغل دکن پر قابض ہوگئے۔

غرض کہ یہ ایک مکمل تاریخی مسودہ اور گزشتہ صدی کی اردو نظم کا بہت اچھا نمونہ ہے جس میں شاعر سہیل نے نہایت کاوش سے تمام واقعات کو سلیس اور دل‌کش پیرایہ میں قلم‌بند کیا ہے اور بعض جگہ وہی فارسی ترکیبیں بھی مضمون کے لحاظ سے برقرار رکھی ہیں۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس سے بخوبی مستفید ہوں‌گے۔

۱ سخاوی مطبوعہ مصر صفحہ ۵-۱۴۴۔
۲ برہان مآثر صفحہ۱۲۹۔

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دلا کر رقم حمد رب کریم — کہ ہے ذات جس کی کریم و رحیم
جہاں آفریں کل کا پروردگار — خطا پوش و ستار و آمرزگار
دو عالم کا دو حرف سے نقش بند — نوازندۂ بندۂ مستمند
صفات اس کی قدرت کی بےحد و مر — نکات اس کی حکمت کے شمس و قمر
گلستان عالم کا وہ باغباں — کیا جس نے پیدا بہ باغ جہاں
گل نوع بنوع اور بہار ربیع — یہ ہیں اس کے نقش و نگار بدیع
عجب جوہر روح بھی ہے لطیف — ہے انسان جس کے سبب سے شریف
ہوئی اس کی قدرت یہ جلوہ نما — دیا خاک کو گوہر بےبہا
حسین و جمیل اور خوشرو جواں — زمیں پر بصد ناز دامن کشاں
ہر اک ملک و ہر شہر میں جلوہ‌گر — کوئی شمس اور کوئی مثل قمر
ہر اک فرد آئینۂ بےمثال — نمایندہ حکمت ذوالجلال
ہیں اضداد آب آتش و خاک و باد — دیا ان کو آپس میں کیا اتحاد
رکھا سر پہ آدم کے تاج کرم — کیا خاک ناچیز کو محترم
ثریا پہ پہنچائی اس کی کلاہ — کیے ختم سب اس پہ اعزاز و جاہ
خزانوں کےاس کے کھلے ہیں‌جو باب — تو بخشش فراواں ہے اور بےحساب
کسی کو وہ دیتا ہے علم و کمال — کسی کو وہ دیتا ہے حسن و جمال
سوا اس کے کس میں ہے یہ اقتدار — کرے خلق عالم جو ہژدہ ہزار
جلال اور عظمت کا اس کے بیاں — کریں کیا کہ عاجز ہے اپنی زباں
خرد فہم و ادراک و وہم و گماں — بھٹکتے ہیں پھرتے ہیں دیوانہ ساں
ہے امکاں سے باہر جو ذات کمال — نہیں پہنچتی وہاں کمند خیال
ہمیشہ سے وہ گوہر سرمدی — دکھاتا ہے قدرت کی اپنی خودی
کشایندہ قفل مہمات کا — برآرندہ عالم کی حاجات کا

ہے باطن وہی اور ظاہر وہی — ہے اول وہی اور آخر وہی
خردمند کرتے رہے جستجو — حکیموں نے کی ہے بہت گفتگو
فصاحت کے میداں میں با صد ہوس — کدائے بہت ناطقہ کے فرس
چلے اور تھکے رہ گئے درمیاں — نہ پہنچا کوئی تاحد لا مکاں
ہے لاہوت میں ذات حق جلوہ گر — نہیں وہم انساں کا اس جا گزر
زباں نالہ کرتی ہے مثل جرس — کہ ہے لنگ ذہن و خرد کا فرس
یہی اس کے کافی ہیں حمد و صفات — یہ عالم ہے سب آیت بیّنات
کہاں لامکاں اور کہاں ممکنات — تفاوت ہے اس میں بچندیں جہات
شناسا ہو تو پہلے یزداں کا — کہ جادہ ہے یہ اہل ایماں کا
کشادہ ہے خوان اس کی نعمات کا — جہاں سب مقر اس کی آیات کا
سلاطین جو صاحب تاج ہیں — یہ سب سامنے اس کے محتاج ہیں
کسی کو وہ دیتا ہے تاج و سریر — کسی کو وہ کرتا ہے بالکل فقیر
اسی کا یہ لطف و کرم موہبت — کہ بخشا اسے رتبۂ سلطنت
ہزاروں میں لاکھوں میں ممتاز ہے — حکومت بصد فخر و اعزاز ہے
جوانی و پیری کی شام و سحر — سمجھ غور سے ہے یہ پیش نظر
ہوئی عمر جس دن کہ تیری تمام — تو صحرائے ناسوت میں ہے مقام
وہاں مونس و یار کوئی نہیں — بجز ذات حق ارحم الراحمین
بیاں کچھ کروں نعت خیرالوریٰ — شہ انس و جاں خواجۂ دوسرا

در نعت حضرت رسول مقبول حبیب رب‌العالمین شفیع المذنبین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم

جناب محمدؐ شہؐ مرسلیں — جو ہیں سید اول و آخریں
شفیع امم رحمت کردگار — ازل سے ہیں محبوب پروردگار
ہزاروں نبی اور ہوئے ہیں رسول — یہ رتبہ کسی کو نہیں ہے حصول
کریم‌الشیم اور ستودہ صفات — رسول خدا سرور کائنات
جو عالم میں آئے وہ خالق کے نور — ہوا پہلے اس معجزہ کا ظہور

نہ تھا سایۂ قامت احمدی — تھی ذات آپ کی طلعت ایزدی
نہ ہونے کی سایہ کے یہ ہے دلیل — مجسم تھے نور خدائے جلیل
سراپا تھے خود سایۂ ذوالمنن — تو پھر کس طرح ہوتے سایہ‌فگن
جو ہے نور حق اس کا سایہ نہیں — کہ ظل الہی کا سایہ نہیں
درخشندہ مہر حدوث و قدم — ملک فخر سے چومتے تھے قدم

بیان معراج آنحضرتؐ

سنو حال معراج خیرالبشر — زمیں سے فلک پر ہوئے جلوہ‌گر
ہوا جانب حق سے جو اشتیاق — سواری کو حاضر ہوا اک براق
دواب بہشتی تھا وہ معتمد — کہ توصیف میں جس کی عاجز خرد
ن تگ و دو روارو میں مثل سحاب — کبھی مثل سیماب و گاہے عقاب
دو آنکھیں تھیں یاقوت کی سرخ فام — زمیں تا فلک اس کو تھا ایک گام
بحکم خداوند رب جلیل — تھے میکال بھی اور دگر جبرئیل
فرشتے تھے دونوں یسار و یمیں — ہوں خدام جس طرح شہ کے قریں
سوار ہو کے حضرت بہ پشت براق — بیک لمحہ پہنچے بصد اشتیاق
منور مزین تھے ساتوں سما — زبان پر فرشتوں کے ہے صل علی
بہشت اور غلمان و حور و قصور — مزین مفرح تھے با صد سرور
تھا آمد کا حضرت کے شور و شغف — ملائک تھے استادہ چاروں طرف
فلک کے کیے طے جو ساتوں اطاق — نظر آئی عرش معلی کی ساق
ہوا جب کہ نزدیک عرش بریں — یہ گویا ہوئے جبرئیل امیں
نہیں آگے جانے کی ہم میں مجال — تجلی کا وہاں ہے فروغ کمال
نہیں ہم فرشتوں کا وہاں پر گزر — ہے خطرہ کہ جل جائیں گے بال و پر
فرشتوں نے آگے بڑھایا نہ گام — گئے آپ ہی خود رسول انام
ہوا قرب اس درجہ مابین کا — رہا فاصلہ قاب قوسین کا

ن روانی دوانی میں مثل سحاب -

تکلم ہوئے جو بہ راز و نیاز / کسی کو نہ اس میں ہوا امتیاز
ہوا حکم خالق کا بہ بعد ازاں / دکھا لاؤ طبقات نار و جناں
تھا رضوان کو آپ کا انتظار / قدم چومے اس نے بصد افتخار
گئے لے کے جو خازنان بہشت / تو دو قصر دیکھے میان بہشت
زمرد کا اک قصر جو سبز تھا / دگر قصر تھا سرخ یاقوت کا
بہ پرساں ہوئے تب رسول جلیل / یہ دو قصر کس کے ہیں اے جبرئیل
کیا عرض جبرئیل نے یا رسول / مفصل کہوں گا تو ہووے گا طول
جو حسنین[ع] ہیں آپ کے نور عین / یہ ہیں قصر ان کے بصد زیب و زین
کہا آپ نے یہ کہو صاف صاف / ہوا رنگ میں ان کے کیوں اختلاف
کیا عرض اس کا کہوں کیا سبب / ہے تصریح میں اس کے رنج و تعب
جو اصرار حضرت کا بے حد ہوا / بالآخر کو جبریل نے یہ کہا
نہ تھا شاہزادوں کا سن تمیز / ہوئے جب سے یہ رنگ ان کو عزیز
زمرد کا ہے قصر بہر حسن[ع] / انھیں سبز مرغوب ہے پیرہن
بہشتی جوانوں میں ہیں سبز پوش / وہ ہیں زہر الماس کے جرعہ نوش
ہوئی کشت امید ان کی ہری / ملا ان کو یہ خلعت آخری
اسی رنگ کی ہے جو ان کی قبا / جناں میں بھی قصر زمرد بنا
برابر جو اس کے ہے قصر دوم / جو ہے سرخ یاقوت کا کلثّم
بنا قصر یہ خاص بہر حسین[ع] / کہ ہوں رونق افروز با زیب و زین
وہ گلگوں قباہیں جو نشر و علن[ن] / شہادت کا ان کو دیا پیرہن
خدا کا ہے ان پر یہ لطف مزید / پیاسے ہی خنجر سے ہوں گے شہید
تمنا میں جن کی رہے انبیاء / تھے مشتاق اس کے بہت اصفیا
کسی کو نہ ہرگز یہ رتبہ ملا / یہ شبیر[ع] کو رتبہ حق نے دیا
یہ درجات عالی ہیں کس کو نصیب / مگر یہ کہ حضرت ہیں حق کے حبیب

[ن] سرّ و علن ۔

ملی ان کو یہ دولت کائنات — یہی آب خنجر ہے آب حیات
حدوث و قدم کے یہ ہیں مہر و ماہ — شہیدوں میں یہ ہیں باعزاز و جاہ
مقام ہے یہ فخر و مباہات کا — ہوا ختم حضرت پہ نعمات کا
رہے جس سے محروم ابن خلیل[ع] — اسی کے ہیں مظہر حسین قتیل
بفضل خداوند رب کریم — یہی تو ہیں معنیٔ ذبح عظیم
جدا ان کا تن سے جو ہوجائے سر — شفاعت کا ہو تاج بالائے سر
جو بخشش ہے امت کی مد نظر — شہادت پہ ان کے یہ ہے منحصر
مشیت میں حق کی یہ ہے اختفا — ظہور ہوگا اس کا جو وقت آئے گا
زبانی جو جبریل کے یہ سنا — تھے خاموش دل میں شۂ انبیا
جہنم کے طبقات دیکھے تمام — گنہگار لوگوں کے جو تھے مقام
نظر آئیں شکلیں عجیب و غریب — ملائک بھی دیکھے بشکل مہیب
ہوئے سیر ملکوت سے جو فراغ — مدینہ میں داخل ہوئے باغ باغ
جو بستر پہ آئے شہ انبیا — جو دیکھا اسی طرح وہ گرم تھا
جو تھا جوہر نور حضرت کا تن — ہوا واقعہ یہ بچشم زدن
گئے اور پھرے مثل مد نظر — تھی جنباں اسی طرح زنجیر در
ہو تعریف حضرت کی کس سے بیاں — ہے مداح جن کا خدائے جہاں
شریعت کا روشن کیا وہ چراغ — ہوا دین و اسلام سب باغ باغ
خدا نے وہ نازل کی ان پر کتاب — جو ہے آفرینش کی لب لباب
سخن مختصر یہ کہ اے سامعیں — زمانہ جو رحلت کا آیا قریں
وصیت کی حضرت نے یہ بالتمام — سنا کر کہا یہ بہر خاص و عام
ہو آگاہ اے فرقۂ مسلمیں — میرے بعد گمرہ نہ ہونا کہیں
تمسک کریں ان پہ اہل سبیل — ہیں دارین میں یہ ثقیل و جلیل
جو ہے ایک ناطق تو صامت دگر — رہ راست کے ہیں یہی راہ بر
کتاب خدا اور عزت مری — رکھیں یاد سب یہ وصیت مری

وصیت کا ہرگز نہ آیا خیال حقوق پیغمبر کیے پائمال
اگر حوض کوثر کا ہے اشتیاق نہ رکھ دل میں آل نبی سے نفاق
محبت دل سے ہو آل یسین کا کہ بھاری ہو پلہ تیرے دین کا
قیامت کا درپیش ہے مرحلہ شفیع امم کا بھی ہے سامنا
بہشتی ہیں وہ صاحبان قبول جو پکڑے ہیں دامان آل رسول
بآل نبی ذوی الاحترام ہزاراں درود و ہزاراں سلام
ہیں اصحاب حضرت کے جو باصفا مہاجر و انصار دین خدا
خدا و پیمبر کے وہ ہیں مطیع مراتب ہیں عقبی میں ان کے رفیع
خدا سے ہے یہ التجائے سہیل نہیں اور کچھ مدعائے سہیل
طمع سے مرے دل کو کر پاک و صاف گنہگار کی ہوں خطائیں معاف
عبث دل کو ہے جستجوئے وفا نہیں باغ دنیا میں بوئے وفا
محبت تو اپنی عطا کر مجھے ہو دنیائے دوں سے تنفر مجھے
رہے دل میں تیری محبت کا داغ لحد میں بھی روشن یہی ہو چراغ
تمنا ہو ہر چیز کی دل سے دور بہت بےوفا ہے یہ دار غرور
تصدق کریمی کا رب کریم تصدق رحیمی کا رب رحیم
ہو لطف و کرم تیرا سایہ‌فگن دفع ہو مرے دل کا رنج و محن
جوانی کا آتا ہے جس دم خیال تو ہوتا ہے بس دل میں جوش وملال
گئی عمر مانند آب رواں ہوا باغ تن پائمال خزاں
کہاں وہ طبیعت کا جوش و خروش قریب ہے کہ ہو شمع ہستی خموش
ہوا سر سے کافور پیری عیاں مگر رہ گیا میں پس کارواں
ہیں مفقود و معدوم جو ہمنفس دل زار نالاں ہے مثل جرس
جو دیکھا تھا وہ سب ہے خواب و خیال گزشتہ کا بے سود رنج و ملال
سرائے جہاں ہے بمثل دو در دو روزہ مسافر ہے یہاں رہ گزر
سفر دور کا اور رہ پُر خطر درندان وحشی ادھر اور ادھر

اگر پاس تیرے ھے جنس دغل — خریدار ھے کون اے بد عمل
اگر پند ناصح ھو نقش ضمیر — تو ھو حال دنیا سے عبرت پذیر
ھوئی گردش چرخ جو ھمعناں — تو امکان میں ھم ھوئے لامکاں
بہت دیکھے دور سنین و شہور — گئے ملک در ملک ھم دور دور
تر و تازہ عہد نموئے شباب — تصور میں ھے مثل رویائے خواب
زمانہ کے دیکھے فراز و نشیب — یہاں تک کہ اب آ گیا وقت شیب
ھوا گرم بازار بغض و نفاق — مروج نہیں دھر میں اتفاق
کدورت کے ایسے چڑھے ھیں غلاف — نہیں کوئی آئینۂ پاک و صاف
زمانہ کا دیکھا جو یہ انقلاب — کیا میں نے تنہائی کو انتخاب
مجھے کوچہ گردی سے رغبت نہیں — کہیں آمد و رفت و صحبت نہیں
موافق کسی سے نہیں ھے جو دل — اقامت کہیں کی نہیں مستقل
نہیں ھے کوئی اب ھمارا وطن — مگر دور گردوں ھے اپنا وطن
بسیط و وسیع ھے جہاں اس قدر — تماشے میں جس کے ھے قاصر نظر
پھریں شش جہت عمر ھوئے تمام — مگر سیر دنیا رھے ناتمام
نہ بازئ چوسر نہ شطرنج ھے — فریبندہ اس کا شش و پنج ھے
یہ لڑکوں کے ھیں کھیل سب مہملات — ھیں نزد خردمند سب لغویات
کوئی علم سے بڑھ کے دولت نہیں — کسی فن میں یہ جاہ و عزت نہیں
ھوا ھوں جو سب سے کنارہ گزیں — تو علم سخن ھے میرا ھمنشیں
ھوا جب سے میرا کہ سن تمیز — کتابوں کی ھے سیر دل کو عزیز
یہی باغ دنیا میں ھے بے خزاں — کروں اس کی تعریف کیا میں بیاں
تر و تازہ مانند باغ بہشت — ھر اک حرف و ھر لفظ عنبر سرشت
فرح بخش روح اور دل کا سرور — غم و رنج ھو منتشر دور دور
جسے علم حاصل ھے جاھل نہیں — جو جاھل ھے وہ مرد کامل نہیں
رہ راست کا ھے یہی راھبر — نہیں علم جس کو وہ ھے بے خبر

کسی چیز سے شوق اپنا نہیں — کوئی اور غمخوار میرا نہیں
کتابیں ھیں اپنی جلیس و ندیم — یہ اک باغ ھے مثل باغ نعیم
ہنر اور کوئی اس سے بڑھ کر نہیں — کوئی علم سے بڑھ کے جوھر نہیں
شب و روز کا ھے جو یہ مشغلہ — تو نظم سخن کا بھی ھے حوصلہ
سلاطین گزرے ھیں جو بہمنی — ھے تقویم پارینہ یہ اے غنی
ھے تاریخ مطبوع جو اک امجدی — وہ ھے نثر میں اور ھے فارسی
کیا نظم اردو میں اس کو تمام — کہ ھوں مستفیض اس سے سب خاص و عام

بیان سلطنت و حکومت سلاطین بہمنی

حسن بہمنی جو ھوئے بادشاہ — تو گلبرگہ ان کا ھوا تخت گاہ
تواریخ میں اس طرح ھے لکھا — حسن کی تھی یہ حالت ابتدا
برھمن تھا دھلی میں قانون گوئی — منجم بھی تھا اور قانون گوئی
مگر عہد وہ شاہ تغلق کا تھا — برھمن ملازم تھا شہزادہ کا
ملازم تھا اس بہمنی کا حسن — پریشان گرفتار رنج و محن
حسن نے برھمن سے اک دن کہا — جو ھو کوئی خدمت تو لاؤں بجا
برھمن نے جس دم یہ اس سے سنا — تو اک جفت نرگاؤ اس کو دیا
دو مزدور بھر تردد دیے — مطیع حسن وہ ھمہ‌تن ھوئے
تردد کے قابل زمیں کی عطا — زراعت کرے تاکہ وہ بےنوا
حسن نے بھی کی جانفشانی کمال — بہ امر زراعت کیا اشتغال
مہہ و سال گزرے یوں ھی بیش‌تر — گئی شام غم آئی صبح ظفر
نہیں اس کی بخشش کی کوئی جو حد — مددگار سب کا وھی ھے صمد
ھوا ایک دن یہ عجب ماجرا — اسی کھیت میں قلبہ خود رک گیا
جو مزدور تھے قلبہ ران زمیں — حسن سے کیا جا کے یہ دل نشیں
حسن پر جو یہ حال ظاھر ھوا — پئے حفر موضع اشارہ کیا
جو اس موضع کو قدرے کندہ کیا — تھا زنجیر میں قلبہ الجھا ھوا

تفحص جو اس میں زیادہ کیا　　تو زنجیر میں ظرف بستہ ملا
وہ سب ظرف تھا اشرفی سے بھرا　　مگر سب طلا غیرمسکوک تھا
حسن کی ذرا دیکھو خوش نیتی　　تھی اقبال مندی کی خوش طینتی
نصیبہ جو اس کا ہوا جلوہ گر　　ترقی کی جانب ہوا راہبر
لپیٹ اس کو چادر میں در وقت شب　　برہمن کو جا کے دیا اس نے سب
جو تھا نیک نیت بوجہ حسن　　حقیقت کہی اس سے نشر و علن ن
دیانت حسن کی ہوئی دل نشیں　　کہا آفریں بلکہ صد آفریں
برہمن بہت اس سے تھا شادماں　　کیا شاہزادہ سے جاکر بیاں
علو ہمتی کی دلالت ہوئی　　تعجب ہوا اور حیرت ہوئی
وسائی کا پیدا ہوا یہ سبب　　حسن کو کیا ابن شہ نے طلب
ملاقات سے اس کی وہ خوش ہوا　　تو شاہ محمد سے قصہ کہا
ہوئی شاہ تغلق کو جو آگہی　　توجہ حسن پر ہوئی شہ کو بھی
ہوئے لطف شاہی سے مانند خاص　　بسلک امیراں دیا اختصاص
برہمن نے اک دن حسن سے کہا　　تیرے زائچہ سے یہ ظاہر ہوا
ہو درجات عالی یہ تجھ کو صعود　　سعادت ہے تیری جبیں سے نمود
بفضل الٰہی ہے تو خوش نصیب　　تیرا طالع چمکے گا اب عنقریب
مرے ساتھ یہ عہد و میثاق کر　　ترقی یہ ہو جب کہ تو جلوہ گر
مرا نام ہو جزو اسم کرام　　تیرے ساتھ روشن ہو میرا بھی نام
حسن نے یہ کی بات دل سے قبول　　فقط ذکر تھا تھی نہ ثروت حصول
مسبب کے ہوتے ہیں ایسے سبب　　عقیل اس میں حیران ہوتے ہیں سب
جو ہے نوع بنوع دور چرخ کہن　　گئے شاہ تغلق بہ سمت دکن
گزر جو ہوا جانب دیوگیر　　پسند آیا شہ کو بہت دیوگیر
یہ حصن حصین ہے بہت استوار　　تراشندۂ سنگ ہے یہ حصار

ن سرّ و علن -

رفیع و متین اور جائے لطیف
پسندیدہ آب و ہوائے لطیف

ہوا شاہ تغلق کے مافی الضمیر
بنے بارگاہ ہو خلافت مصیر

یہ نافذ ہوا سب پہ فرمان شاہ
دکن کو ہوں دہلی سے سب روبراہ

امیر و وزیر اور صغیر و کبیر
جز و کل ہوں سب ساکن دیوگیر

کریں ترک وہاں کی سکونت قدیم
سبھی دولت‌آباد میں ہوں مقیم

رکھا دولت‌آباد بھی اس کا نام
عمارت بنی گرد قلعہ تمام

کھدی خندق قلعۂ دیوگیر
ہوا حکم شہ سے خلافت مصیر

ایلورہ کے اطراف بنوائے باغ
ہوئے لالہ و گل کے روشن چراغ

کھدیں نہریں بھی اور حوض بزرگ
کہ آباد ہو یہ بطرز سترگ

ازاں جملہ نافذ تھا یہ حکم شاہ
سرائیں ہوں تعمیر مابین راہ

سڑک پر شجر بھی یمین و یسار
دکن تک ہوں دہلی سے سب سایہ دار

بآسودگی تاکہ خلقت تمام
کرے آمد و رفت میں اہتمام

جو محتاج ہو اور نہ ہو زاد راہ
مصارف ملے اس کو از گنج شاہ

تغیر تبدل ہوا جو جدید
تو صورت ہوئی تفرقہ کی پدید

ہما اڑ گیا دولت‌آباد سے
ہوا کونچ شہ دولت‌آباد سے

ہوا سمت معبر جو شاہ کا گزر
تو تشدید و تہدید کی بیشتر

طلب جو ہوا تھا خراج گراں
تو عمال و زراع نے دی اپنی جاں

محصل مقرر کیے تیز و تند
رعایا کو پہنچا نہایت گزند

ہوا تھا جو یہ حکم کشورستاں
گئے سمت دہلی کو خواجہ جہاں

مگر شاہ تغلق ز راہ تلنگ
گئے سمت معبر کو خود بے‌درنگ

موافق نہ تھی وہاں کی آب و ہوا
کیا قصد پھر دولت‌آباد کا

ہوا قصبۂ بیڑ میں جو ورود
ہوا درد دنداں یکایک نمود

بالآخر کو دنداں اک کر پڑا
اسے دفن کرنے کو گنبد بنا

پٹن میں جو پہنچے شہ تخت و تاج ن کئی دن رہے اس میں بھر علاج
جو گجرات میں پہنچا یہ بادشاہ شریروں کا فوراً ہوا بیخ و کاہ
جو تھے بانی شر و فتنہ فساد ہوئے یک‌قلم قتل وہ بد نہاد
ہر اک فتنۂ خفتہ بیدار تھا پئے کشت و خوں گرم بازار تھا
جو تھے مجد دیں اور دگر رکن دیں دیا حکم ان کو بصد خشم و کیں
ابھی جا کے ان کو کرو دستگیر جو کچھ دولت آباد میں ہیں شریر
پکڑ لاؤ ان سب کو پیش حضور سیاست سے ان کو کرو چور چور
ازیں بعد تھا پھر یہ حکم قہار ملک ہے علی جو سر جامدار
دگر ہے جو لاچین افاق گیر سر نام احمد ہے روشن ضمیر
جو خسرو ہیں اک شاعر نامور اعزا میں ان کے ہیں یہ مشتہر
سوئے خان قتلغ یہ افسر گئے یہ فرمان تہدید لے کر گئے
امیران سدہ کو فوراً ضرور روانہ کرو تم ہمارے حضور
معہ دو امیران عالی وقار ہزار اور دگر پانصد ہوں سوار
معہ رائے چور اور مدکل کے سب ہوئے دولت آباد میں یہ طلب
شدائد تھے سلطاں کے جو گوش زد سمجھتے تھے جانے میں وہ روز بد
تو لاچین بھی اور علی جامدار سوار ان کے ہمرہ تھے پندرہ ہزار
محصل کی صورت بجر ثقیل دیا بھنچ ان کو بہ طرز جمیل
سیاست سے تھے شاہ کی جو بتنگ ہوا تا بہ شش ماہ ان کو درنگ
جو لاچین نے سرزنش کی سوا تو ہر دل پہ تھا ایک نشتر لگا
خلاصہ بجد و بجہد تمام جمع کر کے گلبرگہ میں بالتمام
روانہ کیا دولت آباد میں یہ حاضر ہوئے دولت آباد میں
ہو ماقبل الملک کے لفظ عین یہ تھے دھاراکرڑ میں بصد زیب و زین
سوئے بادشاہ جو روانہ کیا تو اثنائے رہ میں یہ سب نے کہا

ن رہے چند روز اس میں بھر علاج ۔

بجز قتل کے اور نہیں ہے سبب — اسی وجہ ہم کو کیا ہے طلب
سزاوار و انسب یہ سمجھے ہیں ہم — نہ ہوں ہم گرفتار ظلم و ستم
کریں آپ کو ہم جو اس کے سپرد — تو قصاب کی ہم پہ ہو دست و برد
مناسب یہی ہے کہ جائیں نہ ہم — خلافت کا ہم خود اٹھائیں علم
یہ جب باہمی اتفاق ہوگیا — تو لاچین کو پہلے کشتہ کیا
جو خود سر ہوئے پھر جنگ و جدال — لیا لوٹ سب اس کا اسباب و مال
ہوا حادثہ جب کہ یہ آشکار — گریزاں ہوا خود علی جامدار
گئے دولت‌آباد با کر و فر — ہوئے عالم الملک پر حملہ ور
قلعہ پر تصرف جو ان کا ہوا — فقط عالم الملک اک بچ گیا
رضامند اس سے تھے یہ بے گماں — اسی وجہ سے اس نے پائی اماں
ملقب بسرتیز داماد شاہ — جو تھا ایک سردار فوج و سپاہ
وہ تھا حاکم خاندیس و برار — ایلچپور میں رکھتا تھا وہ قرار
خلاف اس نے دیکھی جو اپنی سپاہ — ایلچپور سے وہ ہوا رو براہ
جماعت وہ تھوڑی سی لے کر اقل — بتعجیل وہاں سے ہوا رہ کسل
کیا اس نے حیلہ بعزم شکار — گیا وہ مگر جانب ندربار
ہوا با خبر جو رئیس برار — کہ داماد سلطاں ہوا ہے فرار
کیا تھا جو کچھ چھوڑ مال و متاع — طرف اپنے اس کو کیا انتزاع
گئے دولت‌آباد پھر مصاف — ملے ان سے جو کہ تھے شہ کے خلاف
جو میثاق الفت موکد ہوا — تو اخلاص مابین بے حد ہوا
جماعت جو تھی اک درون حصار — ہوا اتحاد ان سے بھی استوار
جو تھا عالم الملک مثل وزیر — سپہ نے کیا اس کو مل کر اسیر
قلعہ گنج و اسباب تجمل جو تھا — مسلم بدست مخالف ہوا
نہ گزری تھی سہ مہ سے مدت زیاد — گئی شاہ تغلق کی ہستی بباد
رعایا پہ کیں سختیاں اس قدر — کہ پیدا ہوا ملک میں شوروشر

اطاعت سے شہ کے ہوے منحرف
جو شہ اک طرف تو سپاہ اک طرف

مدبر خردمند جو تھے امیر
وہ باہم ہوئے اس طرح سے مشیر

جو ہم میں سے ہو لائق عز و جاہ
مناسب ہے اس کو کریں بادشاہ

جو لائق ہو اس تاج و دیہیم کا
وہ حاکم ہو اس جملہ اقلیم کا

مطیع اس کے ہوں سب صغیر و کبیر
ریاست سے ہو ملک رونق پذیر

کوئی منتخب ہو جو ہم میں سے شاہ
ہو فرماں پذیر اس کی جملہ سپاہ

سمعیل اک فتح افغان تھا
امیروں میں باعزت و شان تھا

پس از مشورہ کے یہ پایا قرار
کہ اسمعیل کو کر لیا اختیار

تھا منصب میں یہ دوہزاری امیر
بنایا اسے سب نے صاحب سریر

جو یہ شاہ با جاہ و تمکیں ہوا
مخاطب یہ تب ناصرالدین ہوا

ہوا چتر بھی سر پہ سایہ فگن
ہوا ناصرالدین شاہ دکن

مناصب سے جملہ ہوئے کامیاب
ہر اک نے جداگانہ پایا خطاب

ستارہ حسن کا جو تھا با شرف
خطاب ظفر خاں سے پایا شرف

باقطاع مکری و رای و باغ
حکومت ملی ان کو با صد فراغ

دگر کلھر و مرج و گلبرگہ خاص
ظفر خاں کو اس سے ملا اختصاص

تھے گجرات میں شاہ تغلق مقیم
سنی یہ خبر جو عجیب و عظیم

شتابی سے اٹھے بصد اضطرار
چلے دولت آباد کو ایلغار

ملقب بہ سرتیز داماد شاہ
ملا یہ بھی تغلق سے ذی دستگاہ

مخاطب ملک کل افغان ستیز
جو تھا سور میدان رزم و ستیز

معہ لشکر مالوہ سی ہزار
مددگار شہ تھا پئے کارزار

جو تھا ناصرالدین میان حصار
نکل آیا وہ بھی پئے گیرودار

یہ ہے فوج جنگی کا اس کے شمار
معہ راجپوت و مغل سی ہزار

نمک خوار شہ سے ہوئے برخلاف
ہوا گرم میدان رزم و مصاف

جو تھا میمنہ و میسرۂ بادشاہ
قریب الوقوع تھا کہ ہوئے تباہ

یہ تھی چیرہ دستیٔ فوج شریر — ہو مغرور یا شاہ ہو دستگیر
تھی حق اور باطل میں جنگ و جدال — بالآخر کو اس کا ہوا یہ مآل
یہ کفران نعمت ہوئی جلوہ‌گر — ہوا قتل اک افسر نامور
مخاطب تھا وہ خاں جہاں با شکوہ — جو فوج مخالف میں تھا سرگروہ
جمے تھے قدم جو بدشت ستیز — اٹھے اور لی سب نے راہ گریز
عجب ترس و بیم ان پہ غالب ہوا — نشان علم‌دار بھی گر پڑا
ہوا رایت جنگ جو سرنگوں — سپاہ اس کو سمجھی شگون زبوں
رہے رزم سے باز وہ سب کے سب — دن آخر تھا جو آ گیا وقت شب
ستادہ ہوئے خیمہ طرفین کے — جواں تھے جو زخمی فریقین کے
پئے زخم دوزی ہوئے جاں تبار — ہر ایک اپنے بستر پہ تھا ہوشیار
تھے موجود سب افسران دکن — معہ ناصرالدین و کانکو حسن
پس از مشورہ کے یہ پایا قرار — مناسب نہیں جنگ اب زینہار
کہا ناصرالدین شہ سے کہ ہاں — رہو جاکے تم قلعہ کے درمیاں
جماعت ہو اک مردم ہوشیار — ہو حافظ درون و برون حصار
ظفر خاں کی جانب ہوا یہ خطاب — روانہ ہو گلبرگہ کو تم شتاب
سپہ ان کی ہمرہ کی بارہ ہزار — گئے اور ہوئے وہ مقیم حصار
دگر اور سردار نامی امیر — باقطاع خود سب ہوئے راہ‌گیر
تعہد ہوا یہ بھی باہمدگر — ممد و معاون رہیں ہمدگر
جو میثاق مذکور محکم ہوا — ہر اک اپنے مرکز کا عازم ہوا
جو سرتیز داماد تغلق کا تھا — تعاقب ظفر خاں کا اس نے کیا
ہے بیدر میں جو اک حصن حصین — ہوا اس میں سرتیز جاکر مکین
حسن با امیران ملک برار — تھے اسوار جس میں کہ عشرین ہزار
بڑھا سوئے بیدر برزم و ستیز — چلا وہ بھی با صولت تیغ تیز
غرض دور خندق جو کندہ کیا — تو تا بست روزہ توقف ہوا

لڑائی کی جرأت نہ دونوں میں تھی — تلنگان سے فوج جو آ گئی
تھا راجہ جو ملک تلنگان کا — اسے بغض تھا دل میں سلطان کا
یہ کولاس سے اس نے بھیجی مدد — کہ پندرہ ہزار آئے تا شد و مد
تھے میثاق مابین جو دل نشیں — ہوا ناصرالدین حسن کا معیں
گئے دولت آباد سے جو سوار — لکھا ہے وہ مجموع تھے پنج ہزار
مقابل میں دونوں کی فوجیں بڑھیں — جواں مردوں کی خوب تیغیں چلیں
تھے کشتوں کے پشتے بروئے زمیں — پر از خون تھا جملہ روئے زمیں
بہت سخت اس دن ہوئی کارزار — چلے دونوں جانب سے تیغوں کے وار
ہوئے قتل و مجروح ہزاران ہزار — زمیں ہوگئی تختۂ لالہ زار
مخاطب بہ سرتیز اور ترکماں — ہوا سرنگوں جنگ کے درمیاں
جو سرتیز پر وار خنجر ہوا — اسی معرکہ میں وہ بے سر ہوا
ظفر خاں جو اس پر مظفر ہوا — پرا جنگ کا اس کے ابتر ہوا
ہوئی فوج دشمن کی سب منہزم — حسن کا بصد جاہ چمکا علم
جو سرتیز پر یہ ہوا فتحیاب — تو سامان شاہی ہوا دستیاب
کیا دولت آباد باں شد و مد — کرے تاکہ پھر ناصرالدین کی مدد
تھے سلطان تغلق جو اک کینہ جو — تھے گھیرے ہوئے دولت آباد کو
سوار اور پیادہ تھے بارہ ہزار — پیاپے تھے حملہ بروئے حصار
سنی قتل سرتیز کی جو خبر — تو بےدل ہوئی فوج و دل سرد تر
گرا جب کہ یہ سلطنت کا عماد — پڑا تفرقہ اور حد سے زیاد
دگرگوں ہوا رنگ جو آشکار — تو شہ اپنا مصلح نہ سمجھا قرار
غم و رنج دل کو ہوا بیکراں — ہوئے سمت گجرات یہاں سے رواں
رہی تا بسہ ماہ جنگ دو سر — قلعہ کی مہم پر نہ ہوتی تھی سر
ن جو مسموع ہوا حال گجرات کا — خیال آیا دفع فسادات کا

ن فسادات گجرات کر استماع — کیا رائت جنگ وہاں ارتفاع

تھے گجرات پر شاہ وہاں حملہ‌ور یکایک دکن سے یہ پہنچی خبر
حسن کانکو کو کیا بادشاہ مخاطب علاءالدین با عز و جاہ
یہ تھا قصد سلطان با حوصلہ پس از طے طغیانئ سومرہ
علاءالدین پہ کھیچوں کا تیغ مہیب مگر سوگئے شاہ کے خود نصیب

بیان سبب انتقال تغلق شاہ

گئے سمت ٹھٹھہ کو جو سی گروہ وہ تھا روز عاشورہ اے با شکوہ
غرض شاہ تغلق نے رکھا تھا صوم تو ماھی تازہ سے کھولا تھا صوم
حرارت ھوئی اس سے پیدا شدید تھی سابق سے تپ ھوگئی اب مزید
دم مرگ ھوتی ھے حالت عجیب ھیں اس جا پہ عاجز حکیم و طبیب
خدا کی مشیت جو ھو چارہ گر علاج و دوا کا ھو پیدا اثر
تھی میعاد جو وقت موعود کی اطاعت اجل نے کی معبود کی
محرم کی تاریخ تھی بست و یک سنہ ھفتصد اور چون تھے بے ریب و شک
گئے سند کے بحر کے جو قریں تو طے ھوگئی منزل واپسیں

رفتن حسن خان بہمنی بجانب دولت‌آباد برائے ملاقات ناصرالدین

حسن دولت‌آباد با کر و فر جو آئے تو ناصر کو پہنچی خبر
بڑھا پیشوائی کو تا شش کروہ بغل‌گیر دونوں ھوئے باشکوہ
حسن کو جو دیکھا بہ‌جاہ و جلال دیا چھوڑ خود سلطنت کا خیال
خدا نے جو بخشا اسے اختصاص رجوع ھوگئے اس سے کل عام و خاص
امیروں سے ناصر کا یہ تھا خطاب حسن سلطنت پر رھے کامیاب
سن و سال میری ھے وقت لعب نہیں آرزو ملک داری ن کی اب
جو پوچھا کسی نے کہا اس سے صاف ھوں معذور اس سے امر ھوں معاف
حسن کانکو ھے جو بہمن نژاد سزاوار شاھی ھے عالی نہاد
سعادت سے روشن ھے اس کی جبیں وہ ھے لائق تاج و تخت و نگیں

ن ملک گیری

سنیے ناصرالدین جو یہ کلام — ہوا یہ پسندیدۂ خاص و عام

جلوس میمنت مانوس حسن کانگوی بہمنی در شہر گلبرگہ بتاریخ ۲۴ ربیع‌الثانی

بنام حسن خسروی شد تمام — جہاں زیر فرمان شد و گشت رام
بر اورنگ شاہی بر آمد پگاہ — برآورد بر سر کیانی کلاہ
بشمشیر فرماروائے گرفت — بداد و دہش بادشاہی گرفت
جہاں را ازو شد عمارت پدید — بہر مملکت نام نیکش رسید
ہماں شہر گلبرگہ شد تختگاہ — عمارت برآورد بر اوج ماہ
بنام حسن شہر چوں شد تمام — نہادند زان حسن آباد نام
محمد منجم و صدرالشریف — بدخشی سمرقندی دونوں ظریف
تھے ارکان دولت میں بس ہوشمند — علوم ریاضی سے بس بہرہ‌مند
جو ہندی منجم تھے زنار دار — تھے علم کہانت میں وہ ہوشیار
ہوئی ساعت جلسہ میں قیل و قال — یہی بحث تھی اور جواب و سوال
نجومی ہندی تھے بیحد و مر — عمل کر لیا کثرت قول پر
جو ہے مسجد قطب دیں بادشاہ — گئے جمعہ کو اس میں وقت پگاہ
ربیع دوم کی تھی چوبیسویں — سنہ سات سو آٹھ تھے شک نہیں
حسن سلطنت پر ہوئے جلوہ گر — رکھا تاج شاہی کو بالائے سر
ہے عباسیوں کا جو چتر سیاہ — ہوا سایہ افگن وہ بالائے شاہ
علاءالدین حسن بہمنی ہے خطاب — سہا کو خدا نے کیا آفتاب
حسن اور برہمن ہوئے ہمقریں — یہ دو اسم ہیں جزو نقش نگیں
حسن کانگو بہمنی ہے لقب — ہوا وجہ تسمیہ کا یہ سبب
حسن‌آباد اس وجہ رکھا تھا نام — کہ گلبرگہ میں تھا قرار و قیام
سعید و مبارک تھی یہ جائگاہ — لہذا اسی کو کیا تخت گاہ
لکھوں وہ بھی ہے جو کہ قول دگر — مورخ یہ لکھتے ہیں اے خوش سیر
عجم کے جو مشہور ہیں تاجدار — کہ بہمن تھا ایک اور اسفندیار

ملقب ہوا بہمنی جو حسن ۔۔۔ یہ تھا نسل بہمن میں بےریب و ظن
تھا عالی نسب اور عالی نہاد ۔۔۔ حسن نام تھا اور کیانی نژاد
ہوا جب کہ یہ شاہ با عز و جاہ ۔۔۔ کیا اس نے گلبرگہ کو تخت گاہ

طلب نمودن بادشاہ محمد منجم و صدرالشریف را بعد از جلوس

محمد منجم و صدرالشریف ۔۔۔ تھے علم ریاضی میں جو بس شریف
بکرّات و مرّات کہتے بہم ۔۔۔ بہ تصدیق و تحقیق کہتے ہیں ہم
اگر شہ کا اس وقت ہوتا جلوس ۔۔۔ پئے سلطنت تھا وہ اچھا جلوس
وہ ساعت اگر کرتے شہ اختیار ۔۔۔ تو یہ سلطنت رہتی بس پائدار
گئی بادشاہ تک جو اس کی خبر ۔۔۔ تردد تحیر ہوا بیشتر
توہم ہوا دل میں شہ کے ضرور ۔۔۔ ہے شاید مری سلطنت میں فتور
تھے فاضل جو دونوں بعلم و ادب ۔۔۔ کیا وقت خلوت میں ان کو طلب
سبب شاہ نے پوچھا افسوس کا ۔۔۔ قسم کھا کے دونوں نے تب یہ کہا
جو سمجھے ہیں آپ اس سے ہوں بیخطر ۔۔۔ تأسف کا باعث ہے امر دگر
جو سلطاں نے پوچھا کہ وہ ہے کدام ۔۔۔ کیا عرض اے شاہ عالی مقام
ہر اک وقت و ساعت ہے تاثیر بخت ۔۔۔ مبارک ہو یہ آپ کو تاج و تخت
یہ کہتے ہیں علم ریاضی سے ہم ۔۔۔ کہ عشرین عدد سے سلاطیں ہوں کم
وہ ساعت کہ ہم کرتے تھے اختیار ۔۔۔ قبول اس کو کرلیتے گر شہریار
تو یکصد و پنجہ عدد ہوتے شاہ ۔۔۔ تو قائم بہت رہتی یہ بارگا
یہاں تک ریاست کو ہوتا قیام ۔۔۔ کہ تا ہفت صد سال رہتا قیام
باولاد و احفاد این دودماں ۔۔۔ اسی تخت پر ہوتے سب حکمراں
سنا شاہ نے جو یہ حسن کلام ۔۔۔ ہوا مطمئن اور بصد احترام
صدارت سے اک کو کیا سرفراز ۔۔۔ دوم کو دیا منصب امتیاز
ہے تاریخ فرشتہ جو اک معتبر ۔۔۔ بتصریح لکھتے ہیں وہ ذی ہنر
کہ بعد از صد و ہفت ہفتاد سال ۔۔۔ ہوا دولت بہمنی کو زوال

سلاطیں ہوئے تھے عشریں نفر گئی سلطنت ہاتھ سے جو گزر
بہ تحقیق تھا ان کو علم نجوم بتصدیق تھے عالمان علوم
ہوا خان صفدر بہ الطاف شاہ مفخر ہوے وہ باعزاز و جاہ
دیا خان مذکور کو اختیار ہو مامور مشمول ملک برار

سوار شدہ رفتن بادشاہ بجانب دھلی و باز مراجعت کردن بسبب تپ محرقہ

یہ لکھتے ہیں اسجا وقائع نگار حسن بہمنی شاہ عالی وقار
ہوئے مائل سیر ہندوستان چلے لے کے لشکر بصد عز و شان
تھے دھلی میں ان روزون فیروز شاہ طرف ان کے نہضت کی از تختگاہ
جو گلبرگہ سے پہنچے سلطان پور تو رائے ہرن[1] آیا پیش حضور
قدمبوس ہوکر کیا التماس موکل کی جانب سے با درد و یاس
یہ اول ہو فدوی پہ لطف و کرم کہ گجرات میں آئیں شہ کے قدم
یہ خطہ ہے میرے ہی اجداد کا نمونہ ہے یہ باغ شداد کا
گلستاں ہے کیا پرستان ہے کوئی حور ہے کوئی غلمان ہے
اگر حسن خلقت ہے یہاں کی سرشت تو آب و ہوا میں ہے مثل بہشت
یہ سرگشتۂ تیہ ادبار سخت کرم ہو تو ہوجائے بیدار بخت
ہو خدام شاہی میں میرا شمار توجہ کریں اس طرف شہریار
ازین بعد دھلی کو نہضت کریں غلام ہی کو مسرور حضرت کریں
مؤثر ہوا عرض اس بات کا کیا شاہ نے قصد گجرات کا
تھا نوساری قصبہ کا وہ مرحلہ ہوئی شاہ کو جو تپ محرقہ
ہوئی شدت مرض جس دم شروع تو کی سمت گلبرگہ شہ نے رجوع
مشائخ[2] وغیرہ ہوئے جو طلب وہ دربار شاہی میں حاضر تھے سب
جو کی توبہ شہ نے بحال نحیف تو شاہد ہوئے اس کے صدرالشریف

---

۱ رائے ہرن نام ایلچی راجہ گجرات ۔

۲ اطبا ۔

ازاں جملہ یہ حکم نافذ ہوا — جو ہیں قید میں ان کو کردو رہا
جو محبوس تھے بد وضع زشت خوی — بلاکر انھیں شاہ نے روبروی
بجرم عظیمہ تھے وہ پر خطا — عفو کرکے آزاد ان کو کیا
جو سات آدمی اور باقی رہے — وہ تھے مرتکب جرم سنگین کے
جو تھا دین و دنیا کے بالکل خلاف — رہائی میں ان کی کیا اعتکاف
محمد۱ سے لیکن کہا یہ سخن — ہے مختار تو اس میں اب بعد من
ہوا مرض سے حال جس دم سقیم — تھے موجود نامی طبیب و حکیم
لکھو قبل الدین نصیر و علیم — یہ تبریز و شیراز کے تھے حکیم
حکیمان ہندی کا بھی تھا علاج — نہ اصلاح پر آیا شہ کا مزاج
اثر تھا نہ کوئی دوا کا پدید — صحیح المزاجی ہوئی ناپدید
ہوا شاہ کے دل کو بالکل یقیں — ہے رحلت ہی اور ہے دم واپسیں
نہ صحت پہ آیا جو شہ کا مزاج — کیا ترک آخر کو سب کا علاج
قریب الوقوع آیا وقت سفر — غم و درد و حسرت تھے پیش نظر
تھا فرزند کوچک کا محمود نام — یہ پوچھا کہاں ہے وہ عالی مقام
دیا حاضریں نے جواب سوال — کہ مکتب میں پڑھتا ہے وہ نونہال
بشفقت کیا پاس اپنے طلب — قریب آیا جس دم وہ عالی نسب
یہ پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو میری جاں — کیا عرض پڑھتا ہوں میں بوستاں
یہ پرساں ہوئے شاہ عالی مقام — پڑھی آج تم نے حکایت کدام
کہا آج تو یہ ہے درس سبق — پڑھے شعر دو سہ الٹ کر ورق

اشعار بوستان

شنیدم کہ جمشید فرخ‌سرشت — بسر چشمۂ بر بسنگی نوشت
بدین چشمہ چون ما بسی دم زدند — برفتند چون چشم برہم زدند
گرفتند عالم بمردی و زور — و لیکن نبردند با خود بگور

۱ پسر حسن شاہ۔

سنی بادشاہ نے جو بیت سوئم
ہوا جوش گریہ بصد درد و غم
صدا ہائے ہائے کی تھی آشکار
رواں اشک تھے مثل ابر بہار
خزانہ میں تھا جس قدر روپیہ
کہ کل مبلغ و نقد و زر روپیہ
محمد[1] کو داؤد و محمود کو
دیا حکم تقسیم اس کو کرو
فواضل مشائخ تھے جو مستحق
کہ تھے مسجدی و پرستارحق
کی تعمیل فرمودۂ شاہ پر
دیا راہ مولا میں کل گنج و زر
سنا جب کہ تقسیم سب ہوگیا
تو الحمدللّٰہ زباں سے کہا
گئی روح فوراً بملک بقا
فقط جسم خاکی یہاں رہ گیا
ہوئے سات سو اور اڑسٹھ جو سال
علاء الدین کا ہوگیا انتقال
بجاہ و تجمل بصد تمکنت
دو ماہ یازدہ سال کی سلطنت
ہوئی زندگی شصت اور ہفت سال
حسن آباد میں دفن ہے خوش خصال

ذکر مزین شدن دیہیم و کاہ جہانبانی بوجود نونہال گلستان سلطنت و کامرانی محمد شاہ بن سلطان علاءالدین بہمنی در شہر گلبرگہ و بیان جلوس

لکھا ہے سوم روز بعد از حسن
محمد ہوئے زیب تخت دکن
سلاطین کا تھا جو داب قدیم
اسی رسم پر یہ رہے مستقیم
کیا تیسرے دن تغیر لباس
کہ تھا ماتمی وہ سراسر لباس
تھا گلبرگہ میں تخت فرماندھی
مزین تھا وہاں تخت فرماندھی
ہوا شاہ کا جب کہ اس پر جلوس
ہوئی زینت دھر مثل عروس
ہوا بذل و جود و کرم وافرہ
ہر اک کو دیا خلعت فاخرہ
درخشندہ تابندہ تھا چتر شاہ
مرصع بدر رشک خورشید و ماہ
لاٰلی جواہر سے آراستہ
ہوا از سر نو وہ پیراستہ
وہ چتر ہمایوں تھا مثل ہما
سر شہ پہ مخصوص ظل ہما
جو قبہ مزین بجوہر ہوا
چمک میں وہ مہر منور ہوا

[1] اسمائے پسران حسن شاہ بہمنی -

مرصع تھا یاقوت احمر سے سب   مزین تھا لعل و جواہر سے سب
بتصریح لکھتے ہیں اہل سیر   یہ مرسلۂ رائے بیجانگر
نہ یاقوت وہ تھا چراغ دکن   یہ آیا تھا تحفہ میں بہر حسن
کسی سے نہ تشخیص قیمت ہوئی   زباں سے نہ کہنے کی جرأت ہوئی
بالقاب گرامی ہوئے مخترع   حدود ممالک ہوئی مرتفع
جو ہے دولت آباد اک انتخاب   دیا مسند عالی اس کو خطاب
ہر اک سمت کو بخشا شہ نے وقار   ہوا مجلس عالی ملک برار
نواح تلنگ اور بیدر کو سب   ہمایون اعظم کا بخشا لقب
تھا گلبرگہ جو پایۂ امتیاز   وکالت کے منصب سے تھا سرفراز
ملک نائب اس کو دیا تھا خطاب   بتدریج سب کو کیا کامیاب
ممالک میں ہر سو یہ پایا قرار   ہیں سردار جو فوج کے ذی وقار
امیرامیراں ہو ان کا لقب   ہوا سب کو حاصل سرور و طرب
دگر یہ کہ ہر روز میں پنج بار   بجے نوبت کوس لیل و نہار
پڑی ضرب سکہ بہ قسم چہار   مگر مختلف وزن کا ہے شمار
بیک سمت نام خدا و رسول   معہ شرع دین فروع و اصول
دگر سمت کندہ ہوا شہ کا نام   کہ تاریخ و سن اس پہ تھا ارتسام
غل و غش سے سکہ تھا بالکل بری   طلا مثل کندن کے چاندی کھری
بہ تحریک رایان بیجانگر   گلاتے تھے صراف انھیں بیشتر
یہ تھا مطلب خاص اشرار کا   مروج رہے سکہ کفار کا
جو شاہ محمد کو پہنچی خبر   دیا حکم مانع بہ تاکیدتر
مکرر سنی ان کی یہ شاطری   کہ کرتے ہیں صراف یہ زرگری
جو سکہ کہ ہے اہل اسلام کا   مخالف ہے وہ اہل اصنام کا
کیا امرممنوع یہ جو ارتکاب   تو نافذ ہوا حکم تیر شہاب
ممالک میں فرمان جاری ہوا   فقط آب شمشیر جاری ہوا

ہر اک شہر و قریہ میں اور جابجا		جہاں دستیاب ہوں وہ اہل دغا
کرو ان کی ہستی کو بالکل خراب		پلاؤ انھیں تیغ براں کا آب
معین تھی تاریخ تو بےدریغ		چلی ان کے سر پر سیاست کی تیغ
سنہ ہفتصد اور ارسٹھ تھا سال		ہوا قوم صراف کا جو قتال
جو تھے مرتضی شاہ بحری نظام		ہوا عہد میں ان کے یہ انتظام
تھے خان صلابت جو ترک و قلی		وہ بانیء ٹکسال تھے اک ولی
بنام گرامیء اثنا عشر		وجوہ زر و سیم تھا جلوہ گر
دگر سمت کندہ تھا شاہ نظام		بصد زیب و زینت تھا یہ ارتسام
ایلچپور میں اور بملک برار		رواج اس کا چاہا تھا ہو آشکار
خباثت میں تھے جو کہ لب لباب		ہوا ان کے باعث سے یہ سد باب
تھیں ملکہ جہاں شاہ کی والدہ		پھریں بعد حج کے جو وہ طیبہ
مصارف پڑا آمد و رفت کا		یہ تصریح اس کی ہے اے باصفا
حساب اس میں لکھا ہے منوان کا		کہ سیم ہفتصد چار من تھا طلا
گئے ایلچی شاہ آفاق گیر		تلنگاں سے لین خراج کثیر
نہ تعویق اس میں کرے زینہار		دے نذرانۂ شاہ عالی وقار
تھا مشہور راجہ جو رائے تلنگ		ہوا اس طرح وہ مہیائے جنگ
پسر ناگدیو تھا ابن بزرگ		عقیل و فہیم اور نہایت سترگ
ورنگل سے کولاس تک بےشمار		سوار اور پیادے ہزاراں ہزار
چلا جنگ کو اس طرح ناگ‌دیو		کہ اٹھتا تھا چاروں طرف سے غریو
برائے تلنگ اور بیجانگر		جو تھا سلسلہ دوستی ہمدگر
مدد اس نے یہ اس کو دی آشکار		سوار اور پیادے تھے عشریں ہزار
یہ حاضر ہوئے ناگ‌دیو کے پاس		ہوئے سن کے برہم شہ حق شناس
دیا حکم فتح سمعیل کو		کہ اعظم ہمایوں کو بیدر سے لو
ایلچپور سے خان صفدر بڑھے		سواران جنگی کو لےکر بڑھے

رکھیں دوش پر تیغ خارا شگاف — کریں گرم میدان رزم و مصاف
تخالف نہ ہوئے کسی بات میں — کریں جانفشانی مہمات میں
کیا جب یہ فرمان عالی وقار — تو صفدر چلا لے کے فوج برار
بہادر جواں مرد و شمشیرزن — تہمتن دلاور ہر اک پیل‌تن
تھا خان صلابت جو ابن کلاں — اسے منتظم کر ہوا خود رواں
مسافت کا طے جو ہوا فاصلہ — ملا خان بہادر سے بےفاصلہ
بہادر بصد شوکت و دبدبہ — بڑھا لے کے لشکر بصد دبدبہ
فریقین جو ہوگئے دوبدو — ہوئی کینۂ جنگ سے تندخو
دلیران پولاد و خارے برار — دکھانے لگے حملۂ کارزار
شجاعان جوشن شگاف و دلیر — جھپٹتے تھے دشمن پہ مانند شیر
ایلچ‌پوریوں نے وہ کی رستمی — صف ناگدیو میں تھی برھمی
پر افواج کا اس کے ابتر ہوا — فرار آخرکار خودسر ہوا
بہادر جو تھا ایک نبرد آزما — گیا تا ورنکل نبرد آزما
تعاقب کیا جو پئے گیر و دار — فرار ہی کو اس نے کیا اختیار
جو راجہ وہاں کا تھا فرمانروا — بہادر نے ہون‌ن اس سے اک لک لیا
ازانجملہ پچیس زنجیر فیل — بہ ھیکل قوی و عریض و طویل
ھدایا نفیس اور لےکر تحف — پھرا سمت گلبرگہ کو ذی‌شرف
جو تھا عزم تسخیر ملک تلنگ — تھے شاہ محمد مہیائے جنگ
ھوا نام صفدر پہ فرماں صدور — معہ فوج حاضر ہو پیش حضور
یہ پہنچا جو صفدر کو فرمان شاہ — معہ فوج تھا حاضر بارگاہ
تھے شاہ محمد جو روشن ضمیر — تو تدبیر یہ کی بہ رائے منیر
دیا حکم گلبرگہ دے کر تمام — ملک نائب اس کا کریں انتظام
یہ تھے سیف دین اور غوری لقب — دیا ان کو تفویض میں ملک جب

ن زرھون -

تو کشورستانی کا کھولا علم　　گئے جلد کولاس میں باحشم
تھی ماہور و بیدر میں جنگی سپاہ　　تو کچھ احمدآباد میں تھی سپاہ
ہمایوں اعظم جو تھے اک امیر　　یہ گلکنڈہ کو سب ہوئے راہ گیر
ازانجملہ صفدر بھی تھے جاں نثار　　تھے ساتھ ان کے جملہ رئیس برار
ورنگل پہ ان کو مقرر کیا　　مہیا پئے جنگ لشکر کیا
تھا اقبال یاور جو صبح و مسا　　بہادر کو لےکر چلے بادشاہ
ہزیمت زدہ تھا جو رائے تلنگ　　نہ باقی رہا اس میں یارائے جنگ
ہے قول حکیماں جو الصلح خیر　　رکھا طاق پر اس نے سب رزم و بیر
پئے صلح آیا جو اس کا رسول　　کہا شہ نے اس شرط پر ہے قبول
ہمیں تین سو دے وہ زنجیر فیل　　کرے پیش‌کش یہ بطرز جمیل
دگر تیرہ لک ہون داخل کرے　　خراج دوامی یہ داخل کرے
کیا حسب فرمودہ اس نے عمل　　تو موقوف کی شہ نے جنگ و جدل
کیا کونچ وہاں سے ہوئے رو براہ　　تو بیدر میں داخل ہوئے بادشاہ
بعیش و بعشرت بناز و نعیم　　رہے تا بسہ ماہ اس میں مقیم
جو آئے تھے صفدر پئے کارزار　　دیا حکم جائیں بملک برار
ولایت جو ہے دولت‌آباد کی　　ہوئی کیفیت اس میں اضداد کی
گئے شاہ جو سمت بیجانگر　　ہوئے ہممناں حاکم مقتدر
ہوا دولت‌آباد میں شور و شر　　تھا بہرام خاں افسر نامور
حسن بہمنی تھے جو عالی منش　　وہ کرتے تھے اس کی بہت پرورش
جوان و شکیل و تنومند تھا　　انھیں کا یہ خواندۂ فرزند تھا
باغوائے قوم مرہٹہ بہم　　بغاوت کا اس نے اٹھایا علم
تو بعضے امیران ملک برار　　جو تھے اس علاقہ کے قرب و جوار
یہ ہمراز و دمساز تھے سربسر　　خصومت پہ ان سب نے باندھی کمر
کئی سال کا حاصل خالصہ　　یہ سب دھاراکرڑ میں تھا اندوختہ

تصرف میں لے آیا بہرام خاں　　جو باغی تھے ان کا ہوا ہم عناں
حوالی احمدنگر میں تھے شاہ　　ہوا یہ جو مسموع عالم پناہ
بتوبیخ و تنبیہ اس کو لکھا　　بغی مابدولت سے جو تو ہوا
کریں عفو پاداش تجھ سے نہیں　　جو توبہ کرے تو معہ تابعیں
دیا وہ نوشتہ بسید جلال　　گئے تا بہ بہرام وہ خوش خصال
جو تھا کوتیا دیو اک مرہٹہ　　لیا اس سے بہرام نے مشورہ
کہا اس نے سلطان ہے بس قہار　　نہ اب آپ کو تو سمجھ رستگار
ارادے سے اپنے تو پس پا نہ ہو　　وہ زن ہے کہ جو مرد ہیجا نہ ہو
سیاست سے سلطاں کی کریو گریز　　اگر حوصلہ ہے تو آ بھر رزم و ستیز
لیا دیوگڑھ کا جو ہم نے حصار　　تو بکلانہ سے تا بہ ملک برار
موافق بہت ہوں گے ہم سے امیر　　مناسب یہی ہے کریں داروگیر
فرستادہ فوراً ہوا تیزگام　　کہا شاہ سے جو سنا تھا کلام
چلے دولت آباد کو جب کہ شاہ　　مقابل میں آیا نہ وہ روسیاہ
ہوا حاضر خدمت زین دین　　وہ درویش قانع تھے گوشہ نشین
صلاح ان سے پوچھی جو درخوب وزشت　　رکھا پشت پر دست نیکو سرشت
کہا خیر ہے مت کرو خوف و بیم　　چلے جاؤ گجرات میں ہو مقیم
تعاقب میں اس کے گئے لشکری　　نہ ہاتھ آیا ان کے مگر وہ جری
ہوا رنجش شاہ کا یہ سبب　　دیا حکم سلطان نے ان کو یہ تب
مرے شہر سے زین دین ہوں بدر　　مصلا رکھا شیخ نے دوش پر
جو ہے روضۂ شیخ برہان دیں　　گئے اور ہوئے اس میں گوشہ نشیں
یہ گویا ہوئے حضرت زین دیں　　جو ہو مرد جنبش دے یہاں سے کہیں
ہوئے گوش زد شاہ کو یہ کلام　　پشیماں ہوئے شاہ عالی مقام
دیا مصرعہ لکھ کر بصدرالشریف　　بدرگاہ شیخ آئے صدرالشریف

من ز آن توام تو ز آن من باش

یہ گویا ہوئے حضرت زین دیں — کہ سلطان غازی شہ مسلمیں
ہو توفیق باری تمھیں راہبر — رہو تخت شاہی پر تم جلوہ‌گر
شریعت محمد کی جاری کرو — دفع شہر سے بادہ‌خواری کرو
ہر اک کوچۂ شہر میں ہے شراب — ہے میخانوں سے شہر سارا خراب
برانداختہ ہو ہر اک خمکدہ — کرو شہر سے برطرف میکدہ
خلاف شرع سے کرو اجتناب — کرو بادہ‌خواری کا تم سدّ باب
ہو قضات پر حکم شاہی صدور — بامر و نواہی نہ ہوئے قصور
رواسم کرو جاری مثل پدر — نہ ہو زین دیں سے کوئی دوست تر
جو سلطان غازی زباں سے کہا — مسرت ہوئی شہ کو بے انتہا
نصیحت ہوئی شیخ کی راہبر — کیا شہر سے میکدوں کو بدر
ایلچپور و گلبرگہ میں بے حساب — دکانیں تھیں بکتی تھی بے‌حد شراب
قلمرو سے اپنی کیا یوں بدر — نہ باقی رہا خم‌کدوں کا اثر
جو اصلاح پر شہ کا آیا مزاج — شریعت نے فی‌الجملہ پایا رواج

بیان قتل و قمع قطاع‌الطریقاں کہ در ممالک محروسہ رہزنی می نمودند

بہت دزد و مفسد تھے اور راہزن — وہ اک فوج تھی درمیان دکن
تھا غارت‌گری ان کا اکثر شعار — زیادہ تھے لیکن بملک برار
ہوئی ہمت شاہ جو منعطف — یہ نافذ ہوا حکم چاروں طرف
نہ باقی رہیں چور اور راہزن — علاقہ ہو سب پاک نشر و علن [ن]
بزرگ اور کوچک ہو جو دستگیر — کرو سر قلم تا ہوں عبرت پذیر
ہوا جب کہ جاری یہ حکم قہار — قلم ہو کے سر آئے تھے پنج ہزار
ہر اک سمت مجموع کا یہ ہے شمار — قطع ہو کے سر آئے عشریں ہزار
تھے گلبرگہ میں جمع وہ سر بسر — سروں کا تھا انبار پیش نظر
ہوئی سطوت شاہ آفاق‌گیر — جرامی ہوئے اس سے عبرت پذیر
ہوا انتظام شہ بحر و بر — نہ باقی رہا کوئی خوف و خطر

ن سرّ و علن۔

سنہ سات سو اور چھہتر ہوئے — جو شاہ محمد عدم کو گئے
رہے حکمراں تا بہ سبعہ عشر — تھے نُہ ماہ افزوں گئے جو گزر
خوشا بادشا ہے کہ چوں او گزشت — ازو باز ماندہ چنیں سرگزشت
در ایام دولت بود دوست کام — بہنگام رحلت بود نیک نام

کیفیت احوال فرخندہ مآل سلطان مجاہد شاہ ابن محمد شاہ بہمنی و کشتہ شدن او بوقت مراجعت از بیجاپور بدست داؤد خاں عم حقیقی خود

یہ سلطاں مجاہد کا لکھتے ہیں حال — تھی جب عمر شہزادہ انیس سال
جو تھے وارث و جانشین پدر — ہوئے تخت شاہی پہ یہ جلوہ گر
جو ہیں صاحب ملک و گنج و سپاہ — کمربستہ رہتے ہیں شام و پگاہ
کشن رائے والیء بیجانگر — مکدر تھے اس سے شہ بحر و بر
طلب فوج میں حکم صادر ہوا — تو گلبرگہ میں جملہ حاضر ہوا
چلے لے کے ہمراہ فوج عظیم — کبھی کونچ تھا اور کبھی تھے مقیم
کیا آپ تمہید رہ کو عبور — حصار ادھونی پہ پہنچے حضور
دکن میں ہے یہ بھی عدیم النظیر — ہوئی اس کی تسخیر مافی الضمیر
تھی صفدر کے ہمراہ سپاہ برار — تہور منش اور جلادت شعار
دیا حکم ان کو کہ تم گھیر لو — معہ فوج کے اس پہ حملہ کرو
جو اعظم ہمایوں ہوئے ہم عناں — عقب میں تھے صفدر وہ آگے رواں
کھنچا طول اس میں جو شش ماہ کا — کشن رائے جنگل کو راہی ہوا
وہ راہیں کہ مشکل تھا جس میں گزار — جبال رفیع اور بہت خارزار
مجاہد نے بھی ایسی باندھی کمر — تعاقب کیا اس کا پہنچا جدھر
درختوں سے تھا راہ کا انسداد — دگر یہ کہ آب و ہوا کا فساد
مجاہد نے بھی راہ لی اس طرف — پےء رزم پہنچے بہ شور و شغف
برادر جو تھا اک کشن رائے کا — وہ جرّار لشکر کو لے کر بڑھا
یہ لشکر کا اس کے کیا ہے شمار — تھے شش لک پیادے مگر جاں نثار

سواروں کی تعداد تھی ہشت ہزار
مقابل میں آئے پئے کارزار

کشن کا جو لشکر فراہم ہوا
تو لشکر میں داخل وہ اس دم ہوا

ہوئے حملے مردانہ باہم دگر
چلی تیغ و تیر و سنان و تبر

ہوئے قتل طرفین سے بےشمار
شہادت پہ فائز ہوئے جاں نثار

غرض خان صفدر کا تھا اک پسر
وہ خان مقرب سے تھا نامور

یہ تھا اک طرفدار ملک برار
پیا اس نے بھی شربت ناگوار

دگر اور اعیان و انصار شاہ
سوئے ملک عقبیٰ ہوئے روبہ‌راہ

مجاہد بھی تھے جو شریک جہاد
سعی اور کوشش کی حد سے زیاد

ہوئے حملہ اسلام کے اس قدر
مخالف کی سب فوج تھی منتشر

کہا شاہ نے یہ سخن مختصر
کچھ آساں نہیں فتح بیجانگر

یہ تھا راجہ و شہ میں قول و قرار
رعایا کو ہو قتل سے زینہار

جوان و مسن اور صغیر و کبیر
کیے فوج شہ نے یہ جملہ اسیر

مورخ نے ان کا کیا یہ شمار
تھے مجموع وہ جملہ ستر ہزار

کیا کونچ از شہر بیجانگر
ادھونی پہ آئے شہ بحر و بر

جو تھے خان صفدر بڑے نامور
حصار ادھونی پہ تھے حملہ‌ور

مقام اس میں شہ نے کیا ایک ماہ
تو مدکل کی جانب چلے بادشاہ

ہوئے واں جو مصروف بہر شکار
تو ہمراہ تھے چار سو جاں نثار

جماعت یہ مخصوص تھی ہمرکاب
سنیں نام بھی ان کے سب شیخ و شاب

تھے عموئے شہ ایک داؤد خاں
وہ خود فکر شاہی میں تھے ہرزماں

تھا صفدر جو اک مردم دوربیں
پئے حفظ رہتا تھا شہ کے قریں

مجاہد جو کم‌سن تھے اور خورد سال
تو انجام کا تھا نہ ان کو خیال

جو صفدر تھے اعظم تھے بس ہوشیار
کیا ان کو رخصت بملک برار

بناچاری شہ سے کنارا کیا
لیا راستہ اپنے اقطاع کا

تو سلطاں مجاہد معہ ہمرہاں
چلے تاکہ لشکر کے ہوں ہم‌عناں

ملے جب کہ لشکر سے عالم پناہ ہوئے سمت گلبرگه کو روبه‌راه
گئے نہر کشنه کے جو متصل پئے صید ماهی هوئے مشتغل
هوا درد سے چشم کے کچھ تعب ہوئے داخل خیمه آئی جو شب
تو داؤدخاں اور مسعودخاں هوئے متفق اور بعضے جواں
سراپردۂ شه کے بیٹھے قریں نگہبان جس طرح چوکی نشیں
گئی رات دو پاس جس دم گزر هوئے آدمی جا بجا منتشر
سوا نام‌بردوں کے کوئی نه تھا تو داؤد خیمه میں شه کے گیا
تھے خوابیده سلطاں به‌روئے پلنگ کیا حمله داؤد نے بےدرنگ
تھا خواجه سرا ایک حبشی غلام وه تھا بالش شاه میں بالتمام
جو داؤد کو دیکھا خنجر به‌کف تو نالاں هوا وه به‌شور و شغف
اٹھے خواب سے جو شه حق‌شناس پراگنده تھے۔ تھے نه جمع حواس
تو داؤد نے خنجر پر ستم به‌صد زور مارا به‌روئے شکم
شکم سے نکل آئے رودے بروں مجاهد کا رایت هوا سرنگوں
پڑی اس طرح کی وه ضرب شدید که اک وار میں تھے مجاهد شهید
نه تھا شاه مرحوم کا بھی پسر جو هوتا وهی تخت پر جلوه‌گر
هوئے جمله داؤدخاں کے مطیع مصاحب هوئے وه بجاه رفیع
تھا داؤدخاں وارث سلطنت مسلم هوئی اس په کل مملکت
جنازه بھی گلبرگه بھیجا گیا جو تھا دوست اس کا وه روتا گیا
رهے تین دن واں په داؤدخاں پھرے سمت گلبرگه کو بعد ازاں
تھی تاریخ ذی‌الحجه وه ساتویں انہتر سنه هفت صد بالیقیں
مجاهد کا جو یه هوا واقعه که سه سال بعد از هوا واقعه
اجل خانۂ تن بپرداختش پس از تخت بر تخته انداختش
زمانه نخستیں چنیں کار کرد جهاں کار زیں گونه بسیار کرد
یکے را ز زر بر سر افسر نهد یکے را بخاک سیاه در نهد

احوال جلوس داؤدشاہ بن سلطان علاءالدین حسن بہمنی بعد از قتل مجاہد شاہ

چچا تھے مجاہد کے داؤدخاں　　اسے قتل کرکے ہوئے شادماں
معہٗ کوکبہ فوج باعز و جاہ　　ہوئے رونق‌افروز دیہیم و گاہ
خبر یہ ہوئی چار سو انتشار　　فسادات اکثر ہوئے آشکار
ہوئے خان صفدر بھی دل میں حزیں　　تھے اعظم ہمایوں بھی گوشہ نشیں
وہ اس درجہ آزردہ خاطر ہوئے　　پئے تہنیت بھی نہ حاضر ہوئے
معہ فیل و اسپاں باعزاز و جاہ　　ہوئے دولت‌آباد کو رو بہ راہ
یہ داؤد شہ کو وہاں سے لکھا　　کہ خیل و حشم بس مرے ساتھ تھا
ولایت میں اپنی ہوا تیز گام　　مرے ساتھ تکلیف میں تھے تمام
مگر چشم ہے بر رہ انتظار　　طلب جب کہ فرمائیں گے شہریار
بہ تحصیل اعزاز و اکرام و جاہ　　قدم‌بوس ہوں‌گا بالطاف شاہ

بیان جلوس داؤد شاہ بہمنی

سر تخت فیروزہ داؤد شاہ　　ہوئے رونق افروز با عز و جاہ
سر نو پڑا سکہ داؤد کا　　پڑھا خطبہ میں نام داؤد کا
اطاعت میں ہر شخص کا سر جھکا　　ہر اک مرد درویش افسر جھکا
حضوری میں حاضر ہوئے کل امیر　　کہ تھا مالک تخت و تاج و سریر
مجاہد کی تھی روح پرور بہن　　برادر کا تھا اس کو رنج و محن
نہ دی تہنیت اور نہ تھی فرح‌ناک　　برادر کے غم میں وہ تھی دردناک
مقرب مجاہد کا تھا بانکہ نام　　سپاہی جواں مرد و ذی احترام
محرم کی تاریخ بست و یکم[1]　　مگر یوم جمعہ تھا نیکو شیم
جو داؤد مسجد کے اندر گئے　　صفیں جم گئیں لوگ سب بھر گئے
تھے اول کی صف میں جو داؤد شاہ　　عقب میں یہ بانکا بھی تھا کینہ خواہ
تھا داؤد شاہ کے جو یہ متصل　　نماز ہی میں پہلے رہا مشتغل

۱　سنہ سات سو اور ہشتاد تہ -

ملا وقت فرصت تو کھینچی حسام مجاھد کا اس نے لیا انتقام
بیک حربۂ و ضربت جاں‌گزا کیا قتل داؤد کو برملا
جو خاں‌محمد نے دیکھا یہ حال تو عم‌زادہ کا اپنے آیا خیال
جھپٹ کر یہ بانکہ یہ فوراً گرا کیا تیغ سے سر کو اس کے جدا
جدا ہوگئے جب‌کہ دونوں کے سر قضیہ جو تھا ہوگیا مختصر
یہ تھی حکمرانی داؤدشاہ فقط پانچ دن اور دگر ایک ماہ

ذکر سلطنت سلطان محمود شاہ بہمنی فرزند کوچک علاءالدین حسن بہمنی بر تخت موروثی تخت‌گاہ گلبرگہ بصد شوکت و دبدبہ

غرض روح پرور کا ایسا ھوا جو محمود کو تخت شاہی ملا
حسن بہمنی کے یہ چھوٹے خلف درخشاں ھوا مہر برج شرف
پس از قتل داؤد جاکا جو بخت ہوئے زیب و زینت دہ تاج و تخت
کم‌آزار و خوش‌خلق تھے اور سلیم شعار عدالت پہ تھے مستقیم
نہ تھا سلطنت میں کچھ ان کے فتور قوانین تھے غیر نقص و قصور
بہادر و صفدر جو حاضر ہوئے تو اعظم ھمایوں بھی حاضر ہوئے
بجا لائے سب تہنیت کے رسوم تھا دارالخلافہ میں سب کا ھجوم
یہ سلطان محمود شاہ دکن تھے قاری قرآں بہ وجہ حسن
نوشت اور تحریر میں خوشنویس پسندیدہ مطبوع و ہر دل انیس
علوم جز و کل سے تھے با خبر پئے نظم اشعار بھی بہرہ ور
ہوئی گرم جو شاہ کی انجمن عرب اور عجم کو تھا شوق دکن
ہوئے میر فضل‌اللہ انجو وزیر وزارت کی مسند پہ رونق‌پذیر
قصیدہ جو گزرانا در پیش‌گاہ ہوئے خوش نہایت خلافت پناہ
یہ داد و دھش کی جلی و خفی کہ دی جائزہ میں ہزار اشرفی
کھلا تھا جو دربار انعام کا بچھا ہر طرف خوان اکرام کا
ہنر پروری کی جو حد سے سوا سخاوت کا آوازہ ہر سو گیا

ہوا خواجہ حافظ کو شوق دکن　　ہے مشہور شیراز جن کا وطن
جو تھے میر فضل اللہ انجو وزیر　　گئے ان کی جانب سے خواجہ بشیر
جو کی میر نے اس میں بس جد و کد　　کیا پاس خاطر سے ان کے نہ رد
سفر ہند کا کرلیا اختیار　　یہاں تک کہ آپہنچے تا حدّ لار
جو مرموز میں آئے عالی وقار　　ہوئے کشتیٔ شہ پہ خواجہ سوار
روانہ نہ کشتی ہوئی تھی ادھر　　جو باد مخالف چلی بیشتر
ہوا بحر کو زور و شور اس قدر　　رہے باز خواجہ ز عزم سفر
بالآخر رجوع کی بہ‌سمت وطن　　کہ شیراز ہے بہترین چمن
جو آنے میں حافظ کے پہنچا خلل　　تو یہ میر انجو کو بھیجی غزل
دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بکوئے مے فروشانش بجامے بر نمی گیرند　　زہے سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
رقیبم سرزنشہا کرد کز ایں باب در بگذر　　چہ افتاد ایں سر مارا بخاک در نمی ارزد
بسے آساں نمود اول غم دریا ببوئے سود　　غلط کردم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو درج ست　　کلاہ دل کش ست اما بدرد سر نمی ارزد
ترا آں بہ کہ روئے خود ز مشتاقاں بپوشانی　　کہ سودائے جہانداری غم لشکر نمی ارزد
بشو ایں نقش دلتنگی کہ در بازار یکرنگی　　بہ نعمت ہائے گوناگوں مئے احمر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش وز دنیائے دوں بگذر　　کہ یک جو منت دوناں بصد من زر نمی ارزد
کیا میر نے یہ جو معروض حال　　یہ گویا ہوئے شاہ جود و نوال
کیا تھا جو خواجہ نے قصد حضور　　مراعات اس کی ہوئی بر ضرور
تھے محمود جو بحر جود و عطا　　تو اک الف دی اشرفی طلا
تھے ملا محمد جو اک مشہدی　　رقم بھر ارسال ان کو یہ دی
ہوا قحط جس دم دکن میں پدید　　وہ تھا عہد محمود شاہ سعید
تھے نرکاؤ سرکار میں دہ ہزار　　انھیں پر یہ آیا تھا غلہ کا بار
یہ جاتے تھے گجرات اور مالوہ　　طلب غلہ کرتا تھا با حوصلہ

یتیم و مساکیں کی لیتا خبر یہی فیض جاری تھا شام و سحر
مدرس ہر اک جا مقرر کیے
رجب کی تھی تاریخ بست و یکم تپ محرقہ کی تھی شدت اتم
سنہ تسعہ و تسعین تھے اور سات سو بہ‌ملک بقا جو ہوئے راہ رو
بہ روز دگر یہ ہوا ماجرا ریاست کا اک رکن اعظم گرا
ملک نائب اور بادشاہ کے قریں تھے غوری بھی اور نام تھا سیف دیں
صد و ہفت کا طے کیا مرحلہ جو درپیش یہ ہوگیا واقعہ
پلایا قضا نے جو جام ممات تو گل ہوگیا وہ چراغ حیات

ذکر سلطنت سلطان غیاث الدین بن سلطان محمود بہمنی

غیاث‌الدین تھے ایک ان کے پسر بہ عمر گرامیٔ سبعہ عشر
ہوئے تخت شاہی پہ رونق پذیر مزین ہوا ان سے تاج و سریر
جو تھے رسم شاہانہ نیک و سعید بدستور سابق بطرز حمید
سلوک و نوازش بہر خاص و عام بہ‌اعزاز و منصب ہر اک شاد کام
تھے اعظم ہمایوں کے ولد رشید مسمی بخان محمد سعید
بخدمات لائق ہوئے سرفراز ملا ان کو اک پایۂ امتیاز
تھا سلطان محمود کا اک غلام لکھا ہے تغل‌چین تھا اس کا نام
مزاج تغل‌چیں کے یہ تھا خلاف مکدر بہ باطن بہ ظاہر تھا صاف
وہ تھا آرزومند اس بات کا وکیل ہوں میں جملہ مہمات کا
وزارت کا خلعت ہو مجھ کو عطا وزارت کا منصب ہو مجھ کو عطا
دگر وہ جو ہے ولد میرا حسین ہو سرتیز نوبت بہ صد زیب و زین
مگر قول شہ تھا یہ نشر و علن یہ فرماتے اکثر زباں سے سخن
قبیح ہے یہ نزدیک میرے تمام شریف ہوئیں محکوم و حاکم غلام
چہ جائیکہ ہوں ان میں آل نبی پسندیدہ مجھ کو نہیں یہ کبھی
حکومت غلاموں کی سادات پر ہو اسفل کا درجہ مباہات پر

اسی عرصہ میں یہ ہوا آشکار جو صفدر تھا سردار ملک برار
ایلچ پور میں یہ ہوا واقعہ اجل آ گئی ہو گیا واقعہ

قطعہ تاریخ فوت صفدر خاں

سپہ سالار صفدر سیستانی خطاب مجلس عالی ز شہ داشت
بدوران علاء الدین بہمن برار اندر لوائے امر افراشت
بعہد شہ غیاث‌الدین غازی بگلگشت ارم چوں گام برداشت
قلم بر لوح محفوظ از سر آہ بہشت ملجائے او تاریخ بنگاشت

تھا صفدر کا خان صلابت پسر ہوئی جب کہ سلطان کو یہ خبر
یہ ہم درس و تدریس مکتب میں تھا نوازش ہوئی شہ کی اس پر سوا
کیا اس کو صفدر کا قائم مقام وہی عہدہ اس کو دیا بالتمام
عنایت ہوا خلعت زرنگار روانہ ہوا یہ بہ ملک برار

بیان نمک‌حرامی و مکر و فریب تغل‌چیں کہ از راہ حیلہ دعوت غیاث‌الدین شاہ را در مکان خود بردہ، مجبور کردہ، نابینا ساختہ، و بسیار کساں را قتل کردہ

تغل‌چیں کمیں‌گہ میں تھا روز و شب ضیافت کے حیلہ کا سوچا سبب
گئے شاہ ہمراہ خانہ خراب تھے بےہوش اتنی پلائی شراب
یہ تب اھل مجلس سے حیلہ کیا کنارا کرو ہوگا پردہ ذرا
تھی دختر تغل‌چیں کی رشک ماہ تو دلدادہ مفتون تھے اس پہ شاہ
ہوا خرخشہ دور غیروں کا جب تغل‌چین تھا اور خواجہ طرب
پس پشت بستہ کیے دست شاہ بدر نوک خنجر سے کیں چشم شاہ
سوا اس کے کی اور بدعت عجیب تھے سلطان کے جو عزیز و قریب
بہانہ ہر اک سے یہ کرتا تھا تب تمھیں بادشاہ نے کیا ھے طلب
جو داخل وہ ہوتا درون خیام اسے قتل کرتا تھا ترکی غلام
کیے قتل اس طرح چوبیس کس کیا یہ ارادہ ازیں باز پس
غیاث الدین کے چھوٹے اخی بہمنی مسمی تھے وہ شمس دین بہمنی

جو آئے تو ان کو یہ دی تہنیت — مبارک تمھیں ہوئے یہ سلطنت
مگر جاریہ سے تھے یہ شمس دیں — مبرا اصالت سے تھے شمس دیں
درون قلعہ ان کو وہ لے گیا — سر تخت فیروز دی ان کو جا
جو سلطاں غیاث ہوگئے بے بصر — تغل چیں کے قابو میں تھے بے بصر
تھے محبوس و مجبور با درد و آہ — رہے حصن ساغر میں وہ تا دو ماہ
تھی تاریخ رمضان کی سترہ — سنہ ہفت صد اور نود بےشبہ
ہوا جب کہ اس واقعہ کا ظہور — جو بد اصل ہیں ان کے یہ ہیں شعور

ذکر سلطنت شمس‌الدین بہمنی برادر علاتی غیاث‌الدین ابن سلطان محمود شاہ بہمنی کہ از بطن جاریہ بود۔

ہوئے شمس‌الدیں بہمنی بادشاہ — مزین ہوا ان سے دیہیم و گاہ
ہوئی عمر جو پانزدہ کے قریب — ہوئے جنس دو ان کے جاگے نصیب
تغل‌چین مذکور تھا جو غلام — نوازش ہوئی اس پہ یہ بالتمام
ملک نائب اس کو دیا تھا خطاب — علوئے مراتب سے تھا کامیاب

تفصیل اولاد سلطان داؤد بہمنی

تھے سلطان داؤد کے سہ پسر — یہ تفصیل اس کی ہے ہو باخبر
محمد کے بعد از ہو سنجر اگر — اسی نام سے ایک تھا مشتہر
مگر کام یہ روح پرور کا تھا — کہ سنجر کو مکحول اس نے کیا
دوم تھا مخاطب بہ فیروز خاں — سوم خان احمد تھا با عز و شاں
یہ دونوں برادر تھے اک بطن سے — مگر تھا وہ سنجر دگر بطن سے
چچا ان کے سلطان محمود تھے — بہ اخلاق عمدہ جو مسعود تھے
تھی سلطان پہ ان کی شفقت تمام — خیال اور توجہ تھی ہر صبح و شام
جو تھے میر فضل‌اللہ ذی مرتبہ — وہی درس دیتے تھے ذی مرتبہ
دو خواہر حقیقی جو اعمی کے ہیں — وہ ان دونوں کے ساتھ منسوب ہیں
معطل ہوئے سلطنت سے غیاث — تھے بے بس تو کہتے تھے وہ الغیاث

بترغیب نسواں مقید ہوئے ہوئے بےبصر اور مقید ہوئے
گئے سمت ساغر کیا وہاں قیام ہوئی فکر اس کی کہ لیں انتقام
ہوئے شہ سے خواہاں امن و اماں تو نافذ ہوا حکم امن و اماں
ہوئیں خوش بہت مادر شمس الدیں کہ باقی خاش اب تو کوئی نہیں
بشاشت تھی سب کے یسار و یمیں تغل چیں تھا خوش اور ہم شمس دیں
ہوا اک تسلی کا نامہ رقم جو تھا عہد و میثاق لطف و کرم
اماں نامہ جس دم یہ حاصل ہوا تو اندیشہ و خوف زائل ہوا
طلبگار اپنی ریاست کے تھے تفکر میں دارالخلافہ کے تھے
نکل آئے ظلمات دیجور سے پکارا جو دیوانہ یہ دور سے
میں آیا ہوں اس واسطے اب یہاں کہ اے روزافزوں فیروزخاں
کروں تجھ کو گلبرگہ کا بادشاہ ہوئی فال نیک ان کو یہ روبراہ
جو آئے وہ گلبرگہ با عز و جاہ ہوئے فضل خالق سے وہ بادشاہ
مسبب نے پیدا کیا وہ سبب نکل آئے دونوں ز چاہ تعب
گئے جب کہ دو ہفتہ اس میں گزر تھی بست و سوم وہ ز ماہ صفر
سنہ آٹھ سو تھے جو فیروزخاں باقبال و صولت بصد عز و شاں
جواں تین سو اس کے ہمراہ تھے کہ سب جاں نثار اور ہوا خواہ تھے
وہ جرار و جاں باز و با حوصلہ مسلح مکمل بصد ولولہ
پیاپے گئے اندرون حصار تھے فیروزاحمد پئے گیرودار
دلیروں نے کھینچی جو تیغ دو سر تو کرنے لگے دھڑ پہ دھڑ سر پہ سر
تغل چین بھی اور اس کا پسر ہوئے قتل دونوں کے تھے شور و شر
جگہ بھاگنے کی نہ پائی کہیں چھپے زیرخانہ میں خود شمس دیں
بالآخر کو از حکم فیروزخاں مسلسل تھے زنجیر کے درمیاں
تغل چین بھی اور ہم شمس دیں مقید ہوئے دونوں اک جا وہیں
تھا ارکان دولت کو جو اتفاق تو فیروزخاں بھی بصد طمطراق

سر تخت فیروز تھے جلوہ‌گر | لقب روزافزوں شہ بحر و بر
غیاث‌الدین تھے جو اسیر تعب | کیا ان کو ساغر سے شہ نے طلب
نغل‌چیں کو ان کے کیا جو سپرد | بہ‌یک ضرب شمشیر کی دست و برد
ہوئے شمس‌دیں ملتمس یوں بہ‌شہ | کہ مکہ کو جاؤں معۂ والدہ
ملی جب کہ رخصت تو اندوھگیں | گئے اور وھیں تھے سکونت گزیں
رھے زندہ جب تک وھاں ذی‌وقار | درم سرخ بھیجے انھیں پنج ھزار
سنہ آٹھ سو اور تھے شانزدہ | مدینہ میں جو ھوگیا واقعہ
یہ ھے مدت شاھیٔ شمس دیں | کہ پنجاہ اور ھفت دن بالیقیں

روںق گرفتن تخت سلطنت دکن از وجود برکت آمود سلطان فیروز شاہ الملقب
به روزافزوں بن داؤد شاہ بهمنی بدارالخلافت گلبرگه

چو فیروز شہ آں کشادہ جبیں | برآرندۂ تاج و تخت و نگیں
بتائید یزداں و نیروئے بخت | خداوند کشور شہ تاج و تخت
بروز خجستہ‌تر از مہر و ماہ | بسر برنہاد او کیانی کلاہ
در گنج بکشاد و لشکر بخواند | بدامن زر و سیم و گوھر فشاند
یہ سلطان فیروز ذی دستگاہ | اولوالعزم تھا شاہ عالم پناہ
علوھمتی ایک یہ مختصر | کہ لی دختر رائے بیجانگر
مکرر سکرر ھوئے کارزار | ھوئی فتح فیروز انجام‌کار
مرصع تھا تاج اس کے بالائے سر | بہ تشبیہ دستار تھا جلوہ‌گر
ادائے فرائض میں نیکو صفات | ھمیشہ تھا پابند صوم و صلوۃ
ھر اک شب کو معمول تھا تا دو پاس | خردمند رھتے تھے سب شہ کے پاس
فواضل بھی اور شاعر قصہ خواں | ندیماں خوش‌لہجہ شیریں بیاں
شگفتہ طبیعت کریم و حلیم | ھنرمند و زیرک تھے شہ کے ندیم
مقولہ تھا اس شہ کا یہ گاہ گاہ | بہ‌وقت عدالت ھوں میں بادشاہ
بہ‌وقت دگر ھوں میں مثل شما | تھے اخلاق ایسے کہ صلّ علیٰ

ہوئی سمت نسواں جو رغبت تمام　　یہ گویا ہوئے اہل‌سنت تمام
فقط چار زن سے کریں شہ نکاح　　نہیں خامسہ سے جواز و مباح
یہ ہے مذہب حنفیہ میں حرام　　نہ تھا موافق شاہ جو یہ کلام
تھے ایک میر فضل اللہ شہ کے وکیل　　یہ کی میر موصوف نے اک دلیل
بہ‌عہد جناب رسالت مآب　　بہ‌حکم خدا تھا جواز و ثواب
ہے اب بھی امامیہ میں یہ مباح　　وہ ہے ایک فرقہ بہ‌زہد و صلاح
غرض شاہ نے بعد رد و بدل　　کیا مسئلۂ شیعہ پر یہ عمل
کیا ہشت صد زن سے اک دن متاع　　نہ تھا حکم ثانی کا کچھ اتباع
نہ پوچھو کہ کیسے تھے عمدہ خصال　　تھی اک قوت حافظہ بھی کمال
تھا معمول و دستور شاہ حمید　　ہر اک روز لکھتا کلام مجید
جو اک بار سنتا وہ رکھتا تھا یاد　　فصاحت تکلم میں حد سے زیاد
سخن گو و ذی فہم و ذہن رسا　　تخلص عروضی و فیروزی تھا
اصول اور تفسیر و حکمت فقہ　　تھا علم طبیعی میں بھی مدرکہ
رموزات صوفیہ سے با خبر　　بدیع‌الکمال اور بدیع‌النظر
پئے درس سہ دن کیے اختیار　　سہ شنبہ دو شنبہ تو شنبہ چہار
شرح تذکرہ زاہدی کا سبق　　پڑھاتا تھا اکثر کتاب ادق
جو شرح‌مقاصد بہ‌علم کلام　　مطول و علم معانی تمام
تھا مطبوع خاطر جو عربی کلام　　کیا شاہ نے اس طرح انتظام
جہاں رونق افزا تھے دکھنی عمل　　مبدل کیے وہاں یہ عربی محل
نگہباں ان پر تھے حبشی نژاد　　جمیل اور خوش‌رو و عربی نژاد
زنان عجم کے بھی تھے نہ محل　　تو خدام گرجی تھے ایسے باعمل
ازاں جملہ تھیں کچھ زنان فرنگ　　تھے خدام بھی ان کے اہل‌فرنگ
بہ تحقیق ہر علم ساعی تمام　　تو توریت و انجیل دیکھی تمام
برہمن نصارا و قوم یہود　　ملازم تھے شہ کے بہ‌عز و نمود

تھی تنقیح ادیان مد نظر	ہر اک کی روش سے ہوتا باخبر
جو اک خان احمد اخ شاہ تھا	وہ دل‌دادۂ عزت و جاہ تھا
بہت مورد لطف خاقاں ہوا	مخاطب بھی خان‌خاناں ہوا
جو تھے میر انجو سیادت مآب	ملک نائب ان کو دیا تھا خطاب
برھمن جو تھے صاحب امتیاز	انھیں بھی کیا شاہ نے سرفراز
ہوا دیو رائے بہت خیرہ سر	وہ تھا ایک والیِ بیجانگر
معہ فوج اسوار با سی ہزار	پیادے تھے جنگی تھے نہ صد ہزار
تھے ہاتھوں میں ان کے سنان و تفنگ	مسلح مکمل پئے رزم و جنگ
یہ تھا قصد اس کا کہ لوں رائے چور	یہی طمع رکھتا تھا وہ پر غرور
گئے جب کہ گلبرگہ شاہ جری	تو ساغر میں پہنچے معہ لشکری
سپہ کا کیا شاہ نے جو شمار	سوار اور پیدل تھے بارہ ہزار
زمیندار ساغر تھا اک خیرہ سر	مخالف مبارز بہ‌صد شور و شر
وہ تھا فتنہ انگیز با ہشت ہزار	معہ ہندی و کولی اہل شرار
گرفتار اسے فوج شہ نے کیا	تو مقتول وہ حکم شہ سے ہوا
صلابت بن صفدر نامدار	تھا حاضر معہ فوج ملک برار
بہ نافذ ہوا حکم عز و شرف	اطاعت سے نرسنگہ ہے منحرف
وہ سابق میں دیتا تھا باج و خراج	تمرد کا اب اس کے سر پر ہے تاج
خیالات فاسد ہیں مغرور کو	کیا اس نے تاراج ماہور کو
مسلمین کو ہے وہ ایذا رساں	پئے تخت و تاراج ہے ہر زماں
ہے کھیڑلہ کا قبضہ میں اس کے حصار	صلابت معہ فوج ملک برار
ایلچپوری اور حاکم دیوگیر	معہ فوج اس پر کریں داروگیر
مگر خود معہ فوج بارہ ہزار	سوئے رائے دیو چلے شہریار
صلابت کے ہمراہ تھا جم غفیر	وہ ماہور پہنچا بہ فوج کثیر
تقارب فریقین سے جو ہوا	بڑھے دونوں جانب سے جنگ آزما

شپاشپ چلی تیغ آہن گزار ہوا گرم ہنگامۂ کارزار

بالآخر ہوئی فتح فیروز شاہ تھا نرسنگھ میدان سے روبہ‌راہ

عریضہ صلابت نے شہ کو لکھا مبارک ہو یہ فتح اے بادشاہ

صلابت پس از جنگ فتح اتم ایلچپور پہنچا بہ جاہ و حشم

ہوا دیو رائے سے شہ کو فراغ کیا ضرب سے اس کا خالی دماغ

ہوا دفع سب اس کا خبط و جنون لیے یازدہ لاکھ دیو سے ہون

ذکور و اناث اور صغیر و کبیر ہوئے تھے جو کچھ فوج شہ میں اسیر

ہوئے حکم شہ سے وہ فوراً رہا دگر حکم فولادخاں کو دیا

کرے ضبط وہ کل میان دو آب گئے سمت گلبرگہ کو پھر شتاب

ہوا تا با سہ ماہ شہ کا مقام ہوئے سمت نرسنگھ پھر تیزگام

جو تھا ملک‌گیری کا دل میں خیال چلے اس طرف کو پئے گوشمال

جو ماہور میں پہنچے فیروزشاہ مقدم وہاں کا ہوا عذرخواہ

تحائف کیے پیش کش بیکراں بہ عجز و بہ الحاح مانگی اماں

ہوا جب کہ وہ پائے بوس رکاب رہے پانچ دن وہاں خلافت مآب

ایلچپور پھر پہنچے فیروزشاہ تو نرسنگھ کو یہ ہوئی دستگاہ

مدد اور کمک کی تھی اس نے طلب مگر منحرف ہوگئے سب کے سب

مقابل میں جس پر بھی وہ آگیا معہ فوج میداں میں آکر جما

یہ تھا عزم سلطاں کہ ہوکر سوار کروں جاکے نرسنگھ سے کارزار

کیا میر و خاں نے یہ معروض شاہ ہیں کس واسطے آپ کے خیرخواہ

محول یہ خدمت ہو ہم کو اگر بہ فضل خدا فتح ہو جلوہ‌گر

پسند آیا شہ کو یہ ان کا سخن ہوئے دونوں مامور وہ صف‌شکن

غرض میر و خاں نے یہ تدبیر کی پئے مصلحت ایک تحریر کی

تھا مضمون تحریر کا یہ اصول اطاعت کرو شاہ کی تم قبول

مناسب ہے پیکار سے اجتناب نہ ہستی کو اپنی کرو تم خراب

کرو صلح دو شہ کو باج و خراج
ہے فیروز شاہ صاحب تخت و تاج

یہ لکھنا نہ اس کو ہوا کارگر
ہٹا وہ نہ میدان سے خیرہ سر

تو میر انجو اور خان‌خاناں بہم
جما کر صفیں ہوگئے بر قدم

کھڑی تھی مقابل میں فوج عظیم
کیے حملے مردانہ بے خوف و بیم

ہوا کشت و خوں اور جنگ و جدال
ہر اک تیغ پر چڑھ گیا رنگ لال

شجاعوں نے دی داد مردانگی
لڑائی میں دکھلائی فرزانگی

سپاہی جواں مرد و رستم سپر
خوانین میں جو کہ تھے معتبر

شہادت پہ فائز ہوئے سر فروش
گئے خلد کو سرخ رو سرخ پوش

مخالف کو غلبہ ہوا اس قدر
ہوا جیش اسلام سب منتشر

جو تھے خان‌خاناں سوئے میمنہ
تو تھے میر انجو سوئے میسرہ

اسی معرکہ میں بہ جمع قلیل
تھے حیران و استادہ دونوں اصیل

سی عرصہ میں یہ کسی نے کہا
کہ لو خان‌خاناں شہید ہوگیا

مگر میر انجو نے اخفا کیا
دیا حکم دو کوس شادی بجا

کیا مشتہر یہ میان سپاہ
خود آتے ہیں سلطان فیروز شاہ

پراگندہ تھے ہر طرف لشکری
ملے میر انجو سے سب وہ جری

مخالف مقابل میں تھے خیرہ سر
معہ فوج ان پر ہوئے حملہ ور

مبارز جو تھے ہوگئے منہزم
ہوا فتح و نصرت کا پایہ علم

غلط خان‌خاناں کی وہ تھی خبر
تو ملحق ہوئے دونوں باہم دگر

جو یہ شیر دل دونوں اک دل ہوئے
مخالف لڑائی سے بیدل ہوئے

تھا نرسنگھ رائے کا نامی پسر
وہ تھا رائے کوسل سے وہاں مشتہر

اسی معرکہ میں وہ استادہ تھا
وہ مغلوب و منکوب جو ہوگیا

جوانوں نے اس کو دیا دستگیر
فراری ہوئی اک جماعت کثیر

تعاقب میں ان کے چلی فوج شاہ
ہوئے جانب قلعہ وہ روبہ راہ

پیادے تھے نرسنگھ کے اور سوار
ہوئے قتل اس جنگ میں دہ ہزار

قلعہ میں جو نرسنگھ داخل ہوا
تو سب شور و زور اس کا زائل ہوا

ہوا مضمحل اس کا تاب و تواں
تو دو ماہ کے بعد چاہی اماں

یہ گویا ہوئے میر و خاں ذی وقار
نہیں ہے ہمیں اس میں کچھ اختیار

ہے نرسنگھ جو خواستگار پناہ
تو خود جاکے وہ ہو قدم‌بوس شاہ

ہوا خواہ نرسنگھ گم کردہ راہ
ہوئے جملگی حاضر بارگاہ

بالحاح و زاری یہ شہ سے کہا
پشیمان و نادم ہیں حد سے سوا

جو کچھ ہم سے سرزد جسارت ہوئی
کریں عفو ہم کو ندامت ہوئی

بعہد حسن صاحب تخت و تاج
جو دیتے تھے دیں گے وہ باج و خراج

ہیں بندے جو درگاہ شاہی کے ہم
رہیں گے اسی طرح ثابت قدم

ہوا موج زن لطف فیروز شاہ
تو زردوزی نرسنگھ کو دی کلاہ

ہوا خوش وہ شہ کی عنایات سے
رہائی ملی جملہ آفات سے

جو شہ کا کرم دیکھا یہ بے قیاس
تو نرسنگھ نے خود کیا التماس

مصالح بہت سے تھے اس کے شمول
کیا اس کی دختر کو شہ نے قبول

طلا پنج اور نقرہ پنجاہ من
چہل فیل نامی دیے پیل تن

لیا شہ نے نرسنگھ سے اس قدر
تو تسخیر قلعہ سے کی درگزر

اسے شاہ نے جب کہ رخصت کیا

کرم اس پہ جو خسروانہ ہوا
قلعہ کی طرف وہ روانہ ہوا

گیا حکم یہ خان‌خاناں کے نام
قلعہ چھوڑ کے ہو ادھر تیزگام

غرض میر و خاں جملہ دونوں بہم
ایلچ‌پور آئے بہ‌فوج و علم

سر فتح ہے چونکہ فضل‌اللہ میر
بہت خوش ہوئے ان سے صاحب سریر

کیا ان کو سردار فوج برار
ہوئے سرفراز اور بڑھایا وقار

ہوا جو ایلچ‌پور میں کچھ قیام
بنا اک سنگیں مکاں بار عام

حصار ارک میں ہے اس کی بنا
وہ مشہور و معروف ہے دل کشا

مظفر و منصور با بندوبست
ہوئی سمت گلبرگہ کو بازگشت

تھے ان روزوں دھلی میں رونق پذیر ملقب بہ تیمور صاحب سریر
تھے زینت دہ تخت ھندوستاں شۂ گورگاں یعنی صاحب قراں
سنہ سات سو آٹھ تھے ھجریہ جو فیروزشہ کا گیا مرسلہ
تقی الدین داماد فضل اللہ تھے دگر اور مولانا لطف اللہ تھے
فواضل میں ان کا کیا ھے شمار یہ تھے پایۂ تخت میں ذی وقار
معہ نامۂ و ھدیہ ھائے تحف ھوئے عازم ھند یہ با شرف
گئے راہ دریا سے یہ ذی شعور مسافت کی دریا کی جس دم عبور
ھوئی شاہ میں باریابی حصول دیا پیش کش اور ھوا وہ قبول
ھوئے خوش بہت دل میں صاحب قراں زباں سے ھوئے اس طرح در فشاں
دکن اور گجرات اور مالوا کیا ھم نے فیروزشہ کو عطا
دی رخصت رکھے چتر بھی بادشاہ کرے سلطنت وہ بہ اعزاز و جاہ
لکھا ایک فرماں سعادت نشاں بہ اعزاز و اکرام و با عز و شاں
تھا مرقوم بر نام فیروزشاہ ھو فرزند دلبند اور خیر خواہ
مرخص ھوئے وھاں سے جو سفیر تو وہ لائے یہ تحفہ ھائے امیر
مرصع تھی شمشیر اک آب دار کمر اور قُبّ ملوکانہ چار
ازاں جملہ تھا ایک ترکی غلام دگر چار تھے اشھب تیزگام

رسد بندئ بالا گھاٹ بموجب حکم بادشاہ

الوالعزم و ذی رتبہ فیروزشاہ تھے علم ریاضی میں ذی دستگاہ
سنہ آٹھ سو اور وہ تھے عشر ھوا جو یہ حکم شہ بحر و بر
رسد بندی ھو بر روئے بالا گھاٹ جو عالم تھے وہ آئے تا بالا گھاٹ
حسن ان میں کہلاتے تھے اک حکیم دگر اور بہ تعداد مرد فہیم
تھے مشغول کار اور طرح فکن ھوئے فوت ناگہہ حکیم حسن
رسد رہ گئی سب کی سب نا تمام ھوا جملہ بےکار وہ اہتمام
سنہ آٹھ سو اور تھے اثنا عشر جو گلبرگہ میں شہ کو پہنچی خبر

ورود سعادت آمود سید بندہ نواز گیسو دراز در شہر گلبرگہ

ملقب بہ القاب بندہ نواز — یہ آئے ہیں دہلی سے گیسو دراز
ملک احترام اور عالی مقام — ہیں ذی‌رتبہ سید محمد ہے نام
یہ ہیں آل یٰسین میں بالیقین — ہے نور سعادت سے تاباں جبیں
چراغے ز شمع خرد تافتہ — کہ خورشید و مہ نور ازو یافتہ
ہوئے ہیں وہ رونق فزائے دکن — سنا جب کہ یہ بادشاہ نے سخن
جو تھا ایسے لوگوں کا شہ قدرداں — خوشی اور مسرت ہوئی بیکراں
دیا حکم ارکان دولت کو تب — کریں پیش قدمی بطرز ادب
امیران ذی رتبہ با احتشام — گئے اور لائے بہ صد احترام
ہوا شہر میں جب کہ ان کا ورود — ہوا بام عزت پہ پیدا صعود
یہ تھے شاہ صاحب جو عالی نہاد — ہوا خان خاناں کو بھی اعتقاد
بنی واسطے ان کے اک خانقاہ — قدم بوس خاں ہوتے شام و پگاہ
حسن خاں تھا فرزند فیروزشاہ — ولی‌عہد وہ تھا بہ اعزاز و جاہ
بڑے تھے جو فرزند فیروز بخت — معزز ہوئے یہ معہ فیل و تخت
کمر اور شاہانہ چتر و کلاہ — سرا پردہ بھی اس کو بخشا سیاہ
یہ سلطان نے سید کو بھیجا پیام — حسن کو دعا سے کریں شاد کام
یہ گویا ہوئے ان سے بندہ نواز — کہ تم خود اسے کرچکے سرفراز
دعا کی میری اس میں حاجت ہے کیا — جو کی سلطنت تم نے اس کو عطا
فرستادۂ شہ نے بار دگر — بہ اصرار اس میں کہا آن کر
دیا آپ نے تب یہ اس کا جواب — برادر ترا ہوچکا کامیاب
اسے تاج شاہی فلک سے ملا — ترے بعد وہ ہوگا فرماں‌روا
ہوئی خان‌خاناں کو یہ نام زد — ہے بے‌سود اس میں سب جد و کد
کرے کس طرح سے دعا یہ فقیر — خدا دے چکا اس کو تخت و سریر
ہوئے سن کے مغموم فیروزشاہ — کہا ہے قریب قلعہ خانقاہ

خلائق کا بس ہوتا ہے اژدھام   کریں شہر سے دور جا کر مقام
تو اس وقت میں شاہ گیسو دراز   ہے مرقد جہاں وہاں کیا انتزاز
فروکش ہوئے شہر سے برکنار   مرید ان کے جاتے تھے وہاں بےشمار
سکونت وہیں کی بہ اہل و عیال   مزین جگہ تھی بہ حسن و جمال

بیان جنگ و جدال که از رائے دیو راجه بوقوع آمد و شکست اهل اسلام گردیده

ہوا رائے دیو بہت خیرہ سر   جمع کی سپاہ اس نے بےحد و مر
ہوئی جنگ کرنے میں اس کو یہ کد   کہ ہر ایک راجہ سے مانگی مدد
فرستادۂ فوج رائے تلنگ   جمع ہوکے آئے تھے از بہر جنگ
مقابل میں دونوں کی آئی سپاہ   ہوا گرم میدان آورد گاہ
جوانان جنگی ہوئے حملہ ور   اجل گہ ادھر تھی کبھی تھی ادھر
دم تیغ تھا اس قدر برق دم   دکھاتا تھا ہر اک کو راہ عدم
جو تھے میر فضل اللہ انجو لقب   شہادت پہ پہنچے وہ عالی نسب
ہوا غلبہ و شوق خلد بریں   گئے ان کے ہمراہ اور مسلمیں
دگر میسرہ کے جوان سعید   ہوئے جاں نثار اور اکثر شہید
ہوا رایت خسروانی جو پست   خوشی کا تھا کفار میں بندوبست
تھا مجروح بس لشکر نامور   مگر خان خاناں تھے شہ کی سپر
کیا دیو نے اس قدر قتل عام   سروں کا تھا انبار ہر سو تمام
تعاقب جو سلطان کا اس نے کیا   عمل دخل اس کا ہوا جا بہ جا
پئے قتل اسلام گاڑا قدم   مساجد بھی اکثر کیے منہدم
تو پھر خان‌خاناں نے انجام کار   فراہم کیا لشکر بےشمار
خزانہ کیا صرف بےحد و مر   دفع تا کہ دیو کا ہو شور و شر
نہ کیوں شہ کو ہوتا غم دل خراش   کہ پیری میں پہنچا تھا یہ زخم فاش
غم و غصہ نے کردیا تھا سقیم   ہوا عمر آخر میں صدمہ عظیم
بسے غصہ میخورد و شوریدہ وار   بہ پیچید بر خویش چوں روزگار

به تدبیر آں بود شاہ جہاں　　کہ تا بر کشد کینہ از ہندواں
پس از چند گاہ آں کیانی نژاد　　ز خستہ دلی سر ببالیں نہاد
بالآخر کو شہ نے زمام مہام　　سپرد ان کو کی تھے جو دونوں غلام
تھا بیدار اک اور دگر ہوشیار[۱]　　ہوا سلطنت میں انھیں اختیار
بالطاف و اشفاق فیروز شاہ　　ہوئی گو کہ حاصل انھیں دستگاہ
مگر خان‌خاناں تھے خود مدعی[ن]　　انھیں کیفیت جب یہ واضح ہوئی
یہ سلطان سے عرض اک دن کیا　　طبیعت سے احمد کی واضح ہوا
وہ رکھتا ہے خود دعوۂ سلطنت　　اسے حوصلہ ہے کہ لوں مملکت
جو ہو خان‌خاناں سے خالی دکن　　ہو اس وقت شاہی یہ فائز حسن
جو فرماتے تھے شاہ گیسو دراز　　کہا سچ تھا وہ قول بندہ نواز
یہ تدبیر کی شہ نے روز دگر　　کروں خان‌خاناں کی آنکھیں بدر
ہوئی اطلاع خان‌خاناں کو جب　　فراری ہوا وہاں سے وہ وقت شب
ہوا وہ قدم بوس گیسو دراز　　کیا عرض ان سے بہ عجز و نیاز
پئے فاتحہ بھی کیا التماس　　دعا پھر فدوی کریں حق شناس
فقط اک پسر ان کے ہمراہ تھا　　معین و مددگار اللہ تھا
تو سید نے دستار کو پھاڑ کر　　دیا باندھ دونوں کے بالائے سر
دیا ان کو پھر مژدۂ سلطنت　　پڑھی فاتحہ اور دی تہنیت
جو کچھ گھر میں حضرت کے تھا ماحضر　　شریک ہوگئے اور رکھا ماحضر
جو کی خدمت شاہ سے بازگشت　　تردد میں تھے کیا کریں بندوبست
گئے اپنی منزل پہ پھر قیام　　تفکر میں شب ہوگئی وہ تمام
جو نکلا وہ گھر سے بوقت سحر　　مسلح مکمل بہ تیغ دو سر
جوان ان کے ہمراہ تھے چار سو　　جری اور جانباز تھے چار سو
اسی عرصہ میں آشنائے قدیم　　تھا استادہ بیرون در وہ سلیم

۱　ہوشیار عین الملک دیگر بیدار نظام الملک ۔
ن　جو واضح ہوئی خواہش مدعی

کیا اس طرح اس نے جھک کر سلام ‌ ‌ ‌ کریں شاہ کو جیسے بڑھ کر سلام
کیا خان احمد نے اس سے کلام ‌ ‌ ‌ طرف اپنے گھر کے ہو تم تیزگام
مری دوستی میں نہ پہنچے ضرر ‌ ‌ ‌ یہ اک رہ گزر ہے مقام خطر
حسن اور بصری ہے بعد از خلف ‌ ‌ ‌ یہی نام اس کا ہے اے ذی شرف
یہ تب خان خاناں سے اس نے کہا ‌ ‌ ‌ نہیں ہے یہ ہرگز طریقہ مرا
جلیس و ندیم ہوں بہ عیش و طرب ‌ ‌ ‌ کنارا کروں میں بہ وقت تعب
پسندیدہ ہرگز یہ شیوہ نہیں ‌ ‌ ‌ یہ اہل وفا کا طریقہ نہیں
رہ دوستی میں ہوں ثابت قدم ‌ ‌ ‌ نہیں غم اگر سر بھی ہوئے قلم
مری چاکری ہو اگر دل‌نشیں ‌ ‌ ‌ تو حاضر ہے یہ بندۂ کمتریں
ملازم رہے یہ جو پیش حضور ‌ ‌ ‌ تو اخلاق رو نیک کا ہو ظہور
یہ اخلاص اس کا پسند آ گیا ‌ ‌ ‌ اسے خان احمد نے ہمرہ لیا
چلا خان خاناں پئے بندوبست ‌ ‌ ‌ باطراف گلبرگہ کرتا تھا گشت
خلف[۱] یار تھا جو مودت طریق ‌ ‌ ‌ وہ دل سوز تھا اور نہایت شفیق
کیا اس نے سامان چتر و کلاہ ‌ ‌ ‌ بڑا دوست تھا اور بڑا خیر خواہ
روانہ کیے ہر طرف آدمی ‌ ‌ ‌ کہ ہوں مجتمع اس طرف آدمی
جو کلیانی و بیدر سے حسب الطلب ‌ ‌ ‌ ملازم ہوئے آئے جو سب کے سب
دیا ان کو بس وعدۂ دل‌فریب ‌ ‌ ‌ ہوئے مشترک وہ بہ جنگ و نہیب
دگر خان احمد کو دی یہ صلاح ‌ ‌ ‌ مہیا ہوں اسباب جنگ و سلاح
ہو گاوان و رہوار کی کچھ خرید ‌ ‌ ‌ کہ کثرت ہو لشکر کی اس سے پدید
یہ ہے طرز و رفتار اہل دکن ‌ ‌ ‌ کریں بیرقیں ان پہ جلوہ فگن
پیادوں کو ہمراہ لیں بے‌شمار ‌ ‌ ‌ کریں اسپ و گاواں پہ ان کو سوار
جو قائم ہو اس طرح سے طرز جنگ ‌ ‌ ‌ بہ فضل خدا فتح ہو بے درنگ
نمایاں ہوں اردو سے یہ ایک طرف ‌ ‌ ‌ کریں مشتہر یوں بہ‌شور و شغف

---

۱ خلف — بصری -

امیران نامی جاگیردار — شریک مدد ہیں پئے کارزار
یقیں ہے بہ تائید رب انام — ہراسیں اور پست ہوویں غلام
خلف نے یہ تقریر کی دل‌پذیر — ہوئی پر نہ احمد کے نقش ضمیر
جو ہشیار و بیدار تھے دو غلام — سپہ کا تھا ساتھ ان کے بھی اژدھام
ہوئی فوج شاہی جو ان سے قریں — تھا طے مسافت میں یہ دل حزیں
بہ یک لمحہ ٹھیرا جو زیر شجر — ہوئیں بند آنکھیں ہوا بے خبر
یہ تھا عالم خواب میں جلوہ گر — ہیں درویش اک اس کے پیش نظر
کف و دست میں ان کے ہے سبز تاج — طرف اس کے آتے ہیں وہ خوش مزاج
کیا خان احمد نے بڑھ کر سلام — دیا تاج بخشا اسے احترام
خود ہی ہاتھ سے تاج سر پر رکھا — کہا مرسلہ ہے یہ اک شیخ کا
ہوئیں خان احمد کی آنکھیں جو وا — خلف سے بیاں حال رویا کیا
مبشر جو مژدہ یہ حاصل ہوا — تو تدبیر سابق پہ مائل ہوا
خلف تھا جو ہر باب میں ہوشیار — وہ کلیانی پہنچا بہ چندیں سوار
پئے اسپ و گاواں جو تھا اضطراب — پھرا مول لے کر وہاں سے شتاب
جو تیار کیں بیرقیں رنگ بہ رنگ — بجایا دم صبح کو کوس جنگ
یہ مشہور آوازہ ہر سو ہوا — کہ لشکر مدد کو بہت آ گیا
ہیں اطراف کے جتنے نامی امیر — وہ اک دل ہوئے ہیں پئے دار و گیر
انھیں خان‌خاناں سے ہے اتفاق — غلاموں سے ہے بس نفاق و شقاق
سخن مختصر یہ کہ از جانبین — مقابل میں آئے بہ صد زیب و زین
تھی سلطان کی فوج تو ہشت ہزار — تھے ہمراہ احمد فقط اک ہزار
دیا گھیر احمد کو چاروں طرف — ہوئے حملے ان کے بہ شور و شغف
خلف تھا جہاں دیدہ و ہوشیار — صف جنگ کو یوں کیا استوار
جو اسپان و گاواں تھے اے ذی شعور — کیا پیش ان کو بہ راہ مرور
مسطح جو میدان تھا اک طرف — ہوا معرکہ وہاں بہ شور و شغف

ہوا طرف ثانی کو جب یہ یقیں
ہیں امرائے دولت شریک و قریں

ہوا جب کہ غالب یہ ان پر قیاس
تزلزل میں تھے اور پریشاں حواس

تھے احمد کے ہمرہ جو جنگی سوار
ہوئے حملہ ور جملہ وہ ایک بار

گرے قلب دشمن پہ کھینچی حسام
فراری ہوئے رزمگہ سے غلام

ہوئے جب کہ آگاہ فیروز شاہ
تھے بیمار لیکن وہ عالم پناہ

اسی دم ہوئے پالکی میں سوار
امیر اور سپہ بھی تھی چندیں ہزار

معہ توپخانہ بہ‌جاہ و توزک
جلو ریز آئے تھے بھر کمک

حسن خاں جو تھے ایک ان کے پسر
لگاتے تھے وہ چتر بالائے سر

حسن‌آباد سے اس طرف سہ گروہ
مقابل میں آئے جو ہر دو گروہ

صفیں جم رہیں تھیں بہ آوردگاہ
یکایک تھے بےہوش فیروزشاہ

تھے سکتہ میں لیکن اڑی یہ خبر
ہوئے فوت فیروز شاہ خوش سیر

بزرگ اور کوچک کہین و مہیں
رفاقت سے تھے سب کنارا گزیں

ملے خان احمد سے آکر تمام
اٹھا لے گئے شہ کو دونوں غلام

قلعہ تک جو پہنچی سواری شاہ
تو ہوش آیا اور کچھ ہوا انتباہ

دکھایا فلک نے یہ خواب عجیب
ہوا شعبدہ یہ عجیب و غریب

رعایت کو احمد نے رکھا نگاہ
ہوئے داخل قلعہ فیروز شاہ

تھے احمد بہ اطراف و گرد حصار
تردد . تفکر میں با حال‌زار

بزیر قلعہ خیمہ استادہ کر
ہوئے خان احمد وہیں جلوہ گر

بروج قلعہ پر چڑھے تھے غلام
جدھر خان احمد کے دیکھے خیام

حسن کے اشارے سے وہ تابعدار
سوئے خان احمد ہوئے گولہ بار

چلی ضرب و بندوق و توپ و تفنگ
گرے خیمۂ خان پہ وہ بےدرنگ

جماعت ہوئی جب کہ ان کی تلف
قلعہ سے گئے دور وہ ذی شرف

جو فیروز شہ نے سنی یہ خبر
حسن سے کہا یہ کہ سن اے پسر

ہوئی متفق جس سے جملہ سپاہ
وہ ہے حاکم ملک اور بادشاہ

ترے غم سے خلقت ملی بالتمام
رجوع اس طرف ہوگئے خاص و عام

کرو عقل و دانش کا اب اتباع
نوردیدہ ہوئے بساط نزاع

فنا و خرابی کا ہوگا سبب
اطاعت کرو اپنے عمو کی اب

دیا حکم کردو در قلعہ وا
طلب خان‌احمد کو شہ نے کیا

گئے خان‌احمد جو با چشم تر
ادب سے رکھا پائے سلطاں پہ سر

بہت روئے مانند ابر بہار
پڑھے شعر یہ پیش شہ زار زار

ازیں سرنوشت ز سود و زیاں
فلک را بہانہ منم درمیاں

ازینش ستاند بآنش دہد
کند ہرچہ خواہد بما بر نہد

بہ ظاہر بشاشت سے شہ نے کہا
کہ الحمدللہ سپاس خدا

مرے سامنے تم ہوئے بادشاہ
مبارک ہو تم کو یہ دیہیم و گاہ

مرے بعد اول تمہارا تھا حق
ہو آیندہ وہ جو کہ ہو مستحق

ولی‌عہد میرا ہوا جو حسن
بہ جوش محبت تھا سر و علن

حسن کو بھی تیرے حوالہ کیا
کیا تجھ کو میں نے سپرد خدا

جو کچھ سلطنت کے ہیں امر اہم
توجہ کر اس میں بہ وجہ اتم

جو کچھ زندگی ہے مری ماہ و سال
نہ غافل ہو، میرا ہو پرسان حال

سنہ ہشت صد اور تھے بست و پنج
مہ عید شوال کا یوم پنج

رکھا تاج شاہی کو بالائے سر
ہوئے تخت فیروزہ پر جلوہ گر

یہ سلطان احمد شہ بہمنی
ہوئے بادشاہی سے جس دم غنی

پڑا سکہ ان کا بہ ملک دکن
پڑھا خطبہ ان کا بہ سر و علن

دگر روز سلطان فیروزشاہ
روانہ ہوئے جانب خوابگاہ

رہی سلطنت ان کی پچیس سال
پس از ہفت مہ کے ہوا انتقال

ذکر سلطنت احمدشاہ ولی البہمنی برادر فیروز شاہ بن داؤد شاہ مقتول

ہوا سلطنت پر جو ان کو صعود
تو علما و سادات کی تھی نمود

جو سید محمد تھے گیسو دراز
کی تعظیم ان کی بہ عجز و نیاز

تھا سابق سے یہ شاہ ان کا مرید
ہوا ان پہ الطاف وافر مزید

دیے پرگنے ان کو جاگیر میں
ہمہ تن تھے مصروف توقیر میں

قرین شہر کے ایک جائے سترگ
دی ترتیب از بہر پیر بزرگ

ہوا پھر یہ مرکوز شاہ انام
کہ لوں دیورائے سے میں انتقام

خلف کو کیا شہ نے اپنا وکیل
علو مرتبت سے ہوا وہ جلیل

ہزار اور دو صد کا منصب دیا
بہ صد عزت و شاں مخاطب ہوا

جو ہشیار تھا وہ ہوا کامیاب
امیر امیراں کا پایا خطاب

دگر نام جس کا کہ بیدار تھا
شریک و مساوی دربار تھا

اسے دو ہزاری کا منصب دیا
ہر اک کو بہ قدر مناسب دیا

وہ افسر ہوا دولت‌آباد کا
وہ حاکم ہوا دولت‌آباد کا

دیا الف و پانصد کا منصب اسے
بڑھایا بہ چندیں مراتب اسے

ہوا عہد اس شہ میں یہ ضابطہ
مروج ہوا اس طرح ضابطہ

کرو دولت‌آباد کو بھی شمار
یہ ہر سہ جہت ہوگئیں آشکار

برار و ایلچ‌پور ہر سہ جہات
ہوئے دوہزاری یہ ہر سہ جہات

امیر اور تھے جو کہ اس کے سوا
ہزاری سے منصب زیادہ نہ تھا

صدی سے نہ تھا کوئی منصب بھی کم
ہزاری کا مخصوص تھا یہ حشم

ہوا مرحمت اس کو طوغ و علم
معہ کوس و نقارہ با صد حشم

جو فیروز مرحوم کا تھا پسر
دی جاگیر اس کو بہ قدر بسر

بہ تاکید یہ حکم اس کو دیا
رہے چار فرسخ یہ عملہ ترا

نہ آگے کبھی اس سے رکھنا قدم
رہو تابع حکم عالی ہمم

ازیں بعد پھر شاہ عالی وقار
معہ فوج جرار با چہل ہزار

ہوئے دیورائے پہ جو حملہ‌ور
بھگایا اسے تا بہ بیجانگر

تعاقب میں اس کے گئے جاں‌نثار
تو مخفی ہوا وہ درون حصار

ولایت میں پہنچے جو آفاق گیر　　زن و مرد وہاں کے کیے سب اسیر
تھے بدعات دیو سے بس دل فگار　　کیے قتل اک دن میں عشرین ہزار
رہے تین دن شاہ اس میں مقیم　　ہر اک روز ہوتا تھا جشن عظیم
جو بت‌خانہ نامی کی کرتے شکست　　تو بجتی تھی نوبت بہ صد بندوبست
کنایس کو بھی ان کے ویراں کیا　　ہنودوں سے سابق کا بدلہ لیا
جو سلطان احمد شہ ذی وقار　　معہ چند تن نکلے بہر شکار
مخالف جو تھے ان کو موقع ملا　　تعاقب اسی وقت شہ کا کیا
بہ جہت مواشی تھا کچّا حصار　　پئے حفظ اس میں چھپے شہریار
یہ چاہا بد اندیشوں نے گھیر کر　　گرا دیویں دیوار کو سربسر
ہنودوں کا مجمع ہوا جو بہم　　لگے کرنے دیوار کو منہدم
ملازم جو تھے شاہ کے شیرگیر　　لگے چھوڑنے وہ کمانوں سے تیر
تھے سیدحسن اک بدخشی نژاد　　تو فرخ علی بھی تھے عالی نہاد
ہنودوں کی پہنچی وہ ضرب شدید　　ہوئے بست و دو دکھنی اس دن شہید
بہ تعداد تھے آدمی چھے ہزار　　جو کندیدہ کرتے تھے پیہم جدار
غرض یہ کہ سلطاں بہ معدود چند　　تحیّر میں تھے درمیان گزند
سلح داروں کا ایک سردار تھا　　وہ جانباز و جرّار و کرّار تھا
دیا تھا اسے منصب سروری　　سر نام ہے عبد لیکن جری
معہ حلقہ فیل دو سہ ہزار　　وہ آپہنچا جلدی سے وہاں ایلغار
ہوا جنگ و پیکار میں مشتغل　　کیا اہل بدعت کو بس مضمحل
چلیں تیغیں کرتے تھے سر باربار　　غضب اور شدت کی تھی کارزار
مخالف کے ہے قتل کا یہ شمار　　لکھا ہے کہ مارے گئے سہ ہزار
مسلماں بھی کام آگئے پانسو　　ہوئے شوق جنت میں وہ تیزرو
ملی شاہ کو مہلکہ سے نجات　　دوبارا ہوئی زندگی و حیات
بہ الطاف شاہی ہوا کامیاب　　دیا عبد کو خاں جہانی خطاب

یہ نافذ ہوا حکم سلطاں دگر
ملیں تیر انداز اب جس قدر

ملازم ہوں وہ اپنی سرکار میں
ضرورت ہے ان کی بھی پیکار میں

سر نام جس کے ہے لفظ خلف
یہ نافذ ہوا اس پہ حکم شرف

عراق و عرب ماوراءالنہر سے
طلب کردہ آئیں ہر اک شہر سے

قدر انداز ہوں جو بہت ہوشیار
وہ نوکر ہوں سرکار میں سہ ہزار

امیروں پہ بھی حکم نافذ ہوا
کریں مشق تیر و کماں کی سوا

ہر اک روز مشق اس کی باہم کرو
سکھاؤ جوان اور اطفال کو

جو تھا دیورائے بہت خیرہ سر
چلے فوج لےکر بہ بیجانگر

رکھا طاق پر اس نے بغض و عناد
ہوا طالب صلح وہ دیوزاد

نقود فراواں معہٗ اقمشہ
تو فیل گراں ڈیل بالکل سیہ

تھے تعداد میں تیس زنجیر فیل
وہ بھیجے پئے نظر شاہ جلیل

جو آیا تھا یہ لےکے اس کا پسر
حضوریٔ شہ سے ہوا بہرہ‌ور

بٹھایا اسے شہ نے بالائے تخت
بغل‌گیر اس سے ہوئے نیک بخت

اسے شاہ نے بھاری خلعت دیا
مرصع کمر خنجر پُرضیا

عراقی و عربی دیے راہوار
بہ تعداد عشرین ہے ان کا شمار

ہوئی شاہ کی یہ عطائے جزیل
سگان شکاری دگر پنج فیل

کیا کونچ وہاں سے بہ جاہ و جلال
تھی ان روزوں میں قحط سالی کمال

ہوئے خشک و بےآب انہار و چاہ
کھلا دست جود و در گنج شاہ

بہت پلّہ نیکی کا سنگیں ہوا
ہر اک جاں بہ‌لب زندہ مسکیں ہوا

دیا غلہ بسیار و بسیارہا
یہ تقسیم ہوتا تھا خروارہا

زمیں پر نہ ہو جب کہ روئیدگی
دوابوں کی ہو کس طرح زندگی

دگر سال بھی یہ ہوا حال زار
رہی خشک کھیتی نہ تھا سبزہ زار

ہوا شاہ کو بھی بہت اضطراب
تو علماء دیں اور کل شیخ و شاب

پڑھی جاکے جنگل میں سب نے نماز
کیا استغاثہ بہ عجز و نیاز

نہ باران رحمت کا دیکھا اثر ہوا جب نہ کچھ اس کا پیدا اثر
تو اس وقت کہتی تھی خلقت بہم رعایا پہ ھیں شوم شہ کے قدم
یہ سن کر ہوا شاہ کو بس‌کہ غم گیا سمت صحرا کو با چشم نم
پئے سجدہ شہ نے جو رکھی جبیں ہوئی اشک‌باری سے سب تر زمیں
کیا عرض حق سے جو با چشم زار ہوئی جوش‌زن رحمت کردگار
نزول آب باراں ہوا اس قدر خود ھی شاہ پانی میں تھے تربتر
جو ہمراہ سلطان تھے ہم‌رکاب لرزتے تھے سردی سے تھا اضطراب
دعا کا جو یہ شہ کے دیکھا اثر ولی بہمنی ہوگئے مشتہر
اسی حالت جوش باران میں گئے بھیگتے قصر و ایوان میں
سنہ تسعہ و عشریں تھے اور آٹھ سو ہوئے حصن ماہور پر تیزرو
زمیندار سرکش تھا اک بد سرشت اسی کا تھا قبضہ بہ صد بندوبست
پئے قلعہ‌گیری جو لشکر چڑھا تو بے جنگ وہ شاہ کو دے دیا
حصار کلم گوندواڑہ میں تھا تھا معدن بھی اک اس میں الماس کا
کیا قبضہ اس پر بھی با تن‌دہی تو بت‌خانہ ماہور کے بھی سبھی
[ن]کیا اہل اسلام نے انہدام مساجد بنائے وہاں پر تمام
پئے درس عالم معین ہوئے چراغان اسلام روشن ہوئے
ایلچ‌پور میں کر کے چندے قیام ہوا دل‌کشا میں بھی دربار عام
جو مخلوق اطراف و اکناف تھے وہ مرہون احسان و الطاف تھے
تھے کرمان میں نعمت‌الله ولی کرامت تھی ان کی خفی و جلی
حبیب‌الله جندی تھے ان کے مرید دگر شمس دیں ایک مرد سعید
انھیں بھیجا شہ نے گئے اس طرف جو کرمان پہنچے یہ لے کر تحف
ولی کے جو دل کو بشاشت ہوئی تو نعمت پئے شہ عنایت ہوئی
مرید ولی تھے جو اک قطب دیں وہ تھے معتمد مثل اہل یقیں

ن شکستہ کیے وہ بہ جہد تمام

روانہ کیا ان کو سمت دکن
ہوئے تخت شاہی کے وہ بوسہ زن

مقفل تھا صندوق میں تاج سبز
ولی کا تھا وہ مرسلہ تاج سبز

ہوئے قطب دیں حاضر بارگاہ
پڑی شاہ کی جب کہ اس پر نگاہ

کہا شاہ نے یہ انھیں دیکھ کر
وہی ہے یہ درویش نیکو سیر

جو دیکھا تھا زیر شجر میں نے خواب
وہی شخص ہے یہ کرامت مآب

دیا تھا اسی نے مجھے تاج سبز
ہے صندوق میں یہ وہی تاج سبز

تبسم کناں قطب دیں نے کہا
رہیں مطمئن دل میں تو بادشاہ

اسی روز سے تا بہ تاریخ حال
امانت تھا یہ تاج جاہ و جلال

جو تھے نعمت اللہ ولی اللہ
یہ مضمون مکتوب تھا سوئے شاہ

ہے احمد شہ کل سلاطین ہند
سر سروران سلاطین ہند

پڑھا جاکے منبر پہ وہ بالتمام
لکھا تھا جو القاب احمد کے نام

ایلچپور میں شہ تھے رونق پذیر
تو بشّاش و فرحاں صغیر و کبیر

جو مائل ہوئے بہر سیر و شکار
نظر آیا اک کوہ رفعت شعار

پر از سبزہ اخضر سراسر زمیں
خوش اسلوب و خوش بو و خوشتر زمیں

ریاحین و گل سے تھا آراستہ
ہر اک رستنی سے وہ پیراستہ

ز ہر سو چشمۂ چوں آب حیواں
چراغ لالہ ہر جانب فروزاں

شقائق رستہ و سبزہ دمیدہ
نسیم صبح جیب گل دریدہ

نظر آیا درّاج مثل پری
خراماں تھا وہ مثل کبک دری

ہوا حکم شہ جو سوئے میر قوش
دیا چھوڑ شاہیں با عقل و ہوش

ہوا سمت درّاج جو یہ رواں
تو آنکھوں سے اس کے ہوا وہ نہاں

ہوا حملہ ور خود وہ شاہین پر
بچا اس کے پنجہ سے یہ بھاگ کر

کی درّاج نے ایسی جنگ و ستیز
تھی شاہین کو خود ہی اس سے گریز

یہ گویا ہوئے شاہ عالی وقار
زمیں کی یہ تاثیر ہے آشکار

عجب نزہت افزا ہے آب و ہوا
عجب فرحت افزا ہے آب و ہوا

مصمم ارادہ یہ شہ کا ہوا حصار متیں اس میں ہوئے بنا
مقرب جو درگاہ شاہی کے تھے وہ ہمراہ ظل الٰہی کے تھے
مخاطب ہو ان سے کیا یہ کلام فضا اس کی ہے مثل دارالسلام
قلعہ اک بنے اس میں ایسا متیں معہ کاخ و ایوان و حصن حصیں
رہے یاد وہ زیر چرخ کہن ہو شاہوں کی اس میں سدا انجمن
کیا حاضریں نے تب یہ التماس جو ہو حکم حاضر ہوں اختر شناس
ز اختر شناساں بپرسید شاہ کہ سازم من ایں جا یکی بارگاہ
ازو فر و بخمّ بساماں بود دیا کار با جنگ شاہاں بود
بگفتند یکسر بشاہ گزیں کہ خوبست و فرخندہ انجام ایں
سنا جب کہ یہ مژدۂ تہنیت مہندس جو تھے صاحب وقفیت
بدائع صنائع کے طرح فکن ہوئے مثل فرہاد وہ تیشہ زن
سرکوہ تھا اک حصار گلی وہ تھا کولیوں کا حصار گلی
وہ چو حدّہ تھی ایک دیوار خام پئے حفظ گاواں تھا وہ اک مقام
سنہ آٹھ سو تیس تھے شک نہیں ہے تاریخ اس کی حصارالمتیں
منازل مساجد دگر شہ نشیں بنائے ہیں اس میں بہ طرز گزیں
جو شیخ اسفرائے تھے اور آذری سخن گو وہ دانندۂ شاعری
ملازم تھے سلطان کے ہمرکاب قصیدہ ہے ان کا یہ با آب و تاب

اشعار قصیدہ

حبّذا قصر مشیّد کہ ز فرط عظمت آسماں شدہ از پایۂ ایں درگاہ است
آسماں ہم نتواں گفت کہ ترک ادب ست قصر سلطان جہاں احمد بہمن شاہ است
توقف ایلچپور میں جو ہوا مورخ نے اس کا سبب یہ لکھا
تھے دھلی میں تیمور عالم پناہ دکن میں تھے سلطان فیروزشاہ
کیا تھا جو پاس ان کے ان کا سفیر ہوئے خوش نہایت وہ صاحب سریر
جو ہے ملک گجرات اور مالوا معہ خاندیس اس نے ان کو دیا
کیا تھا بدیں وجہ اس میں قیام کہ لوں ملک مذکور یہ میں تمام

کروں قصد پھر سوئے بیجانگر
تھی تسخیر اس کی بھی مد نظر

ہوا یہ جو واضح بہ شاہ ہشنگ
بدلنے لگا اس کے چہرہ کا رنگ

جو نرسنگھ احمد کو دیتا تھا باج
بغاوت کا اس کو دیا اہتزاج

ہوا یہ جو نرسنگھ کو عار و ننگ
تو برہم ہوا اس سے شاہ ہشنگ

چڑھائی کی اس پر معہ لشکری
ہوئی دو دفعہ رجعت قہقری

سوم بار آخر کو شاہ ہشنگ
چلا فوج لےکر بہ پیکار و جنگ

کیا ملک نرسنگھ پر اس نے تاخت
لیے چھین اس کے کئی پرگنات

ہوا بس کہ نرسنگھ دل میں ظہیر
معہ عرض‌داشت آیا اس کا سفیر

یہ سلطان احمد کو اس نے لکھا
ہشنگ ہے جو اک والئ مالوا

ہے پرخاش پر مجھ سے وہ بےسبب
گرفتار ہوں میں بہ رنج و تعب

نزاع کی یہ ڈالی ہے اس نے اساس
جمع اس نے لشکر کیا بےقیاس

قدیمی ہے یہ فدوئ بارگاہ
مطیع اور منقاد فیروزشاہ

اطاعت جو کی میں نے شہ کی قبول
یہ اس کی عوض میں ہوا ہے حصول

ہے حکام اطراف کو دشمنی
مجھے کہتے ہیں بندۂ بہمنی

نہ پہنچے اگر شاہ امداد کو
تو آئےگا پھر کون فریاد کو

ہوا خان جہاں کو یہ فرمان شاہ
مدد کو روانہ ہو لےکر سپاہ

جو ہے فوج جرار ملک برار
روانہ ہو ہوشنگ پر ایلغار

بہانہ سے پھر خود بھی بہر شکار
چلے فوج ہمراہ لے شش ہزار

ایلچ‌پور میں آئے بہر شکار
تو کھیلا کیے قمرغہ کا شکار

رہا تا بہ دو ماہ سیر و شکار
شہ مالوی بھی چلا ایلغار

وہ کھرڈلہ کی سرحد پہ جو آ گیا
کیا تاخت و تاراج حد سے سوا

زبان اس نے کھولی بہ لاف و گزاف
جو کچھ منہ میں آیا کہا لام و کاف

ہوئی یہ خبر جب کہ مسموع شاہ
چلے سمت کھرڈلہ بہ فوج و سپاہ

تھے عبد الغنی صدر اور نجم دین
دگر مفتی و عالم و اہل دین

کیا عرض سلطان سے یہ بے درنگ | مسلمیں کے باہم ہو پیکار و جنگ
شریعت کی رو سے مناسب نہیں | ہے بدنامی اس میں بے حد یقیں
کہیں گے یہ آپس میں کل خاص و عام | حمایت کی کفار کی بالتمام
ہوا شاہ کے دل پہ اس کا اثر | جو تھا قصد اس سے کیا درگزر
شہ مالوہ کو یہ بھیجا پیام | ہو معلوم تم کو یہ بعد از سلام
ہے نرسنگھ جو بندۂ بارگاہ | سمجھتا ہے مجھ کو وہ پشت و پناہ
ہے کھرلہ جو اس کا حصار متیں | کوئی لے لے اس کو یہ آساں نہیں
عبث اور بیجا ہے اس کا خیال | فراواں ہے اس میں جدال و قتال
ہے رسم محبت کا یہ اقتضا | عناں گیر ہوں جانب مالوا
جو ہیں مفتی و عالم و اہل دیں | وہ اس جنگ سے ہیں کنارا گزیں
نہ پہنچا تھا وہاں تک یہ شہ کا سفیر | ہوا کونچ سلطان صاحب سریر
گیا ایلچی لے کے جس دم پیام | پر آشفتہ وہ ہوگیا بالتمام
تعاقب کیا اس نے سلطان کا | سپاہی تھا وہ مرد میدان کا
ہوا کونچ شہ کا تو اس کا مقام | تھا منزل بہ منزل بھی اہتمام
فقط ایک منزل کا تھا فاصلہ | ٹھہر جائے شہ تو نہ تھا فاصلہ
شہ مالوے کا یہ دیکھا جو حال | کیا عالموں سے یہ اس دم سوال
شریعت کا میں نے کیا اتّباع | نہ ہو اہل اسلام میں یہ نزاع
کیا کونچ وہاں سے کنارا کیا | جو تھا نیک اس کو گوارا کیا
مگر روز فردا یہ پایا قرار | مسلّح ہوں میں بھی پئے کارزار
وبال اور نکبت بہ حال خبیث | ہوا میں تو پابند قول حدیث
یہ تجویز علماء بہ روز دگر | علم کا کھلا شقہ با کر و فر
ہوئی فوج سلطانی آراستہ | پئے جنگ تھے مرد برخاستہ
کیا جا بجا اس طرح بندوبست | کھڑے کردیے فیل جنگی مست
تھی ہمراہ شہ فوج پندرہ ہزار | مگر اس کے ہمراہ تھی سی ہزار

کیا خان جہاں کو سوئے میمنہ ۔ تو عبداللہ خاں جانب میسرہ
رہا قلب لشکر میں شہ کا پسر ۔ تھا چتر سیہ اس کے بالائے سر
تھے عبداللہ خاں جو کہ با کر و فر ۔ لگائے تھے وہ چتر شہزادہ پر
کیا قلب کو شہ نے ان کے سپرد ۔ یہ اک مرد میدان تھے سو رو گرد
لیے اپنے ہمراہ جنگی سوار ۔ چنیدہ وہ اک فوج تھی دس ہزار
جو تھے دوازدہ فیل جنگی مست ۔ کمیں‌گہ میں ان کی نکالی نشست
تھا مانند سابق قیاس ھشنگ ۔ تعاقب کیا شاہ کا بےدرنگ
فراہم نہ تھے اس کے سب لشکری ۔ تو تھی فوج میں اس کے بھی ابتری
بہ جز جنگ کے تھا نہ چارہ دگر ۔ ن مقابل میں آئے لڑے ہم‌دگر
ہوئی دونوں جانب سے جو داروگیر ۔ شپاشپ تھی آواز شمشیر و تیر
پئے جنگ تھی آرزوئے قوی ۔ لڑے خوب ھی دکنی و مالوی
سپر ہاتھ سے پھینک مردانہ‌وار ۔ کیا گرم ہنگامۂ کارزار
تو اس وقت احمد شہ بہمنی ۔ دکھانے لگے بڑھ کے شیر افگنی
یہ کی تاخت اعدا پہ بےساختہ ۔ حواس ھشنگ ہوگئے باختہ
ہوئی ان کے حملوں کی اس کو نہ تاب ۔ گریزاں ہوا وہ بہ حال خراب
تعاقب میں تھے دکھنیے شیر گیر ۔ کیا قتل ان کو بہ شمشیر و تیر
ہوئے مالوی قتل سب دس ہزار ۔ بچی جان ان کی ہوئے جو فرار
گئے چھوڑ احمال و اثقال سب ۔ ہوا سم اسپاں سے پامال سب
حرم اور دو دخت شاہ ھشنگ ۔ گئے چھوڑ میداں میں ناموس و ننگ
معہ فیل دو بست تھے دست‌گیر ۔ ہوا جب کہ نرسنگھ اس سے خبیر
سر راہ مغرور کو ھیرکر ۔ کیا قتل اس نے بہ تیغ دوسر
مسلماں بہت اس میں کشتہ ہوئے ۔ تو شمشیر و تیروں سے خستہ ہوئے

(باقی آئندہ)

ن یہ ان پر چلے ان پہ وہ حملہ‌ور

درد تصور

ہم نشیں درد سے لبریز ہے افسانہ مرا
آتش فکر نے غارت کیا کاشانہ مرا

مجھ پر ایک فیض الٰہی ہے تصور سچ ہے
غیرت طرۂ شاہی ہے تصور سچ ہے
عالم دوں سے مجھے اس نے بچایا ہے ضرور
بے نیاز دوجہاں مجھ کو بنایا ہے ضرور
جادۂ غم میں مرا ساتھ دیا ہے اس نے
ڈوبتے وقت مجھے ہاتھ دیا ہے اس نے
دے کے موہوم امیدوں کا سہارا مجھ کو
بارہا بحر مصائب سے ابھارا مجھ کو
رو بہ رو آنکھوں کے سامان طرب پاتا ہوں
طاق تخئیل سے جب چاہوں اٹھا لاتا ہوں
زہرہ ہے زمزمہ پرداز شبستانوں میں
ماہوش جھومتے ہیں میرے طربخانوں میں
بخشتا کون ہے یہ فیض تصور کے سوا
کون ضو ریز مرے دل میں ہے اس در کے سوا
پھر بھی یہ سن کے تو انگشت بہ دنداں ہوگا
اور اس فیض الٰہی سے گریزاں ہوگا

ہم نشیں درد سے لبریز ہے افسانہ مرا
آتش فکر نے غارت کیا کاشانہ مرا

دل نازک پہ مرے بار گراں رہتا ہے
مجھ کو معلوم نہیں چین کہاں رہتا ہے
جرأت شک نے یقیں کا بھی نہ چھوڑا مجھ کو
فکر آوارہ! کہیں کا بھی نہ چھوڑا مجھ کو
صبح غم سوز بھی آہوں میں گزاری میں نے
زندگی موت کی راہوں میں گزاری میں نے
سیل آفات کو دم بھر نہ ٹھہرتے دیکھا
میں نے جب دیکھا زمانے کو گزرتے دیکھا
شکر و شہد میں بھی عنصر سم دیکھا ہے
گلشن زیست کو صحرائے عدم دیکھا ہے
دشت تخئیل کی تاریک و سیہ راہوں میں
موت آتی ہے نظر مجھ کو کمیں گاہوں میں

طبع حساس سے دشوار ہے جینا میرا
سخت طوفاں میں ہے کاغذ کا سفینہ میرا

رابندر ناتھ راز لاہوری بی۔ اے

تبصرے

تبصرے

ادب

کلیات میر تقی میر

معہ مقدمہ جناب مولوی عبدالباری آسی - صفحات ۹۷۶ - تقطیع ۲۲×۲۹ - مجلد -
قیمت پانچ روپے - ناشر نولکشور پریس لکھنؤ -

آدھی صدی سے زیادہ زمانہ گزرا کہ اسی نامی گرامی نولکشور پریس سے میر کا کلیات شایع ہوا تھا - بعد میں کئی انتخاب کلام میر کے نکلے مگر کلیات کا کوئی اڈیشن غالباً نہیں شایع ہوا - پہلے کلیات میں غلطیاں بے شمار تھیں - اس تازہ اڈیشن میں بہت ہی تھوڑی ہیں - آخر میں مشکل الفاظ اور محاوروں کی فرہنگ ہے اور شروع میں مولوی عبدالباری آسی کا لکھا ہوا بسیط مقدمہ ہے جو محنت سے لکھا گیا ہے - لیکن میر صاحب کی زندگی کے بعض اہم واقعات سے متعلق متنازعہ امور پر صرف رائیں اور نظریے پیش کرکے محاکمے سے گریز کیا ہے - بہ ہر حال تصحیح کے بارے میں مرتب کی کوشش قابل داد ہے - ایک ہزار صفحوں کی کتاب میں کچھ نہ کچھ اغلاط کا رہ جانا ترتیب اور اشاعت پر حرف نہیں لاتا - سرسری مطالعہ میں یہ مقامات تصحیح طلب نظر آئے امید ہے کہ اگلے اڈیشن میں یہ نقص بھی نکل جائیں -

صفحہ ۱۸۹ پر ایک شعر یوں واقع ہوا ہے :

ہریک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا
شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے

نیند کا یہ کوئی موقع نہیں اس کی جگہ میر صاحب نے ضرور ھند لکھا ھوگا.

ایک اور شعر صفحہ ۱۹۶ میں اس طرح لکھا ھے :-

طرف ھونا بڑا مشکل ھے میر اس شعر کے فن سے
یوں ھی سودا کبھی ھوتا ھے سو جاھل ھے کیا جانے

محاورہ مصرع اولی میں سے کی جگہ میں چاھتا ھے۔

ایک شعر صفحہ ۱۹۹ میں اس طرح ھے :—

کب کب مری عزت کے لیے بیٹھے ھو ٹک پاس
آئے بھی جو ھو تو مجھے مجلس سے اٹھانے

میر صاحب نے بیٹھے ھو کی جگہ آئے ھو لکھا ھوگا۔

ایک شعر صفحہ ۲۲۵ میں یوں ھے :—

چاھیے جیتے گزرے اس کا نام
منہ میں جب تک زبان ھے گویا

ظاھر ھے جیتے کبھی کاتب نے جیتے کی عاقبت بگاڑ کر لکھ دیا تھا۔ سو وہ غلطی اس اڈیشن میں بھی قایم رھی۔

جب یہ قاعدہ املا کا مسلم طور پر قرار پا گیا کہ آخر لفظ کی یاے معروف گول لکھی جائے تو اس سے سھل انگاری بھی بڑی غلطی ھے۔ صفحہ ۱۹۹ میں ایک شعر اس طرح لکھا گیا ھے :—

پایا ھے نہ ھم نے دل گم گشتہ کو اپنے
خاک اس کی سر راہ کوئی کب تئیں چھانے

اس ھے کو ھی لکھنا چاھیے۔

ایسی چند فروگزاشتوں سے قطع نظر مطبع کی یہ کوشش اور آسی صاحب کی محنت اور دقت نظر تحسین کے قابل ھے — اس گرانی کے زمانے کاغذ بہت عمدہ لگایا ھے اور جدول رنگین ھے۔

(ل۔ا)

متاع حرم

تاجور عثمانیہ تخلص زیب لدھیانوی کا منظوم کلام ۔ صفحات ۱۴۳ ۔ تقطیع ۱۷x۲۷ ۔ معمولی جلد ۔ قیمت ایک روپیا ۔ ناشر کریمی دواخانہ ۔ بازار شیخو پورہ ۔ لودیانہ ۔

زیب صاحبہ ان خواتین میں سے ہیں جن کا ذہن ادبی مذاق سے مالامال ہے اور جو کبھی سرسری اور بےمصرف موضوع پر قلم نہیں اٹھاتیں ۔ اس مجموعے کے دو حصے ہیں ایک میں مختلف موضوعوں پر نظمیں ہیں اور دوسرے میں غزلیں ۔ التزام یہ رکھا گیا ہے کہ ہر چیز نظم ہو یا غزل ایک ہی صفحے پر ختم ہوجائے اور اس کے شعر سات ہوں ۔

موضوعوں کا انتخاب بہت مناسب اور عہد حاضر کے مذاق کا نمایندہ ہے ۔ مثلاً رہبران قوم ۔ خاتون مسلم ۔ جدید عورت ۔ سرمایہ‌دار سے خدا کے سوالات وطن کا مستقبل وغیرہ ۔

زیب صاحبہ کا طرز بیان سادہ مگر مؤثر ہے ۔ تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیتیں ۔ امید ہے کہ مزاولت اور مشق سخن سے کلام اور اسلوب میں اور بھی خوبیاں آئیں گی ۔ ثقہ نظموں کی یہ جلد ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہے ۔

عشرت گیاوی کے سو شعر

صفحات ۳۲ ۔ کارڈ سایز ۔ قیمت ۲ آنے ۔ ملنے کا پتہ ۔ سید آل نبی ۔ حسنین منزل ۔ گیا ۔

ایسی جیبی چیزوں میں دیباچہ ایک دو صفحے سے زیادہ زیب نہیں دیتا ۔ یہاں پورے گیارہ صفحے ہیں ۔ ایسے شعر بھی انتخاب کردئے ہیں جو انتخاب کے قابل نہ تھے جیسے

دل مرا لے کے ملایا خاک میں کیا کہا تھا آپ نے اور کیا کیا
آشیاں بلبل بےکس کا خزاں کے ہاتھوں گل فتادہ پس دیوار گلستاں نکلا

صرف ایک ردیف (الف) میں سے سو شعر انتخاب کرنا بڑی مبادرت کا کام ہے ۔ کیا اچھا ہوتا کہ رسا صاحب دیوان عشرت کے چھپنے کا انتظار کرتے ۔

نہر سویز

یہ دلچسپ رسالہ عبداللہ بٹ صاحب نے تالیف کیا اور اس کا "نہر سوئز کی موجوں کے نام" انتساب کیا ہے! اس نہر کی تیاری سے یورپ و ایشیا کے تجارتی اور سیاسی تعلقات میں جو انقلاب پیدا ہوا وہ کسی صاحب نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ لائق مؤلف نے اس انقلاب انگیز تجویز کی تاریخ اور پھر گزشتہ صدی میں اس کے حیّز عمل میں آنے کا خاصی تفصیل سے حال قلم بند کردیا ہے۔ اسی ضمن میں مصر کی قومی اور سیاسی تحریکات پر بھی اپنے خاص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کتاب صاف ستھری چھپی اور قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ لاہور سے مجلد شایع ہوئی ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ڈیڑھ سو صفحات کے لیے ایک روپیہ چار آنہ۔ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن غالباً اس زمانے کی گرانی کے لحاظ سے اسے جائز رکھنا پڑا۔

تاریخ اسلام (حصہ دوم) بنی امیّہ

مرتّبہ شاہ معین الدین صاحب ندوی، رفیق دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ ضخامت ۳۸۰ صفحات۔ قیمت ۴ روپیہ۔

یہ تاریخ دارالمصنفین کے مفید کارناموں میں شمار ہونی چاہیے۔ پہلی جلد پر اردو میں گزشتہ سال تبصرہ کیا گیا تھا۔ اب دوسری جلد شایع ہوئی ہے جس میں بنی امیّہ کے عروج و زوال کے حالات کافی تفصیل اور سلیقے سے جمع کردیے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا تھا، اس تاریخ میں فاضل مولّف نے واقعات پر اس قسم کی تنقید و بحث نہیں کی ہے، جسے زمانہ حال کے تاریخ نویس اپنے فرائض میں داخل سمجھتے ہیں۔ تاہم دوسری جلد میں مولّف نے نسبۃً آزادی سے کام لیا ہے اور اسی لیے یہ حصّہ پہلے کی نسبت ہمیں زیادہ صاف اور شگفتہ معلوم ہوا۔ یقین ہے اہل ذوق اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

رباعیات عمر خیام پر ایک تحقیقی نظر

(از مولوی عبدالباری صاحب، آسی ۔ لکھنؤ)

حکیم عمر خیام

حکیم عمر خیام کے علم و فضل کا قایل نہ ھونا ھر تذکرہ نویس نے ایک اخلاقی کفر سمجھا ھے ۔ اور اسی وجہ سے تمام محققین کا متفقہ اجماع ھے کہ وہ فلسفہ و حکمت ۔ ریاضی ۔ طب ۔ نجوم ھی پر حاوی نہ تھا ۔ بلکہ اس کی عام معلومات علمیہ فقہ ۔ تفسیر ۔ علم تجوید ۔ معنی و بیان میں ایسی ھی دایر و سایر تھی جیسی کہ فن خاص ریاضی و نجوم میں ۔ اس سے اگر کسی مسئلہ خاص کا کسی بارے میں ذکر آتا تھا تو وہ اپنی ھمہ دانی کے ثبوت میں علوم کے دریا بہا دیتا تھا ۔ اور سامع کو اس کا حفظ و ضبط دشوار ھوجاتا تھا ۔ ایسے امام فن ۔ ایسے جوھر قابل کے لیے شعر و شاعری کا صحیح ذوق یا خود اس کا شاعر ھونا کوئی ذریعۂ افتخار نہیں ھوسکتا ۔ بلکہ اس کی دون مرتبت کا مترادف ھے اور کیا عجب ھے کہ اسی سبب سے اس کے شاگرد اس کے معاصرین اس کے شاعرانہ کمال کے بیان کو ضروری چیز نہ سمجھے ھوں ۔ جیسا کہ نظامی عروضی اور ابوالحسن بیھقی نے اس کو نظر انداز کردیا ھے ۔ اور نظامی عروضی باوجود شاگرد ھونے کے اس کو صرف نجومی کہہ کر رہ گئے ھیں ۔

خیام کی مستقل اور جید تصنیفیں دوسرے فنون میں موجود ھیں ۔ جن کی فہرست یہ ھے :—

عمر خیام کی تصانیف

(۱) رسالہ مکعبات (۲) رسالہ جبر و مقابلہ (۳) رسالہ شرح مااشکل من مصادرات اقلیدس (۴) زیج ملک شاھی (۵) رسالہ مختصر در طبیعات (۶) میزان الحکم (۷) رسالہ کون و تکلیف (۸) رسالہ فی کلیات الوجود (۹) رسالہ موضوع علم کلی و وجود (۱۰) رسالہ فی کلیات الوجود

(۱۱) رسالہ اوصاف یا رسالہ الوجود (۱۲) عربی اشعار ۔

مگر یہ سب گم شدہ جواہر کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اور سوائے اس کے کہ بعض بعض مشہور محققین نے علیحدہ علیحدہ ان کا ذکر اپنے اپنے مصنفات میں کیا ۔ مجموعی حیثیت سے کہیں ان کا وجود نہیں تھا ۔ علم کی روشنی پھیلنے پر کچھ کتابیں اس زمانہ میں ملیں جن میں سے کئی ایک چھپ گئی ہیں ۔ جیسا کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ سے ۱۹۳۰ء میں کئی رسالے خیام کے ذیل میں ایک مجلد میں طبع ہوچکے ہیں اور جستہ جستہ اس سے پہلے بعض دوسرے مطابع میں بھی بعض کتابیں شایع ہوئیں ۔ بعض آج بھی نایاب ہیں ۔ مگر علم و فن کا اس حادثہ فاجعہ پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے کہ خیام کی شہرت ان کی ان معرکہ آرا تصانیف سے وابستہ نہیں ہے ۔ بلکہ رباعیات ان کا سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں ۔ جن کے متعلق ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہیں ہوسکا کہ وہ اس مجموعہ کا مالک ہے یا نہیں اور ہے تو کس جزو کا ۔

عمر خیام کی رباعیات

رباعیات حکیم خیام کا مطالعہ کرنے والے نقاد دبی زبان سے ہمیشہ اس کے معترف رہے کہ ان کی رباعیات میں آمیزش ہے اور یہ سونا مغشوش ضرور ہوگیا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بتانے والے بہت کم پیدا ہوئے کہ یہ آمیزش کہاں سے ہوئی اور کیوں ہوئی ۔ اسی پر ہم کو کچھ کہنا اور لکھنا ہے ۔

ایک ایسے شخص کو جو رباعیات عمر خیام کے متعلق بحث کرتا ہو مجبوری ہے کہ وہ یہ بھی بحث کرے کہ رباعی کب شروع ہوئی اور فارسی میں اس کا دور دورہ کب ہوا لہذا مختصر طور پر یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ غزل اور قصاید و مثنوی وغیرہ اصناف سخن سے رباعی پہلی چیز ہے ۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ کسی صنف سخن کا پتہ ہی نہ تھا ۔ مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ترتیبی شہرت اور کمال دوسری چیزوں کو حاصل نہ ہوا تھا کہ رباعی عالم وجود میں آئی ۔

رباعی کی ابتدا

اس کے وجود میں آنے یا اس وزن کے دریافت ہونے کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں ایک یہ کہ غزنین یا سجستان کے کسی شہر میں کچھ بچے اخروٹوں سے گولیوں کا کھیل کھیل رہے تھے ۔ ایک اخروٹ یا ایک گولی

جو کچی سے دور تھی لڑھک کر اس کی طرف جانے لگی بچہ خوشی سے اچھل پڑا اور بیساختہ اس کی زبان سے (غلطاں غلطاں ھمی رود تا لب گو) نکل گیا ۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ھے کہ یہ لڑکا خاندان صفاریہ کے بانی یعقوب صفّار المتوفی ۲۶۵ ھ کا بچہ تھا ۔ یعقوب خود شعر و شاعری کا ذوق رکھتا تھا ۔ وہ کھڑا ہوا اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا اور جو کچھ بچے نے کہا وہ سن رہا تھا ۔ اس کو یہ وزن پسند آیا ۔ سوچا کہ یہ بحر کونسی ھے تو اس وجہ سے کہ اس وقت تک یہ وزن رایج نہ تھا اس لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ اس لیے اپنے درباری شعرا ابو دلف عجلی اور ابن الکعب کو بلا کر پوچھا کہ یہ کون سی بحر ھے ۔ انھوں نے غور و فکر کے بعد بتایا کہ یہ بحر ہزج کی ایک شاخ ھے ۔ پھر انھوں نے اسی پر تین مصرع اور لگا کر پورے دو شعر کردیے اور دوبیتی نام رکھا اسی طرح اور محققین نے بھی کچھ توجیہات بیان کی ھیں کہ اس کا نام رباعی کیوں ہوا ۔ مگر دولت شاہ سمرقندی نے یہ بھی لکھا ھے " تا فضلا دوبیتی را نکو ندیدند گفتند کہ این چھار مصرعی است رباعی نشاید گفتن " اور یہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ھے ۔ اس کو ترانہ قول ' چھاربیتی وغیرہ بھی کہا گیا مگر چونکہ یہ مبحث ہمارے مضمون سے دور ھے اس لیے اس کو طول دینا فضول ھے ۔ مقصد صرف اس قدر ھے کہ رباعی کا دور اگر متذکرۂ بالا روایت کے مطابق شروع ہوا تو بھی اس کے شروع ہونے کو خیام کے زمانے تک دوسو ڈھائی سو برس ہوچکے تھے ۔ اور یوں تو عرب کی شاعری میں بھی رباعی کا نام لیا گیا ھے ۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ھے کہ عرب کی شاعری میں رباعی کی وجہ تسمیہ یہ ھے کہ یہ وزن بحر ہزج سے مستخرج ھے اور وہ چار اجزاء سے مرکب ھے ۔ حالانکہ عرب کی رباعی فارسی کے مذاق سے بہت دور ھے اور اسے رباعی ماننے کو کم از کم میرا جی تو نہیں چاھتا ۔ پھر بھی اگر اس کو مان لیا جائے تو خیام کے زمانے تک رباعی پیدایش کی مدت اور دراز ہوجائے گی ۔

خیام کا سنہ ولادت اور وفات

اتفاق کی بات ھے کہ اتنے بڑے مشہور زمانہ حکیم کا صحیح طور پر نہ سنہ ولادت ھی معلوم ھے اور نہ سنہ

وفات کا تقرر ہوا ہے مگر قیاسات کی بنا پر مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے ان کا سنہ ولادت ۴۴۰ھ یا ۴۴۱ ہجری[1] مقرر کیا ہے - اور سنہ وفات ۵۱۵ سے ۵۳۰ھ[2] تک کوئی سال - اس طرح سے اس کی عمر کم ازکم ۷۵ برس اور زیادہ سے زیادہ ۹۰ برس کی مانی جا سکتی ہے - ۷۵ برس ہوں یا ۹۰ برس بہر حال یہ عمر طویل ہی کہی جائیگی اور اس میں حقیقتاً کام کرنے والا آدمی بہت کچھ کرسکتا ہے - چنانچہ خیام نے بھی اپنی قابلیت کی اپنے مذاق کی بنا پر بہت سی مثالیں اهل عالم کے سامنے پیش کردیں - جن کی ایک فہرست تصانیف ہم اس سے پہلے پیش کرچکے ہیں مگر افسوس کہ اس کی شاعری کا مسئلہ ان تصانیف اور اس کے فضل و کمال کے شمار و اعداد پیش کرنے کے باوجود بھی ویسا ہی الجھا ہوا رہ گیا - جس پر ایک تفصیلی بحث اور غایر نگاہ کی ضرورت ہے -

جیساکہ بیان کیا جا چکا رباعی خیام سے مدتوں پہلے کی چیز ہے - اور کئی ایک شاعر ایسے گزرے جن کی شاعری اگر مستقلاً رباعی کی پابند نہ بھی رہی ہو پھر بھی یہ صنف ان کے یہاں اور چیزوں سے زیادہ موجود تھی -

بایزید بسطامی سب سے پہلے حضرت بایزید بسطامی کا نام آتا ہے - جن کے نام سے بعض رباعیاں پائی جاتی ہیں - اگرچہ بعض محققین نے شک کیا ہے کہ حضرت بایزید نہ شاعر تھے نہ انھوں نے رباعیاں کہی ہیں - مگر بہر حال مجمع الفصحا میں تین رباعیاں ان سے منسوب کی گئی ہیں - اور تذکرۂ حسینی میں بھی ان کے نام سے ملتی ہے - تذکرہ صبح گلشن میں بھی دو رباعیاں ان سے منسوب کی گئی ہیں - آپ کا زمانہ وفات ۲۳۴ھ یا ۲۶۱ھ یا ۲۶۲ھ ہے - اور حسب امید ان کے یہاں جس قدر بھی رباعیاں ہیں وہ مذاق تصوف میں ہیں یا بعض میں اخلاقی اور واعظانہ انداز ہے -

رودکی دوسرا وہ شاعر جس نے اور اصناف کے ساتھ رباعیاں بھی کہیں ، رودکی تھا - جو فارسی شاعری میں ابوالآبا کا درجہ رکھتا ہے - اور جس کی بدیعہ نگاری

---

۱ خیام مطبوعہ ۱۹۳۳ع مطبع معارف اعظم گڑھ صفحہ ۵۹ سطر ۸ - و صفحہ ۶۰ سطر ۵ -
۲ صفحہ ۵۷ خیام -

اهل تذکرہ میں مسلم ہے ۔ اهل تذکرہ متفق هیں کہ یہ ۳۰۴ ھ میں پیوند خاک هوا ۔ مگر مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے ۳۲۹ ھ سال وفات بتاتے هوئے یہ بھی لکھا ہے کہ وفات کا سنہ مشہور غلط ہے ۔ اس کے دیوان مطبوعہ ایران میں رباعیاں اچھی خاصی تعداد میں موجود هیں اور پھر چونکہ وہ ایک درباری اور دنیادار شاعر تھا اس لیے اس کے کلام میں سبھی قسم کا کلام ہے اور یہی رباعیوں میں ہے ۔ عشقیہ حکیمانہ اخلاقی ۔ خمریات یہ تمام رنگ ملے جلے هوئے هیں ۔ جیسی ضرورت داعی هوئی ہے ویسا کہہ دیا ہے کوئی خاص رنگ نہیں ۔ البتہ مدح گستری کا جال ذرا زیادہ بچھا هوا ہے ۔ اتنا کہنا اور رہ گیا کہ پہلے لوگ هر چار مصرع کی چیز کو خواہ وہ قطعہ هی هو رباعی کہہ دیتے تھے ۔ اس کے دیوان میں بھی یہی هوا ہے رباعیوں کے وزن خاص کی رباعیاں کم تعداد میں هیں اور قطع بہت زیادہ ۔ پھر بھی یہ معلوم هوجاتا ہے کہ رباعیوں کے نام سے یہ سب کچھ کہا گیا اگرچہ اب ان سب کو رباعیات کے تحت میں نہ لایا جاسکے ۔ یا پھر چھاپنے والوں نے یہ بدعت کی کہ کچھ کا کچھ لکھ گئے ۔ رودکی کے بیشتر حصۂ کلام کو بھی حکیم قطراں کے کلام میں مخلوط بتایا جاتا ہے ۔ اور حکیم مذکور کا زمانہ سو برس قریب قریب رودکی کے بعد ہے ۔

ابونصر فارابی

تیسرا شخص ابونصر فارابی المتوفی ۳۳۹ ھ ہے اس کے ساتھ بھی بعض رباعیاں منسوب هیں اور تذکروں میں جستہ جستہ پائی جاتی هیں ۔ ان کی رباعیاں وهی حکیمانہ رنگ کی هیں ۔ جن میں حکمت ۔ فلسفہ ۔ موعظت سب هی کچھ ہے ۔ اور دراصل ایک حکیم یا صوفی یہی کہہ بھی سکتا ہے ۔ مگر چونکہ سوائے بعض تذکروں کے اور کوئی دلیل اس کے رباعی‌گو هونے کی نہیں اس لیے اس کی بھی مشتبہ حالت ہے ۔

ابوشکور بلخی

چوتھی صدی کا ایک شاعر ابوشکور بلخی بھی ہے ۔ تذکرۂ لباب‌الالباب عوفی میں اس کے نام کی بھی ایک رباعی ملتی ہے ۔

شمس‌المعالی

شمس‌المعالی کی بھی بعض رباعیاں تذکرہ لباب‌الالباب عوفی میں درج کی گئی هیں جو عشق اور خمریات میں کہی گئی هیں

شمس المعالی قابوس بن وشمگیر المتوفی ۴۰۳ھ دیلمی بادشاہ تھا جو ۳۶۶ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا ۔ اس کی بعض تصانیف مصر میں طبع بھی ہوگئی ہیں ۔

عنصری عنصری المتوفی ۴۴۱ھ کے یہاں بھی رباعیاں ہیں جو کچھ واقعات حالیہ اور کچھ حسن و عشق کے ہنگاموں پر منحصر ہیں ۔ مگر ان میں استادی ہو تو ہو کوئی خاص مزا اور لطف نہیں ہے ۔

عسجدی عسجدی جس نے ۴۳۲ھ میں وفات پائی ۔ بہت سنبھل کر کہنے والا ہے اور ان کی رباعیات میں عشق مجازی و حقیقی کی آمیزش نے ایک حسن خاص پیدا کردیا ہے جو اس کے دوسرے معاصرین کے یہاں نہیں ۔

شیخ بوعلی سینا حکیم شیخ بوعلی سینا کی رباعیاں بھی مشہور ہیں اور بعض بعض سفینوں اور بیاضوں میں ملتی بھی ہیں ۔ ڈاکٹر ایتھے ETHE نے ۱۸۷۵ع میں ان کی بارہ رباعیاں جمع کرکے چھپوائی تھیں ۔ ان میں شاعرانہ اور حکیمانہ و ظریفانہ خیالات کی آمیزش ہے اور کہیں ایسے خیالات بھی ہیں کہ متشرع لوگ ان کو پسند نہیں کرتے ۔

شیخ ابوالحسن خرقانی المتوفی ۴۲۵ھ کی بھی رباعیاں ملتی ہیں ۔ مگر ان کی بعض رباعیوں میں بابا طاہر کی طرح پہلوی کی آمیزش ہے اور بعض میں نہیں ۔ اس واسطے جن میں یہ آمیزش نہیں ہے ان کو بہ نظر شک دیکھا جاتا ہے ۔ اور محققین کو ان کی طرف منسوب کرنے میں باک ہوتا ہے ۔ پھر بھی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے ۔

بابا طاہر ہمدانی بابا طاہر ہمدانی بھی رباعی گو شاعر ہیں ۔ مگر زبان دیہاتی ہے خیال عاشقانہ زیادہ ہیں ان کی رباعیوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ میرے کتب خانہ میں بھی موجود ہے ۔ نامانوس زبان کی وجہ سے پڑھتے ہوئے بھی الجھن ہوتی ہے ۔ ان کا انتقال ۴۱۰ھ میں ہوا ۔

شیخ ابو سعید ابوالخیر رح شیخ ابو سعید ابوالخیر بھی رباعیوں کے بادشاہ تھے ۔ ان کی زیادہ رباعیاں عارفانہ ہیں جن کا چھپا ہوا ایک مجموعہ بھی مل جاتا ہے ۔ ان کا انتقال ۴۴۰ھ میں ہوا ان کی رباعیوں میں سوز و ساز کی وہ کیفیت ہے

که دوسروں کے یہاں نہیں -

علی بن حسن | علی بن حسن باخرزی المتوفی ۴۶۷ ھ ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ موجود تھا جو انھوں نے خود طرب نامے کے نام سے موسوم کیا تھا - ان کی رباعیات میں عاشقانہ واردات - مستانہ کیفیات - رندی و لاابالی پن کے خیالات اور کہیں کہیں اخلاقی اور واعظانہ انداز پایا جاتا ہے - اس کا ایک تذکرہ بھی ہے اسی میں بتایا ہے کہ اس کا ایک دوست محمد بن ابی نصر ہے جس کی رباعیاں فارسی میں موجود ہیں -

شیخ عبداللہ انصاری | ابو اسمعیل شیخ عبداللہ انصاری المتوفی ۴۸۱ ھ مشہور رباعی گو صوفی تھے ان کی رباعیاں اخلاقی - عارفانہ - اور عبرت انگیز ہیں -

امام محمد غزالی رح | امام محمد غزالی ان کی بھی کچھ رباعیاں تذکروں میں منقول ہیں اگرچہ وہ کچھ زیادہ نہیں ہیں - مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور آپ کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے رباعیات کا آپ کے یہاں پایا جانا کچھ تعجب انگیز نہیں - ان کی رباعیات میں حکیمانہ فلسفیانہ - رندانہ انداز ہے - آپ کا ۵۰۵ ھ میں انتقال ہوا -

امام احمد غزالی | امام احمد غزالی کی بھی رباعیاں تذکروں میں موجود ہیں یہ امام محمد کے بھائی تھے - آپ کی وفات کا سنہ ۵۲۰ ھ ہے -

یہی وہ رباعی گو - حکیم - صوفی اور شاعر ہیں جن کا خیام سے پہلے یا خیام کے دور میں پتہ چلتا ہے - اور جن میں سے بعض کی زیادہ تعداد میں اور بعض کی کم تعداد میں رباعیاں پائی جاتی ہیں - ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی باقی ہوں جو حالت گم نامی ہی میں تمام ہوگئے ہوں اور جن کے ساتھ خاک نے ان کے کارناموں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہو - یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کی صرف بعض رباعیاں بہ روئے کار آئی ہوں اور زبانی شہرت دنیا میں پھیل گئی ہو - مگر بہت سی کائنات گنج مدفون بن کر رہ گئی ہو - اس واسطے کہ اس وقت نہ تو اشاعت کے صحیح سامان تھے - نہ پریس تھے نہ دوسرے آلات نشر - زیادہ سے زیادہ زبانی شہرت پر اعتبار کی بنا تھی -

ورنہ کتابوں کی نقل جو مصنف کے دور حیات میں دس بیس سے آگے بڑھنا غیر ممکن تھی، کسی کی تصنیف کا نام مشہور ہوجانا ھی بڑا کمال اور بڑا کام تھا۔ اسی لیے بہت سے ماہر اور کامل مصنفوں کی اعلی تصانیف کو تو گوشۂ گمنامی سے نکل کر زبانوں پر آنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔

ان سب رباعی‌گو شعرا کی رباعیوں کو دیکھنے کے بعد ذرا خیام کی رباعیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے کہ آج ہم کو اس کے مجموعے بارہ سو رباعیات سے پانچ ھزار تک پر مشتمل ملتے ھیں۔ تھوڑی سی تشریح تعداد آپ کو ذیل کے نسخوں کی تشریح اعداد رباعیات سے معلوم ھوسکے گی۔

(۱) فٹز جیرالڈ نے ۵۸۔۱۸۶۰ء میں بےحد کوشش اور چھان‌بین کے بعد جو نسخہ شایع کیا اس میں رباعیات کی تعداد صرف پچھتر تھی۔ اور اسی طرح پیرس کے ایک نسخہ منقولہ میں جو ۹۳۷ھ کے مخطوطہ سے نقل ھوا رباعیوں کی تعداد پچھتر تھی۔

(۲) ایک قدیم ترین نسخہ جو باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ھے اور جو ۸۶۵ھ یعنی ۳۴۸ سال بعد وفات مصنف لکھا گیا اس میں ۱۵۸ رباعیاں ھیں۔ اسی نسخہ کو ایڈورڈ هیرن یلن نے ۱۸۹۸ء میں عکس لےکر شایع کیا تھا۔ فریڈرک روزن کے مطبوعہ نسخہ میں غلطی سے رباعیوں کی تعداد ۱۸۵ چھپ گئی ھے۔

(۳) فان ھومر جرمنی کے زبردست مستشرق نے اپنے ایک نسخہ کی بابت لکھا ھے کہ اس میں دو سو رباعیاں ھیں۔

(۴) موسیونکولس فرانسیسی کانسل مقیم رشت نے ۱۸۶۷ء میں جو نسخہ پیرس سے شایع کیا اس میں رباعیوں کی تعداد ۴۶۴ ھے۔ یہ نسخہ فٹز جیرالڈ کے نسخے کے ایک سال بعد شایع ھوا۔

(۵) بائبلوتھک نیشنل کے ایک نسخہ میں جو ۱۵۲۸ء کا لکھا ھوا ھے رباعیوں کی تعداد ۳۴۹ ھے۔

(۶) وھائن فیلڈ نے جو نسخہ ۱۸۸۳ء میں شایع کیا اس میں پانچ سو رباعیاں ھیں۔

(۷) جان پاپن کے نسخے میں رباعیوں کی تعداد ۵۴۸ ھے۔

(۸) کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کے نسخے میں ۸۰۱ رباعیاں ہیں -
(۹) ڈاکٹر اسپرنگر کا بیان ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک نسخہ میں چار سو رباعیاں دیکھیں -
(۱۰) کلکتہ سے جو ایک نسخہ ۱۸۳۶ع میں شائع ہوا اس میں ۴۳۸ رباعیاں ہیں مگر ضمیمہ کے طور پر اس میں ۱۵۴ رباعیاں اور بھی شامل کی ہیں -
(۱۱) ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نسخہ میں ۵۱۶ رباعیاں ہیں -
(۱۲) بانکےپور پٹنہ کے ایک نسخہ میں ۶۰۴ تعداد بتائی گئی ہے -
(۱۳) بابو گوری‌پرشاد سکسینہ صاحب سکسینہ لکھنؤ کو ایک نسخہ دستیاب ہوا جو ۸۲۶ھ کا لکھا ہوا ہے اس میں رباعیات کی تعداد ۲۰۶ ہے -
(۱۴) محمد سلیم صاحب (لاھوری) کے نسخے میں جو ۸۶۸ کا لکھا ہوا ہے رباعیات کی تعداد ۱۴۳ ہے -
(۱۵) سید نجیب‌اشرف ندوی کا ایک نسخہ جو دیسنہ پٹنہ کی لائبریری میں محفوظ ہے اور ۹۱۱ھ کا مخطوطہ ہے اس کا ایک صفحہ اول کم ہے اور مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے اسی سے نقل لےکر ۱۳۵۱ھ میں اپنا نسخہ شایع کیا ہے اس میں ۲۰۶ رباعیاں ہیں - جس میں سے ۲۰۵ بہ وجہ ایک رباعی کے گم ہونے کے نقل ہوکر شائع ہوئیں -
(۱۶) ہالینڈ میں ایک ترجمہ شایع ہوا مگر اس میں چند رباعیاں تھیں معلوم نہیں نسخہ منقول عنہ میں اسی قدر رباعیاں تھیں یا بقیہ کو نظر انداز کردیا تھا -
(۱۷) مس - جی - سی - ای کیڈل نے ۱۲۰۰ رباعیات کا ایک نسخہ جمع کردیا تھا افسوس کہ اس کا سنہ معلوم نہیں ہوسکا -
(۱۸) محمد شفیع‌الدین خاں مرادآبادی ممبر ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے ۱۹۰۷ع میں ایک نسخہ اس دعوے کے ساتھ شایع کیا کہ میرے پاس نہایت معتبر دو انگریزی نسخے موجود ہیں انھیں سے رباعیوں کو فارسی ترجمہ کرکے شایع کیا جاتا ہے - اس میں صرف ۱۷۲ رباعیاں ہیں -

(۱۹) منشی جے نراین ورما نے ۱۹۰۵ع میں لکھنؤ مطبع جےنراین ورما سے ایک نسخہ شایع کیا اس میں رباعیات کی تعداد ۵۰۰ ھے۔

(۲۰) ڈاکٹر فریڈرک روزن کے نسخے میں ضمیموں کے علاوہ ۳۲۹ رباعیاں ھیں اس کے علاوہ ایک ضمیمہ ۶۲ رباعیوں کا اور ایک عکسی ضمیمہ میں ۱۲ رباعیاں شامل ھیں یہ نسخہ ۱۳۰۴ شمسی میں کادیانی پریس برلن سے طبع ھوا۔

(۲۱) پیام خیام میں جو رباعیات عمرخیام کی شرح ھے اور ڈاکٹر سعیداحمد بریلوی ایم۔بی۔ایس نے معہ مسٹر ظفرقریشی بی۔اے کے مقدمہ کے مصور کراکے محبوب المطابع برقی پریس سے شایع کیا ۴۵۶ رباعیاں ھیں۔

(۲۲) مولوی جلال الدین صاحب زینبی نے جو نسخہ معہ شرح انواراحمدی پریس الہ آباد سے شایع کیا اس میں ۹۰۸ رباعیاں ھیں۔

(۲۳) مطبع نولکشور میں جو نسخہ ۱۳۳۲ھ میں شایع ھوا اس میں ۷۷۰ رباعیاں ھیں۔

(۲۴) تذکرہ رباعیات عمرخیام شرح ولی اللہ صاحب بی۔اے میں جو ۱۹۲۳ع میں شایع ھوا تقریباً چھے سو رباعیاں ھیں۔

اس قدر نسخوں کی تعداد رباعیات کے دیکھنے سے صاف صاف یہ بات سمجھ میں آجاتی ھے کہ اس کے کلام میں یقینی دوسروں کا کلام شامل ھوگیا۔ اور وہ خالص نہیں رھا اور یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ لوگوں نے صرف اپنے خیال اور اپنی معلومات کی بنا پر اس کے نام کے نسخے مرتب کیے۔ ورنہ اگر کوئی نسخہ پہلے سے مرتب ھوتا تو دوسری بڑی بڑی تصنیفوں کی طرح اس قدر تغیر ممکن نہ تھا۔ ھاں یہ ھوسکتا ھے کہ کچھ لفظی غلطیاں اور آمیزشیں ھوجاتیں۔ اور اختلاف نسخ یہیں تک رھتا۔ محدثین اور فقہا کی تصانیف اور نسخوں کے اتحاد مضامین اور یکسانیت کو دیکھیے کہ ان میں سوائے معمولی لفظی اختلاف کے کوئی فرق نہیں اور ھر جگہ ایک ھی طرح کے ملتے ھیں۔ حالانکہ یہ واقعہ ھے کہ ان میں سے بہت سی کتابیں خیام سے بہت پہلے وجود میں آئی تھیں اور ان پر صدیاں گزر چکی تھیں پھر اگر اس پر یہ عذر پیش کیا جائے کہ ایسی کتابوں کی

حفاظت مذہبی ہونے کی حیثیت سے کی گئی ۔ تو کہا جائے گا کہ مذہبی کتابوں کے علاوہ بھی خیام سے پہلے کے بہت سے لوگوں کی تصنیفیں محفوظ موجود ہیں جو من و عن چلی آتی ہیں پھر آخر خیام کے ساتھ ہی زمانے کو کیا عداوت تھی کہ یہ شعبدہ‌گری برروئے کار آئی ۔

نسخوں کا اختلاف صرف تعداد و شمار رباعیات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ہر نسخہ کی ابتداء ایک نئی رباعی سے ہوتی ہے قدیم نسخوں اور جدید مطبوعہ نسخوں میں برابر یہ بوالعجبی کار فرما ہے خود میرے پاس مضمون لکھتے وقت جس قدر نسخے موجود ہیں انہیں سے اندازہ ہوجاتا ہے پیام خیام یعنی شرح رباعیات خیام ڈاکٹر سعید احمد بریلوی میں :-

گویند بہشت و حور عین خواهد بود

نسخہ مرتبہ محمد شفیع‌الدین خاں مرادابادی :-

زاں پیش کہ از جام اجل مست شوی

نسخہ کشوری ۔ و نسخہ منشی جے نرائن ورما :-

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما

نسخہ مشرح حافظ مولوی جلال الدین احمد :-

ساقی بکرم تو می کنی یاد مرا

نسخہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی :-

چون عهده نمی شود کسے فردا را

نسخہ فریڈرک روزن صاحب مطبوعہ برلن :-

تا بتوانی طعنہ مزن مستانرا

اسی پر دوسرے نسخوں کا قیاس کرلیجیے ۔ بعض محققین نے اس اختلاف کو ذرا توضیح کے ساتھ دکھایا ہے مگر نتیجہ یہی نکلتا ہے جو ہم نے عرض کیا ۔ کہ خیام کا کوئی نسخہ ایسا مستند نہیں جس پر یہ بنیاد خیال قائم کی جاسکے کہ خود خیام کا لکھا ہوا ۔ یا اس کے زمانے کا مرتبہ ہے ۔

خیام سے پہلے اور خیام کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ ہر معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی کتاب کا بھی کوئی نام رکھا جاتا تھا ۔ چنانچہ جن حضرات کی رباعیات زیادہ تعداد میں ہیں ان کے اگر علیحدہ نسخے مرتب ہوئے ہیں تو ان کے نام بھی موجود ہیں ۔ جیسا کہ طرب نامہ شمس المعالی ۔ اور مختارنامہ عطار ۔ یہ رباعیات وغیرہ کے مجموعے ہیں ۔ خود خیام کی ہر ایک کتاب کا نام موجود ہے ۔ مگر رباعیات کے نسخہ کا کوئی نام نہیں ۔ اس لیے اس وقت اس کے ہاتھ سے کسی نسخے کا مرتب ہونا ہرگز متیقن نہیں ۔ اسی وجہ سے خیام کے کلام پر تنقید و تنقیح کرنے والوں نے برابر افسوس کیا ہے کہ اس کے وقت کا کوئی مستند نسخہ دستیاب نہیں ہوا ۔

خیام کے زمانے سے پہلے اور اکثر خیام کے زمانے کے تک اکثر رباعی گو ہوئے مگر اتفاق وقت سے چند ان میں سے متعارف ہیں اور چند گوشۂ گم نامی کے زینت افروز ۔ مگر جو مشہور بھی ہوئے ان کی رباعیاں بھی تعداد و شمار میں زیادہ نہیں ہیں ۔ اور ان میں سے اکثر کی رباعیاں خیام کے مجموعے میں ملی ہوئی ہیں ۔

اکثر رباعیاں ایسی ہیں جو مدتوں سے مشہور ہیں ۔ مگر صحیح طور سے یہ متعین نہیں ہوا کہ کس کی ہیں ان کی ایک فہرست ژوکووسکی نے مرتب کرکے ان کو آوارہ گرد رباعیوں کا خطاب دیا ہے ۔ اور بتایا ہے کہ یہ رباعیاں ان لوگوں کے نام سے منسوب ہیں اور خیام سے بھی منسوب ہیں ۔ ان آوارہ رباعیوں کی بہت بڑی تعداد خیام کے مجموعے میں موجود ہے ۔ اور ان آوارہ رباعیوں کی نسبت ان تمام مشاہیر سے کی گئی ہے جن کے نام دنیا کی زبانوں پر ہیں ۔ روسی مستشرق ژوکوفسکی نے جس مجموعہ رباعیات خیام کو دیکھا اس میں کل ۴٦۴ رباعیات تھیں اس میں سے بیاسی رباعیاں آوارہ فرض کی تھیں ۔ مگر (کریستن زن) نے اس تعداد کو ایک سو ایک تک پہنچایا ۔ اور لطف یہ کہ ان ایک سو ایک غیر اصلی رباعیات میں سے ۱۹ عدد رباعیاں اس مشہور اور مستند علیہ بوڈلین لائبریری کے نسخے میں بھی موجود ہیں جس کو سب سے قدیم مانا گیا ہے ۔ جس سے یہ صریحی معلوم ہوتا ہے کہ الحاق کی علت اسی زمانے سے پیدا ہوچکی تھی ۔

کریستن زن نے ان کے خالص خیام کی رباعیاں ڈھونڈنے کی ایک یہ صورت نکالی کہ

صرف وہ رباعیاں لے لیں جن میں خیام کا تخلص ہے اور ان پر اصلی ہونے کا بھروسہ کیا یہ رباعیاں بارہ ہیں ۔ اور دراصل یہ ایک بہتر طریقہ تھا ۔ مگر فریڈرک روزن نے اس طریقہ کو بھی قابل اطمینان نہیں سمجھا ۔ اول تو کریستن زن ہی کو ایک رباعی پر شبہ ہوا کہ اصلی شاعر کا نام نکال کر خیام کا نام ڈال دیا ہے اور اسی پر دوسری رباعیوں کا قیاس کیا ۔ اسی طور پر مستشرق جرمنی روزن نے پانچ رباعیوں کو مختلف دلایل سے مسترد کردیا اور اس مجموعے میں سے چھ رباعیاں باقی رہ گئی ہیں ۔

ایک صورت رباعیات خیام کے اصلی ہونے کی یہ بھی تجویز کی ہے کہ جو رباعیات قدیم کتابوں میں مذکور ہیں ان کو اصلی مانا جائے ۔ جیسا کہ نزہۃالارواح شہرزوری میں ۔ یہ دو رباعیاں پائی جاتی ہیں :-

(۱) گویند بحشر گفتگو خواہد بود — وان یار عزیز تندخو خواہد بود
از خیر محض جز نکوی ناید — خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

(۲) از واقعہ ترا خبر خواہم کرد — و انرا بدو حرف مختصر خواہم کرد
با عشق تو در خاک فرو خواہم شد — با مہر تو سر ز خاک برخواہم کرد

یا فردوس‌التواریخ میں یہ دو رباعیاں ہیں :-

(۱) ہر ذرہ کہ بر روئی زمینی بودہ است — خورشید رخی زہرہ جبینی بودہ است
گرد از رخ نازنین بآزرم فشان — کان ہم رخ و زلف نازنینی بودہ است

(۲) سیر آمدم ای خدائی از ہستئی خویش — از تنگ دلی و از تہی دستی خویش
از نیست چو ہست میکنی بیرون آر — زین نیستیئم بحرمت ہستی خویش

مگر ان میں سے بھی پہلی رباعی کو انگریزی مستشرق (رس) نے حکیم سنائی سے منسوب بتایا ہے ۔ پھر بھی یہ رباعی تاریخ گزیدہ تالیف ۷۳۰ ھ حمداللہ مستوفی میں بھی عمرخیام سے منسوب بتائی ہے اور اسی کے نام سے لکھی گئی ہے ۔ الغرض اگر اس طریقہ کار کو مانا جائے کہ خیام کی وہی رباعیاں مانی جائیں جو ان کے نام سے قدیم کتب میں موجود ہیں تو صرف چند رباعیاں ان کی ملک ٹھیریں گی ۔ اور باقی غیروں کا مال ہوگا ۔ اس پر بھی اگر طرز کلام پر تنقید کی جائے تو ان رباعیوں کی تعداد اور کم ہوجائے گی ۔

اب ذرا ان چیزوں پر بھی نگاہ ڈال لینا چاہیے جن سے استدلال کیا جاتا ھے کہ خیام رباعی‌گو شاعر تھا۔ اس بارہ میں محققین نے مندرجہ ذیل گواہوں کو پیش کیا ھے :—

(۱) مولف قابوس‌نامہ یعنی کیکاوس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر رئیس جرجان۔ جو اپنی کتاب قابوس‌نامہ میں جو ۴۷۵ ھ میں خیام کی زندگی میں لکھی گئی خیام کے دو شعر نقل کرتا ھے۔

(۲) نزھۃ‌الارواح شہرزوری۔ اس میں خیامؔ کی دو رباعیاں بھی لکھی گئی ھیں جن کو ھم پہلے نقل کرچکے ھیں۔ یہ کتاب ۵۸۶ ھ سے ۶۱۱ ھ تک کی تصنیف بتائی گئی ھے اور اس میں عربی و فارسی میں اس کے شاعر ھونے کی گواھی بھی ھے۔

(۳) تاریخ‌الحکماء قفطی جو ۶۲۴ ھ سے ۶۴۶ ھ کے درمیان کی تالیف ھے خیام کے بعض عربی اشعار نقل کیے ھیں۔

(۴) خریدۃ‌القصر جو اس عہد کے عربی شعرا کا تذکرہ اور ۵۷۲ ھ کی تالیف ھے۔ اس میں خیام کے عربی اشعار ھیں۔ عمادالدین اصفہانی کاتب اس کا مولف ھے۔

یہ ممکن ھے کہ ان کے علاوہ اور گواھیاں بھی مل سکیں مگر افسوس کہ وہ ھمارے علم میں نہیں آئیں۔ اب دیکھنا چاھیے کہ یہ گواھیاں کہاں تک درست ھوسکتی ھیں۔ خیام کے لیے شاعر ھونا کوئی بڑی بات نہیں اس لیے اس کی شاعری سے انکار ایک غلط اور دور از کار بات ھوگی۔ مگر صرف قابوس‌نامہ کے دو شعر اس کی رباعیات کے لیے مفید نہیں اور ان کی بنا پر اس کو رباعیات کا مصنف نہیں مانا جاسکتا۔

شہرزوری کی تصنیف میں دو رباعیاں ھیں ان میں سے بھی ایک رباعی سنائی سے منسوب ھے۔ اور ایک رباعی جو رہ جاتی ھے۔ اس کو تذکرۂ آتشکدہ میں سلطان ابویزید آل سلطان مظفر برادر شاہ شجاع سے منسوب کیا ھے۔ اور غالباً اسی کی پیروی المغنم‌البارد (مجموعہ رباعیات مرتبہ نواب محمد صدیق حسن خاں مرحوم) مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۹ ھ میں کی گئی ھے کاس‌الکرام شرح رباعیات خیام میر ولی‌اللہ بی۔ اے میں یہ رباعی قطران بن منصور ترمذی کی طرف منسوب ھے۔ شمع انجمن میں بھی سلطان ابویزید کے نام سے ھے۔ اور یہ دونوں قدیم شعرا میں سے ھیں یہاں تک کہ قطران انوری المتوفی ۵۴۷ ھ

کا استاد ہے۔ ایک دیوان اور قوس‌نامہ اس کی یادگار ہیں ۔ تاریخ الحکما ایک تو خیام کے بہت بعد کی تصنیف ہے اور ۶۲۴ ھ سے ۶۴۶ ھ تک اس کا عالم وجود میں آنا بتایا جاتا ہے۔ اگر خیام کا انتقال ۵۳۰ ھ ہی میں مان لیا جائے تو بھی ایک صدی کی مدت سے کچھ زیادہ کے قریب کا زمانہ گزر جاتا ہے۔ جس میں زبانی اور شہرت یافتہ باتوں کی ایک سربفلک دیوار قائم ہوسکتی ہے۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ اس میں محض عربی اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کا خیال ہے کہ تاریخ الحکما کو اس کی شاعرانہ حیثیت سے کوئی کام نہ تھا۔ حالانکہ اس میں عربی اشعار موجود ہیں۔ مگر شہرزوری نے جو عربی شعر نقل کیے ہیں اس میں سے بھی تین شعر یتیمۃالدہر قسم رابع میں ابوسہل سعید بن عبدالعزیز نیلی المتوفی ۴۲۰ ھ سے منسوب ہیں۔

فارسی کا ایک قطعہ بھی خیام سے منسوب ہے جس کے اشعار یہ ہیں :-

دوش با عقل در سخن بودم — کشف شد بر دلم خیالے چند
گفتم اے مایۂ ہمہ دانش — دارم الحق بہ تو سوالے چند
گفتمش چیست زندگانیِ دہر — گفت خوابیست یا خیالے چند
گفتم ازوے چہ حاصل است بگو — گفت درد سر و وبالے چند
گفتمش نفس رام کے گردد — گفت چون یافت گوشمالے چند
گفتم اہل زمان چہ طایفہ اند — گفت گرگ و سگ و شغالے چند
گفتمش بحث اہل دنیا چیست — گفت بیہودہ قیل و قالے چند
گفتم اہل زمانہ در چہ فن اند — گفت در بند جمع مالے چند
گفتمش چیست کتخدائی گفت — ہفتۂ عیش و غصہ سالے چند
گفتم او را مثال دنیا چیست — گفت زالے نہادہ خالے چند
گفتمش چیست گفتہ‌ہائے خیام — گفت پندے و حسب حالے چند

اول تو یہ قطعہ خواہ وہ کتنا ہی نصایح کے بیش بہا جواہرات سے آراستہ ہو خیام کے طرز کلام کا حاوی ہی نہیں۔ اور ہر وہ شخص جس کو خیام کے بات کہنے کا

ڈھنگ معلوم ہے معاً اس تہ کو پہنچ جائےگا کہ یہ نسبت درست نہیں - اس کے علاوہ میر ولی‌اللہ بی - اے نے رباعیات خیام کی شرح کے مقدمہ میں اس کو نقل کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے ایک قدیم دیوان حافظ کے قلمی نسخے میں حافظ کے نام سے یہ قطعہ دیکھا - اور گفتہ ہائے خیام کی بجائے گفتۂ حافظ پایا - ممکن ہے کہ یہ بھی غلطی ہو اور ہم اس قطعہ کو حافظ کی ملکیت بھی ثابت نہ کرسکیں مگر خیام سے اس کو واسطہ نہیں ہوسکتا اور مقطع میں جس طرح خیام کا لفظ ٹھونس دیا گیا ہے خیام کے علم و فضل کے لیے وہ ایک توہین سے زیادہ نہیں -

الغرض وہ گواہیاں جو خیام کی شاعری کے متعلق دی گئی ہیں نہایت کمزور ہیں - اور ان پر اعتماد نہیں ہوسکتا اب ایک اور بات بھی دیکھیے کہ نظامی عروضی سمرقندی جو خیّام کا ایک سربرآوردہ اور مشہور شاگرد تھا - اس نے چہار مقالہ میں خیام کے علم حساب و نجوم کے کمال کا تو ذکر کیا - مگر خیام کی شاعری کا مطلق تذکرہ نہیں - حالانکہ اس نے دوسرا مقالہ (ماہیت علم شعر اور صلاحیت شاعر) میں لکھا ہے - یہ بات کس‌قدر عجیب ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کا ذکر کرے اور کہیں اپنے استاد کا بھول کر بھی نام نہ لے -

اسی طرح بیہقی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا - جو حکیم صاحب کا معاصر ہے -

یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ ان کے قلم کا - یا ان کے زمانے کا لکھا ہوا کوئی نسخہ کم از کم اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا -

یہ مسئلہ بھی صاف ہوگیا ہے کہ ان کی رباعیوں میں الحاق کا بےپایاں طوفان موجزن ہے اور کوئی محقق کسی صورت میں مطمئن نہیں ہے یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ رباعیات کے بہت سے نسخے ہیں - اور نہ رباعیات کی ترتیب ہی یکساں ہے نہ یہی ہے کہ جو رباعیاں ایک نسخے میں ہیں وہ دوسرے میں بھی ہوں - ایک میں کچھ ہیں دوسرے میں کچھ - کسی میں کوئی رباعی ہے - کسی میں نہیں -

ڈاکٹر فریڈرک روزن نے اپنے نسخے میں آوارہ رباعیوں کی جو مختلف نسخوں میں خیام کے یہاں مختلط ہوگئی ہیں ایک فہرست دی ہے جن کی تعداد مجموعی بہت

بڑی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعیات کے دیباچے خیام کے مجموعے کی بڑی تعداد دوسروں کی فرض کی گئی ہے اور یہ حالت ہر نسخے میں ہے۔ مگر انھوں نے طول کی وجہ سے یا اور کسی سبب سے کوئی رباعی نہیں لکھی صرف اعداد و شمار پر کفایت کی ہے۔

یہی مستشرق لکھتا ہے: «عدّہ رباعیات را کہ بطور کلی بخیام نسبت دادہ شدہ تا پنجہزار تخمین کردہ اند۔ ازینجا معلوم می گردد کہ بمرور زمان رباعیات و اضافات دیگری داخل گفتہ‌ہائی عمر شدہ آنہا را از حالت خلوص خارج نمودہ است بقسمیکہ امروز تمیز رباعیات خود خیام از میان این تودۂ اشعار کاریست دشوار»

اسی محقق کی طرح دوسرے محقق بھی مُقر ہیں کہ ان رباعیوں میں سے خیام کی خالص رباعیات کا نکالنا اور انتخاب کرنا بہت دشوار اور ناممکن کام ہے۔

خیام کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں جن کی تعداد رباعیات بہت زیادہ ہے۔ مندرجۂ ذیل مضامین پائے جاتے ہیں۔ اور یہی مضمون چھوٹے اور بڑے مجموعوں میں مشترک طور پر موجود ہیں کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ ان سب کے ثبوت کے لیے ہم صرف ایک ایک رباعی پیش کرتے جائیں گے:

(۱) متصوفین کا مقولہ اور خیال ہے کہ زندگی میں زندگی کے عقدہ کا حل ہونا دشوار کام ہے بلکہ اس کو سمجھنا امکان نظر و بشر سے قطعاً خارج ہے۔ اور اسی صورت سے دنیا کے وجود کا راز سمجھنا بھی محالات سے ہے۔ مثلاً:

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من   وین حرف معمّا نہ تو خوانی و نہ من
هست از پس پردہ گفتگوئی من و تو   چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

(۲) کائنات کی ہر چیز مظہر نور ذات ہے۔ اور ہر چیز اسی کا پرتو ہے۔ ان کا اصلی مرکز وہی ذات ابدی ہے۔ مثلاً:

اے دل ز غبار جسم اگر پاک شوی   تو روح مجردی بر افلاک شوی
عرش است نشیمن تو شرمت بادا   کائی و مقیم خطہ خاک شوی

(۳) دنیا فانی ہے۔ یہاں کی کسی چیز کا اعتبار نہیں۔ اس میں غم ہیں۔ ہم ہیں۔

اور کہیں شادمانی کا وجود نہیں -

شادی مطلب که حاصل عمر دمی است هر ذره ز خاک کیقبادی و جمے است
احوال جهان و اصل این عمر که هست خوابی و خیالی و فریبی و دمی است

(۴) فرصت هستی کو غنیمت سمجھو اور اس میں جو کچھ جی چاهے وه کر ڈالو پھر اس کا میسر آنا دشوار ہے -

می خوردن و شاد بودن آئین منست فارغ بودن ز کفر و دین دین منست
گفتم به عروس دهر کابین تو چیست گفتا دل خرم تو کابین منست

(۵) خمریات - یہی وه چیز هے جس نے اس هوسناک اور عیش‌پرست دور میں خیام کو مشهور یا بدنام کیا اس میں ان کی بہت سی رباعیات هیں مگر اکثر رباعیاں دوسروں کی هیں جو اس کے سر ڈال دی گئی هیں چنانچه زوکوسکی کی ۸۲ رباعیوں میں ۳۳ رباعیات جن میں شراب کا بیان هے دوسروں کی خیال کی جاتی هیں پھر بھی اس کے یہاں اس قسم کا بہت کافی مساله ره جاتا هے -

سنت مکن و فریضه‌ها را به گزار وین لقمه که داری ز کسان باز مدار
غیبت مکن و دل کسی را مآزار در عهدهٔ آنجهان منم باده بیار

(۶) ریا کار صوفیا اور مشایخ پیشه‌ور کی هجو - اور ان کی ظاهر پرستی سے تنافر و بیزاری -

پوشیده مرقع اند این خامی چند نا رفته ره صدق و صفا گامی چند
بگرفته ز طامات الف لامی چند بدنام کنندهٔ نکو نامی چند

(۷) رحمت اور طلب آمرزش - دعائیں اور حقوق بندگی کے عدم ادائی کا اظهار اپنا عجز اور بے بسی - گناهوں سے شرمساری -

بر سینهٔ غم پذیر من رحمت کن بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائی خرابات رو من بخشائی بر دست پیاله گیر من رحمت کن

(۸) خداوند کریم آمرزگار حقیقی هے وه اپنے کرم سے تمام خطائیں اور گناه معاف کر دے گا - وه خیر محض هے اس سے خیر هی هوسکتی هے -

گویند بحشر گفتگو خواهد بود وان یار عزیز تندخو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

(۹) معتزلۂ جبریہ فرقہ کے خیالات ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ چاہا وہ کیا اور وہ جو چاہےگا کرےگا بندہ مجبور محض ہے:

از رفته قلم هیچ دگرگوں نه شود وز خوردن غم بجز جگر خون نه شود
گو در همه عمر خویش خونابه خوری یک قطره از انکه هست افزون نه شود

(۱۰) اخلاق و آداب کے نکات ۔ عام طور سے نیکی کرنا:

با دشمن و دوست فعل نیکو نیکوست بدکی کند آنکه نیکش عادت و خوست
با دوست چو بد کنی شود دشمن تو با دشمن اگر نیک کنی گردد دوست

(۱۱) بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ بخشش کا قصہ ۔ روز جزا کا وجود یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں ۔ ان کی فکر اور غم محض وہم ہے اور اس جھنجٹ میں پڑ کر دنیا کے عیش و آرام کو چھوڑنا حماقت پر مبنی ہے:

تا چند زنم بروئی دریاها خشت بیزار شدم ز بت پرستان و کنشت
خیّام که گفت دوزخی خواهد بود که رفت بدوزخ و که آمد ز بهشت

(۱۲) عالم حادث ہے یا قدیم ۔ یہ مسئلہ بھی علمائے اسلام میں مہتم بالشان کا درجہ رکھتا ہے ۔ اور اس پر بھی خیام نے کہیں کہیں روشنی ڈالی ہے:

چون نیست مقام ما درین دیر مقیم پس بی مئی و معشوق خطائیست عظیم
تا کی ز قدیم و محدث ای مرد سلیم چون من رفتم جهان چه محدث چه قدیم

(۱۳) عشق و عاشقی کے مضامین بھی رباعیات میں شامل ہیں اگرچہ بعض محققین خیام کی رباعیوں سے اس جزو کو نسبت نہیں دیتے ۔ اس قسم کی رباعیاں بھی اسی بیان میں شامل سمجھنا چاہیے جن میں عشق کا فلسفہ اور عشق حقیقی و مجازی کا فرق ظاہر کیا ہے مثلاً:

عشقی که مجازی بود آبش نه بود چون آتش نیم مرده تابش نه بود
عاشق باید که ماه و سال و شب و روز آرام و قرار و خورد و خوابش نه بود

(۱۴) ان کے علاوہ متفرق مضامین ہیں ' جن میں عبرت ۔ نصیحت ۔ دل خوش کن ترانے

سب ھی چیزیں شامل ھیں اور ان کی مثال کا تعین ناکافی ھوگا۔

اب سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ کیا یہ سب ایسی چیزیں اور ایسے مضمون ھیں کہ جن کا خیّام سے پہلے وجود نہ تھا۔ اور ان کو صرف خیام کی ملکیت بہ جبر ماننا پڑے گا۔ ممکن ھے کہ سرسری نظر میں کوئی کہہ دے کہ ایسا ھی ھے مگر بہ امعان نظر دیکھنے پر یہ تمام چیزیں متقدمین اور معاصرین خیام کے یہاں مل جاتی ھیں۔ دنیا سے بیزاری۔ ساقی سے بادہ و جام کی خواستگاری۔ حکمت و فلسفہ کے مسایل تمام چیزیں موجود ھیں۔ اور ان کی مثالوں کے پیش کرنے کی بجائے ہم یہی کہہ کر خاموشی اختیار کرتے ھیں کہ: آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ کسی کا کلام اٹھائیے۔ گہری نگاہ ڈالیے اور سب چیزیں دیکھ لیجیے۔ رھے متاخرین ان کے یہاں تو دریا بہہ رھے ھیں جس کے دیوان کو اٹھائیے کچھ نہ کچھ مل رھے گا۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ھوئے اگر یہ کہہ دیا جائے تو کیا غلط ھے کہ خیام نے خود کوئی رباعی نہیں کہی بلکہ اس نے متقدمین اور معاصرین کے کلام سے ایک مجموعہ جمع کیا اور مختلف صحبتوں میں مختلف لوگوں کے سامنے اس کی رباعیاں حسب موقع پڑھیں جنھیں لوگوں نے خیام کے نام سے منسوب کردیا اور شدہ شدہ وہ ان کی ملک خالص یا مشترک کا درجہ حاصل کرگئیں یا یہ کہ خود اس زمانے کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی کچھ کہا۔ مگر خدا معلوم وہ کیا تھا اور کس کے یہاں مخلوط ھوا۔

آج پریس نے شہرت کی دشواریوں کو آسان کردیا ھے۔ ایک معمولی مدت میں شہر بہ شہر۔ ادانی و اعالی تک شہرت پہنچ جاتی ھے۔ مگر اس زمانے میں یہ سب کچھ نہ تھا۔ نہ ریڈیو نہ تار نہ ٹیلیفون۔ مدتوں میں کہیں نسخوں کی نقلیں لی جاتی تھیں۔ اور عمروں میں ایک باکمال باکمال کہنے کے قابل ھوتا تھا۔ مکالمۂ باھمی اور تبادلۂ گفتگو ایک روایت کو کچھ کا کچھ بلکہ بیشتر مسخ کرکے پیش کرتا تھا۔ اور یہی وجہ ھے کہ آج ھم نسخوں میں زیادہ سے زیادہ اختلافات پاتے ھیں۔

ھمارے سامنے ایک قدیم سے قدیم نسخہ ڈاکٹر فریڈرک روزن کا ھے جس کو ۷۲۱ھ کے مخطوطہ نسخے کی نقل بتایا گیا ھے۔ مگر دیکھنا چاھیے کہ خیام کی زندگی اور وفات

سے اس کو کس قدر بُعد ہے۔ اور اتنے دنوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ سکتی ہے۔ یقینی یہ مدت نقل کو اصل کر دکھانے کے لیے ناکافی نہیں ہوسکتی۔

آج سے سات آٹھ برس پہلے میرے بعض احباب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں محققین کے فیصلے کے مطابق ان رباعیوں کا انتخاب کروں جو خیام کی طرف منسوب ہوگئی ہیں یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ مگر تاہم میرے ذوق نے اس کو منظور کیا اور نہ معلوم کس قدر کتابوں کو چھان ڈالا۔ اور ان رباعیوں کو نکالا جو خیام کے نام سے منسوب ہیں اور ان کی نہیں ہیں۔ اس انتخاب کے لیے میں نے مطبع نولکشور کے ۱۳۳۲ھ والے نسخہ کو منتخب کیا جس میں رباعیوں کی تعداد ۷۷۰ ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نسخے بھی پیش نظر رکھے جس کے نتیجے میں صرف ایک ہی نسخے سے بہت کافی تعداد ایسی ملی کہ اگر اتنی تعداد میں سے اتنی تعداد منتخبہ نکل جائے تو ہرگز یقین نہیں آتا کہ بقیہ رباعیاں خیام کی ہوں گی۔ چنانچہ ذیل میں پہلے ردیف وار ان رباعیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے بعض نسخوں پر بھی تنقید کی جا سکے گی۔

(۱) آمد سحری ندا ز میخانۂ ما کای رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز می زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

یہ رباعی خیام کے نام کے ساتھ اس قدر چسپاں ہوگئی ہے کہ ایک ایسا آدمی جس کو اس کے کلام پر عبور کلی نہیں ہے خیام کے نام کے ساتھ نسبت دے کر پڑھ دیتا ہے مگر گلستان مسرت میں حیاتی گیلانی کے نام سے لائی گئی ہے۔ اور شراب کے بیان میں جہاں بہت سے اشعار ہیں وہاں یہ رباعی بھی ہے۔

حیاتی گیلانی المتوفی ۱۰۱۵ ایک آزاد منش درویش وضع شاعر تھا۔ مولانا غلام علی آزاد نے ذخیرۃالخوانین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خانخانان اس کو خزانے میں لے گیا۔ اور حکم دیا کہ جس قدر اشرفیاں اٹھا سکے اٹھا کر لے جائے۔ میں نے ایک قلمی نسخہ منتخبات کلام حیاتی کا دیکھا۔ اور اس میں اس رباعی کو ڈھونڈا نہ مل سکی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت خوش گو اور جذباتی شاعر تھا

اس کا ایک یہ شعر :-

درمیان کافران هم بوده ام   یک میان شائستۂ زنار نیست

سعدی کے نام سے مشہور ہوگیا ہے ۔ یہ رباعی بھی نہایت جوش اور جذبات کا اظہار کرتی ہے مگر افسوس کہ اس کے یہاں اس قسم کی خمریاتی شاعری بہت کم ہے اس لیے ممکن ہے کہ یہ رباعی اس کی نہ ہو ۔ تذکرۂ ہفت اقلیم امین رازی میں اس کو سلمان ساوجی المتوفی ۷۷۸ھ سے منسوب کیا ہے ۔ سلمان ان باکمالوں میں سے ہے جن کے کلام میں ہر قسم کا رنگ ہے ۔ رباعی ۔ قصیدے ۔ غزل میں وہ اپنا آپ ہی جواب ہے حافظ نے سلمان کے کلام سے استفادہ کیا ہے اور اس کی مدح میں کہا ہے :-

سر آمد فضلائی زمانه دانی کیست   ز راه صدق و یقین نی ز راه کذب و گمان

شهنشه فضلا بادشاه ملک سخن   جمال ملت و دین خواجه جهان سلمان

تذکرہ تمنا میں بھی یہ رباعی سلمان ہی سے منسوب بتائی گئی ہے ۔ نسخہ برلن منقولہ مخطوطہ ۷۲۱ھ اور نسخہ دارالمصنفین منقولہ مخطوطہ ۹۱۱ھ میں یہ رباعی نہیں پائی جاتی ۔

(۲) گر می نه خوری طعنه مزن مستان را   گر دست دهد توبه کنم یزدان را

تو فخر بدین کنی که من می نخورم   صد کار کنی که می غلام است آن را

یہ رباعی افضل کاشانی المتوفی ۷۰۷ھ کی ہے چنانچہ رباعیات بابا افضل مطبوعہ طہران میں موجود ہے ۔ اور بہ‌جائے (گر می نه خوری) (تا به توانی) ہے ۔ افضل کاشانی کے یہاں ایک بڑی تعداد رباعیوں کی موجود ہے ۔ جن میں ہر رنگ پایا جاتا ہے اور وہ ۳۸۲ رباعیاں ہر جذبے پر منقسم کی جاسکتی ہیں یہ رباعی برلن کے نسخے میں موجود ہے مگر مرتبہ دارالمصنفین میں نہیں ہے ۔ اس رباعی میں ناصحانہ رنگ ہے ۔ اور اس قسم کی نصیحتیں خیام ایسا فلسفی نہیں کرسکتا نہ یہ اس کی طرز و روش نہ یہ اس کا طرز بیان ۔ وہ ناصحانہ انداز میں کہہ سکتا ہے مگر اس کا انداز واعظانہ نہیں ۔

(۳) چون عهده نمی شود کسی فردا را   حالی خوش کن تو این دل سودا را

می نوش بنور ماه ای ماه که ماه   بسیار بـه تـابد و نیـابـد مـا را

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار المتوفی ۶۲۷ھ کی ہے مختارنامہ کشوری مشمولہ کلیات عطار مطبوعہ کشوری میں صفحہ ۱۰۰۲ پر موجود ہے۔ عطار رح نے بہت رباعیاں کہیں۔ جن میں سے ایک معقول تعداد خود انھوں نے ضایع کردی۔ اور اب بھی ہزاروں کی تعداد میں مختارنامہ میں موجود ہیں۔ اور ان میں ہر قسم کے خیالات ہیں۔ ان کی ایک اور رباعی بھی اسی قسم کے خیال کی سنیے:-

روزیکه بود روز هلاک من و تو   از تن ببرند جان پاک من و تو
از بسکه نباشیم درین طـاق کبود   چه مه تابد بر سر خاک من و تو

رباعی کا چوتھا مصرع بجنسه نقل کردیا گیا ہے۔ ظاهرا سکته سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ رباعی بھی فریڈرک روزن کے نسخے میں نہیں ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب کے مطبوعه نسخے میں موجود ہے۔

(۴) بت گفت به بت‌پرست کای عابد ما   دانی ز چه روئی کشتهٔ ساجد ما
بر ما به جمال خود تجلی کرد است   آن کس که ز تست ناظر و شاهد ما

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کے۔ مجموعه رباعیات افضل مطبوعه طهران میں بھی موجود ہے۔ نسخه برلن و دارالمصنفین دونوں میں نہیں پائی جاتی اور حقیقت میں خیام کے طرز گفتار کو جن صورتوں سے منسوب کیا جاتا ہے وہ اس میں موجود نہیں۔ رمز و کنایه۔ شوخی کی بجائے اس میں ایک صاف صاف وحدت وجود اور همه اوست کا مسئله بیان کیا گیا ہے۔

(۵) با بط می گفت ماهی در تب و تاب   باشد که بجوئی رفته بـازاید آب
بط گفت که چون من و تو گشتیم کباب   بود از پس مرگ ما چه دریا چه سراب

تذکرہ آتشکدہ آذر۔ اور روز روشن میں یہ رباعی بندار رازی (مداح مجدالدوله دیلمی) سے منسوب کی گئی۔ بندار کا کوئی دیوان یا مجموعه نہیں دیکھا گیا مگر اس کی بعض رباعیاں تذکروں میں ملتی ہیں اور یہ پانچویں صدی کے اوایل تک یا چوتھی صدی کے آخر کا شاعر ہے جو خیام کے دور سے پہلا دور ہے۔ ملک قمی کی ایک رباعی بھی اسی قسم کی ہے جس میں پہلا مصرع تو بالکل متوارد ہوگیا ہے رباعی یہ ہے:-

با بط می گفت ماهی در تب و تاب می گشت چو در آتش سوزنده کباب
دردا و دریغا که درین دیر خراب گه بر سر آتشیم و گه بر سر آب

(٦) از بادهٔ ناب لعل شد گوهر ما آمد به فغان ز دست ما ساغر ما
از بسکه همی خوریم می بر سر می ما در سر می شدیم و می بر سر ما

یہ رباعی شیخ فخرالدین عراقی المتوفی ٦٨٨ ھ کے دیوان میں موجود ہے۔ اور مولانا روم المتوفی ٦٧٢ ھ یا ٦٦١ ھ کی رباعیات میں بھی شامل ہے۔ مولانا کے یہاں ہر قسم کی رباعیاں پائی جاتی ہیں اور میرے نزدیک زیادہ انہیں سے اس کی نسبت درست ہے۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اسے خیام سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ یہ تصنع اور آورد متاخرین کے یہاں ہوتی ہے۔ ابتدائے زبان و شعر میں یہ کوششیں نہیں ہوتیں۔

(٧) خرم به تو داشتم دل پر غم را هجر تو حزین کرد دل خرم را
من تلخیٔ عالم به تو خوش میکردم با تلخی هجرت چه کنم عالم را

یہ رباعی خواجہ مجدالدین همگر المتوفی ٦٨٢ ھ کی ہے چنانچہ تذکرۂ ہفت اقلیم امین رازی ذکر مجدالدین همگر میں انہیں سے منسوب کی گئی ہے۔ خیام سے ایسے فراقیہ عضامین کی نسبت نہیں دی جاسکتی۔ ڈاکٹر فریڈرک روزن اپنے نسخہ کے دیباچہ میں عشقیہ مضامین کی نسبت لکھتے ہیں "در اشعار حقیقی خیام مضامین عشق ظاهری خیلے کم است۔ و اگر چیزی دیده شود مقصود عشق تصوف است۔ برخلاف نسخ جدیده متن ما ازین اشعار کم دارد و درین عدهٔ معدود هم عشق ظاهری ابداً مورد توجه نیست و به کلی زیر پرده می ماند"

(٨) عاشق همه روز مست و شیدا بادا دیوانه و شوریده و رسوا بادا
در هشیاری غصهٔ هر چیز خوریم چون مست شدیم هر چه بادا بادا

یہ رباعی بھی مولانا روم سے منسوب ہے اور ان کے مجموعہ رباعیات مطبوعہ اسلامبول مطبع اختر ١٣١٢ ھ میں موجود ہے۔ نیز المغنم البارد مرتبۂ نواب صدیق حسن خاں مرحوم مطبوعہ ١٢٩٩ ھ بھوپال میں بھی مولانا روم ہی سے منسوب ہے۔ یہ کتاب

رباعیات کا ایک مجموعہ ہے۔ اور اس میں ہزارہا رباعیات متقدمین و متاخرین کی نام بہ نام جمع کی گئی ہیں۔ میرے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ رباعیات خیام کے قدیم نسخوں میں یہ رباعی نہیں پائی جاتی۔

(۹) ساقی قدحی کہ کارسازست خدا و ز رحمت خود بندہ نوازست خدا
می‌خور بہ بہار و بار طاعت مفروش کز طاعت خلق بی‌نیاز است خدا

ساقی نامۂ اہلی شیرازی کا ایک قلمی نسخہ میری نگاہ سے گزرا جس میں یہ رباعی اہلی شیرازی سے منسوب ہے اس میں چوتھا مصرع اس طرح پر لکھا تھا:

می‌خور بہ نیاز و ناز طاعت مفروش

اہلی امیرعلی شیر کے مداحوں میں سے تھا۔ اور اس کا ایک دیوان بھی ہے جو اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ نہایت خوش‌گو تھا۔

(۱۰) خواہی ز فراق در فغان دار مرا خواہی ز وصال شادمان دار مرا
من با تو نہ گویم کہ چساں دار مرا زانساں کہ دلت خواست چناں دار مرا

یہ رباعی افضل کاشانی کے مجموعہ رباعیات مطبوعہ آتشکدہ طہران میں موجود ہے اور انہیں سے منسوب ہے۔ مگر المغنم البارد مطبوعہ ۱۲۹۹ ھ میں امیرخسرو دہلوی کے نام سے لکھی گئی ہے۔ اور چوتھے مصرع میں یہ تغیر ہے:

ز آنساں کہ تو خواہی آن چناں دار مرا

یہ بھی عشقیہ اور التجائیہ سی رباعی ہے جس کی خیام سے امید نہیں کی جاسکتی۔

(۱۱) اجزائی پیالۂ کہ در می پیوست بشکستن آن روا نمی دارد دست
چندیں سر و دست نازنین و بر و دست از مہر کہ پیوست و بہ‌کین کہ شکست

یہ رباعی خواجہ نصیرالدین طوسی المتوفی ۶۷۲ ھ سے منسوب ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی اور زوکوسکی نے بھی انہیں سے منسوب بتایا ہے۔ اسی قسم کی ایک رباعی تاریخ نایاب میں ذکر شیخ شرف‌الدین بوعلی‌شاہ میں اس قصہ کے ساتھ لکھی ہے۔ کہ سلطان محمد تغلق نے شیخ شرف‌الدین بوعلی‌شاہ قلندر رح کو یہ رباعی لکھکر بھیجی:

که راست کند صورت مردی و زنی که بشکند این طلسم جانی و تنی
کس نیست که استاد قضا را پرسد کز بهر چه سازی و چرا می شکنی

انھوں نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھکر بھیجی:

شرطست که در امر قضا دم نزنی این نوع که گفتی نه تو مردی نه زنی
گل را چه مجالست که پرسد ز کلال کز بہرچه سازی و چرا می شکنی

معلوم ہوتا ہے کہ دونوں رباعیاں اسی ایک رباعی سے نکال لی گئی ہیں۔ کیوں‌که قصہ کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی۔ یہی رباعی مذکورہ بالا افضل کاشانی کے مجموعۂ رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور افضل کی ایک اور رباعی بھی اسی مضمون کی ہے:

از عرش خدا تا بہ ثری ملک خداست در ملک خدا ہرچه کند حکم رواست
کس را نه رسد که پرسد از حضرت حق کین حکم چگونه بود وآن حکم چراست

(۱۲) ای چرخ فلک خرابی از کینۂ تست بیدادگری عادت دیرینۂ تست
ای خاک اگر سینه تو بہ شگافند بس گوهر قیمتی که در سینۂ تست

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہے۔ اس کو مہستی گنجوی شاعرہ دور سنجر بادشاہ سے بھی منسوب کیا ہے۔ مہستی اپنے زمانے کی نہایت زودگو اور مشہور شاعرہ تھی۔ اس کا دیوان مرتب ہوچکا تھا۔ مگر وہ برباد ہوکر نایاب ہوگیا۔ اس کی کچھ رباعیاں اب بھی تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ بعض نے اس کا وطن نیشاپور بتایا ہے۔ یہ رباعی اس نے غالباً اپنے کسی عزیز یا شوہر کی وفات پر کہی ہے۔ اس کی ایک اور رباعی بھی اس قسم کے غم کا پتہ دیتی ہے:

شبہا که بہ ناز با تو خفتم همه رفت درها که بناز غمزه سفتم همه رفت
آرام دل و مونس جانم بودی رفتی و هرانچه با تو گفتم همه رفت

(۱۳) ما کافر عشقیم و مسلماں دگر است ماور ضعیفم و سلیماں دگر است
از ما رخ زرد و جگر پاره طلب بازارچۂ قصب فروشاں دگر است

یہ رباعی بھی رباعیات مولانا روم کے مجموعہ میں موجود ہے۔ تذکرۂ تنبیہ الجہلا میں جو شعر کے جواز و عدم جواز کی بحث میں لکھا گیا ہے اس میں بھی مولانا روم ہی سے

اس کو منسوب کیا گیا ہے۔ مرزا غالب مرحوم کی ایک رباعی جو اسی طرز و روش کے ساتھ کہی گئی ہے ملاحظہ کیجیے:

غالب روش مردم آزاد جداست رفتار اسیران ره و زاد جداست
ما ترک مراد را ارم میدانیم و ان باغچه ضبطئ شداد جداست

غلام مصطفےٰ بلگرامی کی بھی ایک رباعی ہے:

ما عاشق ذاتیم و صفاتی دگر است بیرون ز جهاتیم و جهاتی دگر است
ما واجبی ایم ذکر واجب گوئیم افسانه نویس ممکناتی دگر است

(۱۴) چون هشیارم ز من طرب پنهان است چون مست شوم در خردم نقصان است
حالیست میان مستی و هشیاری من بندهٔ آنکه زندگانی آن است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے۔ اور ان کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہے پہلا مصرع اس طرح پر ہے:

چون هشیارم در طربم نقصان است

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میانہ روی کے لیے یہ خیام کی بہترین نصیحت ہے۔ مگر شاید ان حضرات کو یہ خیال نہیں کہ خیام اس قسم کا ناصح شاعر نہیں ہے۔

(۱۵) هر سبزه که بر کنار جوئی رسته است گویا ز لب فرشته خوئی رسته است
پا بر سر سبزه تابخواری نه نهی کان سبزه ز خاک لاله روئی رسته است

یہ رباعی شیخ نجم‌الدین رازی معروف بہ دایہ المتوفی ۶۵۴ ھ سے منسوب ہے تذکرہ حسینی مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۲ ھ صفحہ ۳۴۷ ذکر شیخ نجم‌الدین رازی اور المغنم البارد صفحہ ۷۰ میں بھی ایسا ہی ہے خیابان عرفان جو فارسی رباعیات کا مجموعہ حیدرآباد سے طبع ہوا ہے اس میں بھی انھیں نجم‌الدین سے نسبت دی گئی ہے۔ ایک تذکرہ قلمی مولفہ غلام امام شاگرد حکیم مومن میں بھی اسی نسبت کو قائم رکھا گیا ہے۔ مگر آتشکدۂ آذر میں شیخ مجدالدین المتوفی ۶۱۶ سے منسوب کیا ہے۔ اگرچہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اور بھی رباعیات منقول ہیں مگر یہ نسبت شیخ نجم‌الدین دایہ رح کی طرف زیادہ درست ہوسکتی ہے اور انھیں کی طرف محققین کی اکثریت بھی ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ خیال اس قدر عام ہے کہ متقدمین اور متاخرین دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے چنانچہ حکیم سنائی رح کی یہ رباعی:

هر ذره که بر روئی زمینی بوده است خورشید رخی زهره جبینی بوده است
گرد رخ آستین بآزرم فشان کانهم رخ خوب نازنینی بوده است

یا قاضی محمد صادق اختر مولف تذکرۂ آفتاب عالمتاب المتوفی ۱۸۵۸ع کی یہ رباعی:

این سبزۂ تر سبزنگاری بوده است وین غنچه گل رشک بهاری بوده است
گلچین گل را مچین ز بیدردیها کان عارض شوخ گلعذاری بوده است

یا شیخ فریدالدین عطار رح:

هر میوۂ و گل که از زمین بیرون است از خاک یکی سبز خطی گل گون است
هر نرگس و لالۂ که در هامون است ازچشم خوش و وز جگر گل ن گون است

یا شمس الدوله محمد بلخی کی یہ رباعی:

هر لاله که چشم کو هساری بوده است صد قطره ز خون شهر یاری بوده است
مسپر به قدم سبزۂ بستان گستاخ کان وسمۂ ابروی نگاری بوده است

(۱۶) می بر کف من نه که دلم در تاب است وین عمر گریز پائی چوں سیماب است
برخیز که بیدارئی دولت خواب است دریاب که اتش جوانی اب است

یہ رباعی اشرف الدین حسن بن ناصرالدین علوی غزنوی سے منسوب ہے هفت اقلیم قلمی محفوظہ یونیورسٹی لائبریری لکھنؤ صفحہ ۱۲۱ اور اس میں یہ تغیر ہے کہ بجائے (دریاب) (بشتاب) مصرع چہارم بجائے مصرع سوم اور مصرع سوم بجائے چہارم ہے۔

خیام کے مجموعے میں اسی رباعی سے یہ رباعی یا تراش لی گئی ہے یا ممکن ہے کہ اس سے یہ رباعی لی گئی ہو۔

(۱۷) در ده پسر آن می که جهانرا تاب است زان می که گل نشاط را مهتاب است
بشتاب که آتش جوانی آب است دریاب که بیداری دولت خواب است

اس میں مصرع اولیٰ۔ مصرع ثانی۔ مصرع سوم میں بڑے تکلف کے بعد معنی پیدا ہوسکتے ہیں۔

ن موزوں۔

(۱۸) هر چند که از گناه بد بختم و زشت نومید نیم چو بت پرستان ز کنشت
اما سحری که میرم از مخموری می خواهم و معشوق چه دوزخ چه بهشت

اسی رباعی کو رد و بدل کرنے کے بعد اهل دل نے یه رباعی بهی مجموعه میں شامل کردی هے۔

(۱۹) تا چند زنم به روئی دریاها خشت نومید نیم چو بت پرستان ز کنشت
امشب من و سیمبر جوانان کنشت می خواهم و معشوق چه دوزخ چه بهشت

(۲۰) گر کار تو نیک است به تدبیر تو نیست ور شر برود نیز به تقصیر تو نیست
تسلیم و رضا پیش کن و شاد نبری چون نیک و بدجهان به تدبیر تو نیست

یه رباعی گلستان مسرت میں (منع شکایت زمانه ناهنجار و راضی بجان و دل بودن بمرضیات خدا) کے ذیل میں امین کے نام سے لکھی هے لیکن یه نهیں لکھا که یه کون سے امین هیں - ممکن هے که احمد قلی‌خاں قمی متخلص به امین کی هو - جو عهد اورنگ‌زیب میں هندوستان آئے اور ملازمان شاهی میں منسلک تهے - یه رباعیاں کهتے تهے - یا پهر خواجه محمد امین کوسج کاشانی کی هو که وه بهی رباعیاں کهتے تهے - یا مولانا شاه ولی الله صاحب امین رح محدث دهلوی کی هو - بهر حال صحیح حال معلوم نهیں هوسکا - گلستان مسرت میں اسی کے ساتھ سالم کی یه رباعی بهی لکھی هے :-

یک ذرۂ اختیار در دست تو نیست لیکن معقول فطرت پست تو نیست
تدبیر چو کعبتین و تقدیر چو نقش در دست‌تو هست‌لیک در دست تو نیست

بهر صورت تدبیر و تقدیر کا ایک نزاعی مسئله همیشه سے علمائے اسلام میں زیر بحث رها هے اور یه ایک عام بلکه پیش‌پا افتاده مضمون هے - اس کے ساتھ هی یه رباعی حضرت ابو سعید ابوالخیر رح المتوفی ۴۴۰ ھ کے مجموعۂ رباعیات میں بهی شامل هے اور کچھ عجب نهیں که انهیں کی هو - مجموعه رباعیات افضل کاشانی میں بهی پائی جاتی هے -

(۲۱) روزی که شود اذ السماء انشقت و اندم که بود اذ النجوم انکدرت
من دامن تو بگیرم اندر عرصات گویم صنما بایِ ذنبٍ قتلت

یہ رباعی بھی رباعیات خیام میں شامل ہے ۔ حالانکہ ترکیب نحوی سے اس کا مصرع چہارم قطعاً غلط ہے ۔ پہلے شعر میں یہ ہے کہ جب آسمان پھٹیں گے اور ستارے دھندلے ہوجائیں گے ۔ یعنی قیامت قایم ہوگی تو میں میدان قیامت میں تیرا دامن پکڑوں‌گا ۔ یہاں تک درست ۔ لیکن دامن پکڑ کر ایک مظلوم کو یہ کہنا چاہیے کہ بای ذنب قتلتنی ۔ یعنی تونے مجھے کس گناہ پر قتل کیا تھا ۔ مگر بجائے اس کے مصرع موجودہ کے معنے یہ ہیں کہ تو کس گناہ پر قتل کی گئی ۔ یہ سوال تو وہ ہے جو دختر موؤدہ سے قیامت میں کیا جائےگا ۔ کیونکہ ایام جاہلیت میں عرب کی رسم تھی کہ وہاں داماد بنانے کی شرم سے زندہ دفن کرادیتے تھے ۔ اسی لیے قرآن شریف میں خدائے جل شانہ نے ارشاد فرمایا ہے : و اذ الموؤدة سئلت بای ذنب قتلت ۔ یہاں اس کا کوئی محل ہی نہیں ہے استاد ذوق دہلوی کا ایک اردو کا شعر ملاحظہ فرمائیے :—

الہی کس بےگنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچے میں اس کے شور بایِّ ذنبِ قتلتنی ہے

مجھے تعجب آتا ہے کہ ایک ہندی شاعر تو اس مفہوم کے ادا کرنے کے لیے صحیح الفاظ لائے اور خیام ایسا عربی کا زبردست فاضل یہ غلطی کرے تعجب ہے کہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی اس کو اپنے مجموعہ رباعیات میں نقل کیا اور کوئی نوٹ بھی نہیں لکھا ۔ مجموعہ ڈاکٹر فریڈرک روزن میں یہ رباعی شامل نہیں ہے ۔ اگرچہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کا نسخہ ۹۱۱ ہجری کے نسخے کی نقل ہے مگر حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب دیکھا جاتا ہے کہ یہ رباعی حکیم مولا بخش صاحب قلق المتوفی ۱۲۹۷ ھ کے کلیات مطبوعہ مطبع انصاری دہلی ۱۲۹۸ ھ کے صفحہ ۲۲۸ پر ان کے فارسی کلام میں متفرقات کے ذیل میں دیکھی جاتی ہے ۔ میں نہیں کہتا کہ یہ قلق ہی کی رباعی ہے ۔ مگر خیام کی کسی صورت سے نہیں ہوسکتی ۔

(۲۲) چون مردن تو مردن یکبارگی است یکبار بمیر این چه بیچارگی است
خونی و نجاستی و مشتی رگ و پوست درکار نبود این چه غمخوارگی است

یہ رباعی بھی شیخ فریدالدین عطار کی ہے ۔ چنانچہ مختارنامہ میں بھی موجود ہے

اور هفت اقلیم تذکرہ عطار میں بھی انھیں سے منسوب کی گئی ہے۔ ہفت اقلیم قلمی مخطوطہ یونیورسٹی لائبریری لکھنؤ صفحہ ۲۶۵۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی کا بیان بہت الجھا ہوا ہے۔

(۲۳) چندین غم مال و حسرت دنیا چیست　　هرگز دیدی کسی که جاوید بزیست

این یک نفسی که در تنت عاریت است　　با عاریتی عاریتی باید زیست

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے، اور ان کے مجموعہ رباعیات میں موجود ہے۔ خیال عام ہے۔

(۲۴) گر از پئی شهوت و هوا خواهی رفت　　از من خبری که بی نوا خواهی رفت

بنگر چه کسی و از کجا آمدهٔ　　می دان که چه می‌کنی کجا خواهی رفت

یہ رباعی حضرت شیخ الاسلام عبداللہ انصاری المتوفی ۴۸۱ھ کی ہے چنانچہ ان کی مناجات اور منازل السائرین میں موجود ہے۔ رباعیات مولانائے روم میں بھی شامل ہے اور دوسرا شعر اس طرح ہے:—

در درگزری ازین به بینی به عیان　　کز بهر چه آمدی کجا خواهی رفت

میرے نزدیک یہ شیخ الاسلام ہی کی رباعی ہے اس لیے کہ ان کی تصانیف مولانا روم سے پہلے کی ہیں اور ان میں یہ موجود ہے۔ المغنم البارد میں نجیب الدین جربادقانی سے منسوب ہے۔ خیام کے مجموعے میں ایک رباعی بالکل اس کے خلاف موجود ہے:—

ای آمده از عالم روحانی تفت　　حیران شده در پنج و چهار و شش و هشت

می خور که ندانی ز کجا آمدهٔ　　خوش باش نه دانی به کجا خواهی رفت

(۲۵) نیکی و بدی که در نهاد بشر است　　شادی و غمی که در قضا و قدر است

با چرخ مکن حواله کاندر ره عقل　　چرخ از تو هزار بار بیچاره تر است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور مجموعۂ رباعیات افضل میں موجود ہے۔ اور پہلا مصرع یوں ہے:—

شادی و غمی که از قضا و قدر است

اور عقل کے بجائے مصرع ثالث میں عشق ہے ۔ دوسرا مصرع بھی بدلا ہوا ہے ۔ ان کے یہاں اسی خیال کی ایک دوسری رباعی بھی موجود ہے :—

در عشق هر آن کسی که مستور تر است　　گوئی ز همه مرادها دور تر است
آنرا که تو آسوده همی پنداری　　چون در نگری از همه رنجور تر است

اس کے علاوہ یہ رباعی شیخ اوحد الدین کرمانی المتوفی ۶۳۵ ھ سے بھی منسوب ہے :—

(۲۶) این کوزه چو من عاشق زاری بوده است　　در بند سر زلف نگاری بوده است
این دسته که در گردن او می بینی　　دستی است که درگردن یاری بوده است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور ان کی رباعیات میں موجود ہے جیسا کہ هم عرض کرچکے هیں یہ ایک عام خیال ہے اور فلاسفۂ قدیم نے اس خیال کو کہ دنیا کا کوئی ذرہ ضایع نہیں ہوتا ۔ نہ بیکار جاتا ہے ۔ بلکہ صور ظاهری کا استحالہ ہوتا رهتا ہے طرح طرح سے ظاہر کیا ہے ۔ چنانچہ افضل کی دوسری رباعی :—

پیش از من تو لیل و نهاری بوده است　　گردنده فلک برائی کاری بوده است
زنهار قدم بـه خـاک آهسته نهی　　کان مردمک چشم نگاری بوده است

یا مجموعه خیام کی یہ دوسری رباعیاں :—

خاری که بزیر پائی هر حیوانیست　　زلف صنمی و ابروئی جانا نیست
هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانی است　　انگشت وزیری و سر سلطانی است

در هر دشتی که لاله زاری بوده است　　آن لاله ز خون شهریاری بوده است
هر برگ بنفشه که زمین می روید　　خالی است که برروئی نگاری بوده است

(۲۷) هشدار که روزگار شور انگیز است　　ایمن منیش که تیغ دوران تیز است
در کام تو گر زمانه لوزینه نهد　　زنهار فرو مبر که زهر آمیز است

اس رباعی کو بھی مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے افضل کاشانی سے منسوب بتایا ہے ۔ مگر مجھے رباعیات افضل میں نہیں ملی ۔ ممکن ہے کہ افضل ہی کی هو کیوں کہ اسی قسم کی ان کی دوسری رباعی بھی موجود ہے :

بر دهر مکن تکیه که لطفش قهر است　　مستان ز جهان لقمه که نوشش زهر است
دامادئی دهر است به نزدم همه عیب　　کین فاحشه را خون عزیزان مهر است

(۲۸) چون آب به جوئبار و چون باد به دشت　　روز دگر از عمر من و تو بگزشت
تا من باشم غم دو روزه نه خورم　　روزی که نیامدست و روزی که گزشت

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کی رباعیات میں موجود ہے۔ اور پہلا شعر یوں ہے :

از عمر هر انچه بهترین بود گزشت　　به گزشت چنان که بگزرد باد به دشت

(۲۹) می خوردن من نه از برائی طرب است　　نے بہر فساد دین و ترک ادب است
خواهم کہ بیخودی برآرم نفسی　　می‌خوردن ومست بودنم زین سبب است

یہ رباعی شیخ علی لالا بن شیخ سعید پسر عمر شیخ سنائی کی ہے چنانچہ ذکر شیخ علی لالا میں مولف هفت اقلیم نے یہی لکھا ہے۔ مرزا غالب نے اردو میں اس مضمون کو نہایت عمدہ طور سے کہا ہے ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

سپہری کاشی کی بھی ایک رباعی اسی مضمون کی ہے ۔

روزم تا شب به می پرستی گزرد　　شب تا روزم به خواب مستی گزرد
زیں بیخودی مدام شادم که مباد　　بر من نفسی به فکر هستی گزرد

(۳۰) می نوش که عمر جاودانی این است　　خود خاصیت از دور جوانی این است
هنگام گل و مل است و یاران سرمست　　خوش باش دمی که زندگانی این است

یہ رباعی دیوان حافظ کی رباعیات میں شامل ہے ۔ دیوان حافظ مطبع نول کشور ۱۲۸۹ھ نیز مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ع میں موجود ہے۔ مگر کلکتہ کے نسخہ میں اصل دیوان میں نہیں ہے بلکہ ضمیمہ میں ہے۔ حافظ کی اگر یہ رباعی ہو تو کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ ان کا تمام کلام ہی مستانہ ہے اور رباعیات میں خمریات کی کمی نہیں ۔

(۳۱) دارنده چو ترکیب طبایع آراست　　از بهر چه او فکندش اندر کم و کاست
گر نیک آمد شکستن از بهر چه بود　　ور نیک نیامد این صور عیب کراست

یہ رباعی بھی رباعیات افضل میں شامل ہے اور اس میں اس طرح پر ہے:

دارندہ چو ترکیب چنین خوب آراست باز از چہ سبب فگندش اندر کم و کاست
گر خوب نیامد این بگو عیب کراست ور خوب آمد خرابی از بہر چہ خاست

اس سے پہلے ایک رباعی:

اجزائی پیالۂ کہ درہم پیوست بشکستن آن روا نمی دارد دست
چندین سر و پای نازنین از سر و دست از مہر کہ ساخت وز برائی کہ شکست

اسی قسم کی لکھی جاچکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس وقت بھی عام تھا اور اب بھی۔ کہ آخر نیست سے ہست کرنا اور ہست سے پھر نیست کرنا کیوں ہے۔

(۳۲) پیش از من و تو لیل و نہاری بودہ است گردندہ فلک برائی کاری بودہ است
زنہار قدم بہ خـاک آہستہ نہی کان مردمک چشم نگاری بودہ است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب ہے جیسا کہ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں یہ ایک عام خیال ہے۔ تذکرہ حسینی کشوری صفحہ ۳۳۔ تذکرہ مجمع التفاسیر۔ مجموعہ رباعیات افضل اور تذکرۂ قلمی غلام امام میں افضل سے منسوب ہے۔

(۳۳) از منزل کفر تا بہ دین یک نفس است وز عالم شک تا بہ یقین یک نفس است
این یک نفس عزیز را خوش میدار کز حاصل عمر ما ہمین یک نفس است

یہ رباعی بھی مجموعہ رباعیات افضل میں موجود ہے اور پہلے مصرع میں عـالم کی بہ‌جائے منزل ہے۔

(۳۴) آں لعل گران بہا ز کان دگر است واں درّ یگانہ را نشان دگر است
اندیشہ این و آں خیال من و تست افسانہ عشق را زبان دگر است

مجموعہ رباعیات مولانا روم میں ایک ایسی ہی رباعی ہے ملاحظہ ہو:

ما را بجز این زبان زبان دگر است جز دوزخ و فردوس مکان دگر است
آزادہ دلان زندہ بجان دگر اند آن گوہر پاک شان ز کان دگر است

بہت ممکن ہے کہ یہ رباعی اس سے یا یہ اس سے مستخرج ہو۔

(۳۵) امروز کہ نوبت جوانی من است می نوشم ازانکہ کامرانی من است
عیبش مکنید زانکہ تلخ است خوش است تلخ است ازان کہ زندگانی من است

یہ رباعی سراج الدین قمری شاعر دربار خوارزم شاہی کی ہے۔ اس کو فخر رازی کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو خود خیام کو بھی امام فخرالدین رازی سے شاگردی کی نسبت ہے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے آتش کدہ اور تاریخ گزیدہ کے حوالے سے یہ رباعی انہیں کے نام منسوب کی ہے۔ مگر تذکرۂ روز روشن میں لکھا ہے کہ قمری مازندرانی تھا اور سلطان ابوسعید کے عہد کا شاعر تھا پہلے سراجی تخلص کرتا تھا۔ عبید زاکانی کے ساتھ اس کے مشاعرے اور مطارحے ہوتے تھے۔ عبید زاکانی آٹھویں صدی ہجری کا شاعر ہے۔

(۳۶) گر بر فلکی بہ خاک باز آرندت   ور بر سر نازی بہ نیاز آرندت
فی الجملہ بنہ تو جہل تابتوانی   آزار مجوئی تا نیاز آرندت

یہ رباعی بھی افضل کاشانی کے مجموعے میں موجود ہے المغنم البارد صفحہ ۱۵۷ میں بھی انہیں سے منسوب کی گئی ہے اور تیسرا مصرع اس طرح پر ہے۔ فی الجملہ حدیث مطلق از من بشنو۔ یہ بھی خالص ناصحانہ انداز ہے جس سے خیام کو نسبت نہیں۔

(۳۷) چون آتش سودائی تو جز دود نہ داشت   مسکین دل من امید بہبود نہ داشت
در جستن وصل تو بسی کوشیدم   چون بخت نہ بود کوششم سود نہ داشت

یہ رباعی انوری کی ہے چنانچہ ۵۴۴ کلیات انوری مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۸۹۷ء میں موجود ہے اور دراصل اس قسم کا ھجریہ بیان خیام کی رباعیات سے بہت دور ہے یہ رباعی مجموعہ رباعیات خیام کشوری میں موجود نہیں مگر دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔

(۳۸) دہ عقل ز نہ رواق و ز ہشت بہشت   ہفت اخترم از ششجہت این نامہ نوشت
کز پنج حواس و چار ارکان و سہ روح   ایزد بدو عالم چو تو یک کس نہ سرشت

یہ رباعی رباعیات افضل کاشانی میں موجود ہے۔ تذکرہ حسینی مطبوعہ کشوری صفحہ ۳۳ میں بھی افضل ہی سے منسوب کی ہے۔ مگر رباعیات افضل میں بتایا گیا ہے کہ یہ رباعی نظامی گنجوی سے بھی منسوب ہے۔ ان دو میں سے کسی کی بھی ہو مگر خیام اس قسم کی عاشقانہ مداحی نہیں کرتا۔

(۳۹) در هیچ سری نیست که اسراری نیست دل را خبر از اندک و بسیاری نیست
هر طایفهٔ روند راهی در پیش الا ره عشق را که سالاری نیست

افضل کاشانی کی رباعیات میں بھی ایک ایسی رباعی موجود ہے ۔ خدا جانے یہ اس سے مستخرج ہے یا وہ اس سے ۔ مگر رباعی دیکھنے کے بعد یہ کہنا دشوار ہے کہ ایک کو دوسری سے تعلق نہیں رباعی افضل :

در هیچ سری نیست که اسرار تو نیست کو را خبر از اندک و بسیار تو نیست
هر طایفه گرفته کاری در دست و انگاه بدست هیچ کس کار تو نیست

(۴۰) ترکیب طبایع چو به کام تو دمی است تو داد کن از هرچه که هردم ستمی است
با اهل خرد نشین که اصل من و تو گردی و شراری و نسیمی و نمی است

یہ رباعی حضرت ابو سعید ابوالخیر کی رباعیات میں بھی شامل ہے ۔ المغنم البارد صفحہ ۶۹ میں مهدی کوکب میر منشی عهد نادری سے منسوب کی گئی ہے اور اس طرح پر نقل کی ہے :

چون حاصل عمر تو فریبی و دمی است بیداد مکن گرت به هردم ستمی است
مغرور مشو به خود که اصل من و تو گردی و شراری و نسیمی و نمی است

(۴۱) دنیا دیدی و هرچه دیدی هیچ است و ان نیز که گفتی و شنیدی هیچ است
سرتاسر آفاق دویدی هیچ است و ان نیز که در خانه خزیدی هیچ است

یہ رباعی بھی افضل کاشانی سے منسوب اور ان کی رباعیات میں موجود ہے ۔ پہلا شعر یوں ہے :-

افضل دیدی که هرچه دیدی هیچ است هر قصه که دیدی و شنیدی هیچ است
سرتاسر آفاق دویدی هیچ است و ان نیز که در کنج خزیدی هیچ است

مجھے شبہ ہے کہ یہ رباعی کسی ہندی شاعر کی ہے ۔ در خانه خزیدن یا در کنج خزیدن ٹکسالی زبان فارسی نہیں ہوسکتی ۔ ایک نسخہ میں دوسرا شعر اس طرح ہے :

هر چند که هر طرف دویدی هیچ است امروز که گوشهٔ گزیدی هیچ است

لیکن جیسا در خانه خزیدن اور در کنج خزیدن خلاف محاورۂ اهلِ ایران ہے

اسی طرح (هر طرف دویدی) بھی فصیح نہیں -

(۴۲) هیهات که این جسم مجسم هیچ است وین دائرۂ سطح مخیّم هیچ است
دریاب که در کشاکش موت و حیات وابسته یک دمیم و آن هم هیچ است

یہ رباعی تذکرۂ هفت اقلیم میں نصیرالدین طوسی المتوفی ۶۷۲ سے منسوب کی گئی هے اور نسخہ مرتبہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی میں بھی محقق طوسی سے منسوب کرتے هوئے اس طرح پر نقل کی هے :

ای بی خبر این شکل مجسم هیچ است وین دائره سطح مخیّم هیچ است
خوش باش که در نشیمن کون و فساد وابسته یک دمیم و آن دم هیچ است

(۴۳) در عالم خاک خاک پاشیدم و رفت صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با چون و چرائی تو مرا کاری نیست چندانکه بداشتی بپاشیدم و رفت

یہ رباعی حضرت شیخ احمد غزالی المتوفی ۶۱۷ھ کی هے جو شیخ ابوبکر نساج کے مرید اور حضرت امام محمد غزالی رح کے بھائی تھے - تذکرۂ هفت اقلیم - ذکر احمد غزالی -

(۴۴) می خور که بزیر گل بسی خواهی خفت بی مونس و بی حریف و بی همدم و جفت
زنهار به کس مگو تو این راز نهفت هر لاله پژمرده نه خواهد بشگفت

تذکرۂ روز روشن میں ایسی هی رباعی ملا نورالدین خراسانی المتخلص به حافظ کے نام سے نقل کی هے اور شمع انجمن میں حافظ علی حافظ کے نام سے -

هنگام سحر که نرگس و لاله شگفت مرغ سحری به ناله و آه به گفت
می نوش که بی نشه بسی خواهی بود برخیز که در خاک بسی خواهی خفت

خیام کی رباعی میں راز نهفت بجائے راز نهفته درست نہیں معلوم هوتا اهل زبان کے تصرف کے سوائے اور کیا کہا جائے - یا پھر کسی هندی نے کہہ کر رباعیات خیام میں شامل کردی هے -

(۴۵) بر چهرۂ گل شبنم نوروز خوش است در صحن چمن روئی دل افروز خوش است
از دی که گزشت هر چه گوئی خوش نیست خوش باش زدی مگو که امروز خوش است

یہ رباعی رباعیات عطار میں شامل هے اور کلیات عطار مطبوعہ نول کشور میں صفحہ ۱۰۲۹

پر موجود ہے خیام کے رنگ کی رباعیاں عطار کے یہاں زیادہ سے زیادہ ملتی ہیں۔

(۴۶) ترس اجل و بیم فنا هستی تست ورنه ز فنا شاخ بقا خواهد رست
من از دم عیسوی شدم زنده بجان مرگ آمد و از وجود من دست بشست

یہ رباعی بھی مجموعہ رباعیات افضل کاشانی میں موجود ہے اور یوں بھی اس کا بیان نہایت الجھا ہوا ہے جو خیام سے تعلق نہیں رکھتا۔

(۴۷) در خواب بدم مرا خردمندی گفت کز خواب کسی را گل شادی نه شکفت
کاری چه کنی که با اجل باشد جفت برخیز که زیر خاک می‌باید خفت

اسی قسم کی رباعی ابھی آپ نے دیکھی ہے:

می خور که بزیر گل بسی خواهی خفت

ممکن ہے کہ وہ اس رباعی سے مستخرج ہو یا یہ اس سے۔

(۴۸) این کهنه رباط را که عالم نام است آرامگه ابلق صبح و شام است
بزمی است که واماندۀ صد جمشید است قصریست که تکیه‌گاه صد بهرام است

یہ رباعی کلیات خاقانی میں خاقانی سے منسوب کی گئی ہے۔ خاقانی کے یہاں اس قسم کے عبرت انگیز مضامین کے قصاید اکثر پائے جاتے ہیں بلکہ اس قسم کے مضامین اس کا خاص حصہ ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ ہر قسم کے مضامین میں استاد کامل ہے۔

(۴۹) گردون کمری ز عمر فرسودۀ ماست جیحون اثری ز چشم پالودۀ ماست
دوزخ شرری ز رنج بیهودۀ ماست فردوس دمی ز وقت آسودۀ ماست

یہ رباعی تین شاعروں سے منسوب ہے۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر رح المتوفی ۴۴۰ھ حافظ شیرازی المتوفی ۷۹۲ھ اور افضل کاشانی سے۔ افضل کی رباعیات میں دو رباعیاں اور اسی قسم کی موجود ہیں:

حلوائی جهان غلام کشکینۀ ماست دیبائی جهان خرقه پشمینه ماست
از جام جهان نمائی تا کی گوئی صد جام جهان نمائی در سینه ماست

سرتاسر افاق جهان از گل ماست سر چشمۀ عقل و روح کلّی دل ماست
افلاک و عناصر و نبات و حیوان عکسی ز وجود روشن کامل ماست

(۵۰) آن قصر کہ بہرام در و جام گرفت آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گور میگرفتی ہمہ عمر بنگر کہ چگونہ گور بہرام گرفت

یہ رباعی بھی کلیات خاقانی مطبوعہ کشوری میں موجود ہے۔ چونکہ عبرت انگیز ہے اور اس سے پہلے (بہرام است) والی رباعی اس سے منسوب ہے یہ بھی اسی سے منسوب ہوسکتی ہے۔

(۵۱) از باد صبا دلم چو بوئی تو گرفت ما را بگزاشت جستجوئی تو گرفت
اکنون ز منش ہیچ نمی اید یاد بوئی تو گرفتہ بود خوئی تو گرفت

رباعیات ابوسعید ابوالخیر میں ابوسعید ابوالخیرؒ سے منسوب ہے۔ اور آتشکدہ آذر میں مقصود تیرگر کے نام سے۔ مقصود کا اصل نام یوسف شاہ تھا جو مقصود درویش تیرگر کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی بعض رباعیاں اور بھی تذکروں میں پائی جاتی ہیں۔ المغنم البارد صفحہ ۱۰۱ پر قلندر کے نام سے لکھی گئی ہے۔

(۵۲) من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی این مزد بود لطف عطائے تو کجاست

یہ رباعی شیخ عبداللہ انصاری کی ہے۔ تذکرہ آتش کدہ۔ تذکرہ حسینی۔ تذکرہ صبح گلشن سب اس خیال پر متفق ہیں۔ شیخ علی حزین نے اسی رباعی سے گوشہ پیدا کرکے کیا خوب رباعی کہی ہے:

اے مطرب عاشقاں نوائی تو کجاست اے ساقی جاں آب بقائی تو کجاست
گیرم دل من از نظرت افتاد است گیرائی مژگاں رسائی تو کجا است

نیز خیام کے مجموعے میں مندرجہ بالا مضمون کی یہ رباعی بھی پائی جاتی ہے:

یارب تو کریمی و کریمی کرم است عاصی ز چہ رو بروں ز باغ ارم است
با طاعتم ار بہ بخشی اں نیست کرم با معصیتم اگر بہ بخشی کرم است

(۵۳) تا کے ز چراغ مسجد و دود کنشت تا کے ز زیان دوزخ و سود بہشت
رو بر سر لوح بین کہ استاد قضا اندر ازل انچہ بودنی بود نوشت

یہ رباعی عراقی سے منسوب ہے اور دیوان عراقی میں موجود ہے۔

(۵۴) در مجلس دهر ساز هستی پست است نے چنگ نه نائے و نه دلم در دست است
رندان همه ترک می پرستی کردند جُز محتسب شهر که دایم مست است

کاس الکرام شرح رباعیات خیام میں اس رباعی کو لسان الغیب کا حواله دیتے ہوئے شاہ شجاع سے منسوب کیا گیا ہے۔

(۵۵) امشب که حضور یار جان افروز است بختم بخلاف دشمنان فیروز است
گو شمع بمیر و مه فرو شو که مرا آن شب که تو در کنار باشی روز است

یه رباعی کو مجموعه رباعیات خیام کشوری میں نہیں ہے۔ مگر نسخه مطبوعه اله آباد میں موجود ہے۔ یه سعدی سے منسوب ہے اور کلیات سعدی نولکشوری میں موجود ہے مگر ایک نہایت قدیم نسخه کلیات سعدی میں نہیں پائی جاتی پھر بھی خواہ یه رباعی سعدی کی نه ہو مگر خیام سے ایسے مضامین اشتیاقیه اور عشقیه کا تعلق نہیں

(۵٦) از آتش این طایفه جز دودے نیست وز هیچ کسم امید بهبودی نیست
دستی که ز دست چرخ بر سر دارم در دامن هر که میزیم سودے نیست

یه رباعی هفت اقلیم۔ اور تذکرہ حسینی میں سراج الدین قمری سے منسوب ہے۔ اور پہلا مصرع تذکرہ حسینی میں اس طرح ہے در آتش اهل عصر جز دودے نیست ایک رباعی اسی قسم کی لکھی جا چکی ہے چون آتش سودائی تو جز دود نه داشت معلوم ہوتا ہے که ان دونوں رباعیوں میں سے ایک دوسری سے نکالی گئی ہے۔ اگرچه دونوں کے مطالب کے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۵۷) بیگانه اگر وفا کند خویش من است ور خویش جفا کند بداندیش من است
گر زهر موافقت کند تریاق است ور نوش مخالفت کند نیش من است

یه رباعی رباعیات افضل میں افضل سے منسوب ہے۔ اور خیام کے رنگ سے منسوب ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

(۵۸) تا به توانی غم جهان هیچ مسنج بر دل منه از آمده نا آمده رنج
خوش می خور و مے بخش دریں دار سپنج با خود نبری گرچه بسے داری گنج

یه رباعی مجموعهٔ رباعیات افضل میں موجود ہے۔ اور ان کے یہاں اس قسم کی

اور رباعیاں بھی ہیں مثلاً:

با دل گفتم متاع دنیا عرض است — اسباب و زر و سیم سراسر مرض است
گیرم کہ ہمہ ملک جہاں آن تو شد — با خود چو جوے نمی بری چہ غرض است

(۵۹) دل گفت مرا علم لدنی ہوس است — تعلیمم کن اگر ترا دسترس است
گفتم کہ الف گفت دگر ہیچ مگوی — درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

یہ رباعی عشقی کاشانی کی بتائی گئی ہے چناں‌چہ کاس‌الکرام شرح رباعیات خیام میں آتشکدے کے حوالے سے عشقی سے منسوب کی ہے اور المغنم‌البارد صفحہ ۶۲ میں بھی عشقی ہی کے نام سے لائی گئی ہے۔ مگر رباعیات افضل میں افضل کاشانی کے نام سے ہے اور افضل کے یہاں اس مصرع پر اور بھی رباعیاں کہی گئی ہیں چناں‌چہ دو رباعیاں یہ ہیں:

اے خواجہ اگر ہمیں بہشتت ہوس است — خیرات بکن اگر ترا دسترس است
خیرات چو کردۂ برو ایمن باش — درخانہ اگر کس است یکحرف بس است

سررشتۂ عمر ما ہمیں یک نفس است — جز ذکر خدا ہرانچہ گویم ہوس است
غافل ز قضا مباش و ایمن منشیں — درخانہ اگر کس است یک حرف بس است

(۶۰) بنگر ز جہاں چو رخت بربستم ہیچ — وز حاصل عمر چیست در دستم، ہیچ
شمع طربم ولی چو بنشستم ہیچ — من جام جمم ولی چو بشکستم ہیچ

یہ رباعی کلیات خاقانی مطبوعہ کشوری میں خاقانی سے منسوب ہے۔ خاقانی کی ملک ہونے کا یقین نہیں کیا جاسکتا مگر خیام کا طرز گفتار بھی نہیں ہے۔

(۶۱) آنہا کہ کہن شدند و آنہا کہ نوند — ہر یک بمراد خویش یک یک برسند
ایں سفلہ جہاں بکس نماند جاوید — رفتند و روند و دیگر آیند و روند

یہ رباعی مجموعہ رباعیات افضل کاشانی میں موجود ہے۔ ایک رباعی نصراللہ بن عبدالحمید کی تذکرہ ہفت اقلیم میں اس طرح پر نقل کی گئی ہے:

از مسند عزّ گرچہ ناگہ رفتیم — حمداً للہ کہ نیک آگہ رفتیم
رفتند و شدند و تیز آیند و شوند — ما نیز توکلت علی‌اللہ رفتیم

خود مجموعہ خیام میں ایک اور رباعی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :

آنہا کہ فلک دیدۂ و دہر آرایند آیند و روند و باز با دہر آیند

(۶۲) دل چراغی است کہ نور از رخ دلبر گیرد ور بمیرد ز غمش زندگی از سر گیرد

صفت شمع بہ پروانہ ولی باید گفت کیں حدیثی است کہ باسوختگاں درگیرد

یہ رباعی کی بحر نہیں ہے بلکہ قطعہ ہے اور نہ معلوم کس کا ہے۔ بہرحال نہ خیام کا رنگ ہے اور نہ اس کی رباعیوں کے مجموعے میں شامل ہونے کے قابل۔ کیونکہ یہ بالکل متغزلانہ انداز ہے اور بہت ممکن ہے کہ کسی غزل کے دو شعر نقل ہوگئے ہوں۔

(۶۳) بوسیدہ مرقع اند این خامی چند نا رفتہ رہ صدق و صفا گامی چند

بگرفتہ ز طامات الف لامی چند بدنام کنندۂ نکونامی چند

اسی انداز کی یہ رباعی مجموعے میں موجود ہے۔

(۶۴) نابردہ بصبح در طلب شامی چند ننہادہ بروں ز خویشتن گامی چند

در کسوت خاص آمدہ اند عامی چند بدنام کنندۂ نکونامی چند

دوسری رباعی تذکرہ آتشکدہ میں مغربی المتوفی ۸۰۹ھ سے منسوب ہے اور پہلی سے دوسری رباعی یا دوسری سے پہلی مستخرج مانی جاسکتی ہے۔ نیز پہلی رباعی رباعیات افضل میں افضل کاشای کے نام سے موجود ہے۔

(۶۵) ایں قافلۂ عمر عجب می گزرد دریاب دمی کہ با طرب می گزرد

ساقی غم فردائی حریفاں چہ خوری پیش آر پیالۂ کہ شب می گزرد

یہ رباعی بھی افضل کاشای کی رباعیات کے مجموعے میں موجود ہے۔

(۶۶) بر چشم تو ارچہ عاشقاں یکرایند مگرائی بدانکہ عاشقاں نہ گرایند

بربائی نصیب خویش کت بربایند بسیار چو تو شدند و بسیار آیند

یہ رباعی خیام مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ مولفہ و مرتبہ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی میں ذرا اختلاف کے ساتھ ہے :

گر جملہ جہاں بر تو می آرایند مگر ای پدر کہ زیرکان نگرایند

شعر دوم مصرع دوم مقدم اور مصرع اولی موخر ہے۔ مگر مجموعۂ منتخبات اشعار

مطبوعہ دارالمصنفین میں یہ رباعی حکیم سنائی المتوفی ۵۳۰ یا ۵۳۵ھ سے منسوب ہے اور رباعیات افضل میں افضل کے نام سے۔ مصرع اول میں بر کی بجائے در اور عاشقاں کی بجائے عالمی اور دوسرے مصرع میں بجائے عاشقاں عاقلاں ہے۔

(٦٧) آں کس کہ گنہ بہ نزد او سہل بود این نکتہ بگوید ار کہ او اہل بود

علم ازلی علت عصیاں کردن نزدیک حکیم، غایت جہل بود

کہا جاتا ہے کہ رباعی علامہ نصیرالدین محقق طوسی کی ہے جو انہوں نے اس رباعی موجودہ مجموعۂ خیام کے جواب میں کہی تھی:

من می خورم و ہر کہ چو من اہل بود می خوردن من بہ نزد او سہل بود

می خوردن من حق بہ ازل میدانست گر می نخورم علم خدا جہل بود

تاریخ گزیدہ مستوفی میں اس آخری رباعی کو سراج قمری کے نام سے منسوب کیا ہے اور اس طریقہ سے یہ دونوں رباعیاں خیام کی نہیں بلکہ وہ رباعی بھی جو محقق طوسی سے منسوب ہے سراج قمری کی نہیں ہوسکتی، کیونکہ نصیرالدین طوسی کی ولادت ۵۹۵ اور وفات ۶۷۲ میں ہے۔ اور قمری بعد کا شاعر ہے جس کا زمانہ سات سو یا آٹھ سو ہجری تک ہے کیونکہ اس کے مناظرے اور مشاعرے عبیدزاکانی سے ہوئے ہیں۔

(٦٨) آں مرد نیم کز عدمم بیم آید آں بیم مرا خوشتر ازیں سیم آید

جانی است مرا بہ عاریت دادہ خدا تسلیم کنم چو وقت تسلیم آید

یہ رباعی امام فخرالدین رازی سے منسوب ہے۔ ہفت اقلیم قلمی محفوظہ یونیورسٹی لائبریری لکھنؤ اور رباعیات افضل کاشانی میں افضل کے نام سے ہے۔ ردیف بجائے آید کے (بود) ہے۔

(٦٩) از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد و انرا بدو حرف مختصر خواہم کرد

با عشق تو در خاک فرو خواہم شد با مہر تو سر ز خاک بر خواہم کرد

تذکرہ آتشکدۂ آذر اور شمع انجمن میں یہ رباعی سلطان ابویزید آل مظفر برادر شاہ شجاع سے منسوب کی ہے۔ المغنم البارد میں بھی اسی کا اتباع کیا گیا ہے۔ مگر کاس الکرام شرح رباعیات خیام میں قطران بن منصور ترمذی کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ جو انوری کا

استاد ھے۔ بالکل اسی مضمون کی رباعی شیخ نظام‌الدین المؤید کی ھے جو اخبارالاخیار شاہ عبدالحق رح میں منقول ھے:

بر عشق تو و بر تو نظر خواھم کرد جاں در غم تو زیر و زبر خواھم کرد
بردرد دلے بخاک در خواھم شد بر عشق سری زگور برخواھم کرد

(۷۰) در عالم جاں بہ ھوش میباید بود درکار جہاں خموش میباید بود
تا چشم و زبان و گوش بر جا باشد بی‌چشم و زباں و گوش میباید بود

اس رباعی کے متعلق بھی اس خیال سے کہ یہ رنگ خیام کا نہیں ھے محققین نے شبہ کیا ھے کہ یہ ناصحانہ انداز اس کا نہیں ھوسکتا۔ اس قسم کی اور رباعیاں بھی ملتی ھیں چنانچہ پہلوان محمود بوریائی کی یہ رباعی:

با قوت پیل مور می باید بود با ملک دو کون عور می باید بود
ایں طرفہ نگر کہ عیب ھر آدمئی می باید دید و کور می باید بود آتشکدہ

یا در بند گرہ کشائی می باید بود گمرہ شدہ رہ نمائی می باید بود
یک لحظہ ھزار سال می باید زیست یکجائی ھزار جای می باید بود المغنم البارد ص ۱۰۳

یا در راہ خدا جملہ ادب باید بود تا جاں باقی است در طلب باید بود
دریا دریا اگر بکامت ریزند کم باید کرد و خشک لب باید بود خواجہ باقی‌باللہ

یا برخود در مدح و ذم نمی باید زد بیروں از حد قدم نمی باید زد
عالم ھمہ آئینہ حسن ازلی است میباید دید و دم نمی باید زد سحابی استرابادی

(۷۱) آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند در کشف علوم شمع اصحاب شدند
رہ زین شب تاریک نبردند برون گفتند فسانہا و در خواب شدند

یہ رباعی سحابی استرآبادی المتوفی ۱۰۱۰ ھ سے منسوب ھے۔ دنیا کے راز کا معلوم نہ ھونا ایک عام خیال ھے۔ حافظ کا ایک شعر اسی مضمون کا ھے:

جنگ ھفتاد و دو ملت ھمہ را عذر بنہ چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند
کس ندانست کہ منزل‌گہ مقصود کجاست اینقدر ھست کہ بانگ جرسے می آید

خود مجموعۂ خیام میں یہ رباعی اسی مضمون کی ہے:

در چرخ بہ انواع سخنہا گفتند　　این بی خبران گوہر دانش سفتند
واقف چو نہ گشتند بر اسرار فلک　　اول زیچی زدند و آخر خفتند

(۷۲) تا بود دلم ز عشق محروم نہ شد　　کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
اکنون کہ ھمی بنگرم از روی خرد　　معلومم شد کہ ھیچ معلوم نہ شد

تذکرۂ آتشکدہ۔ تذکرۂ روز روشن۔ مجموعۂ المغنم البارد میں یہ رباعی امام فخرالدین رازی سے منسوب کی گئی ہے اور اس طرح پر نقل کی ہے:

ہرگز دل من ز عشق محروم نشد　　کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ھفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز　　معلومم شد کہ ھیچ معلوم نہ شد

نیز رباعیات افضل میں بھی موجود ہے۔

(۷۳) آں عقل کہ در رہ سعادت پوید　　روزی صد بار خود ترا می گوید
دریاب تو این یکدمہ صحبت کہ نۂ　　آں ترہ کہ بدروند و دیگر روید

یہ رباعی بھی مجموعۂ رباعیات افضل میں موجود ہے اور دوسرا شعر اس طرح ہے:

زنہار نگہدار تو فرصت کہ نۂ　　آن ترہ کہ بدروند و دیگر روید

(۷۴) در دھر ھر انکہ نیم نانی دارد　　وز بہر نشست آستانی دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسی　　گو شاد بزی کہ خوش جہانی دارد

تذکرۂ حسینی میں یہ رباعی غیاث‌الدین بلخی متخلص بہ ھمتی کے نام سے ہے نیز شمع‌انجمن میں ھمتی کے نام سے ہے مگر اس طرح کہ پہلے مصرع میں در دھر کی بجائے در خانہ اور دوسرا مصرعہ اس طرح۔ در گوشۂ شہر آشیانے دارد۔ چوتھے میں (گو شاد بزی) کی جگہ انصاف بدہ۔ اور کلیات خاقانی میں خاقانی کے نام سے ہے۔ رباعیات افضل میں افضل کے نام سے۔

(۷۵) روزی کہ جزائے ہر صفت خواھد بود　　قدر تو بقدر معرفت خواھد بود
در حسن صفت کوش کہ در روز جزا　　حشر تو بقدر معرفت خواھد بود

یہ رباعی مجموعۂ منتخبات قلمی دارالمصنفین میں نصیرالدین طوسی کے نام سے ہے۔

المغنم البارد میں بھی صفحہ ۱۷۲ پر انھیں کے نام سے منسوب کی گئی ہے اور پہلا مصرع اس طرح ہے :

فردا که حساب شش جهت خواهد بود

نصیرالدین طوسی کے یہاں ایسی عارفانہ ـ ناصحانہ اور اخلاقی حکیمانہ رباعیاں اور بھی ہیں - یہ رباعیات افضل میں بھی موجود ہیں -

(۷۶) گویند بهشت و حور عین خواهد بود و انجا مئی ناب و انگبین خواهد بود

گرما می و معشوق پرستیم رواست چون عاقبت کار همین خواهد بود

یہ رباعی دیوان حافظ میں موجود ہے ـ اور حافظ ہی کا رنگ ہے ـ

(۷۷) آنروز که تو سن فلک زین کردند آرایش مشتری و پروین کردند

این بود نصیب ما ' ز دیوان قضا مارا چه گنه ' قسمت ما این کردند

یہ رباعی مہستی گنجوی کی ہے جو بقول بعض تذکرہ نویسوں کے سلطان سنجر کی بزم عیش کی ایک مغنیہ تھی اور سلطان سنجر اس پر فریفتہ تھا اور بقول بعض بابر کی مطلوبہ تھی - اس کی ایک رباعی کے ساتھ تذکروں میں یہ قصہ بھی مذکور ہوا ہے - کہ سلطان کی محفل عیش گرم تھی - مہستی کو کسی ضرورت سے باہر جانا پڑا ـ رات کا وقت تھا اور سردی کا زور شور تھا ـ مہستی باہر گئی تو دیکھا چاروں طرف زمین پر برف جمی ہے ـ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ـ وہ کانپتی ہوئی واپس ہوئی تو بادشاہ نے پوچھا کہ کیا حال ہے ـ اس نے فی‌البدیہہ یہ رباعی پڑھی ـ حال‌آنکہ بوڈلین لائبریری کے نسخے میں یہ رباعی بھی خیام کے نام سے منسوب ہے :

شاها فلکت اسپ سعادت زین کرد و ز جملهٔ خسروان ترا تحسین کرد

تا در حرکت سمند زرین نعلت بر گل نه نهد پائی زمین سیمین کرد

غرض کہ یہ نہایت ہی خوش‌گو شاعرہ تھی شاید اسی قسم کا کوئی اور واقعہ ہوگا جس پر یہ رباعی کہی گئی ہے بہر حال یہ رباعی مجموعۂ رباعیات افضل میں افضل کے نام سے اور رسالہ شیخ عبداللہ انصاری میں ان کے نام سے ہے ـ اگر تقدم زمانی اور قدامت کو ملحوظ رکھا جائے تو شیخ‌الاسلام عبداللہ انصاری سے بھی منسوب ہوسکتی ہے اور

پھر اس کو تقدیر کے مسئلے پر محمول کیا جائےگا۔ ان کے رسالے میں موجود ہونے سے پورے طور پر خیال ہوتا ہے کہ انھیں کی رباعی ہے۔

(۷۸) عمرت تا کی به خود پرستی گزرد　　یا درپی نیستی و هستی گزرد
می‌خور که چنیں عمر که غم درپی‌اوست　　آں به که بخواب یا به مستی گزرد

کاس الکرام شرح رباعیات خیام میں آتشکدہ آذر کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ رباعی بہ ادنیٰ تغیر مجد ہمگر کے یہاں موجود ہے۔

(۷۹) خواهی که ترا رتبت اسرار رسد　　مپسند که کس را ز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غم رزق مخور　　کین هر دو بوقت خویش ناچار رسد

یہ رباعی سحابی کی رباعیات میں درج ہے اور شاہ سبحان سے بھی منسوب ہے۔

(۸۰) گویند هر آن کسان که با پرهیز اند　　ز انسانکه بمیرند چنان برخیزند
ما با مئی و معشوق از انیم مقیم　　بو تاکه بحشر ما چنان انگیزند

یہ رباعی بھی حافظ کے رنگ کی ہے اور دیوان حافظ مطبوعہ کشوری میں موجود ہے۔

(۸۱) گویند بحشر گفتگو خواهد بود　　وان یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی نآید　　خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

یہ رباعی شاہ قاسم بن شاہ قوام الدین کی ہے۔ بلکہ اس کا دوسرا شعر انھوں نے اس خط میں بھی لکھا ہے جو میر غیاث الدین کو لکھا۔ تذکرۂ هفت اقلیم۔ کشکول بہائی میں اس رباعی کو سحابی سے منسوب کیا گیا ہے۔

(۸۲) خوش باش که ماه عید نو خواهد شد　　نے کار کسے به کار او خواهد شد
اے ساقی اگر باده دهی ور نه دهی　　می دان که سرجمله فرو خواهد شد

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کے یہاں اس طرح پر موجود ہے:

هرگز نه جفائے کهنه، نو خواهد شد　　نے کار کسے بکام او خواهد شد
اے ساقی اگر مے دهی و ور نه دهی　　می داں که سر جمله فرو خواهد شد

(۸۳) دادم به امید روزگارے برباد　　ما بود ز روزگار خود روزے شاد
زاں مے ترسم که روزگارم نه دهد　　چندانکه ز روزگار بستانم داد

یہ رباعی انوری کی ہے۔ چنانچہ کلیات انوری مطبوعہ نولکشور میں موجود ہے۔

(۸۴) آنہا کہ بہ فکر در معنی سفتند در ذات خداوند سخن‌ها گفتند
سر رشتہ اسرار نہ دانست کسے اول زیچے زدند و آخر خفتند

یہ رباعی مجموعے کی اس رباعی سے تراشی ہے۔ یا وہ اس سے۔

(۸۵) در چرخ بہ انواع سخنہا گفتند این بے خبراں گوہر دانش سفتند
واقف چو نہ گشتند بر اسرار فلک اول زیچے زدند و آخر خفتند

(۸۶) فردا الم فراق طے خواہد شد با طالع سعد قصد مے خواہد شد
معشوقہ موافق است و ایام بہ کام اکنون نہ کنم نشاط کے خواہد شد

یہ رباعی بھی شاید اس رباعی مجموعۂ خیام سے تراش کر شامل مجموعہ کی گئی ہے۔

(۸۷) من دامن زہد و توبہ طے خواہم کرد با موے سپید قصد مے خواہم کرد
پیمانہ عمر من بہفتاد رسید ایندم نہ کنم نشاط کے خواہم کرد

(۸۸) با مے بہ کنار جوئے می باید بود وز غصہ کنارہ جوئے می باید بود
این نزہت عمر ما چوگل دو روز است خنداں لب و تازہ روئے می باید بود

یہ رباعی حافظ کی ہے۔ اور صحیح سے صحیح نسخوں میں بھی موجود ہے۔ چونکہ حافظ کے یہاں شراب کی افراط ہے اس لیے ان سے منسوب ٹھہرسکتی ہے۔ تیسرا مصرع اس طرح ہے:

چوں عمر گرانمایۂ ما دہ روز است

(۸۹) یک ناں بہ دو روز گرشود حاصل مرد وز کوزۂ بشکستہ دم آبے سرد
مامور دگر کسے چرا باید بود یا خدمت چوں خودے چرا باید کرد

صبح گلشن اور المغنم البارد میں یہ رباعی ملا شمس‌الدین نیازی استرآبادی سے منسوب ہے۔ اور مصرع سوم میں (کسے دگر) کی بجائے (کم از خردے) اور وہی زیادہ صحیح اور موزوں ہے۔

(۹۰) کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد وز سر خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہرکس ز سر قیاس چیزے گفتند معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شد

یہ رباعی امام محمد غزالی رح سے بھی منسوب ہے۔ دراصل یہ خیال کہ راز قدرت معلوم ہونا محال ہے، عام خیال ہے۔ چنانچہ اس قسم کی رباعیاں خیام کے مجموعے میں بھی اکثر موجود ہیں۔ المغنم البارد میں بھی افضل کاشانی سے منسوب کی گئی ہے۔

(۹۱) چنداں برو ابن رہ کہ دوئی برخیزد گر نیست دوئی ز رہروی برخیزد
تو او نہ شوی لیک اگر جہد کنی جائے برسی کز توتوئی برخیزد

یہ رباعی افضل کاشانی سے منسوب ہے اور ان کے مجموعۂ رباعیات میں موجود ہے۔

(۹۲) من مے خورم و ہر کہ چو من اہل بود مے خوردن من بہ نزد او سہل بود
مے خوردن من حق ز ازل میدانست گر مے نخورم علم خدا جہل بود

یہ رباعی سراج الدین قمری سے منسوب ہے جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اگر محقق طوسی کی رباعی اسی کے جواب میں ہے تو پھر قمری سے نسبت غلط ہوگی ورنہ یہ قصہ ہی غلط ہوگا کہ خیام نے یہ رباعی کہی اور محقق طوسی نے جواب دیا۔ بہرحال تاریخ گزیدہ میں یہ رباعی قمری سے منسوب کی گئی ہے۔ اور تیسرا مصرع یوں ہے:

می خوردنم ایزد بہ ازل مے دانست

(۹۳) آں ہا کہ جہاں زیر قدم فرسودند و اندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمی شوم کہ ایشاں ہرگز زیں حال چنانکہ ہست آگہ بودند

---

(۹۴) از دفتر عمر پاک می باید شد در دست اجل ہلاک می باید شد
اے ساقی خوش لقا تو خوش خوش مارا آبے در دہ کہ خاک می باید شد

یہ دونوں رباعیاں افضل کاشانی کے مجموعۂ رباعیات میں موجود ہیں اور انھیں سے منسوب کی گئی ہیں۔

(۹۵) مے خوارہ اگر غنی بود عور شود وز عربدہاش جہاں پر از شور شود
در حقۂ لعل ازاں زمرد ریزم تا دیدۂ افعی غمم کور شود

آتشکدۂ آذر میں اس رباعی کو شاہ شجاع المتوفی ۷۷۳ھ سے منسوب کیا ہے۔ شاہ شجاع کے یہاں خمریاتی رباعیاں اور بھی ہیں۔ یہ رباعی مجموعۂ رباعیات خیام

بمبئی میں ہے -

(۹۶) خطے کہ ز روئے یار برخاستہ شد تو ظن بہ بری کہ حسن او کاستہ شد

در باغ رخش بہر تماشا کہ جاں گل بود بہ سبزہ نیز آراستہ شد

یہ رباعی عمعق بخاری شاعر دور سلطان سنجر سے منسوب ہے - ایسی صفاتی رباعیاں خیام سے منسوب نہیں ہوسکتیں - میرے نزدیک یہ رباعی بھی کسی ایسے موقع پر کہی گئی ہے جیسے کہ عنصری نے ایاز کی زلفوں کے ترشنے اور سلطان محمود کے مکدر ہونے پر فی البدیہہ یہ رباعی کہی تھی :

گر عیب سر زلف بت از کاستن است نے جائے بہ غم نشستن و خاستن است

وقت طرب و نشاط و مے خواستن است کاراستن سرو ز پیراستن است

(۹۷) رفتیم ز ما زمانہ آشفتہ بماند با آنکہ ز صد گہر یکے سفتہ بماند

افسوس کہ صد ہزار معنیٔ دقیق از بیخبریٔ خلق ناگفتہ بماند

یہ رباعی المغنم البارد میں شیخ الرئیس کے نام سے منسوب ہے - اور اسطرح نقل ہوئی ہے :

اسرار وجود خام و ناپختہ بماند واں گوہر بس شریف ناسفتہ بماند

ہر کس ز سر قیاس حرفی گفتند واں نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند

خیام میں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے یہ رباعی بہ ادنیٰ تغیر الفاظ معلم ثانی ابونصر فارابی سے منسوب کی ہے - نیز مختار نامۂ عطار میں بھی ملتی ہے - اس قسم کی اور رباعیاں بھی مجموعۂ رباعیات خیام میں موجود ہیں - مگر منقولہ رباعی غلط بھی ہے اور مصرعے آپس میں مربوط نہیں -

(۹۸) زاں پیش کہ گور نے ز من آگندہ شود و اجزائے مرکبم پراگندہ شود

اے بادہ سر از گور صراحی بردار باشد کہ دل مردۂ من زندہ شود

خیام کے مجموعے کی ایک دوسری رباعی دیکھئے اور نتیجہ نکالئے کہ کیا وہ اس رباعی سے نکالی گئی ہے یا یہ اس سے :

آنکہ کہ نہال عمر برکندہ شود و اجزام ز یکدگر پراگندہ شود

ور زانکہ صراحی بہ کنند از گل ما حالے کہ پر از بادہ کنی زندہ شود

(۹۹) ساقی علم سیاہ شب صبح ربود برخیز و مے مغانہ را در دہ زود
بکشائے ز ہم دو نرگس خواب آلود برخیز کہ خفتنت بسے خواہد بود

یہ رباعی کلیات خاقانی مطبوعۂ نولکشوری میں خاقانی کے نام سے ہے ۔ اس قسم کی اور رباعیاں بھی مجموعۂ خیام میں آپ نے دیکھی ہیں جیسے : برخیز کہ در خاک بسے خواہی خفت یا :- مے خور کہ بزیر گل بسے خواہی خفت ۔

(۱۰۰) اے دل مطلب وصال معلولے چند مشغول مشو بہ عشق مشغولے چند
پیرامن آستان درویشان گرد باشد کہ شوی قبول مقبولے چند

یہ رباعی مطبوعۂ کشوری میں نہیں ہے مگر بوڈلین لائبریری کے نسخے میں موجود ہے اور دوسرے نسخوں میں بھی پائی جاتی ہے مگر دراصل یہ سیف‌الدین باخرزی المتوفی ۶۵۸ کی ہے ۔ چنانچہ مجموعۂ منتخبات دارالمصنفین میں سیف‌الدین ہی کے نام سے ہے

(۱۰۱) گر بت رخ تست بت پرستی خوشتر ور بادہ ز جام تست مستی خوشتر
در ہستی عشق زاں سبب نیست شدم کاں نیستی از ہزار ہستی خوشتر

کاس‌الکرام شرح رباعیات خیام میں مولانا روم کے دیوان کا حوالہ دیتے ہوئے اس رباعی کو مولانا سے منسوب کیا ہے ۔ المغنم‌البارد صفحہ ۸۵ میں بھی مولانا روم ہی کے نام سے لکھی گئی ہے ۔

(۱۰۲) با یار خوشم جام شراب اولیٰ تر وز دست غمم دیدہ پر آب اولیٰ تر
چون عالم دوں وفا نخواہد کردن در عالم دوں مست و خراب اولیٰ تر

اغلب کہ یہ رباعی حافظ کی اس رباعی کا مثنیٰ ہے:
ایام شباب است شراب اولیٰ تر ہر غمزدہ مست مئ ناب اولیٰ تر
عالم‌ہمہ سر بسر خراب است و خراب در جائے خراب ہم خراب اولیٰ تر

(۱۰۳) از چرخ بہ کام سر برافراشتہ گیر وز عمر تمام بہرہ برداشتہ گیر
از گنج و گہر ہرچہ مراد دل تست برداشتہ گیر و باز بگزاشتہ گیر

اس قسم کی رباعیاں اکثر لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہیں ۔ چنانچہ خواجہ فرید الدین عطار کے یہاں قریب قریب ایسی ہی رباعی ہے :

از عمر تمام بہرہ برداشته گیر هر تخم که دل می طلبد کاشته گیر
اول برخیز و گیر هرچه آوردی آخر به دریغ جمله بگزاشته گیر

کمال الدین اسماعیل اصفهانی المتوفی ۶۳۶ھ کی یہ رباعی بھی ایسی ھی ھے :

ایوان سریر فلک افراشته گیر وین زیر زمیں بگنج انباشته گیر
وین سیم که جو جو بهمش می آری خرمن خرمن بجائے بگزاشته گیر

ایک رباعی جو اسی مجموعۂ خیام میں شامل ھے یہ ھے ۔ معلوم نہ ھوسکا کہ یہ کس کی ھے :

کار همه عالم بمرادت شده گیر وین عمر برفته و اجل آمده گیر
گفتی که بکام خویش دستے بزنم خود نتوانی و گر توانی زده گیر

(۱۰۴) اے دل همه اسباب جهاں خواسته گیر وین خانه پر از نعمت و آراسته گیر
خوش باش درین نشیمنِ کون و فساد روز دو سه بنشسته و برخاسته گیر

یہ رباعی بھی اسی قسم کی ھے جو مجموعۂ خیام میں شامل ھے مگر کاس الکرام شرح رباعیات خیام میں آتشکدہ کے حوالے سے شاھی سبزواری سے منسوب کی گئی ھے ۔

(۱۰۵) اے دل همه اسباب جهان خواسته گر باغ طربت به سبزه آراسته گیر
و انگاه بران سبزه شبے چوں شبنم بنشسته و بامداد برخاسته گیر

ھفت اقلیم میں یہ رباعی عاکفی گیلانی کی طرف منسوب کی گئی ھے اور صبح گلشن میں بھی اسی کا اتباع کیا ھے ۔ عطار رح کی ایک دوسری رباعی اسی انداز کی ھے :

هر رنگ که ممکن است آمیخته گیر هر فتنه که ساکن است انگیخته گیر
وین روئے چو ماه آسمانت بدریغ از صرصر مرگ بر زمیں ریخته گیر

نظام الدین سہیلی کی یہ رباعی بھی اسی مضمون کی ھے :

برخیز و لوائے دولت افراشته گیر دنیا همه در زیر نگیں داشته گیر
آفاق از آنِ خویش پنداشته گیر آخر ز جهاں رفته و بگزاشته گیر

(۱۰۶) بازے بودم پریده از عالم راز بو تاکه پرم دمے نشیبے به فراز
اینجا که نیافتم کسے محرم راز زان در که درآمدم برون رفتم باز

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار رح کی ہے۔ تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی میں شیخ فریدالدین عطار کے بیان میں درج ہے اور بجائے "بازے بودم"۔ "مرغے بودم" اور دوسرے مصرعے میں۔ "ز صعب صیدے بہ فراز"۔ تیسرے میں "چون ہیچ کسے نیافتم" ہے۔ یہ رباعی مجموعۂ رباعیات افضل میں بھی موجود ہے اور شیخ الاسلام عبداللہ انصاری سے بھی منسوب ہے۔

(۱۰۷) بر روئے گل از ابر نقاب است ہنوز　　در طبع دلم میل شراب است ہنوز
در خواب مرو چہ وقت خواب است ہنوز　　جانا مے خور کہ آفتاب است ہنوز

یہ رباعی بھی شیخ فرید الدین عطار سے منسوب ہے اور ان کی رباعیات کے مجموعے مختار نامے میں موجود ہے۔

(۱۰۸) مے پرسیدی کہ چیست این نقش مجاز　　گر برگویم حقیقتش ہست دراز
نقشے است پدید آمدہ از دریائے　　و انگاہ شدہ بہ قعر آن دریا باز

یہ رباعی بھی شیخ فریدالدین عطار کی ہے مختار نامے میں موجود ہے۔ منتخبات دارالمصنفین میں بھی انھیں سے منسوب ہے اور حقیقتاً یہ رنگ تصوف انھیں کا حصہ ہے۔

(۱۰۹) اے واقف اسرار ضمیر ہمہ کس　　در حالت عجز دستگیر ہمہ کس
یارب تو مرا توبہ دہ و عذر پذیر　　اے توبہ دہ و عذر پذیر ہمہ کس

یہ رباعی شاہ ابوسعید ابوالخیر رح کی ہے اور ان کی اس طرح کی بہت سی رباعیاں ہیں المغنم البارد صفحہ ۱۰۴۔ مولانا جامی کی اسی قسم کی رباعی سنیے:-

اے فضل تو دستگیر من، دستم گیر　　سیر آمدہ ام ز خویشتن دستم گیر
تا چند کنم توبہ و تا کے شکنم　　اے توبہ دہ توبہ شکن دستم گیر

(۱۱۰) از حادثۂ زمان آئندہ مپرس　　وز ہرچہ رسد چو نیست پایندہ، مپرس
این یک دم نقد را غنیمت میدان　　از رفتہ میندیش وز آیندہ مپرس

کاس شرح رباعیات خیام میں اس رباعی کو مولانا روم سے منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیوان مولانا روم میں موجود ہے۔ المغنم البارد صفحہ ۱۸۸ میں یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کے نام سے لکھی گئی ہے:-

اے ذرہ ز اندازۂ ذرات مپرس   یک وقت نگہدار ز اوقات مپرس
قصہ چو کنی دراز در غصہ بسوز   در صنع نگہ میکن و از ذات مپرس

یہی رباعی افضل کاشانی کی رباعیات میں موجود ہے:—

(۱۱۱) مرغے دیدم نشستہ بر بارۂ طوس   در پیش نہادہ کلّہ کیکاوس
با کلّہ ہمی گفت کہ افسوس افسوس   کو بانگ جرس‌ها و کجا نالۂ کوس

المغنم البارد صفحہ ۱۸۸ میں یہ رباعی شیخ ابوالحسن بلخی کے نام سے اس طور پر درج ہے:—

دوشم گزر افتاد بویرانۂ طوس   دیدم چغدے نشستہ بر جاے خروس
گفتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ   گفتا خبر این است کہ افسوس افسوس

(۱۱۲) با روئے نکو شراب روشن در کش   با دوست دل از جفائے دشمن در کش
با سادہ رخے نشین و بگزر از خویش   پیراہن کبر و ہستی از تن در کش

دیوان حافظ کے ایک قدیم مطبوعہ نسخے میں یہ رباعی اس طرح پائی جاتی ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۸۱ع میں کلکتہ میں میجر ایچ ایس جٹریٹ صاحب بہادر کے اہتمام سے طبع ہوا۔ یہ رباعی نسخۂ کشوری میں بھی موجود ہے:—

اے دوست دل از جفائے دشمن درکش   با روئے نکو شراب روشن درکش
با اهل هنر گوئے گریباں بہ کشائے   وز نااهلاں تمام دامن درکش

(۱۱۳) غم چند خوری ز کار ناآمدہ پیش   رنج است نصیب مردم دوراندیش
خوش باش وجہاں تنگ مکن بردل خویش   کز خوردن غم قضا نگردد کم و بیش

یہ رباعی رباعیات افضل کاشانی میں موجود ہے۔ المغنم البارد میں بھی افضل ہی کے نام سے لکھی گئی ہے۔

(۱۱۴) ابدل مطلب ز دیگراں مرهم خویش   خود باش بهر درد دلی مرهم خویش
تنها بہ نشین و خویشتن خور غم خویش   از همدمت آرزو کند همدم خویش

یہ رباعی افضل کاشانی کی رباعیات میں موجود ہے۔ تذکرۂ ہفت اقلیم میں تغیر ذیل کے ساتھ کمال اسماعیل سے منسوب کی گئی ہے۔ دوسرا شعر اس طرح ہے:—

تنہا بہ نشین و خود همی خور غم خویش   ور همدمت آرزو کند همدم خویش

(۱۱۵) ایام شباب رفت و خیل و حشمش   تلخ است مرا عیش ولی می چشمش

ایں قامت همچو تیر من گشته کماں   زه کرده ام از عصا و خوش می کشمش

تذکرہ شمع انجمن صفحہ ۵۲ مطبوعہ ۱۲۹۳ ھ میں یہ رباعی احمد خاں بادشاہ گیلان المتوفی ۹۲۰ ھ سے منسوب کی گئی ھے :-

در کار گہ کوزہ گرے رفتم دوش   دیدم دو هزار کوزہ گو یا و خموش

هر یک بزباں حال با من گفتند   کو کوزہ و کو کوزہ گر و کوزہ فروش

یہ رباعی بھی رباعیات افضل میں موجود ھے - سعدی کا ایک قطعہ کیا خوب ھے :-

نرفت از دام قول آن کاسہ گر   کہ میگفت با کاسۂ پر خطر

ندانم کہ سنگ سپهر قضا   ترا بشکند پیشتر یا مرا

(۱۱۶) هاں صبح دمید و دامن شب شد چاک   برخیز و صبوح کن چرائی غمناک

مے نوش هلا کہ صبح بسیار دمد   او روئے بما کرده و ما روئے بخاک

یہ رباعی شیخ فرید الدین عطار رح کی ھے اور مختار نامے میں موجود ھے - مختار نامے میں اس قسم کی رباعیاں بہت ھیں - (هاں) کی جگہ (چوں) اور دوسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں (هلا) کی بجائے (دمے) ھے -

(۱۱۷) با سرو قدے تازہ تر از خرمنِ گل   از دست مده جام مے و دامن گل

زاں پیش کہ ناگہ شود از گرگ اجل   پیراهن عمر تو چو پیراهنِ گل

آتشکدۂ آذر میں یہ رباعی کمال اسماعیل اصفہانی کے منتخبات میں نقل کی گئی ھے -

(۱۱۸) اسرار حقیقت نه شود حل به سوال   نے نیز به درباختن حشمت و مال

تا جاں نه کنی خوں نخوری پنجه سال   از قال ترا ره نه نمایند به حال

نفحات الانس مولانا جامی میں یہ رباعی شیخ اوحد الدین حامد الکرمانی المتوفی ۶۳۵ ھ کے نام سے لکھی گئی ھے - دوسری جگہوں میں بھی انھیں سے منسوب ھے - مگر المغنم البارد میں قلندر کے نام سے ھے - اور یہ معلوم نہیں کہ یہ کون سے قلندر ھیں -

(۱۱۹) از جرم حضیض خاک تا اوج زحل کردم همه مشکلات گردوں را حل
بیروں جستم ز بند هر مکر و حیَل هر بند کشاده شد مگر بند اجل

بعض هم معنی الفاظ کے تغیر کے ساتھ یه رباعی شیخ بوعلی سینا سے منسوب ھے - سوانحعمری بوعلی سینا - تذکرہ صبح گلشن صفحه ۱۲ - مجمع الفصحا - منتخبات دارالمصنفین اعظم گڑھ -

(۱۲۰) گر من گنهٔ روئے زمیں کر دستم عفو تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم عاجز تر ازیں مخواه کا کنون هستم

نفحات الانس مولانا جامی میں یه رباعی اس قصے کے ساتھ شیخ سیف الدین باخرزی المتوفی ۶۵۸ ھ سے منسوب کی گئی ھے - که ایک درویش کا جنازه جارها تھا شیخ بھی موجود تھے - لوگوں نے عرض کیا که حضرت تلقین میت فرمائیے - آپ میت کے سامنے آئے اور یه رباعی ارشاد فرمائی - تذکرۂ حسینی میں بھی یہی قصه بیان کیا گیا ھے -

(۱۲۱) با نفس همیشه در نبردم چه کنم وز کردهٔ خویشتن به دردم چه کنم
گیرم که ز من در گزرانی به کرم آن شرم که دیدی که چه کردم چه کنم

یه رباعی مولانا فخر الدین عراقی کی ھے اور ان کے دیوان میں موجود ھے - امیر خسرو دهلوی رح المتوفی ۷۲۵ ھ کی رباعی بھی ایسی ھی ھے :-

یا رب چو ز عقل خود تباهم چه کنم و ز گیسو و زلف روسیاهم چه کنم
گیرم به کرم گناه من عفو کنی آن شرم که دیدهٔ گناهم چه کنم

مرزا غالب نے ایک نیا گوشه پیدا کرکے یه شعر خوب کہا ھے :-

هفت دوزخ در نهاد شرمساری مضمر است انتقام است اینکه با مجرم مدارا کردهٔ

یا رب تو گلم سرشتهٔ من چه کنم پشم و قصبم تو رشتهٔ من چه کنم
هر نیک و بدی که از من آید به وجود تو بر سر من نوشتهٔ من چه کنم

یه رباعی رباعیات افضل میں شامل ھے - شیخ فرید الدین عطار رح کی ایسی ھی رباعی یه ھے :-

چوں مے نہ رہا نیم زمن، من چه کنم سیر آمده ام ز جان و تن من چه کنم
من میخواهم که راه یابم سوئے تو ره تو نه دهی بخویشتن، من چه کنم
(۱۲۲) گویند مرا که مے پرستم هستم گویند مرا فاسق و مستم هستم
در ظاهر من نگاه بسیار مکن کاندر باطن چنانکه هستم هستم

یہ رباعی شیخ ابوالحسن خرقانی سے منسوب ہے۔ خیام مولوی سید سلیمان صاحب ندوی صفحہ ۲۴۱ - اسی رباعی سے غالباً خیام کے مجموعے میں یہ رباعی تراش کر شامل کی گئی ہے:-

گر من ز مے مغانه مستم، هستم گر کافر و گبر و بت پرستم، هستم
هر طایفهٔ به من گمانے دارند من زانِ خودم چنانکه هستم، هستم
(۱۲۳) گفتم که دگر چشم به دلبر نه کنم صوفی شوم و گوش به منکر نه کنم
دیدم که خلاف طبعِ موزون من است توبه کردم که توبه دیگر نه کنم

یہ رباعی مجموعهٔ رباعیات کشوری میں نہیں ہے۔ مگر مطبوعهٔ الهآباد میں ہے۔ یہ کلیات سعدی کشوری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت صحیح اور قدیم نسخہ مطبوعهٔ کلکتہ میں بھی موجود ہے۔

(۱۲۴) اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم آزادم کن که لایق بند نیم
گر میل تو با بےخرد و نااهل است من نیز چناں اهل و خردمند نیم

آتشکدهٔ آذر میں یہ رباعی اثیرالدین اومانی کی طرف منسوب کی گئی ہے اثیرالدین کمال اسماعیل کا معاصر اور نہایت جید شاعر تھا۔

(۱۲۵) ماکز مئے بیخودی طرب ناک شدیم وز پایهٔ دوں بر سر افلاک شدیم
آخر همه ز الایش تن پاک شدیم از خاک برآمدیم و بر خاک شدیم

موزون الملک لطفی فرزند عرفی کمان‌گر کے یہاں یہ رباعی پائی جاتی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ رباعی اس سے مستخرج ہے یا یہ اس سے:

یکچند پئے گردش افلاک شدیم یکچند پئے دانش و ادراک شدیم
آز آمد و رفتِ خود همی فهمیدیم کز خاک برامدیم و در خاک شدیم

(۱۲۶) ما خرقهٔ زهد در سر خم کردیم وز خاک خرابات تیمم کردیم

باشد که درون میکده دریابیم عمرے که درون مدرسه گم کردیم

یہ رباعی امام محمد غزالی رح المتوفی ۵۰۵ھ کی ہے۔ تذکرۂ شمع انجمن۔ مجمع الفصحا۔ روضات الجنات اور الغزالی موافه مولانا شبلی میں انہیں سے منسوب کی گئی ہے اور مصرع اولی میں (ما خرقه) کی بجائے (ماجامه) ہے۔ نسخه مجموعۂ خیام جےنراین ورما مطبوعۂ ۱۹۰۵ع میں اس طرح ہے:

ما جامه نمازی به سر خم کردیم خود را بمیٔ لعل چو مردم کردیم

در کوئے خرابات مگر بتواں یافت آں عمر که در صومعهها گم کردیم

(۱۲۷) من باده خورم و لیک مستی نه کنم الا به قدح دراز دستی نه کنم

دانی غرضم ز می پرستی چه بود تا همچو تو خویشتن پرستی نه کنم

یہ رباعی کمال اصفہانی کی ہے اور ان کے کلیات میں موجود ہے۔ بجائے (من باده خورم) (می باز خورم) ہے۔

(۱۲۸) چوں نیست مقام ما دریں دیر مقیم پس بے مے و معشوق عذابی است الیم

تا کے ز قدیم و محدث ای مرد سلیم چوں من رفتم جہاں چه محدث چه قدیم

مجھ سے بعض حضرات نے کہا کہ یہ رباعی سنائی کی ہے۔ تلاش کرنے پر سنائی کے یہاں مجھے نہیں ملی مگر حکیم سنائی رح کی ایک ایسی ہی رباعی نفحات الانس میں میری نگاہ سے گزری، جو یہ ہے:

قایم به خودی ازاں شب و روز مقیم بیمت ز سموم است و امیدت به نسیم

با ما نه ز آب و آتشت باشد بیم چوں سایه شدی ترا چه جیحوں چه جحیم

(۱۲۹) ما حاصل عمری به دمی به فروشیم صد خرمن شادی به غمی به فروشیم

در یکدم اگر هزار جاں دست دهد در حال به خاک قدمی بفروشیم

یہ رباعی مجموعۂ خیام مطبوعۂ نولکشور میں موجود نہیں ہے مگر دوسرے نسخوں میں موجود ہے۔ دراصل یہ رباعی شیخ سعدی کی ہے اور قدیم سے قدیم نسخوں میں بھی موجود ہے۔

(۱۳۰) یک چند به کودکی به استاد شدیم   یک چند به استادئی خود شاد شدیم
پایانِ سخن شنو که مارا چه رسید   از خاک برآمدیم و برباد شدیم

یہ رباعی تھوڑے تفاوت اور تغیر سے دیوان مولانا روم میں موجود ہے۔

(۱۳۱) بر مفرش خاک خفتگاں می بینم   در زیر زمیں نہفتگاں می بینم
چندانکه بصحرائی عدم می نگرم   نا آمدگاں و رفتگاں می بینم

یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کی ہے جو مجموعۂ رباعیات یعنی مختارنامے میں موجود ہے۔ اور اسی مضمون کی اکثر رباعیاں ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

(۱۳۲) ہرگه که دریں سبزه طربناک شویم   مانندۂ سبز خنگ افلاک شویم
با سبز خطاں سبزه خورم در سبزه   زاں پیش که زیر سبزه در خاک شویم

یہ رباعی آتشکدے میں شاہ شجاع المتوفی ۷۷۳ھ کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔

(۱۳۳) آں به که زجام و باده دل شاد کنیم   وز نامده و گزشته کم یاد کنیم
ایں عاریتی رواق زندانی را   یک لحظه ز بند عقل آزاد کنیم

یہ رباعی دیوان حافظ میں موجود ہے اور بھی رباعیاں اس قسم کی ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

(۱۳۴) صبح است دمی بر مئے گلرنگ زنیم   ویں شیشۂ نام و ننگ بر سنگ زنیم
دست از املِ درازِ خود باز کشیم   در زلفِ دراز و دامن چنگ زنیم

ہفت اقلیم میں یہ رباعی جمال الدین ابہری کے ساتھ منسوب کی گئی ہے اور (دمے) کی بجائے (بیا)، (خود) کے بجائے (خوش)، (دامن) کی بجائے (حلقه) ہے۔

(۱۳۵) گل گفت که من یوسف مصر چمنم   یاقوت گرانمایۂ پر زر دهنم
گفتم چو تو یوسفی نشانے بنمائے   گفتا که بخوں غرقه نگر پیرهنم

گل کے متعلق سوالات و جوابات کی بہت سی رباعیاں مختارنامۂ عطار میں موجود ہیں۔ اگرچہ تلاش سے یہ رباعی تو مجھے نہیں ملی مگر میرا یہ خیال یقین کی حد پر ہے کہ یہ رباعی بھی شیخ عطارؒ کی ہے۔ اس کے متعلق ایک جواب موجود ہے، ملاحظہ ہو:

با گل گفتم چو یوسف کنعانی   در مصرِ چمن ترا رسد سلطانی
گل گفت که من یک ورقم از هر باب   خود یک ورق است اینکه تو بر میخوانی

ایک اور رباعی احتیاطاً نقل کی جاتی ہے ورنہ سب کو نقل کرنا تو بڑا کام ہے:

گل گفت کہ دست زرفشاں آوردم خنداں خنداں گل بجہاں آوردم

پندار سر کیسہ گرفتم رفتم ہر نقد کہ بود با میاں آوردم

(۱۳۶) اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من وین حرف معما نہ تو خوانی و نہ من

هست از پس پردہ گفتگوئے من و تو چوں پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

یہ رباعی شیخ ابوالحسن خرقانی رح کی ہے۔ المغنم البارد۔ آتشکدہ۔ اور ایک تذکرۂ قلمی سب اسی پر متفق ہیں۔ رباعیات عطار میں اس قسم کی رباعیوں کا ایک پورا باب ہے جن میں سے دو ایک نقل کرتا ہوں:

آں سرّ عجب کہ نی تو دانی و نہ من حل کردن آں نی تو توانی و نہ من

یک ذرہ گر آشکار گردد آں سر یک ذرہ همی نی تو بمانی و نہ من

چیزیکہ درو نہ تو درانی و نہ من کشف است کہ آں را نہ تو دانی و نہ من

برخیزد اگر پردۂ پندار از پیش او ماند و او' نی تو بمانی و نہ من

(۱۳۷) برخیز و مخور غم جہان گزراں خوش باش دمی بہ شادمانی گزراں

در طبع جہاں اگر وفائی بودی نوبت بہ تو خود نیامدی از دگراں

آتشکدۂ آذر۔ تذکرۂ صبح گلشن اور تذکرۂ قلمی میں یہ رباعی کمال اسماعیل اصفہانی سے منسوب ہے۔ اور کمال کے یہاں اس قسم کی اور رباعیاں بھی موجود ہیں۔

(۱۳۸) بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن بر جان و دل اسیر من رحمت کن

بر پائے خرابات رو من بخشائے بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

مجھے صحیح پتہ نہیں چلا کہ یہ رباعی کس کی ہے مگر اس قسم کی دوسری رباعیاں دوسرے شاعروں کے یہاں ملیں جن میں سے قاسم کی یہ رباعیاں نقل کی جاتی ہیں۔ المغنم البارد صفحہ ۷۵:

بر دیدۂ چوں سحاب من رحمت کن بر سیل سرشک ناب من رحمت کن

بر جان و دل خراب من رحمت کن بر زاری و اضطراب من رحمت کن

بر ناله و بر زاریٔ من رحمت کن بر مفلسیٔ و خواریٔ من رحمت کن
بر گریه و بیداریٔ من رحمت کن بر فقر و نگونساریٔ من رحمت کن

حکیم مومن خان مومن دهلوی نے اس مضمون میں ایک نیا گوشه پیدا کرکے یه رباعی کہی ھے :

یا رب نظرے بچشم خونبارم کن رحمے به دل سوختهٔ زارم کن
گر در خور آتشم بدوزخ مسپار یک شعله ز برق طور در کارم کن

(۱۳۹) این چشم پیاله بین به جان آبستن همچون سمنے به ارغواں آبستن
نے نے غلطم که باده از غایت لطف آبے است بآتشِ رواں آبستن

آتشکدهٔ آذر میں یه رباعی عسجدی المتوفی ۴۳۲ ھ سے منسوب کی گئی ھے - هفت اقلیم میں بهاءالدین قزوینی کے نام سے ھے - بجائے « چشم » کے « جسم » ھے اور یہی صحیح ھے -

(۱۴۰) دوش از سر روح از صفائے دل من در مےکده آں روح فزائے دل من
جامے بمن آورد که بستان و به نوش گفتم نه خورم گفت برائے دل من

یه رباعی مولانا لطف‌الله نیشاپوری المتوفی ۷۸۶ ھ کی ھے - خزانهٔ عامره میں مولانا آزاد بلگرامی نے اس کے ساتھ یه واقعه بھی لکھا ھے که وه وقت وفات تنہا تھا اور یه رباعی ایک پرچهٔ کاغذ پر لکھی ھوئی اس کے ھاتھ میں پائی گئی - المغنم البارد اور دولت شاہ کے تذکرے میں بھی اسی سے متعلق بتائی ھے - تذکرهٔ دولت شاه میں مولانا لطف‌الله کا سال وفات ۸۱۰ ھ بتایا گیا ھے - کاس‌الکرام میں اس رباعی کو آتشکدے کے حوالے سے قتالی سے منسوب بتایا گیا ھے مگر مجھے قتالی کے یہاں نہیں ملی - پہلا مصرع اس طرح پر ھے :

دوشینه پئے صدق و صفائے دل من

(۱۴۱) جانها همه آب گشت و دلها همه خوں تا چیست حقیقت از پس پرده بروں
اے با علمت خرد و ز گردوں همه‌دوں اے از تو جهاں پر و تو از وے بیروں

یه رباعی نفحات الانس مولانا جامی میں حکیم سنائی رح کی رباعیوں میں لکھی ھے -

اور چونکہ اس قسم کی اکثر رباعیاں سنائی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں موجود ہیں لہذا بہت ممکن ہے کہ یہ بھی انہیں کی ہو - خیام کے مجموعے میں اس قسم کی صوفیانہ رباعیاں نہیں ہیں - اور ہیں تو وہ الحاقی ہیں -

(۱۴۲) احوال جہاں بر دلم آساں می کن و افعال بدم ز خلق پنہاں می کن
امروز خوشم بدار و فردا با من انچہ از کرم تو می سزد آں می کن

تذکرۂ حسینی میں یہ رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے لکھی گئی ہے اور تذکرۂ هفت اقلیم میں شاہ شجاع کے نام سے لائی گئی ہے - گمان غالب یہ ہے کہ شیخ ابوسعید رح کی ہے کیونکہ ان کی اکثر رباعیاں اس قسم کی ہیں - جن میں آیات و اسما کے افعال و خواص بتائے گئے ہیں - چنانچہ مولف تذکرۂ حسینی نے اس رباعی کے بارے میں بھی یہ لکھا ہے: "ایں رباعی جہت اخفائے افعال ذمیمہ و آسانی مشکلات و حصول نعمات دنیوی و اخروی در نصف اللیل بقدر مقدور بخواند اثر اسم یا ستّارُ یا مُیسّرُ دارد" - اسی طرح اور بھی رباعیاں انہوں نے نقل کی ہیں -

(۱۴۳) رندے دیدم نشستہ بر خنگ زمیں نے کفر نہ اسلام نہ دنیا و نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

تذکرۂ هفت اقلیم ذکر شیخ قطب الدین حیدر میں یہ رباعی خواجہ رکن الدین محمود شاہ سنجان المتوفی ۵۹۷ ھ کی بتائی گئی ہے - اور لکھا ہے کہ یہ رباعی انہوں نے شیخ قطب الدین حیدر المتوفی ۵۲۷ ھ کی مدح میں کہی تھی - شیخ قطب الدین حیدر اپنے وقت کے بڑے با کمال صاحب کشف بزرگ تھے اور ان کو شاہ ابدال کے نام سے پکارا جاتا تھا - نفحات الانس مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ میں ان کا نام قطب الدین مودود بتایا گیا ہے اور یہی صحیح ہے ان کے خلف شیخ احمد مودود تھے -

(۱۴۴) دارم ز جفائے فلکِ آئنہ گوں وز گردش روزگارِ خس پرورِ دوں
از دیدہ رخے ہمچو پیالہ پر اشک در سینہ دلے ہمچو صراحی پر خوں

هفت اقلیم میں یہ رباعی امیر یمین الدین طغرائی فریومدی المتوفی ۷۳۷ ھ سے منسوب ہے - تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی میں یہ قصہ بھی اس کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ

یہ رباعی امیر مذکور نے اپنے بیٹے امیر محمود بن یمین کو لکھی تھی اس نے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی :-

دارم ز جفائے فلک آئینہ گوں   پر آہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہ ہزار غم بشب می آرم   تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

(۱۴۵) از آمدن و رفتن ما سودے کو   وزہ تار امید عمر ما پودے کو
در چنبر چرخ جان چندیں پاکاں   مے سوزد و خاک مے شود دودے کو

تذکرۂ ہفت اقلیم میں یہ رباعی افضل الدین محمد افضل سے منسوب ہے جو سلطان محمود غازی کے زمانے کا شاعر ہے۔ دوسرے مصرع میں (چنبر چرخ) کے بجائے (روزن عمر) ہے حافظ کے دیوان میں بھی موجود ہے۔

(۱۴۶) یاقوت لبے لعل بدخشانے کو   وان راحت روح و راح ریحانے کو
مے گرچہ حرام در مسلمانی شد   تو مے خور و غم مخور مسلمانے کو

یہ رباعی کاس الکرام شرح رباعیات خیام میں کلیات سلمان ساوجی مطبوعۂ بمبئی کا حوالہ دیتے ہوئے مغربی المتوفی ۸۰۹ھ سے منسوب بتائی گئی ہے۔

(۱۴۷) در دیدۂ تنگ مور نور است از تو   در پائے ضعیف پشہ زور است از تو
ذات تو سزاست مر خداوندی را   ہر وصف کہ ناسزاست دور است از تو

ہفت اقلیم میں یہ رباعی ملک الکلام عمر بن محمد الحرقابادی کی طرف منسوب کی گئی ہے اور پہلے مصرع میں بجائے "در دیدۂ تنگ مور" کے "در چشم حقیر مور" ہے۔

(۱۴۸) روزیکہ بود وقت ہلاک من و تو   از تن برود روان پاک من و تو
از بسکہ نباشیم دریں چرخ کبود   مہ در تابد بر سر خاک من و تو

مختار نامے میں یہ رباعی شیخ فریدالدین عطار کے یہاں موجود ہے۔ کچھ الفاظ کا تغیر پہلے مصرع میں (وقت) کی بجائے روز دوسرے میں (برود) کی بجائے (برھد) تیسرے میں (چرخ) کی بجائے (طاق) چوتھے میں (مہ درتابد) کی بجائے (چہ مہ تابد) شیخ فرید الدین عطار کے یہاں یوں تو اس مضمون کی رباعیاں بہت سی ہیں مگر خصوصیت سے یہ رباعی تو قریب قریب ایسی ہی ہے۔

مے خور کہ فلک بہر ہلاک من و تو قصدے دارد بجان پاک من و تو

بر سبزہ نشیں دمے کہ بسیار نماند تا سبزہ بروں دمد ز خاک من و تو

چنانچہ اس کو بھی مجموعۂ خیام میں اس طرح نقل کیا گیا ہے۔ کہ پہلے مصرع میں (مے خور) کی بجائے (ایں چرخ) تیسرا مصرع یوں ہے: بر سبزہ نشیں پیالہ کش دیر نماند۔ غرض کہ یہ رباعی وهی ہے جو مختار نامۂ عطار میں ہے۔ رباعیات افضل کاشانی میں بھی مندرجۂ بالا رباعی موجود ہے۔

(۱۴۹) از تن چو برفت جان پاک من و تو خشتے دو نہند بر مغاک من و تو

وانگہ ز برائے خشت گور دگراں در کالبدے کشند خاک من و تو

یہ رباعی المغنم البارد میں فطرت کے نام سے لکھی گئی ہے۔

(۱۵) ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو

من بد کنم و تو بد مکافات دهی پس فرق میان من و تو چیست بگو

اس رباعی کے ساتھ یہ قصہ بھی بتایا جاتا ہے۔ کہ خیام کا ظرف شراب ایک مرتبہ کسی طرح ٹوٹ گیا تو اس نے یہ رباعی کہی:

ابریق مئے مرا شکستی ربی بر من در عیش را تو بستی ربی

بر خاک بہ ریختی مئے ناب مرا خاکم بہ دهن مگر تو مستی ربی

اس رباعی کے کہتے هی خیام کا چہرہ سیاہ یا مسخ هوگیا۔ دیکھنے والوں نے حکیم سے یہ کہا۔ تو حکیم صاحب نے مندرجۂ بالا رباعی کہی اور چہرہ بدستور اپنی حالت اصلی پر آ گیا۔ یہ سب کچھ ہے مگر مجھے تو یہ رباعی شیخ فخر الدین عراقی کے دیوان میں ملتی ہے۔ اور اس کے پہلے شعر میں یہ تغیر ہے:

آں کیست کہ بے جرم و گنہ زیست بگو بےجرم و گناہ در جہاں کیست بگو

تیسرے مصرع میں بجائے (دهی) کے (کنی) ہے۔ یہ رباعی رباعیات سرمد میں بھی موجود ہے۔ المغنم البارد میں اس کو شیخ اوحدالدین کرمانی کے تحت میں لکھا گیا ہے۔ ایک شعر مولانا روم کا قریب قریب اسی مضمون کا ہے:

گر فراق بندہ از بد بندگی‌ست چوں تو باید بدکنی پس فرق چیست

(۱۵۱) ای زندگی و تن و توانم همه تو جانی و دلی ای دل و جانم همه تو
تو هستی من شدی ازانی همه من من نیست شدم در تو ازانم همه تو

یہ رباعی بھی دیوان فخرالدین عراقی میں موجود ہے اور اس قسم کے تصوف کا مجموعۂ رباعیات خیام میں شائبہ بھی نہیں۔ افضل کاشانی کے یہاں بھی موجود ہے۔

(۱۵۲) سر از همه ناکساں نہاں داری تو راز از همه ابلہاں نہاں داری تو
بنگر که میانِ مردماں کار تو چیست چشم از همه مردماں نہاں داری تو

رباعی کے قوافی وغیرہ کی غلطی سے قطع نظر کرتے ہوئے جب غور کیا جاتا ہے تو یہ مجموعۂ خیام کی ایک دوسری رباعی سے تراشی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو یہ ہے:

سر از همه ناکساں نہاں باید داشت راز از همه ابلہاں نہاں باید داشت
بنگر که بجان مردماں مے چه کنی چشم ازهمه مردماں نہاں باید داشت

(۱۵۳) هر روز برآنم که کنم شب توبه از جام و پیالۂ لبالب توبه
اکنوں که رسید وقت گل ترکم ده در موسم گل ز توبه یا رب توبه

یہ رباعی بھی مختارنامۂ شیخ فریدالدین عطار میں موجود ہے۔(ترکم ده) کی بجائے (ترکم نیست) ہے۔ اس قسم کی رباعیاں بھی اکثر پائی جاتی ہیں جو مختلف شعرا سے منسوب ہیں۔

(۱۵۴) آں بادۂ خوشگوار بر دستم نه واں ساغر چوں نگار بر دستم نه
واں مے که چو زنجیر بپیچد برخود دیوانه شدم بیار بر دستم نه

یہ رباعی دیوان حافظ مطبوعۂ کشوری وغیرہ میں موجود ہے۔ مگر ایک قدیم مطبوعہ دیوان میں اس کو ملحقات کے ذیل میں لایا گیا ہے۔ اگرچہ حافظ کے کلام میں اس رباعی کا ہونا مستبعد نہیں ہے۔ ایسی چیزیں بہت سی ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

(۱۵۵) ساقی به صبوحی مے ناب اندر ده مستان شراب را شراب اندر ده
مستیم و خراب در خرابات فنا آوازه بـه عـالم خراب اندر ده

یہ رباعی بھی کلیات عطار میں موجود ہے۔

(۱۵٦) مائیم به لطف حق تولا کرده وز طـاعت و معصیت تبرا کرده
آنجا که عنایت تو باشد، باشد ناکرده چو کرده، کرده چوں ناکرده

تذکرۂ هفت اقلیم میں یه رباعی شیخ الرئیس بوعلی سینا سے منسوب کی گئی ہے۔ مجموعۂ منتخبات دارالمصنفین میں بھی یہی بتایا گیا ہے۔

(۱۵۷) اے نیک نہ کردۂ و بدیہا کردہ آنگاہ بہ لطف حق تولا کردہ
بر عفو مکن تکیہ کہ هرگز نبود نا کردہ چو کردہ، کردہ چوں نا کردہ

بعض نسخوں میں یه رباعی بھی بوعلی سینا سے منسوب بتائی گئی ہے اور ہوسکتا کہ تنوع مضامین کے لحاظ سے دونوں انھیں نے کہی ہوں، ایسا اکثر ہوتا ہے کہ شاعر ایک ہی مضمون کو طرح طرح سے کہتا ہے مگر بعض محققین شاعر کی گفتار کو اس کے کردار سے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ مولوی سید سلیمان صاحب نے اپنی تصنیف ’خیام‘ میں ان دونوں رباعیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں کا مصنف ایک شخص نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے پہلی رباعی مجموعۂ منتخبات کے حوالے سے شیخ بوعلی سینا کے نام سے منسوب کی ہے اور دوسری محقق طوسی کی جو اس کے جواب میں کہی گئی ہے مگر میری تحقیق میں یه دوسری رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر سے بھی منسوب بتائی جاتی ہے۔

(۱۵۸) گر دولت و بخت باشد و روز بہی در پائے تو سر بباز ماے سرو سہی
سہل است کہ من در قدمت خاک شوم ترسم کہ تو پائے بر سر من نہ نہی

یه رباعی مجموعۂ رباعیات مطبوعۂ مطبع نولکشوری میں نہیں ہے مگر مطبوعۂ الہ آباد میں ہے اور شیخ سعدی کے کلیات میں پائی جاتی ہے۔ علی ہذا یه دونوں بھی الہ آباد ہی کے نسخے میں ہیں اور نولکشوری میں نہیں ہیں اور دونوں سعدی ہی سے منسوب ہیں۔

(۱۵۹) گر کام دل از زمانہ تصویر کنی بے فائدہ خود را ز غماں پیر کنی
گیرم کہ ز دشمناں بنالی بر دوست چوں دوست جفا کند چہ تدبیر کنی

(۱۶۰) گیرم کہ بہ تقوی و خردمندی رائے از دائرۂ شرع بروں نہ نہم پائے
با میل کہ طبع می کند چہ تواں کرد عیبے است کہ درمن آفریدست خدائے

(۱۶۱) اے دل اگر از غبار تن پاک شوی تو روح مجردی بر افلاک شوی
عرش است نشیمن تو شرمت بادا کائی و مقیم خطۂ خاک شوی

ھفت اقلیم میں یہ آخری رباعی امام فخرالدین رازی سے منسوب کی گئی ھے۔ علاؤالدین عطا ملک جوینی نے تاریخ جہانکشا میں ایک بزرگ شیخ احمد بدملی سبزواری کا ذکر کیا ھے جو ۵۸۲ھ میں موجود تھے انھیں سے اس رباعی کو منسوب کیا ھے اور کچھ الفاظ کی تبدیلی ھے۔ مجمع الفصحا میں بدیعی سجاوندی کے نام سے لکھی گئی ھے۔ تاریخ گزیدہ میں امام فخرالدین رازیؒ سے۔ اور غالباً یہ انھیں کی ھے۔ یہ رباعی جلال الدین بلخی سے بھی منسوب ھے۔

(۱۶۲) گر آمدنم بہ خود بُدے نامدمے ور نیز شدن بمن شدے کے شدمے
به زاں نه بدے که اندریں دیر خراب نے آمدمے نے شدمے نے بدمے

مجمع الفصحا میں یہ رباعی حکیم سنائیؒ سے منسوب ھے۔ رباعیات افضل میں افضل کے نام سے ھے۔

(۱۶۳) با درد قناعت کن و آباد بزی در بند فزونی مشو آزاد بزی
منگر به فزونے ز خود و غصه مخور در کم ز خودے نگه کن و شاد بزی

یہ رباعی افضل الدین محمد افضل شاعر دور محمود غزنوی کی ھے۔ تذکرۂ ھفت اقلیم میں یہ رباعی انھیں سے منسوب کرتے ھوئے بتایا ھے کہ یہ بیشتر رباعی ھی کہتے تھے۔ پہلے مصرع میں «با درد» کی جگہ «با بادہ» ھے۔

(۱۶۴) گر روئے زمیں به جمله آباد کنی چنداں نبود که خاطرے شاد کنی
گر بنده کنی به لطف آزادے را بہتر که هزار بنده آزاد کنی

یہ رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ سے منسوب ھے اور ایک قلمی غیر مطبوعہ تذکرے میں بہ ادنیٰ تفاوت شاہ علاء الدولہ کے نام سے ھے، کسی کی بھی ھو مگر اس قسم کا ناصحانہ انداز کلام مجموعۂ رباعیات خیام سے منسوب نہیں ھوسکتا۔

(۱۶۵) ای آں که خلاصۂ چهار ارکانی بشنو سخنے ز عالم روحانی
دیوی و ددی و ملک و انسانی با تست هر انچه می نمائی آنی

یہ رباعی افضل الدین کاشانی کی ھے اور ان کے مجموعۂ رباعیات میں درج ھے۔

(۱۶۶) هنگام سفیده دم خروس سحری دانی که چرا همی کند نوحه گری
یعنی که نمودند در آئینهٔ صبح کز عمر شبے گزشت و تو بیخبری

تذکرۂ حسینی میں یہ رباعی شیخ ابوسعید ابوالخیر سے منسوب ہے۔ اور بہ‌خلاف اس کے المغنم البارد میں اس کو شیخ رباعی مشہدی کے نام سے نقل کیا ہے۔ اسی قسم کی ایک رباعی زلالی خوانساری کی بھی ہے:

گریال که نوحه میکند وقت گری دانی غرضش چیست ازیں نوحه‌گری
یعنی که گری گری شود عمر تو کم پیمانهٔ عمر پر شود تا نگری

(۱۶۷) اے مایهٔ درماں نفسے به نشینی تا صورت حال دردمنداں بینی
گر من به تو فرهاد صفت شیفته ام عیبم مکن اے‌جاں که تو اس شیرینی

(۱۶۸) ای بلبل خوش نفس چه شیریں نفسی کز دست و زبان خویشتن در قفسی
شاید که به‌یاران عزیزت نه رسی سرمست هوا و پائے بند هوسی

(۱۶۹) فردا که بنامهٔ سیه در نگری بس دست تحسر که بدنداں ببری
بفروخته دیں به دنیا از بےخبری یوسف که به ده درم فروشی چه خری

یہ تینوں رباعیاں مجموعۂ مطبوعۂ کشوری میں نہیں ہیں۔ مگر مطبوعۂ احمدی پریس الہ‌آباد میں موجود ہیں اور یہ تینوں شیخ سعدی کے قدیم سے قدیم کلیات میں بھی موجود ہیں۔ ان رباعیوں کے علاوہ مندرجۂ ذیل رباعیاں رباعیات افضل کے مجموعے میں افضل کاشانی کے نام سے جمع کی گئی ہیں۔ یہ رباعیاں خیام سے بھی منسوب ہیں اور بعض دوسرے شعرا سے بھی۔ مگر ان سب کو تحقیق کرنے پر افضل ہی کا کلام سمجھا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر خیام کے مختلف مجموعوں میں ان کو اسی کے نام سے لکھا گیا ہے:

از رفته قلم هیچ دگرگوں نه شود وز خوردن غم جز به جگر خوں نه شود
هاں تا جگر خویش به غم خوں نه کنی یک ذره از انچه هست افزوں نه شود

افسوس که کار پخته خاماں دارند اسباب تمام ناتماماں دارند
آنانکه به بندگی نمی ارزیدند امروز کنیزان و غلاماں دارند

اے ذات تو سر دفتر اسرار وجود   نقش رقمت بر در و دیوار وجود
در پردۂ کبریا نہاں گشتہ ز خلق   بہ نشستہ عیاں بر سر بازار وجود

بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد   یک بد نہ کند تا بہ خوشی صد نرسد
من نیک تو خواہم و تو بدخواہِ منی   تو نیک نہ بینی و بمن بد نرسد

پیرے سر و رائے بے صوابی دارد   گلنار رخت برنگ آبی دارد
بام و در و چار رکن دیوار وجود   ویراں شدہ روئے در خرابی دارد

تا زہرہ و مہ بر آسمانند پدید   بہتر ز مئے لعل کسے ہیچ نہ دید
من در عجبم ز مے فروشاں کایشاں   بہ زانکہ فروشند چہ خواہند خرید

چوں شاہد روح خامہ پرداز شود   ہر چیز بہ اصل خویشتن باز شود
ایں ساز وجود را چہ ابریشم طبع   از زخمۂ روزگار بے ساز شود

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند   با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا   درپیش ندارند و امامت نہ کنند

یہ رباعی شاہ سنجاں سے بھی منسوب ہے:

رازم ہمہ دانائے فلک میداند   کو موئے بموئے یک بیک میداند
گیرم کہ تو اینجا شش و پنجے داری   با او چہ کنی کہ یک بیک میداند

بودی کہ نبودت بہ خور و خواب نیاز   کردند نیازمندت ایں چار انباز
ہر یک بہ تو انچہ داد بستاند باز   تا باز چناں شوی کہ بودی ز آغاز

اے چرخ خسیس خس دوں پرور خس   ہرگز تو نہ گشتی بمراد دل کس
چرخا فلکا ترا ہمیں بادابس   ناکس کس سازی و تو کس را ناکس

پندے دہمت اگر بمن داری گوش   از بہر خدا جامۂ تزویر مپوش
عقبیٰ ہمہ ساعتی است دنیا یکدم   از بہر دمے ملک ابد را مفروش

تا ظن نه بری که از جهاں می ترسم وز مردن و از کشتن جاں می ترسم
مردن چو حقیقت ست زاں باکم نیست چوں نیک نه زیستم ازاں می ترسم

در جستن جام جم جهاں پیمودیم روزے نه نشستیم و شبے ناسودیم
ز استاد چو وصف جام جم پرسیدیم خود جام جهاں نمائے جم، ما بودیم

یه آخری رباعی زین‌الدین نسوی سے بھی منسوب ہے مگر تذکرۂ روز روشن میں زین‌الدین صوفی هروی کے نام سے درج ہے:

حق جان جهاں است و جهاں جمله بدن اصناف ملایکه حواس ایں تن
افلاک و عناصر و موالید اعضا توحید همیں است دگرها همه فن

یه رباعی افضل کاشانی کے علاوہ شیخ‌الدین حموی المتوفی ۶۵۰ھ سے بھی منسوب ہے۔ آتشکدہ میں ان کو شیخ نجم‌الدین کبری کا بھائی اور نفحات‌الانس میں ان کے اصحاب میں سے بتایا گیا ہے اور ان کی بہت سی تصانیف اور رباعیاں پائی جاتی ہیں:

روزے که گذشته است ازاں یاد مکن فردا که نیامده است فریاد مکن
بر نامده و گذشته بنیاد مکن حالے خوش باش و عمر برباد مکن

ای آں که پدید گشتم از قدرت تو پرورده شدم بناز از نعمت تو
صد سال به امتحاں گنه خواهم کرد تا جرم من است بیش یا رحمت تو

اے در خم چوگان قضا همچوں گو چپ میخورو راست مے برو، هیچ مگو
آں کس که ترا فگند اندر تگ و پو او داند و او داند و او داند و او

دنیا به مراد رانده گیر آخر چه ویں نامهٔ عمر خوانده گیر آخر چه
گیرم به مراد دل بمانی صد سال صد سال دگر بمانده گیر آخر چه

از کبر مدار هیچ در دل هوسے کز کبر بجائے نه رسید است کسے
چوں زلف بتاں شکستگی عادت کن تا صید کنی هزار دل در نفسے

یه رباعی افضل کے علاوہ شیخ اوحدالدین کرمانی سے بھی منسوب ہے:

گر شہرہ شوی بہ شہر، شرّالناسی ور گوشہ نشیں شوی، ہمہ وسواسی
آں بہ کہ اگر خضر و گر الیاسی کس نشناسد ترا تو کس نشناسی

کچھ رباعیاں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی ایسی چنی ہیں جو الحاقی ہیں ان میں کی زیادہ‌تر ایسی ہیں جو میں نے بھی ڈھونڈی ہیں مگر بعض ایسی رباعیاں بھی ہیں جو مجھے نہیں مل سکی تھیں بلکہ وہ خالص سید صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہیں مثلاً:

دردا کہ دلم بہ ہیچ درماں نرسید جانم بہ لب آمد و بہ‌جاناں نہ رسید
در بے‌خبری عمر بہ پایاں آمد افسانۂ عشق او بہ پایاں نہ رسید

یہ رباعی شیخ‌الاسلام عبداللہ الانصاری کی مناجات اور منازل السائرین میں موجود بتائی گئی ہے:

درد دل خستہ دردمنداں دانند نے خوش منشان خیرہ خنداں دانند
از سرِّ قلندری تو گر محرومی سرّیست دریں شیوہ کہ رنداں دانند

بتایا گیا ہے کہ قلندری کا لفظ خیام کے یہاں کہیں نہیں اس لیے یہ رباعی ان کی نہیں ہوسکتی:

با این دو سہ ناداں کہ چنیں می دانند از جہل، کہ دانائے جہاں ایشانند
خر باش کہ از خری ایشان بہ مثل ہر کو نہ خرست کافرش می دانند

یہ رباعی شیخ الرئیس بو علی‌سینا کی بتائی گئی ہے:

زاں مے خواہم کہ خرمی را سبب است نامش مے و کیمیائے شادی لقب است
سرخ است چو عناب وز آب عنب است آبے کہ بہ رخ بر آتش آرد عجب است

یہ رباعی حسن باخرزی المقتول ۴۶۷ کی ملکیت بتائی گئی ہے:

خیام تنت بہ‌خیمہ می ماند راست سلطاں روح است و منزلش دار فنا ست
فراش اجل ز بہر دیگر منزل از پا فگند خیمہ کہ سلطاں برخاست

یہ رباعی ڈاکٹر فریڈرک روزن نے دیوان مولانا روم میں پائی ہے اور اس کا پہلا مصرع اس طرح ہے: این صورت تن بہ‌خیمہ می ماند راست

مجھے افسوس ہے کہ زوکوفسکی نے جو ۸۲ رباعیاں اور دوسرے مستشرقوں نے جو اور کچھ رباعیاں زیادہ کرکے شائع کی ہیں وہ میری نگاہ سے نہیں گزریں۔ ورنہ ان میں سے شاید اور کچھ ایسی رباعیاں ملتیں جو میرے دسترس تجسس سے باہر تھیں مگر پھر بھی ان بیاسی رباعیوں میں سے ۳۳ رباعیوں کی نقل خیام میں دے دی گئی ہے ان میں سے ۱۴ رباعیاں ایسی ہیں جو میری تلاش کردہ رباعیوں کے علاوہ ہیں ۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ زوکوفسکی نے صرف شبہ اور اپنے معیار تنقید کی بنا پر انھیں خیام کی ملک نہیں سمجھا یا اور کسی سے منسوب پایا۔ لہذا بغیر کسی سند و حوالہ کے ہم صرف رباعیاں نقل کیے دیتے ہیں :

مائیم نہادہ سر بہ فرمانِ شراب جاں کردہ فدائے لب خندانِ شراب
هم ساقیٔ ما حلق صراحی در دست هم بر لب ساغر آمده جانِ شراب

چوں بلبل مست راہ در بستاں یافت روئے گل و جام بادہ را خنداں یافت
آمد بزبان حال در گوشم گفت دریاب کہ عمر رفتہ را نتواں یافت

ابر آمد و باز بر سر سبزہ گریست بے بادۂ ارغواں دمے نتواں زیست
ایں سبزہ کہ امروز تماشا گہِ ماست تا سبزۂ خاکِ ما تماشا گہِ کیست

مہتاب بہ نور دامن شب بہ شگافت مے خور کہ دمے چنیں نہ بتوانی یافت
خوش باش و براندیش کہ مہتاب بسے اندر سر خاک یک بیک خواهد تافت

حال گل و مل بادہ پرستاں دانند نے تنگ دلان و تنگ دستاں دانند
از بیخبری بیخبراں معذورند ذوقے است دریں شیوہ کہ مستاں دانند

زاں پیش کہ نام تو ز عالم برود مے خور کہ چو مے رسد، ز دل غم برود
بکشائے سر زلف بتے بند ز بند زاں پیش کہ بند بندت از هم برود

مے خور کہ ز دل کثرت و قلت بہ برد و اندیشۂ هفتاد و دو ملت بہ برد
پرهیز مکن ز کیمیائے کہ ازو یکمن بہ خوری هزار علت بہ برد

هاں تا نه نهی بر تن خود غصه و درد   تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد
زاں پیش که گردد نفس گرم تو سرد   با دوست بخور که دشمنت خواهد خورد

ایام جوانی و شباب اولیٰ تر   با خوش پسراں جام شراب اولیٰ تر
ایں عالم فانی چو خراب است به آب   از باده درو مست و خراب اولیٰ تر

آں لعل در آبگینهٔ ساده بیار   واں محرم و مونس هر آزاده بیار
چوں میدانی که عالمی آمده خاک   بادیست که زود بگزرد باده بیار

کردیم دگر شیوهٔ رندی آغاز   تکبیر همی زنیم بر پنج نماز
هرجا که پیالهایست ما را بینی   گردن چو صراحی سوئے آں کرده دراز

در پائے اجل چو من سر افگنده شوم   در دست اجل چو مرغ پرکنده شوم
زنهار گلم بجز صراحی مکنید   باشد که به بوئے مے دمے زنده شوم

افتاده مرا با مئے و مستی کارے   خلقم بچه می کنند ملامت بارے
اے کاش که هر کدام مستی کردے   تا من به جهاں نه دیدمے هشیارے

شمع است و شراب و ماهتاب اے ساقی   شاهد بینی چو لعل ناب اے ساقی
از خاک برآر ایں دل پر آتش را   بر باد مده بیار آب اے ساقی

جس قدر رباعیاں پیش کی گئی هیں وه اتنی هیں که ایک سات آٹھ سو کے مجموعے میں سے اگر اتنا حصه نکل جائے تو پھر بقیه پر کسی صورت سے اعتبار نهیں کیا جاسکتا که یه اس شخص کی هیں جس سے پورا مجموعه منسوب هے۔ میرا خیال هے که اس کے بعد اگر یه کهه دیا جائے که خیام نے اپنے معاصرین یا متقدمین کی رباعیوں پر مشتمل ایک مجموعه جمع کیا تھا اور اس میں کچھ شاید اپنی رباعیاں بھی شریک کردی تھیں یا اپنی بالکل نهیں تھیں۔ تو اس پر بحث کرنا هٹ دھرمی سے زیاده نهیں۔ اس کے حسب ذیل وجوه هوسکتے هیں۔ خیام کے رباعی‌گو هونے کے قدیم سے قدیم گواه بھی جرح میں بیکار ثابت هوتے هیں۔

سب سے پہلا گواہ امیر عنصر المعالی کیکاوس ہے جس نے اپنے قابوس نامہ مولفہ ۴۷۵ھ میں شرابخوری کے آداب میں یہ کہہ کر کہ «چنانکہ عمر خیام گفتہ» یہ رباعی پیش کی ہے:

اے دل حذر از مستی و مخموری کن وز ہمدمی رطل گراں دوری کن
از بادہ شفا خیزد و از مستی رنج تو ہ ز شفا مکن ز مخموری کن

اس رباعی میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ مروجہ اور موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتی۔ نہ کوئی تذکرہ اس کا گواہ ہے۔ اس لحاظ سے گمان ہوتا ہے کہ عنصرالمعالی نے کسی سے یہ رباعی خیام کے نام سے سنی اور اپنی کتاب میں درج کردی۔ کسی خاص صورت سے اس نے تحقیق نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ شراب پینے کے آداب میں مجموعۂ خیام کی اس سے اچھی اچھی رباعیاں موجود ہیں:

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور یا با صنمے سادہ رخے خنداں خور
بسیار مخور۔ و رد مکن۔ فاش مساز اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور

دوسری گواہی شمس الدین شہرزوری کی کتاب نزهۃ الارواح مولفہ (۵۸۶ھ۔ ۶۱۱ھ) کی ہے۔ اول تو یہ کتاب خیام کی وفات (۵۱۷ھ۔ ۵۳۰ھ) کے بہت بعد کی تالیف ہے اور اتنے دن میں ایک غلط بات بھی مشہور ہوسکتی ہے تو خیام جو بجائے خود ایک عالم و فاضل (اور ممکن ہے کہ شاعر) بھی تھا اور اس نے ہمارے خیال کے مطابق ایک مجموعۂ رباعیات بھی جمع کیا تھا۔ اس کے لیے رباعی کو مشہور ہوجانا کونسی بڑی بات تھی۔ دوسرے یہ دو رباعیاں جو ترجمہ فارسی شہرزوری میں دی گئی ہیں:

گویند بہ حشر جست و جو خواہد بود واں یار عزیز تند خو خواہد بود
از حیز محض جز نکوئی ناید خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

از واقعۂ ترا خبر خواہم کرد وارا بہ دو حرف مختصر خواہم کرد
با عشق تو در خاک فرو خواہم شد با مہر تو سر ز خاک برخواہم کرد

مگر ان دونوں رباعیوں کا یہ حال ہے کہ پہلی رباعی تذکرۂ ہفت اقلیم میں شاہ قاسم

بن شاہ قوام الدین سے منسوب کی ہے ۔ اور کشکول بہائی میں سحابی سے نسبت دی ہے اور دوسری رباعی قطران بن منصور ترمذی سے منسوب ہے ۔ قطران انوری کا استاد تھا اور اس کا زمانہ نزھۃالارواح کی تالیف سے بہت پہلا ہے ۔ شاہ قوام الدین کا سنہ وفات معلوم نہیں ہوا ۔ اس پر بھی شہرزوری کی شہادت صرف سماعی ہی ہوسکتی ہے اور غلطی کا امکان کافی ہے ۔

مرصادالعباد شیخ نجم الدین دایہ میں بھی دو رباعیاں ہیں ۔ یہ کتاب ۶۲۰ھ میں تصنیف ہوئی اور اس وقت خیام کی وفات کو ایک کافی مدت گزر چکی تھی ۔ مرصادالعباد میں جو رباعیاں ہیں وہ دونوں یہ ہیں ان میں سے بھی ایک رباعی افضل کاشانی کی ہے ۔ افضل کاشانی ۵۸۲ ۔ و بقولے ۵۹۲ میں پیدا ہوا :

در دائرۂ کامدن و رفتن ماست — انرا نہ بدایت و نہایت پیداست
کس می نزند دمے دریں عالم راست — کایں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست

دارندہ چو ترکیب طبایع آراست — آنرا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
گر زشت آمد پس ایں صورت عیب کراست — ور نیک آمد خرابی از بہر چراست

عطا ملک جوینی نے تاریخ مولفہ ۶۵۸ھ میں یہ رباعی لکھی ہے اور حوالہ دیا ہے کہ سید عزالدین نسابہ نے مرو کے قتل عام کے میدان میں لاشوں کا شمار کرتے ہوئے اس رباعی کو پڑھا :

ترکیب پیالۂ کہ درہم پیوست — بشکستن آں روا نمی دارد دست
چندیں سر و پائے نازنیں از سر دست — از مہر کہ پیوست و بکین کہ شکست

یہ رباعی بھی خواجہ نصیرالدین طوسی اور افضل کاشی سے منسوب ہے ۔ نصیرالدین طوسی کی ولادت ۵۹۷ھ اور وفات ۶۷۲ھ میں واقع ہوئی ۔ رہا سید عزالدین نسابہ کا قصہ اس میں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ رباعی خیام کی ہے بلکہ یہ قول مولف کا ہے کہ یہ رباعی خیام کی پڑھی تھی اور یہ مفید ثبوت نہیں ہے ۔ اسی کتاب میں یہ دوسری رباعی بھی دی گئی ہے جو اب خیام سے منسوب ہے مگر مولف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ۔

لہذا یہ بھی قابل اعتنا نہیں ہے:

مے خور کہ سمن بسے سما خواھد دید خوش زی کہ سہی بسے سہا خواھد دید
زیں یکدم عافیت کہ داری بر خور مے داں کہ چمن چو ما بسے خواھد دید

اسی طرح جن تاریخوں میں حوالہ ہے وہ خیام کے بعد کی اور بہت بعد کی ہیں جب کہ ان کا مجموعہ ان کے نام سے منسوب ہوچکا تھا اور لوگوں کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ دوسروں کی رباعیاں ہیں - اس پر یہ بھی قیامت ہے کہ ان کی وہ رباعیاں جو ان کتب میں مندرج ہیں دوسرے شعرا سے منسوب ہیں -

جن رباعیوں کا ہم نے ذکر کیا ان میں بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ کسی دسویں یا گیارھویں صدی کے شاعر سے منسوب ہیں مگر لندن کے اس نسخے میں جو مشہور ہے یا برلن وغیرہ کے ان نسخوں میں جو منسوب الیہ شاعر کے دور سے پہلے کے بتائے جاتے ہیں موجود ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ مخطوطہ نسخے تاریخ کتابت کے بعد کے شاعر سے وہ منسوب ہو ہی نہیں سکتی مگر ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے کہ ان نسخوں پر جو تاریخیں دے دی گئی ہیں وہ درست نہیں ہیں اور وہ نسخے مصنوعی ہیں - بہت ممکن ہے کہ خیام کے کلام کی قدردانی دیکھنے کے بعد یہ نسخے قدامت ظاہر کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں اور آج ہم ایک تاریکی اور دھوکے میں ہوں - یہ نسخے معتبر جب ہوسکتے تھے کہ وہ انہیں تاریخوں میں یا ان کے قریب جو ان پر درج ہیں خریدے بھی گئے ہوتے - ورنہ ایسی قلمی تاریخیں کوئی قابل اعتبار و استناد نہیں ہیں - خصوصیت سے جب کہ تذکرے ان کی تکذیب کررہے ہوں -

چناں چہ فریڈرک روزن کو جو ۷۲۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ ملا وہ اس کا اعتبار نہیں رکھتے اور کہتے ہیں: "در ایں کتاب از ہر چیز جالب توجہ تر تاریخ آن ست یعنی در آخر کتاب نوشتہ شدہ "تمت الرباعیات ۷۲۱" اگر صحت ایں تاریخ ثابت شود متن ما باندازہ ۱۴۰ سال شمسی و یا ۱۴۴ سال قمری از نسخہ اکسفورڈ قدیم تر خواھد بود - ولی خط نستعلیق و خوب ماندن کتاب صحت ایں تاریخ را مشکوک میکند" -

اسی طرح اور جگہ بھی شکوک ظاہر کیے ہیں - فریڈرک روزن کا شک ایک اصولی

مگر ادنی بات پر مبنی ہے۔ اگر ہم بیسوں تذکروں اور دیوانوں کو مقدم سمجھ کر اس شک کو پختہ کریں اور یقین کا درجہ دیں تو شاید گنجایش نکل آئے گی۔

انقلابات کا طوفان ہم کو ذرا بھی متعجب نہیں ہونے دیتا جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج ایک مصنف کی مستقل کتاب کسی دوسرے مصنف کے نام سے مشہور ہو رہی ہے اس کی مثالیں اگر تلاش کی جائیں تو زیادہ تعداد تک پہنچیں گی مگر دو چار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ "تذکرۂ رشحات"۔ ملا حسین واعظ کاشفی کے نام سے مشہور ہے حالاں کہ وہ ان کے صاحبزادے علی بن الحسین الواعظ الکاشفی کی ہے۔ مثنوی "زادالمسافرین" جو تصوف میں ایک مختصر جامع مثنوی ہے ملا حسین واعظ کاشفی کے نام سے مطبع نولکشور میں چھپی ہوئی ہے۔ حالاں کہ وہ میر حسینی سادات ہروی۔ مرید شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے۔ "ہفت بند" ملا محتشم کاشی کے نام سے مشہور ہے دراں حالیکہ وہ حسن کاشی کا ہے اور ملا محتشم کا صرف مرثیہ ہے۔ مولانا روم کا دیوان شمس تبریز کے نام سے معہ تخلص کے دائر و سائر ہے۔ مخفی رشتی لاہیجانی کا اکثر کلام زیب النساء مخفی دختر شاہ اورنگ زیب عالمگیر سے منسوب ہے۔ چناں چہ یہ غزل تذکروں میں مخفی رشتی کے نام سے ہے مگر زیب النساء کے دیوان میں بھی موجود ہے:

ز سوز عشق تو زآنگونہ دوش تن میسوخت   کہ ہر نفس ز تف سینہ پیرہن می سوخت

اور یہ بوالعجبی صرف یہیں تک کارفرما نہیں۔ شاہنامہ جس کو ابن الاثیر نے قرآن العجم کہا ہے اس میں ایک قول کے مطابق بیس ہزار شعر دقیقی کے شامل ہیں اور سب کا نہیں تو کچھ کا فردوسی نے بھی اعتراف کیا ہے مگر کیا سوائے محققین کے عام پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ شاہنامہ میں دقیقی کا بھی حصہ ہے اور اس کا سنگ بنیاد اسی کا رکھا ہوا ہے۔

میر تقی میر کی غزلیات کلام بسمل فیض آبادی میں یا بسمل کی غزلیں کلام میر میں موجود ہیں۔ سودا کے یہاں قائم کی ایک مثنوی ہے اور لیجیے میر کا یہ شہرۂ آفاق

مطابع مجموعۂ انبساط گلدستہ نشاط ۔ منولال میں بالمکند حضور(۱) کے نام سے موجود ہے اور ممکن ہے کہ مولچند کے مجموعۂ کلام میں یہ پوری غزل شامل ہو:

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اصل میں یہ شہرت کے اعجاز ہیں اور شہرت نے بیشتر ایسا کیا ہے کہ ایک کے سرمایہ کا دوسرے کو مالک بنادیا۔

ان سب باتوں کے بعد غلط رباعیات کو دیکھا جائے - جن میں بعض معنی سے معرا ۔ بعض قوافی سے مبرّا ہیں ۔ بعض کے مصرعوں میں کوئی ربط نہیں ۔ بعض کے مضامین مکرر ہیں بعض میں الفاظ کا ادنیٰ تغیر ہے تو ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ کسی طرح خیام سے منسوب نہیں ہوسکتیں ۔ مگر چونکہ ان میں معانی وغیرہ کی تشریح بےربطیوں کی توضیح کی ضرورت پڑےگی اور اس کی وجہ سے یہ مضمون کم از کم اسی قدر اور ہوگا ۔ اس لیے اس وقت اس کو ملتوی رکھکر دوسری قسط لکھنے کی ضرورت ہوگی ۔ ورنہ یہ مضمون ایک کتاب کی صورت اختیار کر جائےگا ۔

آخر مضمون میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ابھی تلاش و تفتیش کا سلسلہ جاری ہے اور ہم عنقریب اور رباعیاں ایسی پیش کریں گے جو دوسرے شعرا کی ہیں ۔ فی الحال ہم اتنا بتا کر کہ خیام کے مجموعۂ رباعیات میں کسی قسم کی گنجایش نہیں اور کس طرح کی رباعیاں اس کے مجموعے میں نہ ہونا چاہییں یا بہ الفاظ دیگر خیام اگر رباعی گو تھا بھی تو اس کے طرز کلام سے کس قسم کا کلام مماثل و مشابہ نہیں ہے ۔ وہ حسب ذیل ہے:

شراب کا بیان اس کی رباعیوں میں سب سے زیادہ موجود ہے مگر اس طرح سے کہ زیادہ سے زیادہ ایک مسلمان بھول کر یا از راہ خطا اس کا مرتکب ہورہا ہے ۔ اس کا تفقہ اس کی ثقاہت ۔ اس کا علم اس کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ ایک رند لاابالی یا ایک کافر بیباک ہوکر عملاً نہ سہی قولاً ہی شراب کی طلبگاری کرے جیسا کہ اس کے مجموعے میں اکثر اس قسم کی رباعیاں شامل ہوگئی ہیں۔

---

(۱) گلدستہ انبساط مطبوعۂ کلکتہ صفحہ ۲۹۸ تصحیح داتا رام برہمن ۔

۔ ابریق مئے مرا شکستی ربی　بر من در عیش را تو بستی ربی
بر خاک بریختی مئے ناب مرا　خاکم بہ دهن مگر تو مستی ربی

(۲) خیام ایک ظریف ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس کا بہر صورت اہل ہے ۔ مگر اس کے ساتھ یہ ستم کہ اس کو فحاش بھی بنادیا جائے گوارا نہیں ہوسکتا ۔ ملاحظہ ہو کیا خیام کی یہی شان ہوسکتی ہے جو ذیل کی رباعیوں میں پائی جاتی ہے :

اے رفتہ و باز آمدہ بلہم گشتہ　نامت ز میان نامہا گم گشتہ
ناخن ہمہ جمع آمدہ و سم گشتہ　ریش از پس کون برآمدہ دم گشتہ

فاسق خوانند مردمانم پیوست　من بے گنہم خیال شان بین کہ چہ ہست
بر من ز خلاف شرع اے اہل صلاح　جز خمر و اواطت و زنا چیزے ہست

(۳) نہ وہ مفلس تھا اور نہ مفلسی کے خیالات کو نظم کرتا تھا ۔ نہ اس سے اس کی امید ہوسکتی ہے ۔ جیسے :

چون ز آب و گل آفرید صانع ما را　کردہ بہ غم زمانہ قانع ما را
پیوستہ ز مے مرا ہمیں منع کنی　خود دست تہی بس است مانع ما را

(۴) وہ قصیدہ گو شاعروں کی طرح بھٹئی یعنی مدّاحی سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرتا، جیسے :

اے کردہ ز لطف و قہر توضع خدا　در عہد ازل بہشت و دوزخ برپا
بزم تو بہشت است و مرا جرمی نیست　چون است کہ در بہشت رہ نیست مرا

(۵) متغزلانہ شاعری اس کی نصب العین نہیں ۔ لہذا وہ فراقیہ رباعیاں نہیں کہتا ۔ یا حسن کے خارجی اوصاف کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا جیسے کہ یہ رباعیاں :

آن بت کہ دلم ز بہر او زار شدہ است　او جائے دگر بہ غم گرفتار شدہ است
من در طلب علاج خود چوں کوشم　چون آنکہ طبیب ماست بیمار شدہ است

لعل تو مئے مذاب و ساغر کان است　چشم تو پیالہ و شرابش جان است
آن جام بلوریں کہ ز مے خندان است　اشکے است کہ خون دل درو پنہان است

بر روئے تو زلف را اقامت ہوس است سر فتنۂ روم را قیامت ہوس است
ز ابروئے تو محراب نشیں شد چشمت آن کافر مست را امامت ہوس است

اور جب یہ نہیں تو پھر حسن کے ظلموں کے گلے کیوں کرنے لگا ہے، جیسے :

روزے کہ بود اذا السماء انشقت روزے کہ بود اذا النجوم انکدرت
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات گویم صنما بایِّ ذنبٍ قُتِلت

الفاظ کے گورکھ دھندے اس کے مجموعۂ رباعیات کے شایان شان نہیں اور خیام کبھی اس قسم کی رباعیات نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ متقدمین میں ہے اور متقدمین کے یہاں یہ آورد کی شان۔ یہ مراعات النظیر۔ یہ ضلع جگت نہیں ہوتا :

نفست بہ سگ خانہ ہمی ماند راست جز بانگ میاں تہی ازو ہیچ نخاست
روبہ صفت است خواب خرگوش دہد آشوب پلنگ دارد و گرگ وغا است

اس کے مجموعے میں ناصحانہ رباعیاں بھی ہیں۔ مگر ان کا ایسا دل نشیں انداز ہے جو ہر واعظ اور ناصح کے بس کی بات نہیں۔ اس عام انداز بیان کو اس کے طرز بیان میں دخل نہیں ہے :

در کوئے نیاز ہر دلے را درباب در کوئے حضور مقبلے را درباب
صد کعبۂ آب و گل بیک دل نہ رسد کعبہ چہ روی برو دلے را درباب

ہرگہ کہ غمے ملازم دل شودت یا قصۂ کار خویش مشکل شودت
حال دل دیگرے بہ باید پرسید تا خوشدلی تمام حاصل شودت

وہ مذہبی عقاید کا عوام کی طرح ذکر نہیں کرتا۔ اور نہ ان لوگوں کی طرح اپنے گناہوں کی آمرزش اور مغفرت کی دعائیں مانگنا اس کا شعار ہے بلکہ جب تک حکمت و فلسفہ کی آمیزش اس میں نہیں ہوتی اس وقت تک وہ کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا :

ساقی قدحے کہ ہست عالم ظلمات جز روئے تو نیست در جہاں آب حیات
از جان و جہاں و ہرچہ در عالم ہست مقصود توئی و بر محمد صلوات

یک یک ہنرم بین و گنہ دہ دہ بخش هر جرم کہ رفت حسبةً للّٰہ بخش
از باد فنا آتش کینی مفروز ما را بسرِ خاک رسول اللّٰہ بخش

اے دل مے و معشوق مکن در باقی سالوس رہا کن و مکن زرّاقی
گر پیر احمدی خوری جام شراب زاں حوض کہ مرتضاش باشد ساقی

وہ دعائے مغفرت بھی کرتا ہے لیکن اس طرح کہ معلوم ہو ایک حکیم اپنے لیے دعا کرتا ہے ۔ وہ توبہ بھی کرتا ہے مگر اس طرح نہیں :

اندیشۂ جرمم چو بخاطر گزرد آز آتش سینہ آبم از سر گزرد
لیکن شرطے است بندہ چوں توبہ کند مخدوم بہ لطف از سر آں در گزرد

یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی خیام سے امید نہیں ۔ مگر آج اس کے نام نہاد مجموعے میں اس قسم کی بہت سی رباعیاں شامل ہیں جن پر ایک مرتبہ گہری نگاہ ڈالی جائے گی ۔ اس وقت اسی اختصار پر بس کی جاتی ہے ۔

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

گزشتہ سے پیوستہ

تاسف ہوا شاہ کو بھی کمال
شہ مالوی کے جو چھوٹے عیال

کیا ان کو مسرور انعام سے
مکرم کیا اپنے اکرام سے

بہ ہمراہئ مردم خوش سیر
معِ چند خواجہ سرا معتبر

روانہ کیا جانب مالوہ
نہ مضطر ہو تا صاحب مالوہ

تھے ہمراہ نرسنگھ اس کے پسر
حضوریٔ شہ سے ہوئے بہرہ ور

ضیافت کا سامان اس نے کیا
سوئے کھرڑلہ وہ شاہ کو لے گیا

جواہر نفیسہ دیے دل ستاں
تو الماس اک من دیا بے گماں

تھا یاقوت بھی اور درّ عدن
مدارات شہ کی بہ وجہ حسن

جو سردار نامی تھے با امتیاز
بہ حسب لیاقت کیا سرفراز

مراسم وہ خدمت کے لایا بجا
کی تعظیم و تکریم حد سے سوا

وہ ماہور تک آیا ہمراہ شاہ
بجا لایا آداب کے رسم و راہ

دیا شہ نے تب خلعت باز گشت
کہ جاکر کرے ملک کا بندوبست

بیان انتقال پر ملال شاہ بندہ نواز گیسو دراز در سنہ ہشت صد و سی و سہ ہجری

ہے رحلت کا صبح و مسا واقعہ
ازاں جملہ یہ اک ہوا واقعہ

جو سید محمد تھے گیسو دراز
ہوئے فوت وہ شاہ بندہ نواز

ہوئی ان کے مرنے سے کلفت عظیم
سمائی تھی آنکھوں میں عبرت عظیم

وہ تھے ہشت صد اور تینتیس سال
سنہ ہجریہ جو ہوا انتقال

جو بے ہوش تھے ہوگئے ہوشیار
نہ سمجھے کوئی اس کو جائے قرار

ہر اک چیز دنیا کی ہے بے ثبات　　بقا جس کو ہے وہ خدا کی ہے ذات
ہوا شاہ احمد کو بھی رنج و غم　　کہ اک روز جانا ہے سوئے عدم

بیان تقسیم ممالک محروسہ و مقبوضہ در زمان حیات خود بنام ہر سہ پسر و نصیحت کردن از نزاع و جنگ باہمی و تاکید و ترغیب دادن توالف۔

کیا ملک تقسیم بیٹوں کے نام　　محول انہیں پر ہوا انتظام
کلم اور ماہور اور رام گیر　　تو کچھ ملک برآر روشن ضمیر
ہوا نام زد یہ بہ محمود خاں　　ایلچ پور کو ہوگئے وہ رواں
دگر شاہزادہ تھا داؤد خاں　　اسے دے کے سامان اعزاز و شاں
روانہ کیا اس کو بھی بے درنگ　　کیا اور ہوا وہ مقیم تلنگ
علاءدین تھا جو کہ پور مہیں　　کیا بادشہ نے اسے جانشیں
جو خان محمد تھا چھوٹا پسر　　نہ رشد و بلوغت سے تھا بہرہور
ولیعہد کو وہ مسلم ہوا　　سفارش بھی کی اس کی حد سے سوا
یہ سوگند لی شہ نے باہمدگر　　تنازع پہ ہرگز نہ باندھیں کمر

بیان جنگ و جدال کہ فیمابین شاہ ہشنگ و راجہ نرسنگھ بوقوع آمدہ و نرسنگھ کشتہ گردید۔

شۂ مالوہ تھا پئے کارزار　　کہ نرسنگھ سے چھین لوں میں حصار
ہوئے آٹھ سو اور سینتیس سال　　ہوا مستعد پھر وہ بہر جدال
پڑا رن پہ رن اور گرے سر پہ سر　　مقابل میں دونوں ہوئے حملہور
ہوئی جنگ و نرسنگھ کشتہ ہوا　　شۂ مالوی نے قلعہ لے لیا
بڑھے شاہ احمد پئے دار و گیر　　تو مانع و حائل تھا خان نصیر
تھا والیٔ آسیر کو یہ خیال　　کہ مابین دو شہ نہ ہوئے جدال
ہوئی گفتگو اور بہت قیل و قال　　بالآخر کو اس کا یہ نکلا مآل
ہے کھرلہ پہ قابض جو شاہ ہشنگ　　کریں شاہ احمد نہ کچھ اس میں جنگ
وسیع و بسیط ہے جو ملک برار　　رہے شاہ احمد کا اس میں قرار

وثیقہ بسوگند ایماں ہوا تو پھر جنگ سے خالی میداں ہوا
سنہ آٹھ سو اور تھے بست و ہشت ہے تاریخ ہجرت کی یہ سرگزشت
لکھا مدت سلطنت کا یہ حال زیادہ دو ماہ اور تھے بارہ سال
ہوا دونوں شاہوں سے خالی دکن محمد[1] رہے اور نہ شاہ زمن
ندید از کس خویش و از اجنبی گرامی تر از اہل بیت نبی
بجاں معتقد بود سادات را ہماں اہل تقوی و حاجات را
یقینش قوی بود و دینش درست بجز داد گر یاری از کس نہ جست

ذکر سلطنت سلطان علاءالدین بن سلطان احمد شاہ بہمنی

پس از فوت احمد شہ بحر و بر ہوئے رونق افروز ان کے پسر
علاءدین نے اس میں کیا جو جلوس مزین تھا بیدر بمثل عروس
تھا خان محمد جو ان کا اخی ترحم کے قابل تھا چھوٹا اخی
تودد تلطف بطرز جمیل کہ اقطاع و جاگیر اور اسپ و فیل
وصیت انہیں کرگئے تھے پدر ہو بیدر ہی میں سلطنت کا مقر
تھے خان دلاور جو افغان جلیل مقرب ہوئے بادشاہی وکیل
کیا شہ نے خواجہ جہاں کو وزیر امور جز و کل میں یہ تھے مشیر
ہو ماقبل 'الملک' لفظ 'عماد' کہن سال تھا مرد با اعتماد
امیر امیراں کا پاکر خطاب گیا سمت بیجانگر یہ شتاب
جو خان محمد کہ شہزادہ تھا معہ اس کے ان کو روانہ کیا
نہ تھا شاہزادے کا سن تمیز باغوائے نا اہل اور بدتمیز
جو خواجہ جہاں اور دیگر عماد کیا شاہزادے نے ان پر جہاد
ملا رائے بیجانگر سے جو زر ہوا مدعی سلطنت بے خطر
کیا تخت و تاراج تارائے چور تو ماتحت اس کے ہوا شولا پور
ازاں جملہ مدکل ہے اور نلدرگ لیا چھین و قبضہ کیا بے دھڑک
علاءدین شہ نے سنا یہ جو حال گئے اور اس کے ہوئے گوشمال

---

۱ سید محمد بندہ نواز و احمد شاہ بہمنی۔

خیال وصایائے مرحوم تھا — جرائم کو اس کے عفو کردیا
تھے داؤد خاں جو بملک تلنگ — ہوئے راہئی آخرت بے درنگ
یہ شہزادہ خان محمد جو تھا — روانہ اسے اس طرف کو کیا
بعیش و نشاط و بناز و نعیم — رہا ایک مدت یہ اس میں مقیم
تھی ملکہ جہاں بنت خان نصیر — وہ تھی زوجۂ شاہ ماہ منیر
منکشیر جو تھا رائے نیکو شیم — تھی دختر بھی اک اس کی اس کے حرم
سراپا تھا اس کا جو زیبا حسیں — محبت تھی اس کی بہت دل‌نشیں
ہوا رشک ملکہ جہاں کو سوا — تو یہ باپ سے حال جملہ کہا
شکایت وہ کی اس کے نقش ضمیر — ہوا سن کے آزردہ خان نصیر
جو سلطان احمد تھا گجرات کا — لیا مشورہ اس سے اس بات کا
ہوا دونوں رائے میں جو اتفاق — بھرا دل میں خاں کے نفاق و شقاق
نو کاویل و نرناله ملک برار — کیا عزم تسخیر جملہ دیار
تھے اس ملک مذکور میں جو امیر — ہوئے متفق وہ بہ خان نصیر
طمع مال و زر دی انھیں اس قدر — پئے جنگ ان سب نے باندھی کمر
ہوئے متفق لفظ وہ جاں نثار — یہ کہتے تھے آپس میں وہ بار بار
ہے اولاد حضرت عمر میں نصیر — وہ ہے سب طرح سے خلافت مصیر
کریں نوکری اس کی ہم اختیار — مخالف سے اس کے کریں کارزار
کوئی ہوئے غازی تو کوئی شہید — خوشا بخت‌ور ہو یہ روز سعید
عریضہ لکھا یہ بہ صد اعتقاد — زیادہ ہوا خان کو اعتماد
تھا آمادہ پہلے سے جو بہر جنگ — کمربستہ اب ہوگیا بےدرنگ
سوار اور پیادے تھے جو بےشمار — وہ داخل ہوئے سب بملک برار
ہوا یہ امیروں کے مافی الضمیر — جو ہے خاں جہاں اس کو کرلیں اسیر
مددگار سلطاں ہوا جو اسیر — تو لے جائیں گے اس کو پیش نصیر
ہوا اس سے آگہ جو خان جہاں — تو نرناله میں پہنچا وہ ناگہاں

جو داخل ہوا وہ میان حصار — عریضه لکھا شه کو یه ایک بار
امیران نامیٔ جمله برار — بخان نصیر ہوگئے جنبه‌دار
ہوئی خطبه خوانی بھی یہاں اس کے نام — قلعه آکے گھیریں گے اب بالتمام
علاءدیں نے جو یه عریضه پڑھا — تو یه حکم فوری خلف کو دیا
سر نام جس کے ہے لفظ خلف — معه فوج جائے بشور و شغف
یه سر لشکر دولت آباد تھا — یہی افسر دولت آباد تھا
مہمِ یورش پر ہوا به رواں — بڑھا فوج جنگی کا لےکر نشاں
مغل تیر انداز تھے بےشمار — امیران نامی بڑے ہوشیار
یه تفصیل اس کی ہے بے ریب و ظن — که تھے خان قاسم بھی اک صف شکن
فرا خان تھے اک شہامت پناه — تو گرد علی خاں بخود و کلاه
ملقب بکافرکش عالی نسب — علی میر میراں ز اہل عرب
تھے موسوم اک احمد یکه تاز — جواں مردی جن پر کرے فخر و ناز
دگر خان رستم بھی تھے جاں‌نثار — جہاں دیده دیکھے ہوئے کارزار
بدخشی تھے اک ان میں خان‌حسین — دگر خان خسرو بصد زیب و زین
تھے چنگیز کی نسل میں اے ولی — که مجنون سلطان و شاه قلی
یورش پر یه جمله مقرر ہوئے — پئے جنگ آماده یکسر ہوئے
گیا دولت آباد پہلے خلف — جو حبشی و دکنی تھے اے ذی‌شرف
ہر اک حد په ان کو مقرر کیا — تحفظ کریں تاکه وه جا بجا
جو سرحد گجرات کا تھا مقر — تعین وہاں کی سپاه ظفر
گروه عرب ساتھ لے ہفت ہزار — توجه کی اس نے بملک برار
کھلا آمد فوج کا جو نشاں — نکل آیا قلعه سے خود خاں جہاں
تھے ہمراه اس کے بھی دکنی امیر — ایلچ پور کو وه ہوئے راه‌گیر
زبانی بھی یه خاں جہاں سے کہا — کرو سد باب اس کی امداد کا
رہو کوندواڑه یه با جد و کد — اسے روکو راجه جو بھیجے مدد

روہت کھیڑہ کا ہے جو اک پرگنہ — خلف پہنچا اس جا بہ صد طنطنہ
ہوئی بہمنی خاندیسی میں جنگ — شکست نصیر ہو گئی بےدرنگ
خلف نے تعاقب کیا تا بہ دور — نہ چھوڑا اسے تا بہ برہان پور
ہوا جب کہ برہان سے وہ فرار — تو داخل ہوا شہر میں ایک بار
کیا شہر تاراج اور پائمال — خرابی پہ پہنچا رعایا کا حال
جواہر دگر اقمشہ دل فریب — لیا اور کیا ان پہ قتل و نہیب
چلا وقت شب وہاں سے جو ایلغار — تو اسوار ہمراہ تھے چار ہزار
نہ چھوڑا تھا اس سے وہ سمت و نواح — نصیر اپنے دل میں یہ سمجھا صلاح
مسافت کی ہیں کوفتگی میں غنیم — ہے موقع کروں ان پہ حربہ عظیم
سوار اس کے ہمرہ تھے بارہ ہزار — پیادوں کا انبوہ تھا بےشمار
قلعہ سے مسافت تھی وہ دو کروہ — مقابل میں جو آ گئے دو گروہ
نہ ٹھیرے مگر معرکہ میں قدم — ہوئے خاندیسی بہت منہزم
معین و مددگار خان نصیر — ہوئے قتل و بعضے ہوئے راہ گیر
معہ توپ‌خانہ کے ہفتاد فیل — غنیمت ملے یہ بہ طرز جمیل
فتح‌یاب و منصور با صد طرب — گئے احمد آباد و بیدر کو تب
ہوا شاہزادے کا شہ قدرداں — دیا حکم جاکر بہ صد عز و شاں
امیں اور اعیان درگاہ شاہ — گئے اور لے آئے با عز و جاہ
عنبرچہ کمر چند زنجیر فیل — مع خلعت و تیغ و نیکو جمیل
نوازش یہ فرما کے حد سے سوا — سوئے دولت آباد رخصت کیا

تعمیر دارالشفا حسب‌الحکم بادشاہ در شہر بیدر و بہ تعین کردن دیگر لوازم

بنی حکم سے شہ کے دارالشفا — اسی شہر بیدر میں اے با صفا
ہوئے وقف قریہ کئی اس کے نام — دوا اور غذا میں تھا مصرف تمام
مسلماں تھے اس میں طبیب و حکیم — معالج تھے وہ بہر جملہ سقیم
تھے قاضی و مفتی امین و متیں — خدا ترس و حامیٔ شرع مبیں

دیا حکم کوئی نہ پیوے شراب
بدوں پر تھا شہ کا عقاب و عتاب

بہ نافذ ہوا حکم شاہی دگر
قماری جو ہیں ان کو کردو بدر

ہوئے امر ممنوعہ جو مرتکب
ز روئے شریعت تھا ان پر غضب

بہ تکلیف شاقہ تھا ان پر عذاب
کی تہدید ان پر بہ راہ ثواب

دلیری جو کرتا بہ شرب خمر
پلانے اسے سرب کو گرم کر

بہ اغوائے خارجین و منافقین سادات کشی شایع گردید و بادشاہ بیمار و مجروح گشت و بیان انجام کار آں

بد و نیک سے دھر خالی نہیں
منافق زیادہ تو کم مومنیں

ہوئے جمع کچھ دشمن اہل بیت
خباثت سیر دشمن اہل بیت

عجب بے حیا تھے وہ خانہ خراب
سمجھتے تھے سید کشی کو ثواب

یزیدی تھے سادات کے بیخ کن
مسلماں، مگر دشمن پنج تن

تھا عباسیہ کا طریق و شعار
کیا شاہ نے بھی وہی اختیار

ضلالت کی جانب ہوئے رہنما
تھا پیش نظر واقعہ کربلا

جو منبر پہ اک روز خطبہ پڑھا
تو سلطان عادل زبان سے کہا

رؤف و حیم و رحیم و غنی
ہے سلطان عادل شہ بہمنی

تھا موجود وہاں ایک تاجر عرب
یہ بولا وہ سن کر بہ غیظ و غضب

نہیں ہے تو واللہ عادل کریم
نہ ہے تو رحیم اور نہ تو ہے حلیم

رؤف ہے نہ ہی تو رحیم العباد
نہیں ہے ترے قول کا اعتماد

ہے کذّاب تو حامی فاسقین
تو ہے قاتل زمرۂ طیبین

یہ کلمات بسر منبر مسلمیں؟
جو ظالم ہو یہ اس کے شایاں نہیں

رباعی فارسی

سادات کہ پاکیزہ بود گوھرشاں
تاج سر عالم است خاک درشاں

آنہا کہ بہ عقب آل یسیں شدہ اند
یاسیں سیادت ارّہ شو بر سرشاں

سر عام جب یہ کہا آشکار
تو رونے لگا شاہ بھی زار زار

زر قیمت اسپ کردی عطا
دگر بعد اس کے بہ شہ نے کہا

خدا کے غضب سے نہ پائیں نجات   ہوئے جن کے باعث سے یہ سیئات
کیا مجھ کو بدنام مثل یزید   خدا کا غضب ان پہ ہوئے شدید
غرض پائے شہ جب کہ زخمی ہوا   نہ آئے تھے باہر ز دولت سرا
بپا ہے خبر یہ ہوئی منتشر   علاءدین گئے اس جہاں سے گزر
تھا داماد سلطان خان جلال   ہوا مدعی وہ پئے ملک و مال
بخاری جو تھے ایک سید جلال   یہ تھا ان کی اولاد میں خوش خصال
یہ داماد سلطان عالی وقار   تھا نلکنڈہ کا ایک جاگیر دار
اڑی فوت شہ کی خبر یہ کہیں   بہ تصدیق اس کو ہوا یہ یقیں
تصرف میں لایا یہ اس کے نواح   مسلح ہوا وہ بہ جنگ و سلاح
سکندر نواسا جو تھا شاہ کا   ولایت یہ اس کو مسلط کیا
تھا مرکوز و مکنون اہل تلنگ   سکندر ہی ہو بادشاہ تلنگ
علاءدین ہرچند بیمار تھا   مگر مستعد بہر پیکار تھا
تہیہ کیا بہر جنگ و جدال   ہوا جب یہ مسموع خان جلال
گیا سمت ماہور کو بے درنگ   کہ ہے وہ بھی از قصبہ‌ہائے تلنگ
جمع اس نے وہاں فوج کی بے شمار   کیا اس سے بس شہ نے قول و قرار
مؤثر نہ تھا کوئی نامہ پیام   ارادے پہ اپنے تھا وہ تیز گام
تھا محمود خلجی شہ مالوا   سکندر نے مضموں یہ اس کو لکھا
علاءدین شہ جو کہ بیمار تھا   بہ امراض چندیں گرفتار تھا
بہ ملک بقا ہوگیا وہ رواں   اراکیں نے اس کو کیا ہے نہاں
ہے اعیان شاہی کو مدنظر   ہر اک سمت ہوں ملک میں حملہ‌ور
توجہ کریں گر ادھر شہریار   تو لیں چھین ملک تلنگ و برار
سنا جب کہ خلجی نے یہ تذکرہ   لیا بعض حکام سے مشورہ
ہوئے متفق وہ تو انجام کار   مع فوج آیا بہ ملک برار
سنہ آٹھ سو ساٹھ تھے لا کلام   بھیر اور بنکاہ لے کر تمام

سکندر کی کل فوج تھی اک ہزار — دوئی ہم عناں ایک دل ایک بار
سکندر جو خلجی سے باہم ملا — علاءدین کو حیلہ یہ اس دم ملا
ارادے سے اپنے وہ پس پا ہوا — مگر فوج سے وہ صف آرا ہوا
جو تھا خواجہ محمود گاواں لقب — وہی ہفت ہزاری تھا عالی نسب
مع بعض افسر بہ جنگ و جدال — تعین ہوا وہ بہ سمت جلال
دگر اور تھی فوج ملک برار — گیا اس کو فرمان عالی وقار
جو آیا ہے والئ برہان پور — کرو جنگ، اس کا گراؤ غرور
دگر قاسم نامور صف شکن — یہ سردار لشکر تھا شمشیر زن
عقب سے اسے بھی روانہ کیا — پئے جنگ خلجی یہ پھر خود چلا
لکھا ہے کہ تھا پالکی میں سوار — جراحت سے پاؤں کی تھا حال زار
سخن مختصر یہ کہ محمود شاہ — تھا جس کا کہ ماہور میں خیمہ گاہ
علاءدین ہوا اس طرف کو رواں — ہوا فسخ جو کچھ تھا اس کو گماں
علاءدین کو دیکھا بہ قید حیات — کیا کونچ، دو پاس باقی تھی رات
طرف ملک کے اپنے لی اس نے راہ — سکندر نے خلجی سے مانگی سپاہ
تھا اک افسر نامی با شد و مدد — گیا چھوڑ پاس اس کے بہر مدد
مگر کر گیا اس کے نقش ضمیر — ملے دکنیوں سے تو کرنا اسیر
ہیں ہمراہ اس کے جو رہوار و فیل — نظر بند کرنا بطرز جمیل
سکندر کو معلوم جب یہ ہوا — معیت سے اس کی کنارا کیا
سپہ اس کے ہمراہ تھی دو ہزار — تو تلنگنڈہ میں آ گیا ایلغار
ہوا آٹھ سو اور باسٹھ جو سال — علاءدین کا ہو گیا انتقال
رہی سلطنت اس کی تیئیس سال — تھے دس مہ سوا آ گیا جو زوال

ذکر سلطنت ہمایوں ظالم[1] بن سلطان علاءالدین بہمنی

ہمایوں ستمگر ہوا بادشاہ — مجسم سیاست ستم دستگاہ

---

۱ بادشاہ یازدہم -

غضب اس کی طینت میں تھا امتزاج — پر از خشم رہتا تھا اس کا مزاج
ہر اک شخص پر یہ ستمگار تھا — دل آزار و جبار و قہار تھا
سنی اس نے جاسوس سے یہ خبر — حسن خاں جو شہزادہ ہے نامور
دگر نام جس کا حبیب‌اللہ شاہ — یہ دونوں ہوئے بیڑ کو رو بہ راہ
ہے یوسف جو ترک کجل اک غلام — ہوا اس کے باعث یہ بیہودہ کام
کیا قید خانے سے ان کو بدر — یقین ہے کہ پیدا ہو بس شوروشر
ہمایوں نے جس دم سنا یہ سخن — دریدہ کیا خشم سے پیرہن
پکڑتا تھا داتوں سے فرش زمیں — ہوا اس قدر غیظ سے خشم گیں
چباتا تھا غصے سے دندان کو — یقین تھا کہ کھالے گا انسان کو
دہن اور لب خون میں تھے تربتر — تھا مجروح گویا کہ اس کا جگر
بالآخر کو بیدر میں داخل ہوا — تو دیوان خانے میں داخل ہوا
درندے تھے گوشے میں اس کے اسیر — ہے مردم دری جن کی اصل و خمیر
سیاست ہوئی اس کی کرسی نشیں — حسن خاں کو اس نے بلایا قریں
سوئے شیر پھینکا اسے دفعۃً — دریدہ کیا اس نے اس کا بدن
وہ قیدی عدم کے کنارے گئے — ہوئے دستگیر اور مارے گئے
تھے باقی جو کچھ ان کے اہل و عیال — ہوئے ظلم ظالم سے وہ پائمال
فضیحت کی ان کی بہ ظلم و ستم — ہوئے سب وہ راہی ملک عدم
جفاؤں کا اس سے ہوا وہ صدور — سلف سے نہ اب تک ہوا تھا ظہور
ن پئے نفس امارہ وہ گم کردہ راہ — پکڑتا عروسوں کو مابین راہ
جو لے جاتا اس کو درون سرا — ازالے کے بعد اس کو کرتا رہا
پیے ایک دن چند جام شراب — تھا بےہوش و بدمست مابین خواب
ہوئی ظلمت ظلم تاریک و تار — زن حبشیہ نے نکالا دمار
لگائے عجب ضرب بالائے سر — فنا ہوگیا بستر خواب پر

ن پئے خواہش نفس وہ روسیاہ

مولانا نظیری شاعر المخاطب بملک‌الشعراء در حق او این دو بیت گفته :

ای ظالم از آه دل شب خیز بترس ‏ ‏ ‏ وز نقش بد شوم شر انگیز بترس
مژگان دم آلودهٔ مظلوماں بیں ‏ ‏ ‏ وز خنجر آبدار خوں ریز بترس

و این تاریخ وفات نیز از نتائج طبع بے نظیر آن شاعر روشن ضمیر است :

همایوں شاه آن مردود عالم ‏ ‏ ‏ تعالی الله زهے مرگ همایوں
جہاں پر ذوق شد تاریخ فوتش ‏ ‏ ‏ هم از ذوق جہاں آرید بیروں

ذکر سلطنت نظام شاه بہمنی بن همایوں شاه ظالم بن سلطان علاءالدین بہمنی - [۱]

همایوں گیا جو جہاں سے گزر ‏ ‏ ‏ پسر اس کا آیا بہ‌جائے پدر
مگر هشت ساله تھا طفل صغیر ‏ ‏ ‏ هوا جو دکن میں یه صاحب سریر
لکھا هے که شہزادے کی والده ‏ ‏ ‏ بہت منتظم تھی زن عاقله
اکابر میں تھے جو که خواجه جہاں ‏ ‏ ‏ پئے مشورت تھے وهی درمیاں
تھی اک ماه باو زن نیک نام ‏ ‏ ‏ ذریعے سے اس کے تھے سارے پیام
مہمات میں سلطنت کے کلام ‏ ‏ ‏ یہی عرض کرتی تھی اندر تمام
بلوغت کو پہنچا نه تھا چونکه شاه ‏ ‏ ‏ تو معمول تھا یه که هر صبح گاه
محل سے طلوع هوتا فیروز بخت ‏ ‏ ‏ بٹھاتے تھے سب اس کو بالائے تخت
تو محمود گاواں و خواجه جہاں ‏ ‏ ‏ یسار و یمیں هوتے با عز و شاں
سنا یه جو سلطان خلجی نے حال ‏ ‏ ‏ که شاه نظام هے بہت خورد سال
پئے قصد بیدر روانه هوا ‏ ‏ ‏ تو مخدومه نے کوچ یہاں سے کیا
در و گنج و آلات و جمله حرم ‏ ‏ ‏ تو تجار و محمود گاواں بہم
کیا جا کے ان سب نے اس میں قیام ‏ ‏ ‏ که فیروزآباد جس کا هے نام
فقط خان ملو هی اک وهاں رهے ‏ ‏ ‏ حصار ارک کے نگہباں رهے
جو هے دولت آباد و بیڑ و برار ‏ ‏ ‏ کیا قبضه ان پر بصد گیر و دار
خلایق کو اس نے کیا جو مطیع ‏ ‏ ‏ هوا رایت خلجیه بس رفیع

---

۱ بادشاه دوازدهم-

که ناگاه گجراتی محمود شاه — بڑھا اپنی سرحد سے لے کر سپاه
اگرچه سن و سال میں تھا صغیر — مگر آیا رن میں پئے دار و گیر
تھا فیروز کی سمت عزم نظام — تو پہلے سے اس کا کیا انتظام
روانه کیا اک ادھر نامه بر — تو کل کیفیت سے اسے دی خبر
تو محمود گجرات نے بست هزار — مدد کے لیے بھیجے جنگی سوار
امیران نامی بھی تھے معتمد — گئے سب یه ارسال بهر مدد
چلے یاں سے بیدر کو خواجه جہاں — جو مرکز تھا پھیری ادھر کو عناں
تو محمود گاواں بھی با چهل هزار — تھے دکنی بھی اور اس میں فوج برار
هوئے سمت دارالاماره رواں — تو ملّوؤ خلجی اڑے درمیاں
جو محمود گاواں کی آمد سنی — ره مالوه دل میں اس کے ٹھنی
تھا ملو سے خلجی پئے کارزار — سنی آمد فوج جو ایک بار
نه ثابت رها اس کا وه حوصله — عناں پھیری اس نے سوئے مالوه
روانه هوئی یاں سے جنگی سپاه — شه مالوه کے هوں تا سد راه
تو محمود گاواں به صد ایلغار — معه فوج جرار عشریں هزار
گئے بیڑ و قندهار پر مثل شیر — عدو کو لیا چار جانب سے گھیر
هوئی جب که خلجی په به گیر و دار — گیا گوندواڑه میں با حال زار
بصد اضطراب اور بحال خراب — تک و دو سے مندو میں پہنچا شتاب
هوئی پھر یه تجویز شاه نظام — کریں شاه محمود کو شاد کام
ره و رسم کے هیں جو طرز جمیل — تو بھیجے مع هدیه رهوار و فیل
گیا سمت گجرات محمود شاه — یه بیدر میں آئے که تھی تختگاه

بیان ورود غم و اندوه در هنگام سرور و شادمانی و حکایت عجیب لیل و نہار

مورخ نے اس جا په یه هے لکھا — هوا شاه کا جب که جشن طوی
مزین مفرح تھی سب انجمن — بشاشت کے عالم میں سب مرد و زن

قضا را گئی جب گزر نصف شب — تو فریاد و نالہ تھا روتے تھے سب
زمین و زماں ہوگئے سبز فام — ہوا دھر سے کوچ شاہ نظام
گلے ناشگفت از کیانی درخت — یکایک فرو ریخت از باد سخت
خط حسن بر گل نہ انگیختہ — اجل خاک بر وے فرو ریختہ
غرض بعد دو سال و یک ماہ شاہ — بہ ملک عدم ہوگیا رو بہ راہ

ذکر شاہئی ابوالمظفر محمد شاہ بہمنی کہ در عمر نہ سال بجائے برادر بتختش رسید[1]

تھی شاہ محمد کی وہ کم سنی — رکھا سر پہ جو تاج اک بہمنی
مہمات ملکی میں تھے ہم عناں — کہ محمود کاواں و خواجہ جہاں
محل سے جو ماں ان کی کرتیں خطاب — سر انجام دیتے یہ اس کو شتاب
ہوئے خواجۂ ترک ایسے دخیل — نہ تھا ان کی نظروں میں کوئی جلیل
تھے اقطاع پہ جتنے امیر قدیم — مبدل کیا ان کو بے خوف و بیم
یہ کی اپنی جانب سے طرح جدید — مقرر کیے اور بہ لطف مزید
جو محمود کاواں نے دیکھا یہ حال — اگر دخل دیتے تو ہوتا ملال
امور جز و کل سے تھے برکنار — نہ باقی رہا ان کا کچھ اختیار
تھی مخدومہ جو اک زن عاقلہ — پسر سے کہا کردو تم فیصلہ
سنہ اٹھ سو اور ستر تھے وہ بے گماں — تھے دیوان ان روزوں خواجہ جہاں
ہوا حسب ایمائے شہ اس سے کام — کہ 'الملک' آخر ہے اول 'نظام'
بضربات شمشیر بر روئے خاک — کیا روبرو شہ کے اس کو ہلاک
بتدبیر زاں پس خردمند زن — بفرمان خود ساخت ملک دکن
جہانے ز عدلش باسودگی — رخ دھر شستہ ز آلودگی
ازاں پس بالطاف مخصوص شاہ — تھے محمود کاواں باعزاز و جاہ
عنایت ہوئی شاہ کی بے حساب — دیا خلعت خاص و پایا خطاب
امیران شاہی کے افسر ہوئے — وہ منصب کہ جس سے مفخر ہوئے

---

[1] بادشاہ سیزدہم -

جو سلطان محمد شه تاج و تخت | ہوئے چارده ساله فیروز بخت
سر نام جس کے هے لفظ نظام | توجه هوئی ان په شه کی تمام
هوا وه سر فوج ملک برار | به تسخیر کھرڑله کیا جان نثار
خلاصه سخن یه که تا ایک سال | پئے قلعه کی اس نے جنگ و جدال
هوا آخرش کو یه انجام کار | مخالف کا مجمع تھا باره هزار
یه تھے راجپوت اور افغاں تمام | توجه هوئی ان کو سوئے نظام
مقابل میں دونوں فریق آ گئے | شجاعت کے جوهر کو دکھلا گئے
کھنچیں تیغیں ہوئے لگی جنگ سخت | هوئی لشکر مالوی کی شکست
قلعه سے گئے تھے جو باهر نکل | در قلعه پر پھر اڑے ان کے دل
تھا دنبال میں ان کے جیش نظام | پس و پیش مخلوط تھے بالتمام
هوا اهل قلعه کو تب یه گماں | که آتے هیں ساتھی همارے یہاں
جو کھولا در قلعه کو بالتمام | هوئے داخل قلعه وه وقت شام
هوا دکھنیوں کا قلعه میں عمل | رهے کچھ جو باقی تو تھے مثل شل
نه پہنچایا جانوں کو ان کی ضرر | قلعه سے مگر کردیا تھا بدر
درون قلعه ره گئے دو نفر | دلیر و شجاع و جری نامور
هوا برطرف جب که وه ازدحام | زن و مرد باهر گئے بالتمام
فقط راجپوتوں میں تھے دو نفر | یه گویا هوئے وه بصد کر و فر
مخاطب هوئے یوں به سمت نظام | هوئی جنگ میں عمر اپنی تمام
شجاعوں کی دیکھی بہت صفدری | مگر مثل تیرے نه دیکھا جری
شجاعت کا رستم کے سنتے هیں نام | حقیقت هے کیا اس کی پیش نظام
جو هو اذن تو چومیں آ کر قدم | قلعه سے تو اب کونچ کرتے هیں هم
نه تھا آلهٔ حرب، نے تھی حسام | طلب کرده آئے وه پیش نظام
پئے پائے بوسی بڑھائے قدم | فنون سپاهی میں تھے برق دم
جماعت کھڑی تھی جو قرب نظام | بچالاکی لی چھین ان سے حسام

عجب تیز دستی سے کی دستبرد
عجب حیلہ سازی سے کی دستبرد

دو دستی چلی ان کی ایسی حسام
ہوا جملہ چو رنگ جسم نظام

کیے حربے اوروں پہ بھی بیدرنگ
ہوئے کشتہ خود بھی وہ مابین جنگ

جو تھے خان عادل اخی نظام
تاسف تحیر تھا ان کو تمام

ہوا اہل قلعہ پہ ان کا گماں
جماعت عقب میں کی ان کے رواں

وہ تھا خواب غفلت میں سارا گروہ
قلعہ سے مگر دور تھے اک کروہ

گئے تھے جواں جو برہنہ حسام
اسی دم کیے قتل وہ بالتمام

حفاظت قلعہ کی تھی مدنظر
سوار اور پیادے وہاں چھوڑ کر

تھی حمّال کے سر پہ نعش نظام
غنیمت بھی موفورہ تھی بالتمام

روانہ ہوئے جانب بارگاہ
غنیمت رکھی لاکے سب پیش شاہ

جو خدمت پسندیدۂ شاہ کی
ترقی ہوئی عزت و جاہ کی

ہزاری ہوئے صاحب حوصلہ
ملا ان کو جاگیر میں وہ قلعہ

امیروں میں شہ کے ہوئے منتظم
خدا کا ہوا ان پہ فضل و کرم

جو والی مندو تھا پرخاش پر
پئے صلح مایل ہوا خیرہ سر

ہے 'الملک' کے قبل لفظ 'شریف'
فرستادہ محمود شہ کا ظریف

ہوا آستاں بوس گردوں اساس
سفیر آیا شاہ محمد کے پاس

بجا لاکے آداب شاہی تمام
کیا عرض محمود شہ کا پیام

محبت کا جادہ جو ہے مستقیم
رواسم ہیں اس کے نہایت قدیم

ہشنگ اور احمد میں تھی رسم و راہ
جو سابق میں لازم ہے اس کا نباہ

برار ہے جو اک ملک مثل چمن
مسلم رہے وہ بہ شاہ دکن

جو کھرلہ کا ہے ایک حصن حصین
جز و کل مضافات حصن حصین

بہ والی مندو مسلم رہے
ہر اک اپنی سرحد پہ قایم رہے

جو سلطان کھرلہ پہ قابض ہوا
تنازع ہوا اس میں مابین کا

نہ ہو نقض عہد اور نہ ہو گیر و دار
مواثیق سابق رہیں برقرار

تنازع یہ ہوجائے جو ہر طرف
رعایا کی جانیں نہ ہوئیں تلف

کیے منتخب شاہ نے دو سفیر
خردمند و ذی‌علم و روشن ضمیر

تھے اک شیخ احمد تو دیگر شریف
روانہ ہوئے دونوں مرد ظریف

یہ والی مندو سے جاکر کہا
یہ کہتے ہیں سلطان فرماں روا

محبت کا جادہ تھا جو کچھ بہم
ہنوز اس پہ مضبوط و راسخ ہیں ہم

جو مدراس ہے ایک ملک وسیع
بہ کثرت ہیں اس میں قلاع رفیع

ہنود و مجوس اس میں کرتے ہیں راج
نہیں مجھ کو کھرڑلہ کی کچھ احتیاج

بحمداللہ یہ بہمنی دودماں
کریں نقض عہد اس سے ہیں برکراں

برادر مرا جب کہ تھا خورد سال
اراکین دولت میں تھا اختلال

تمھارے ہی لشکر نے کی ابتری
ہوئی کس کی جانب سے غارتگری

مرے ملک میں جو ہوئے واقعات
وہ ہیں عہد چنگیز کے واقعات

جو گزرا سو گزرا مگر بعد ازیں
ہو اصلاح مابین خاطر نشیں

جو کچھ شیخ احمد صدارت پناہ
وہ ہے اہل اسلام کا خیر خواہ

دیانت میں از بس کہ ہے معتبر
وہ مصلح ہے اور دافع شور و شر

وہ مابین میں جو کہ دیویں قرار
مناسب ہے اس کو کریں اختیار

حوالی مندو میں پہنچا سفیر
تو سب پیش قدمی کو آئے امیر

مدارات و اعزاز و اکرام سے
کیا خوش اسے شہ کے انعام سے

رسائی ہوئی بخت مسعود کی
ملاقات سلطان محمود کی

بلا واسطہ پیش صاحب سریر
کیا عرض جو کچھ تھا مافی‌الضمیر

جو ارکان دولت تھے شہ کے قریں
کہا سچ ہے شک اس میں ہرگز نہیں

ہر اک کی زباں پر یہی تھا سخن
ہوئے بے شبہ ہم ہی پیماں شکن

ہوا نقض عہد اپنی جانب سے سب
خدا سے یہ امید رکھتے ہیں اب

فراواں جو ہے رحمت کاملہ
ہمیں بخش دے اور نہ لے مواخذہ

کہا شاہ محمود نے بعد ازیں
ہے مابین میں مصلحت کے قریں

رہیں دوست دو بادشاہ غنی　　رہیں متحد خلجی و بہمنی
کریں محو سابق کے دل سے خیال　　سر نو ہو باہم محبت کمال
نہ سرزد کوئی امر ہوئے خلاف　　کدورت سے ہوجائیں دل صاف صاف
بہ اولاد و احفاد از جانبین　　روابط ضوابط ہوں با زیب و زین
نہ ہرگز کبھی ہو نفاق و شقاق　　رہے ایک دل باہمی اتفاق
محمد شہ بہمنی کی طرف　　تھے اک شیخ احمد بہ عز و شرف
تھے سلطان محمود کے اک وکیل　　سلام اللہ آل نبی میں جلیل
ہوا الغرض عہد نامہ رقم　　موکد بہ ایمان و قول و قسم
جو علماء مشایخ تھے ذی احترام　　مواہیر ان کے ہوئے ارتسام
لکھا دونوں شاہوں نے بر حاشیہ　　تجاوز کرے جو کہ از معاہدہ
کریں اس پہ نفریں خدا و رسول　　گرفتار لعنت ہو وہ بوالفضول
یہ تھا عہد نامے کا اک ماحصل　　کریں تاکہ طرفین اس پر عمل
ہر اک شاہ کا یہ رہے بندوبست　　ہوں حد تجاوز سے کوتاہ دست
دگر اور جو کچھ ہے ملک خلاف　　ہو توفیق جس کو کرے وہ مصاف
ہوا عہد نامہ یہ جس دم درست　　نگہبان قلعہ کو لکھا نخست
ابھی خالی کھڑلہ کا کردو قلعہ　　کریں قبضہ اس پر شہ مالوہ
ملازم تھے محمود کے مثل کرد　　کیا حسب فرمان ان کو سپرد
تو شیخ احمد صدر ذی احترام　　مرخص ہو آئے بعین المرام
ہوا آٹھ سو اور ستتر جو سال　　ہوئی قحط سالی دکن میں کمال
برار اور گجرات تا مالوہ　　تو بیدر تلنگان اور مرہٹہ
ہوئے شہر ویران اور دہ خراب　　زمیں خشک سالی سے بےآب و تاب
ہوا قحط باراں کا جو دو برس　　گئی خلق پانی کو بالکل ترس
وزان پس جہاں را بہ گردید حال　　کہ قطعاً نبارید باران دو سال
برآمد یکے ہائے ہوئے ز دہر　　ز مردم تہی ماند بازار و شہر

سوم سال رحمت کی آئی نسیم — ہوا موجزن بحر رب کریم
نزول آب باراں کا جس دم ہوا — سر نو جہاں سبز و خرم ہوا
تھے محمود گاواں جو مرد عقیل — جو دیکھا کہ ہے ملک شاہی طویل
ہوا رائے صائب کا یہ اقتضا — ضوابط نئے ملک میں ہوں ادا
کیا عرض سلطاں سے با قل و دل — پسندیدہ مطبوع ہوئے وہ عمل
ازاں جملہ یہ اک ہوا بندوبست — ہوئی چار قسمت کی تقسیم ہشت
سر لشکر سمت بھی اس قدر — مگر خود انہیں اس سے پہنچا ضرر
دو قسمت ہوا جملہ ملک برار — یہ تفصیل اس کی ہے اے ذی وقار
جو گاویل تھا وہ بفتح‌الله خاں — تو ماہور میں تھے خداوند خاں
ملی خان عادل کو یہ دست برد — کیا دولت آباد ان کو سپرد
اسی طرح تقسیم کی ہر طرف — بھی حکم نافذ ہوا ہر طرف
بہ عہد علاءالدیں حسن بہمنی — یہ تھا انتظام حسن بہمنی
تھے سر فوج کے جملہ تابع قلاع — اٹھاتے تھے وہ رایت ارتفاع
حصون متیں پر تھا یہ داعیہ — تھے سرکش بھی اور کرتے تھے سامنا
بدیں وجہ یہ آصف جم حشم — بطرز دگرگوں ہوئے منتظم
شرایط سے تھا حزم کے جو بعید — لہذا کیا انتظام جدید
مع دولت آباد و بیجانگر — بہ تجویز شاہنشۂ بحر و بر
تو گاویل و نرناله گلبرگہ بھی — یہ حصن حصین و متیں تھے سبھی
بہ حکام دیگر مسلّم ہوئے — تو محمود سے جملہ برہم ہوئے
جو تھے مردم منصبی ذی وقار — مفوض ہوئے ان کو جملہ حصار
بہ محمود گاواں سے پہنچا الم — کیا اس وجہ سے انہیں متہم
بہ رائے اڑیسہ تھا خط رقم — کہ خواجہ کی مہر اس پہ تھی مرتسم
یہ مضمون نامہ تھا اے با ادب — تھی خواجہ کی جانب سے اس کی طلب
محمد جو ہے بادشاہ دکن — وہ غافل ہے بے ہوش، سرّ و علن

دگر یہ بھی مضموں تھا اس میں لکھا | شریک ہم بھی ہوں ہو جو جنگ آزما
مورخ نے در اصل یہ ہے لکھا | یہ خط جعل کا مہر خواجہ سے تھا
غرض مہر خواجہ تھی جس کے سپرد | کسی شخص نے اس سے کی دستبرد
رکھا بادشہ کے جو پیش نظر | پئے مرسلہ تھا وہ آشفتہ تر
جو محمود کاواں سے پرساں ہوا | جو منکر ہوئے یہ تو حیراں ہوا
غم و غصہ شہ کو تھا حد سے زیاد | لکھا تھا کسی نے ز راہ عناد
غضب قہر سے شاہ تھے خشم گیں | یہ بولے مجھے علم اس کا نہیں
اگرچہ مری مہر ہے مرتسم | نہیں ہے مگر میرا خط رقم
کہا خواجہ نے گو ز روئے حلف | مگر قہر شہ تھا بہ شور و شغف
ہوئے قتل محمود جو بے گناہ | تو برہم ہوئے جملہ اعیان شاہ
مسمی بہ جوہر تھا خواجہ سرا | پئے قتل حکم اس کو شہ نے دیا
دو زانو نشستہ تھے وہ قبلہ رو | ہوئے قتل جو خواجۂ نیک خو
ہوا پیش جو سخت یہ مرحلہ | تھا ورد زباں کلمۂ طیبہ
طریقہ ہے یہ اہل آگاہ کا | دم ذبح ہو نام اللہ کا
شہادت کا درجہ ہے یہ منجلی | کہ کہتے ہیں الحمد للہ ولی

ملا عبدالکریم ہمدانی این قطعہ گفتہ:

شہید بے گنہ مخدوم مطلق | کہ عالم را ز جودش بود رونق
اگر خواہی تو تاریخ وفاتش | فرو خواں قصۂ قتل بہ ناحق

و دیگرے چنین گفتہ:

سال فوتش گر کسے پرسد بگوئے | بے گنہ محمود کاواں شد شہید

و ملا سامعی کہ مداح و ندیم و نوکر او بود تاریخ وفات او گفتہ:

چوں خواجہ جہاں نبود ہرگز حرام خواری | در دل ہنود میکرد پیوستہ جان کاری
کشت او شہید و مغفور اے سامعی بتحقیق | تاریخ کشتن او جوئے از حلال خواری

در بلدۂ بیدر مدرسہ از آثار خیر اوست کہ قطعۂ تاریخش سامعی گفتہ

این مدرسۂ رفیع محمود بنا چوں کعبہ شد است قبلۂ اہل صفا
آثار قبول بیں کہ شد تاریخش از آیت «ربنا تقبل منا»

و مولانا جامی قدس سرہ مکاتیب باو میفرستاد او نیز جواب می نگاشت و در قصاید ملا جامی قصیدہایست کہ مخصوص بنام او کردہ است مطلعش اینست

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا اھّلا کز جان و دل نذر تو کردم اھّلا
ہم جہاں را خواجہ وہم فقر را دیباچہ اوست آیت الفقر است لیکن تحت استار الغنا

و دیگر فرمودہ است

جامی اشعار دل آویز تو جنسیست لطیف بودش از حسن بود لطف معانی نارش
ہمرہِ قافلۂ ہند رواں کن کہ رسد شرف عز و قبول از ملک التجارش

ہوا قصد جو احمدآباد کا تو پیدا ہوا رنگ اضداد کا
تو فتح اللہ بھی اور خداوند خاں مع فوج و لشکر کے آئے یہاں
دو فرسخ یہ اترے تھے شہ سے جدا سنا یہ تو فسخ عزیمت ہوا
کیا آدمی جو برائے طلب علیحدہ اترنے کا پوچھا سبب
جواب افسروں نے یہ شہ کو دیا ہوا خواجہ محمود پر افترا
ہوئے تابع بدگمانی جو شاہ کیا قتل ناحق اسے بے گناہ
نہیں ایسے اشخاص سے کچھ عجب کریں متہم ہوں اسیں تعب
یہ تب شاہ نے خفیہ بھیجا پیام جو آؤ تو شورے میں کچھ ہوں کلام
جو تحقیق ہوجائے یہ ماجرا تو دوں خواجہ کے دشمنوں کو سزا
بلانے جو آیا تھا اس سے کہا اگر خان عادل یہاں آئے گا
تو بےعذر آئیں گے یہ خیر خواہ معہ اس کے ہوں گے قدم بوس شاہ
بغیر از مواسا جو چارہ نہ تھا سوئے خان عادل کے فرماں گیا
بسرعت ہوا وہ بھی وہاں سے رواں گیا نزد فتح اللہ وہ ناگہاں
جو تھا جانب شہ سے سب کو نفاق ارادہ ہوا ایک بالاتفاق

پئے مدعا سب ہوئے تیز گام　　کہ خودسر ہوئے، تھا نہ کچھ شہ سے کام
جو جاگیر خواجہ تھی بیجانگر　　وہ لی خان عادل نے با کرّ و فر
طرف دار اس حد کا وہ ہوگیا　　نشان اس کی عظمت کا اس میں گڑا
تھا اک خان دریا دگر ملّو خاں　　مع فخر ملک اور امیران و خاں
مطیع اور منقاد عادل ہوئے　　اسی سمت و اقطاع کے عامل ہوئے
سر نام جس کے تھا لفظ نظام　　کہ الملک و دکنی بھی ہو انضمام
طرف‌داری دولت[1] کی اس کو ملی　　رہا جا کے اس میں یہ با خوش‌دلی
عماد اور حبشی خداوند خاں　　حصول مقاصد میں با عز و شاں
باقطاع خود تھے جو ان کے قدیم　　ہوئے دونوں یہ جا کے اس میں مقیم
گئے احمدآباد بیدر میں شاہ　　ہر اک اپنے مقصد پہ تھا رو بہ‌راہ
عماد اور عادل خداوند خاں　　نہ آئے یہ سب شہر کے درمیاں
بہ‌جائے دگر سب کی تھی بارگاہ　　کنارا کیا خود بنے بادشاہ
ہوا شاہ کو بھی وثوق و یقیں　　مطیع ہوں مرے اب یہ ممکن نہیں
خزانہ رہا اور نہ ملک و سپاہ　　فقط نام کو رہ گئے بادشاہ
جو برہم ہوا سلطنت کا یہ رنگ　　کیا پھر نہ سلطاں نے بھی عزم جنگ
کسی سے نہ پھر کچھ تعرض کیا　　ہر اک اپنے اقطاع کا حاکم بنا
ملک اور حسن اور لفظ نظام　　معہ الملک و بحری یہ پورا ہے نام
یہی پیشوا اور نایب ہوا　　جز و کل میں شہ کے یہ نایب ہوا
ہوا پھر یہ سلطاں کو سودائے خام　　کہ لوں خان عادل سے میں انتقام
پئے صید شہر و قلعہ ملکواں　　کیا کونچ بیدر سے با عزّ و شاں
کیا تھا امیروں کو شہ نے طلب　　مع فوج جنگی کے آئے وہ سب
مگر تھا وہی طور و طرز قدیم　　علیحدہ ہوئے شاہ سے وہ مقیم
مگر کونچ کے وقت وہ بالتمام　　الگ دور سے کرتے شہ کو سلام

۱ مراد از دولت‌آباد۔

لکھا ہے پس از سیر شہر و حصار
پئے عزم رجعت ہوئے شہریار
جو تھا برسیو رائے بیجانگر
دیا حکم عادل کو جاؤ ادھر
فروغ و ترقی ہو اسلام کو
کرو سرنگوں اہل اصنام کو
عماد اور خداوند و فتح اللہ خاں
ایلچ پور بے اذن شہ تھے رواں
جو کثرت سے پیتا تھا یہ شہ شراب
بالآخر علیل ہو بہ حال خراب
سنہ آٹھ سو اور ستاسی ہوئے
جو شاہ محمد عدم کو گئے
شہنشاہ جہاں شاہ محمد
کہ در بحر فنا ناگہ فرو شد
دکن چوں شد خراب از رفتن او
«خرابئ دکن» تاریخ او شد

۸۸۷

ذکر جلوس محمود شاہ بہمنی[1] بن محمد شاہ بہمنی

تھے بارہ برس کے یہ محمود شاہ
ہوئے رونق افروز دیہیم و گاہ
جہاں قصر شاہی میں رکھا تھا تخت
مزین پئے شاہ اقبال و بخت
دو کرسی تھیں اس کے یسار و یمیں
لکھا ہے کہ وہ ساخت نقرہ کی تھیں
محب اللہ شاہ اور سید حبیب
مشایخ تھے اس عصر کے اور نجیب
پس از فاتحہ تاج وہ بہمنی
رکھا سر پہ محمود شہ بہمنی
چپ و راست پکڑے تھے شہ کا یہ تخت
بٹھایا اسی طرح بالائے تخت
طرف دار اربعہ پئے تہنیت
مع فوج آئے بہ صد تمکنت
تھیں سلطان محمود کی والدہ
عفیفہ و با عصمت و عاقلہ
تھا فتح اللہ جو سلطنت میں عماد
وزارت سے اس کو کیا یاد و شاد
علاءالدیں تھا جو کہ اس کا پسر
سر فوج تھا وہ ازیں پیشتر
ایلچ پور اس کو روانہ کیا
دگر بندوبست اس طرح پر ہوا
عماد اور فتح اللہ بحری نظام
یہ سب ملک کے تھے مدارالمہام
تھیں محجوب سلطان کی جو والدہ
ہر اک امر میں ان سے تھا مشورہ
مگر حاسدوں کو ہوا جو حسد
تھا سلطان کم سن بھی اور بے خرد

---
[1] بادشاہ چہاردہم۔

کیا فوجیوں نے اسے برخلاف ہوا مثل شمشیر وہ بے غلاف
کیا اس طرح سے اسے پر عناد ہے فتح اللہ جو سلطنت میں عماد
سمجھتا ہے سلطان کو وہ حقیر مگر سلطنت کا ہے مالک وزیر
ہوئی بات یہ شہ کے نقش ضمیر دلاور کو تھا حکم قتل وزیر
جو یہ خان حبشی کو فرمان دیا کمربستہ وہ قتل پر ہوگیا
دلاور معہ ایک شخص دگر تھا شمشیر در دست اور کینہ ور
جو آئے وہ باہر پس از مشورہ گرا ان پہ شمشیر کا صاعقہ
وہ تھے مرد میدان جنگ و نبرد کیا زور بازو سے حملوں کو گرد
قلعہ سے نکل آیا جس دم وزیر ایلچ پور کو وہ ہوا راہ گیر
ملک تھے حسن جو کہ بحری نظام ہوئے سمت گجرات وہ تیزگام
ضروری مہم ہوتی سلطان کو جب تو فتح اللہ اس وقت ہوتے طلب
یہ آتے تھے ہمراہ لے کر سپاہ رفاقت بھی کرتے تھے ذی دست گاہ
جو ہوتا تھا شہ عازم بارگاہ جدا ہوتے دونوں ز اثنائے راہ
فقط دور سے کرتے جھک کر سلام نہ تھا شہ کے جلسے سے کچھ ان کو کام
ملک تھا جو اک بحری احمد حسن ہوا خیرہ سر وہ بھی سرّ و علن
بالآخر وہ سرکش ہوا اس قدر لیا اس نے آباد[1] و احمد نگر
جو حاصل ہوئی ثروت خسروی حکومت سے دل ہوگیا بس قوی
روانہ کیا ایک اپنا سفیر لکھا تھا جو کچھ اس کے مافی الضمیر
مشرح تھا یہ نامۂ اتحاد سوئے عادل و خان فتح عماد
بہ تاکید و اصرار یہ تھا رقم سزاوار و لایق اب اس کے ہیں ہم
لوازم جو کچھ بادشاہی کے ہیں رواسم جو ظل الٰہی کے ہیں
بجالائیں ہم تینوں بالاتفاق ارادہ ہوا یہ تو با طمطراق
تھا اقبال و بخت ان کا جو پائے بوس تو بجنے لگا بادشاہی کا کوس

---

[1] دولت آباد.

باظہار شاہی دیا یہ قرار بجے پنج وقتہ یہ لیل و نہار
ہوئے جب کہ یہ صاحب تخت و تاج دیا خطبہ و سکہ کا بھی رواج
گرا خطبہ و سکہ سے شہ کا نام ہوئی سلطنت بہمنیہ تمام
سنہ نُہ صدی میں تھے دس سال کم ہوئے شہ جو معزول جاہ و حشم
بہت پست فطرت تھا عشرت گزیں جو دشمن تھے ان کو کیا ہمنشیں
امور اہم میں نہ کرتا تھا قیاس تزلزل میں تھے سلطنت کے اساس
سفاہت ہوئی اس کے جو پس پدید ہوا تب مسلط امیر برید
نہ باقی رہا کچھ اسے اختیار نہ محمود کو تھی مجال فرار
قطب شاہ[1] جس دم ہوا بادشاہ رکھے رسم سابق کے اس نے نگاہ
غرض پنج ہزار ہوں وہ شخصیات انھیں سر بہ سر بھیجے حین الحیات
جو نُہ صد پہ افزوں ہوئے بست و چار تو محمود پہنچے بدار القرار
لکھا مدت سلطنت کا یہ حال کہ کی سلطنت اس نے سینتیس سال
لکھا ہے یہ قاسم نے اس شہ کا حال فراغت طلب تھا خفیف الخیال

احوال احمد شاہ بہمنی[2] بعد فوت سلطان محمود امیر برید خلف الصدق او احمد شاہ بہمنی را بر تخت شاہی مثل سرفروش بنشاند:

تھے محمود شہ کے جو احمد خلف ہوئے بادشاہ وہ بہ عز و شرف
مسلط تھے لیکن امیر برید جز و کل پہ ان کا تھا حکم شدید
تھے احمد بھی اپنے پدر کی مثال وہی ان کی خلقت میں سب تھے خصال
نہ تھا مشغلہ اور کچھ روز و شب مئے و شاہد و عیش و رقص و طرب
جو بدمست دیکھا بہ حدّے شدید یہ تدبیر سوچا امیر برید
عمارات شاہانہ ترتیب دی پئے جلسۂ عیش ترغیب دی
درختان موزوں و آب رواں چمن در چمن مثل باغ جناں
بساط و صراحی و طنبور و جام مہیا تھا سامان عشرت تمام

---

۱ قطب شاہ والی گلکنڈہ۔ ۲ بادشاہ پانزدہم۔

مرصع جو اک تاج تھا بہمنی — تو جام مرصع بھی تھا بہمنی
تھا موجود ہر دم یہ اسباب عیش — نہ تھا رنج کوئی بجز خواب عیش
موکل معین تھے ہر صبح و شام — کہ محبس سے باہر نکالے نہ گام
دو سال اور اک ماہ ہوئے جو بسر — گئے شاہ احمد جہاں سے گزر

ذکر علاءالدین شاہ بہمنی بعد رحلت احمد شاہ امیر برید برائے اصلاح دولت خویش بر سریر دولت بنشاند:

علاءدین احمد کے جو تھے پسر — کیا سلطنت پر انھیں جلوہ گر
شجاع و خردمند و نیکو سیر — نہ تھا مثل اوضاع جد و پدر
صفات ذمیمہ سے تھا اجتناب — نہ بھولے سے لیتا یہ نام شراب
مدارا کیا وہ بہ خلق سعید — ہوا دوست اس کا امیر برید
کیا اس طرح اپنے دشمن کو رام — کہ آزاد مطلق ہوا بالتمام
بہ تدبیر چاہا کروں اس کو زیر — مقدر میں اس کے تھا جو ہیر پھیر
نہ تدبیر کوئی ہوئی چارہ گر — اجل آ گئی اس کے بالائے سر

ذکر ولی‌الله شاہ بہمنی

علاءدین عدم کو ہوئے تیزگام — ولی‌الله ہوئے ان کے قائم مقام
سلاطین میں یہ جو شامل ہوا — تو خطبے میں نام اس کا داخل ہوا
بہ ظاہر تھا دشمن سے بس اختصاص — تھا مکنون دل یہ کہ ہوئے خلاص
ہوا اس سے آگہہ امیر برید — رکھا پاس اپنے بہ قید شدید
ولی‌الله کی منکوحہ تھی دلربا — امیر برید اس پہ عاشق ہوا
بدیں وجہ مسموم سلطاں ہوا — جو تھا امر مشکل وہ آساں ہوا

ذکر کلیم‌الله شاہ بہمنی

لکھا ہے کلیم‌الله شہ بہمنی — تھے چھوٹے اخی ولی بہمنی
فقط نام کو یہ ہوئے بادشاہ — نہ تھا کوئی ساماں اعزاز و جاہ
تھے نُہ صد یہ پینتیس ہجری فزوں — ہوئے وارد ہند جو بابر شیوں

هوا ان کی آمد کا شور و شغف | گئی کوکبے کی چمک ہر طرف
تھے جتنے سلاطین صاحب سریر | عرایض مع تحفہ بھیجے سفیر
کلیم‌الله نے بھی بہ غرض حصول | لکھی عرضی اور ایک بھیجا رسول
ہوا تھا نہ حاصل جو اس کا ثمر | کہ اعلان اس کا ہوا سربسر
نہ پائی جو دشمن سے اپنے مفر | فراری ہوا وہ بہ احمدنگر
جو برہان تھا وہاں کا فرماں روا | وہ تعظیم کرتا تھا حد سے سوا
بالآخر بہ حکم قضا و قدر | اجل آئی اس کی بہ احمدنگر
کلیم‌الله پر ہوگیا اختتام | ہوا بہمنی پھر کسی کا نہ نام
گئی دولت بہمنی جو گزر | ہوئے طائفے پنج پھر جلوہ گر

۱ قطب شاہ و عادل نظام و عماد
بریدی تھے بیدر میں فرحان و شاد

---

۱ عادل شاہ' نظام شاہ' قطب شاہ' عماد شاہ و برید شاہ -

تبصرے

تبصرے

تبصرہ یا استہزاء؟

تبصرہ ایک فن ہے لیکن اردو تبصرہ نگار اس کی فنی خصوصیتوں سے عموماً نابلد ہوتے ہیں اور اسے فنی حیثیت سے نہیں برتتے۔ اگر کسی وجہ سے (اور یہ وجہ عموماً غیر متعلق ہوتی ہے) کوئی کتاب پسند ہے تو اس کی مدح میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور اگر پسند نہیں تو پھر ہجو کی بوچھار ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں کوئی ادبی معیار پیش نظر نہیں ہوتا اور سمجھ بوجھ، صداقت، حقیقت کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر تصنیف عام پسند ہے یا کسی دوست نے شائع کی ہے، کسی مشہور و معروف مصنف کے قلم سے نکلی ہے یا کسی ذی مرتبہ شخص کی فکر کا نتیجہ ہے تو پھر اس کی تعریف، مبالغہ آمیز تعریف لازمی ہے۔ لیکن اگر کسی تصنیف میں آزادئ فکر سے کام لیا گیا ہے یا اس میں عام پسند اور روایتی چیزوں کے نقایص بیان کیے گئے ہیں یا اس سے تبصرہ نگار کے ذاتی، قومی و ملی احساسات کو صدمہ پہنچا ہے تو پھر وہ آپے سے باہر ہوجاتا ہے، فہم و ادراک کو پس پشت ڈال کر ہذیان سرائی کرنے لگتا ہے۔ تبصرہ لکھنے کے بدلے وہ محض اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ کتاب کو ٹھنڈے دل سے نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے اس کے خیالات کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی۔ اردو میں غالباً صرف ایک شخص نے فن تبصرہ کی اہمیت کو سمجھا اور اسے پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔ وہ شخص عبدالحق صاحب ہیں اسی وجہ سے جو تبصرے «اردو» میں نکلتے تھے وہ دوسرے تبصروں سے زیادہ قیمتی اور اہم ہوتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اس طرف خود متوجہ نہیں ہوسکتے۔

میں نے «اردو» جنوری نمبر میں «اردو شاعری پر ایک نظر» اور

«گل نغمہ» کے ریویو دیکھے تو میں ہنس کر خاموش ہوگیا لیکن بعض احباب نے کہا کہ «اردو» ایک مقتدر رسالہ ہے اور چونکہ یہ ریویو «اردو» میں نکلے ہیں اس لیے اگر ل۔ا اور م۔ی کی ستم ظریفیوں کا انکشاف نہیں کیا گیا تو ممکن ہے کہ دونوں کتابیں غلط فہمی کا شکار بن جائیں۔ اسی لیے چند سطریں قلمبند کی جاتی ہیں۔ میں عبدالحق صاحب کا ممنون ہوں کہ مجھے انھوں نے اس کی اجازت دی کہ میں «اردو» میں اپنے خیالات کا اظہار کرسکوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ل۔ا صاحب میرے دو جملوں («شاعری کی ہندستان میں قدر و منزلت نہیں» اور «اردو شعری کا مستقبل امید افزا نظر نہیں آتا») سے اس قدر برافروختہ ہوئے، ان کے احساسات کو کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ ہجوگوئی پر آمادہ ہوگئے۔ انھیں غیر شعوری طور پر اس کا بھی احساس ہوا کہ جو نظریے اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں ان کا رد ممکن نہیں (کیونکہ اس کتاب میں صرف رائے زنی نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر بات کے ثبوت میں اٹل مثالیں پیش کی گئی ہیں) اس لیے وہ استہزاء پر آمادہ ہوگئے۔ اس فیصلے کے بعد اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ کتاب کا بہ غور مطالعہ کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ل۔ا صاحب کو معلوم نہیں کہ جو چیز غور و فکر کے بعد لکھی جاتی ہے اسے غور و فکر کے بعد ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ل۔ا صاحب نے اسے سمجھنے کی مطلق کوشش نہ کی۔

ل۔ا صاحب پہلے ایک اصولی بات بیان کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ «مشرقی» ادب کو «مغربی» معیار سے جانچنا غلطی ہے۔ مجھ سے بھی وہ ایک اصولی بات سن لیں۔ ادب انسانی تجربات اور انسانی زندگی کی روح ہے۔ یہ بنیادی تجربات، یہ زندگی ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانے میں یکساں ہوتی ہے۔ اس لیے وہ معیار بھی جن سے ادب کی جانچ پرتال کی جاتی ہے لازمی طور پر یکساں ہوں گے اور سطحی اختلافات کے باوجود ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانے میں یکساں نظر آئیں گے۔ اس لیے «مغربی ادب و معیار» اور «مشرقی ادب و معیار» کا تفرقہ مہمل ہے جسے فہم سلیم کبھی تسلیم نہیں

کرسکتی (مزید تفصیل کے لیے دیکھو «معاصر» فروری سنہ ۱۹۴۱ع صفحہ ۶۳) بہرکیف اس «اصولی» بات کے بعد لایق تبصرہ نگار مجھ پر یورپ زدگی کا الزام عاید کرتے ھیں اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کو اپنی مدد کے لیے بلاتے ھیں ۔ عبارت کا جو حصہ نقل کیا گیا ھے اسی کے کچھ بعد بجنوری مرحوم جس یورپ‌زدگی کا الزام وہ طالب‌علم اور انگریزی تعلیم یافتہ پر رکھتے ھیں خود بھی اسی کے مرتکب ھوتے ھیں: «دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ھوسکتا ھے تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گیٹے المعروف بہ گیٹے ھے» اس کے بعد جتنے مغربی مصنفین اور فن‌کاروں کے نام ممکن تھے گنائے گئے ھیں: گیٹے، ایری‌اوسٹو، میکائل‌آنجاو، ورجل وغیرہ وغیرہ ۔ حقیقت یہ ھے کہ شاید ھی کسی ایک مقالے میں یورپ‌زدگی کا اس قدر مفصل نمونہ مل سکے جیسا بجنوری مرحوم کے مقدمے میں ملتا ھے ۔ ایسے شخص کو ل ۔ ا صاحب اپنی مدد کے لیے بلاتے ھیں ع

چہ دلاورست دزدے کہ بہ کف چراغ دارد

اگر انھیں بجنوری مرحوم کی یورپ‌زدگی کا مفصل بیان دیکھنا ھو تو وہ «معاصر» جون ۱۹۴۱ع کے منتظر رھیں ۔ بہرکیف اگر میں نے مغرب سے استفادہ کرنے کا مشورہ پیش کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی ۔ یہ مشورہ تو زمانہ ھوا حالی و آزاد (جنھیں ل ۔ ا صاحب قابل عظمت سمجھتے ھیں) نے پیش کیا تھا پھر مجھے کیوں مورد الزام قرار دیتے ھیں؟ فاضل تبصرہ نگار فرماتے ھیں :- «یہ کوئی نھیں کہتا کہ جن چیزوں کا ذکر ابھی ھوا (یعنی نقد و نظر کے مغربی معیار) ان کو حرف غلط سمجھکر رد کردیا جائے ۔ جہاں تک ھماری زبان کے ادبی اور لسانیاتی عوارض اجازت دیں ان سے استفادہ کیا جائے» ۔ اگر وہ کتاب کا بہ غور مطالعہ کرتے تو انھیں حصۂ اول صفحہ ۱۶۲ پر یہ دو جملے نظر آتے: «لیکن مغربی ادب سے بھی کوئی مفید شے حاصل نھیں ھوسکتی اگر اردو شعرا اس کی بھی اسی طرح کورانہ تقلید کریں جیسے انھوں نے فارسی کا تتبع کیا» اور «ذاتی حسیات و تصورات، شخصی تجربات کی اپنے ماحول، اپنے مذاق کا لحاظ رکھتے ھوئے ترجمانی کریں ۔»

استعجاب و تاسف ہے کہ ل۔ا صاحب اپنے جذبات سے اس قدر مجبور ہوجاتے ہیں کہ وہ دانستہ حقیقت کو چھپاکر "اردو" کے قارئین کو اس کتاب کی طرف سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "شاعری کا صحیح مفہوم کیا ہے اس کا اظہار کہیں نہیں کیا گیا ہے" میں نے کتاب کے پہلے باب میں شاعری کی ماہیت اور اہمیت، شاعری کے اوصاف، نظم کی خصوصیتوں کا مختصر لیکن جامع بیان کیا ہے ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں: "وہ فارسی جس کی غلامی کا طوق ولایت سے نیا گڑھوا کر مصنف نے اردو غزل کے گلے میں ڈالا ہے" یہ غلامی کا طوق میں نے "ولایت سے" نیا نہیں گڑھوایا ہے یہ طوق حالی و آزاد (جن کی ل۔ا صاحب عظمت کرتے ہیں) نے ہندوستان میں گڑھا تھا۔ میں نے لکھا ہے "اردو شاعری نے فارسی کے سایے میں پرورش پائی" (حصہ اول صفحہ ٦) اس حقیقت سے کسی ذی فہم کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اور میں نے یہ جملہ "اصغر، عزیز، حسرت، کیفی، فانی اور سیماب" کی غزلوں پر تنقید لکھتے ہوئے نہیں تحریر کیا ہے جیسا ل۔ا صاحب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

مختلف اقتباسات جو میری کتاب سے پیش کیے گئے ہیں ان میں منصف مزاج تبصرہ نگار نے عجب ستم ظریفی سے کام لیا ہے۔ کہیں سے وہ ایک جملہ انتخاب کرلیتے ہیں کہیں سے آدھا جملہ، متفرق جگہوں سے جملے چن کر ایک دوسرے میں ضم کردیتے ہیں۔ کسی جگہ بیچ سے عبارت حذف کردیتے ہیں۔ غرض ہر طرح کا "تصرف" جائز خیال کرتے ہیں۔ تفصیل کی گنجایش نہیں اس لیے میں تین مثالیں پہلے حصے سے اور صرف دو مثالیں دوسرے حصے سے پیش کرتا ہوں۔

(۱) میر | "میر کی قوت حاسہ مخصوص و محدود قسم کی تھی" پھر فرمایا ہے:- "میر کی دنیا تنگ تھی" میر کے کلام پر تبصرہ ان جیسے الفاظ پر ختم ہوتا ہے:- "میر کے کلام میں خامیاں بھی ہیں اصل نقص لیکن کلام کی ناہمواری ہے۔ اس کا معتدبہ حصہ نہایت ہی پست و مبتذل ہے"۔

میر کی شاعری کے محاسن و نقایص میں نے نو صفحوں میں بیان کیے ہیں۔ منصف مزاج حضرات یہ صفحے دیکھ لیں (حصہ اول ۲۸-۳۷) میں یہاں ان صفحوں

کو نقل نہیں کرسکتا لیکن ایک مختصر حصہ پیش کرتا ہوں ۔ اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ میں نے کیا لکھا ہے اور اسے ل۔ا صاحب نے اپنی ستم ظریفی سے کیا بنا دیا ہے:۔
« جب میر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ، ایسے جذبات جو ذاتی طور پر محسوس کیے گئے ہیں تو ان کے اشعار میں ایک حیرت انگیز سادگی رونما ہوتی ہے ۔ سیدھے سادھے ، مختصر ، نرم و ملایم الفاظ میں وہ اپنے منفرد احساسات و تاثرات کا نہایت صفائی ، درد انگیزی اور جامعیت کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور ان کے شعر میں ایسا ترنم ہوتا ہے ۔ کہ گویا ان میں روح موسیقی جلوہ گر ہے ۔ حیرت ہوتی ہے اس پر کہ وہ ان معمولی الفاظ میں کیا جادو بھردیتے ہیں جس سے ان کا اثر دل پر اس قدر گہرا ہوتا ہے ۔ ان الفاظ میں ایک کیمیاوی تغیر ظاہر ہوتا ہے اور ان کی فطرت بدل جاتی ہے ۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر نہایت سہولت و آسانی سے جم جاتا ہے ۔ الفاظ کی ترتیب بھی وہی ہوتی ہے جو بول چال میں مستعمل ہے ۔ یہ تو ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ غزل لکھی گئی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی باتیں کررہا ہے اور باتیں بھی ایسی جو دل کی گریباں گیر ہوجائیں ۔ اگر ہر لفظ کو الگ الگ دیکھا جائے تو ان میں کوئی خاص بات نہیں لیکن ان کے میل سے ایک خاص سحر پیدا ہوجاتا ہے »۔ کیا ل۔ا صاحب نے یہ حصہ دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو تبصرہ لکھتے وقت کیا وہ اسے یک قلم بھول گئے؟ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخری جملے کے نقل کرنے سے ان کا کیا مطلب ہے ۔ کیا وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ میر کے سارے اشعار اچھے ہیں؟ کیا انہیں عبدالحق صاحب کا یہ قول یاد نہیں؟ «میری یہ رائے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ہے ورنہ ان کی ضخیم کلیات میں رطب و یابس سب کچھ بھرا پڑا ہے ۔ مولانا (آزردہ) نے ان کے کلام کی نسبت اپنے تذکرے میں صحیح لکھا ہے کہ ' پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است ' »

۲ درد

«جن تجربات کی درد ترجمانی کرتے ہیں وہ غیر مانوس ہیں اور اکثر درد ان تجربات کو اس جوش و وجد کے ساتھ محسوس نہیں کرتے جو میر کا حصہ ہے۔ اس لیے درد کے اشعار میر کے اشعار سے کم تاثیر کے حامل ہیں ۔ رعایت لفظی

بھی موجود ہے قند مکرر ۔ دل آوارہ ۔ اثر مطلق نہیں '۔ ہم نہیں سمجھے کہ قند مکرر اور دل آوارہ میں رعایت لفظی کیوں کر پیدا ہوگئی ۔ شاعری کے صحیح مفہوم کی طرح رعایت لفظی کا مفہوم بھی مصنف کے ذہن میں خانہ زاد ہی ہوگا ۔ پہلے فرمایا تھا : ' درد کے اشعار میں تاثیر کم ہے' (صفحہ ۴۲) اگلے صفحے پر ارشاد ہوتا ہے : ' ہر ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے ' فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

یہاں ل ۔ ا صاحب نے یہ انصاف پسندی دکھلائی ہے کہ صفحہ ۴۲ سے اپنے مطلب کے کچھ جملے چن کر جوڑ دیے ہیں پوری عبارت یہ ہے :- " جن تجربات کی درد ترجمانی کرتے ہیں وہ غیر مانوس ہیں ' اور اکثر درد ان تجربات کو اس جوش و وجد کے ساتھ محسوس نہیں کرتے جو میر کا حصہ ہے اس لیے درد کے اشعار میر کے اشعار سے کم تاثیر کے حامل ہیں ۔ جس طرح میر کے کلام میں دو قسم کے اشعار ملتے ہیں شخصی اور مصنوعی ' یہی واقعہ درد کے ساتھ بھی وابستہ ہے بعض اشعار سے فوراً یہ نتیجہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ وجدانی کوایف دل پر گزرے ہیں جن کی عکاسی صفحۂ کاغذ پر منظور ہے لیکن اکثر ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو محض رسماً لکھے گئے ہیں ۔ درد فرماتے ہیں : ' بندے نے کبھی شعر بدون آمد کے سوا اہتمام آورد سے موزوں نہیں کیا ' پھر بھی صاف مثل روز روشن ہے کہ بعض جذبات نے دل میں ہیجان پیدا کیا ہے اور بعض نے سطح دریا پر کوئی لہر بھی نہیں رونما کی :-

کہا جب میں ترا بوسہ تو جیسے قند ہے پیارے لگا تب کہنے پر قند مکرر ہو نہیں سکتا
دل آوارہ الجھے یاں کسی کی زلف سے یارب علاج آوارگی کا اس سے بہتر ہو نہیں سکتا
نہیں چلتا ہے کچھ اپنا تو تیرے عشق کے آگے ہمارے دل پہ کوئی اور توڑ ہو نہیں سکتا

یہاں محض آورد ہے یہ اشعار اصلیت و صداقت سے مبرّا ہیں ۔ صاف ظاہر ہے کہ درد نے ان اشعار میں محض مروّجہ خیالات کا رسمی اظہار کیا ہے ۔ ان خیالات نے ان کے دل و دماغ میں کچھ بھی ہیجان نہیں پیدا کیا ہے ۔ رعایت لفظی بھی موجود ہے " بوسہ ۔ قند ۔ قند مکرر " ' " دل آوارہ ' زلف ' آوارگی " اثر مطلق نہیں ۔ ان خیالات نے خود شاعر کے دل کو مسرور نہیں کیا ' اس کے تخیل کو پر پرواز

پھیلانے پر آمادہ نہیں کیا۔ اس لیے ان میں روح شاعری مفقود ہے۔ اس طرز میں اور درد کے مخصوص رنگ میں آسمان و زمین کا فرق ہے'۔ دیکھا! میں نے 'رعایت لفظی' کو کسی «خانہ زاد» مفہوم میں نہیں استعمال کیا ہے۔ میں نے اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے جسے ہر ذی فہم سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ صفحۂ ۴۲ پر کہیں یہ جملہ نظر نہیں آتا کہ «درد کے اشعار میں تاثیر کم ہے» جملہ یہ ہے: درد کے اشعار میر کے اشعار سے کم تاثیر کے حامل ہیں» غالباً ل۔ا صاحب ان دونوں جملوں کا ایک ہی مفہوم سمجھتے ہیں۔ میر اور درد کے اشعار میں تاثیر کے لحاظ سے درجے کا فرق ہے اس لیے میرے اس جملے اور دوسرے جملے میں کوئی تضاد نہیں۔ دوسرا جملہ میں نے درد کی اس غزل کے اشعار سے متاثر ہوکر لکھا تھا جس کا مطلع ہے:—

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

غالباً ل۔ا صاحب اس غزل اور مذکورۂ بالا اشعار میں تاثیر کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں محسوس کرتے۔

۳ مثنوی | قصیدے کے بعد مثنوی تنقید کی زد میں آتی ہے۔ «سحر البیان» میں میر حسن نے میر داستان کی شان میں یہ لکھا تھا:—

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال مروت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے نفروں سے نفرت اسے سدا قابلوں سے تھی صحبت اسے

اس پر بگڑ کر ارشاد ہوتا ہے: اسے دیکھ کر ہر ذی فہم یہی کہے گا کہ ایسے کامل جانور دنیا میں نظر نہیں آتے (جانور پر خط ہم نے کھینچا ہے) ان الفاظ کو سن کر ہر ذی فہم یہی کہے گا کہ یہ مخلصانہ اور شریفانہ انتقاد کی زبان نہیں۔ کیا کیمبرج کے چڑیا خانے میں ایسے جانور سدھائے نہیں جاسکتے؟

میں نے یہ لکھا تھا: «.. ہر جگہ عاشق معشوق نما کا اسی انداز سے بیان ہوتا ہے۔ اس کی رنگین ادائی، اس کی زلف دراز، نگاہ جادو، کافر بھویں، اس کے رخ منور، لب لعلیں، دھن تنگ کا ذکر ہر جگہ ملتا ہے صرف وہ حسن ہی میں تمام حسینان جہاں

سے برتر نہیں ہوتا، اس میں ساری نیک انسانی خصوصیات بھی مجتمع ہوتی ہیں۔ شاہزادۂ بےنظیر کے کمالات ملاحظہ ہوں :-

دیا تھا زبس حق نے ذہن رسا — کئی سال میں علم سب پڑھ چکا
معانی و منطق بیان و ادب — پڑھا اس نے منقول و معقول سب
خبردار حکمت کے مضمون سے — غرض جو پڑھا اس نے قانون سے
لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم — زمیں آسماں میں پڑی اس کی دھوم
کیے علم نوک زباں حرف حرف — اسی نحو سے اس نے کی عمر صرف

خوش نویسی میں وہ طاق، کمان کشی میں شہرہ آفاق، موسیقی میں بڑی دستگاہ اور مصوری میں بھی کمال۔ ان کے علاوہ :-

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال — مروت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے نفروں سے نفرت اسے — سدا قابلوں سے تھی صحبت اسے

«اسے دیکھ کر ہر ذی فہم یہی کہے گا کہ ایسے کامل جانور دنیا میں نظر نہیں آتے»۔ سمجھ والے سمجھ سکتے ہیں کہ «مخلصانہ اور شریفانہ انتقاد کی زبان» میں نے استعمال کی ہے یا ل۔ ا صاحب نے۔ میں نے بےنظیر کو جانور نہیں کہا ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میر حسن کردار نگاری میں واقعیت کا لحاظ نہیں کرتے۔ وہ اس قدر مبالغے سے کام لیتے ہیں کہ بےنظیر کی شخصیت ناقابل وثوق ہوجاتی ہے۔ ہر ذی فہم سیاق کلام سے یہی مطلب سمجھے گا۔ ہندستان میں مشہور و مقتدر مصنفوں کو تقدس کا جامہ پہنادیا جاتا ہے اور انھیں تنقید سے بالاتر سمجھا جاتا ہے لیکن یہ زاویۂ نظر غلط ہے۔ خدا کی ذات کے سوا اور کوئی ذات کامل نہیں۔ اگر کسی مصنف میں اہم نقایص ہیں تو ان کا انکشاف صرف جایز ہی نہیں بلکہ ایک اہم ادبی خدمت ہے۔ لیکن ل۔ ا صاحب نے تو «جذبۂ پرستش» کی انتہا کردی اور اردو شعرا کے ساتھ وہ ان کے تخلیق کیے ہوئے کردار کو بھی مقدس اور تنقید سے بالا سمجھنے لگے۔

تبصرے کے دوسرے حصے میں بھی ل۔ ا صاحب بعض جملے نقل کرکے اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں:-

۱ شوق قدوائی | ۔۔۔ ”ارشاد ہے: ”شاعر قصداً سادہ طرز اختیار کرسکتا ہے لیکن کامیابی کے لیے شرط ہے کہ وہ اس کو آمد کے سانچے میں ڈھال سکے یعنی اپنی کاوش اپنے تکلف کو مخفی رکھ سکے اسی میں شوق کامیاب نہیں ہوتے“۔ معترض ایک قابل رحم مغالطے میں پڑے ہوئے ہیں ۔ ہمارے ہاں شعر کی تعریف ہی میں قصد کی شرط لازمی ہے ۔ وہ سادہ طرز ہو یا رنگین طرز ، آپ کے مغرب میں جو مشاہیر شعرا آپ کے پیر و مرشد ہیں کیا ان کا کلام ذہن کی اضطراری حالت کا مولود ہے یا آپ کے خیال میں شاعر یا ناثر بغیر ارادے کے اپنے طرز کو برقرار رکھ سکتا ہے ۔ میں بڑی یہی کہتا ہوں کہ ”قصد کی شرط لازمی ہے“، لیکن قصد و ارادہ سے مصروف لینا اور قصد و ارادہ کو مخفی رکھنا دو مختلف چیزیں ہیں ۔کیا ل ۔ ا صاحب نے اگریزی کا یہ مقولہ نہیں سنا ہے کہ Art lies in concealing art .

۲ اقبال | ۔۔۔ ’خضر راہ‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے : ’۔۔۔ یہ ربط یہ ارتقائے خیال مکمل نظم میں بھی موجود ہے ۔ لیکن اکثر علیحدہ بند میں نظر نہیں آتا ۔ مثلاً جس بند میں زندگی کی ماہیت پر عمیق فلسفیانہ روشنی ڈالی گئی ہے وہاں اشعار میں ربط و تسلسل نہیں ۔ارتقائے خیال تو سرے سے مفقود ہے ۔ اسی طرح اکثر خیالات کی اہمیت ایسی چھاجاتی ہے کہ شعریت گھبراکر حلقۂ وزن سے نکل جاتی ہے ‘ (۷۷) یہ تنقید اس بند سے تعلق رکھتی ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے :—

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

اس بند میں ربط و تسلسل کا فقدان ہمیں تو کہیں نہیں معلوم ہوتا ۔

یہ تنقید خضر راہ کے پہلے بند سے تعلق نہیں رکھتی ۔ اس بند پر جو تنقید میں نے لکھی ہے وہ یہ ہے (صفحہ ۷۶) :—

” پہلا بند شعریت سے لبریز ہے ۔ شاعر آغاز نظم میں عقبی زمین پیش کرتا ہے خیالات و جذبات تلاطم خیز ہیں اس لیے وہ شاعرانہ اوصاف کو پیش نظر رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے ۔ ’ساحل دریا‘ ، ’سکوت‘ ، ’طلسم ماہتاب‘ ، ’انجم کم ضو‘ ہر شے صاف صاف نظر

آتی ہے - پھر شاعر کا وجود تنہا ، اور اسی تنہائی میں یک بیک خضر جہاں پیما کا نمودار ہوکر سرگرم گفتگو ہونا نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے - کس قدر حسین ہیں یہ اشعار :-

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر   تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سوجاتا ہے طفل شیرخوار   موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں سے طایر آشیانوں میں اسیر   انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

اشعار ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں - یہ مربوط ہیں اور مکمل بند میں صاف ارتقائے خیال نظر آتا ہے ل - ا صاحب کی غلط بیانی کا اس سے محکم ثبوت ممکن نہیں - جو جملے انہوں نے نقل کیے ہیں وہ اس بند سے تعلق رکھتے ہیں جس میں "زندگی کی ماہیت پر عمیق فلسفیانہ روشنی ڈالی گئی ہے - " اگر ل - ا صاحب کو وہ بند یاد نہیں تو اپنی یاد تازہ کرلیں -

ان مثالوں سے ظاہر ہوگیا ہوگا کہ ل - ا صاحب نے اپنے تبصرے میں ناقابل بیان احساسات سے مصرف لیا ہے - تفصیل کی گنجایش نہیں ورنہ اسی "تبصرہ" پر ایک مفصل کتاب لکھی جاسکتی ہے اور تبصرہ نگار کی ذہنیت کا انکشاف کیا جاسکتا ہے -

اب "گل نغمہ" سے متعلق م - ی صاحب کی گل فشانیاں دیکھیے - شروع میں فرماتے ہیں : " ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ اور شغل منصبی اگرچہ سائنس سے متعلق رہا " معلوم نہیں م - ی صاحب کو کہاں سے یہ الہام ہوا کہ مصنف "گل نغمہ" کا مطالعہ اور شغل منصبی سائنس سے متعلق رہا - غالباً ڈاکٹر کے لفظ سے انہوں نے دھوکا کھایا اور انہیں طبیب سمجھ لیا - یا شاید انہیں میرے اس جملے سے غلط فہمی ہوئی : "پھر کالج میں سائنس کا طالب علم ہوا " اگر م - ی صاحب نے میری کتاب دیکھی تھی تو کاش وہ " گل نغمہ " کا اشتہار بھی جو کتاب کے آخر میں ہے دیکھ لیتے - انہیں معلوم ہوتا کہ یہ ڈاکٹر صاحب ام - بی - بی - ایس نہیں بلکہ پی - ایچ - ڈی ہیں اور سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو پٹنہ یونیورسٹی بھی ہیں - اسی طرح م - ی صاحب پر دوسرا الہام یہ ہوا ہے کہ مصنف کسی کے " غلط مشورے " سے گمراہ ہوگئے - کاش انہیں اس کا علم ۱۹۰۱ء

میں ہوتا اور وہ مصنف کو متنبہ کردیتے ! اسی الہامی طور پر وہ " زبان درگور " کا ماخذ میر کے مشہور قطعے کو بتاتے ہیں - اگر وہ اشارات کو دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ یہ نظم گویا بستر مرگ پر لکھی گئی تھی اور اس میں کسی کی تقلید نہیں -

فاضل تبصرہ نگار کا نزلہ خاص طور سے " برسات اور شاعر " پر گرا ہے - طوالت کے خوف سے میں صرف ایک حصہ نقل کرنے پر قناعت کرتا ہوں - فرماتے ہیں:- " بیان تسلسل سے جو قطعہ کی شرط اول ہے معصوم ہے اول شعر کے دوسرے مصرع میں تشبیہ عامیانہ ہے جب کہ وجہ شبہ ندارد ہے - شروع کے دونوں شعر آپس میں بے واسطہ ہیں اگرچہ دوسرے شعر میں " جو " نے اس نقص پر پردہ ڈالنے کی کچھ کوشش کی ہے - چوتھا مصرع قاری کو اس سے زیادہ حیرت میں ڈال دیتا ہے جو دلبر سے یکایک دوچار ہوجانے میں ہوتی ہوگی کہ ڈالیاں ہلنے سے پتے پتے میں تازہ بہار کیوں کر آجاتی ہے" - بیان تسلسل سے معصوم ہیں - بیان میں وہ تسلسل ہے جو نظموں میں ہوتا ہے اور جس سے عموماً اردو قطعے معصوم ہوتے ہیں - تشبیہ عامیانہ مطلق نہیں - تبصرہ نگار کی فہم کا قصور ہے - پہلے دو شعر بے واسطہ ہیں ان میں ایسا ناگزیر ربط ہے جسے ہر ذی‌فہم سمجھ سکتا ہے - پتے پتے میں تازہ بہار ہوا چلنے سے آجاتی ہے - جناب م - ی صاحب اپنی آنکھوں سے مصرف لیں - جہاں جہاں م - ی صاحب نے مصنف کی قوت مشاہدہ پر اعتراض کیا ہے وہاں انھوں نے اپنی کم نظری ظاہر کی ہے - ان اعتراضات کا جواب دینا تضییع اوقات ہے - اگر م - ی صاحب اپنی قوت مشاہدہ سے کام لیں تو انہیں معلوم ہوجائےگا ساری جزئیات حقیقت پر مبنی ہیں - وہ کمرے میں بیٹھ‌کر مہمل اعتراضات کرنے کے بدلے فطرت کا مطالعہ کریں تو ان کی آنکھیں کھل جائیں‌گی - (مزید تفصیل کے لیے دیکھو " اردو شاعری پر ایک نظر " حصۂ دوم باب ہفتم)

اس تبصرے میں بقیہ اعتراضات زبان اور آورد سے تعلق رکھتے ہیں - میں اس سلسلے میں ایک دوسرے تبصرے سے چند جملے نقل کرنے پر قناعت کرتا ہوں "۰۰۰۰ نظمیں فرسودہ خیالات اور عامیانہ جذبات سے پاک ہیں - شاعر نے پہلے خود محسوس کیا ہے اس کے بعد اس کا احساس شعر کے قالب میں ڈھل‌گیا ہے - شاعری زندگی کا آئینہ ہوتی ہے -

اس مقولے کے ثبوت میں "گل نغمہ" پیش کیا جاسکتا ہے - زندگی کے بے رنگ خاکوں میں شاعر نے تصورات کے رنگ بھرے ہیں - اس لیے یہ شعری تصویریں دلکش اور ولولہ انگیز بن گئی ہیں - جدید بحروں کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے - جس کی وجہ سے اشعار کی روانی میں موسیقیت کا جزو شامل ہوگیا ہے"
(ساقی دہلی)

کلیم الدین احمد

(نوٹ از اڈیٹر)

"اردو شاعری پر ایک نظر" ایک تنقیدی تالیف ہے - اردو میں مولانا حالی کے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے بعد کوئی کتاب اس موضوع پر ایسی نہیں لکھی گئی جو قابل لحاظ ہو - ایک دو کتابیں جو لکھی گئیں وہ ایسے حضرات کی قلم سے نکلی ہیں جنھیں اس فن سے کوئی لگاؤ نہیں - ان کی تنقید یا تو بالکل سطحی اور ناقص ہے یا سرقہ یا ترجمہ جو بے سوچے سمجھے بغیر کسی تعلق کے، کسی ادیب یا شاعر کے سر چپکا دی گئی ہے - کلیم الدین صاحب نے اردو شاعری اور مغربی ادب دونوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے اور اصول تنقید سے پورے باخبر ہیں - انھوں نے اس تنقید میں بہت سی وہی باتیں کہی ہیں جو آپ کو مقدمۂ شعر و شاعری میں ملیں گی، لیکن ایک نئے ڈھنگ سے، اور اس کے سوا وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں - انھوں نے ہماری شاعری کے عیوب بڑی بے باکی سے بیان کیے ہیں اور وہ بڑے بڑے اساتذہ بھی جن کے نام کا لوگ کلمہ پڑھتے ہیں ان کی تنقیدی نظر سے نہیں بچے - اس معاملے میں انھوں نے بڑی قابل تعریف آزادی سے کام لیا ہے - اور بعض ایسی سچی اور بے لاگ باتیں کہیں ہیں کہ ان کی صداقت ماننی پڑتی ہے - لیکن کہیں کہیں وہ اپنے جوش تنقید میں یا مغربی اثر میں آکر حد سے تجاوز کرگئے ہیں - رائے میں اختلاف کی گنجایش ضرور ہے اور ہوسکتا ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ کلیم صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت غور کے بعد اور سوچ سمجھ کر لکھا ہے -

میں انھیں ل۔ا صاحب کی طرح "مغرب زدہ" تو نہیں کہتا لیکن اس قدر کہنے میں مجھے تامل نہیں کہ وہ ہر چیز کو مغربی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میر، سودا، درد وغیرہ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مغربی ادب سے واقف ہوتے تو بڑے اعلیٰ پایے کے شاعر ہوتے۔ حیرت ہی کی نہیں، ہنسی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ یہ الفاظ ان کی قلم سے کیسے نکلے یہ پایۂ تنقید سے گری ہوئی بات ہے اور خود قابل نقاد کے مرتبے کے شایاں نہیں۔ دنیا میں مغربی ادب ہی ایک ادب نہیں، اور بھی ادب ہیں اور ایسے ہیں کہ مغرب نے بھی ان کے سامنے سر جھکایا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔

جس طرح زبان کے ظہور کے بعد اور زبان کے مطالعے سے صرف و نحو کے قواعد مرتب کیے گئے، اسی طرح ادب کے وجود میں آنے کے بعد اور اس کے مطالعے سے اصول تنقید وضع ہوئے۔ اگر ارسطو کے بعد سے اب تک مختلف زبانوں میں ادبی تنقید پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ تنقید کے ڈھنگ کس کس طرح بدلتے رہے ہیں۔ جس طرح مشرقی تمدن و تہذیب میں فرق ہے اسی طرح مغربی اور مشرقی مفکرین اور ادیبوں کے روش خیال و فکر میں بھی فرق ہے۔ گو اکثر وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں لیکن ان کے فکر کے رستے جدا جدا ہیں۔ ادب پر بہت کچھ ملک کے حالات معاشرت و زندگی، آب وہوا اور ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ اور شاعر اور ادیب اس سے نہیں بچ سکتا۔ اس لیے ہمیں اپنے شاعر کے نقطۂ نظر کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ ہمارے شاعر کا تخیل حسن کی نسبت کیا ہے اور اس کے پاس اس کے ادا کرنے کے کیا اسلوب ہیں۔

غزل پر کلیم صاحب نے جو تنقید کی ہے اس میں بہت سی پتے کی باتیں ہیں جو قابل غور ہیں۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ ہمارے شاعر کا کمال اس میں ہے کہ وہ ایک شعر یعنی دو مصرعوں میں اپنے کسی جذبے یا خیال کی مکمل تصویر کھینچتا ہے۔ اسے جزییات میں جانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا شعر

جزییات پر حاوی ہے ۔ اس کے پڑھنے کے بعد کسی انتظار کی ضرورت نہیں رہتی وہ تسکین قلب کے لیے بالکل کافی ہوتا ہے؛ یہی نہیں بلکہ اس میں بعض ایسے نازک خیال چھپے ہوتے ہیں جن کے تصور سے لطف شعر دوبالا ہوجاتا ہے ۔ مثلاً فاضل نقاد نے میر کے اس شعر کی بےحد تعریف کی اور وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے :

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یہ بہت ہی لطیف اور کامل شعر ہے ۔ لطف اور تسکین قلب کے لیے اس میں کسی اور چیز کے انتظار کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ اگر شاعر اس خیال کی جزییات میں پڑجاتا تو شعر کا سارا حسن غارت ہوجاتا ۔ پھول کا حسن اس کی پنکھڑیوں کے تجزیے میں نہیں ۔ ایک بلّی کسی خوش نوا بلبل کے چہچہے سے ایسی مسحور ہوئی کہ اس نے ان چہچہوں پر ہمیشہ کے لیے قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ جھپٹ کر بلبل کو دبوچ لیا اور چیر پھاڑ کر تار تار کردیا لیکن کہیں اسے وہ نغمہ نہ ملا جس نے اس پر جادو کا سا اثر کیا تھا ۔ یہی حال شعر کا ہے ۔

فاضل نقاد نے غالب کی ایک غزل کے ایک ایک شعر کا تجزیہ کرکے ان کی بےربطی وغیرہ دکھائی ہے اور جس نظر سے انھوں نے یہ تنقید کی ہے یعنی غزل کے سلسلے میں، اس کی صحت میں شک نہیں ۔ لیکن جس ڈھنگ سے ہر شعر پر الگ الگ انھوں نے اپنے خیالات ظاہر کرکے ان کو ناقص ٹھیرایا ہے اس کے بر محل ہونے میں شبہ ہوتا ہے ۔ مثلاً اس غزل کا مقطع ہے :-

عشق نے غالب نکمّا کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس کے متعلق فرماتے ہیں «کام کے آدمی تھے» اس ٹکڑے کا مطلب واضح نہیں کس کام کے تھے ؟ کن معیار (ہکذا) پر پورے اترتے تھے؟ مذہبی یا دنیاوی، اخلاقی، سیاسی یا قومی ؟ عشق نے کیوں نکما کردیا ؟ قصور عشق کا ہے یا اپنا ؟» ۔ یہ سب ملایانہ اعتراض ہیں ۔ قاری کو پڑھتے وقت مطلق ان باتوں کا خیال نہیں آتا ۔ وہ «نکما» اور

« آدمی تھے کام کے » کے معنی خوب سمجھتا ہے اور اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے دل میں نہ کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی اور بات کے انتظار کی ضرورت رہتی ہے۔ شاعر بعض وقت ایک شعر کیا ایک مصرع میں خیال یا جذبے کی ایسی سچی اور مکمل تصویر کھینچ دیتا ہے جسے پڑھکر یا سن کر آدمی محو ہوجاتا ہے۔ مثلاً مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ نواب مصطفی خاں شیفتہ نے میر انیس کا یہ مصرع:

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

پڑھکر فرمایا کہ بس یہ ایک مصرع کافی ہے آگے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ یا میر کا یہ مصرع:

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

بالکل کافی ہے۔ اس میں جو ارمان اور حسرتیں بھری ہوئی ہیں وہ سب سامنے آجاتی ہیں اور ان کے سمجھنے کے لیے کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔ تفصیل اور جزئیات میں جانے سے اکثر اوقات نظم پھسپھسی اور بےاثر ہوجاتی ہے۔

محض اس دلیل پر کہ غزل کی صنف دنیا کے کسی اور ادب میں نہیں پائی جاتی اسے مردود قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور نہ یہ خیال قابل قبول ہے کہ ایک شعر میں جذبہ یا خیال پورا ادا نہیں ہوتا۔ اردو فارسی میں ہزارہا ایسے شعر ہیں کہ جن میں کوئی خیال یا جذبہ کامل حسن کے ساتھ ادا ہوگیا ہے۔ ہندی کا دوہرا بھی اسی قبیل سے ہے۔ اس کے دو مصرعوں میں بھی بڑی خوبصورتی سے پورا خیال یا جذبہ ادا کردیا جاتا ہے۔ اس قسم کے شعر اور دوہرے اپنی خوبیوں کی وجہ سے زباں‌زد خلایق ہوجاتے ہیں۔ اور ایسے شعر اور دوہرے اپنے حسن، اثر اور لطف میں کسی نظم سے کم نہیں ہوتے۔ غزل میں بیشک عیب ہیں اور وہ بھی ایک دو نہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسے ادب سے یک‌لخت خارج کردیا جائے۔

کاش کلیم صاحب « نغمۂ گل » پر بھی اسی صفائی سے تنقید کرتے جیسی انھوں نے دوسرے اساتذہ کے کلام پر کی ہے اور انہیں اصول تنقید سے اسے جانچتے اور پرکھتے۔

یہاں وہ کچھ مرعوب معلوم ہوتے ہیں اور ان کی تنقید تقریظ سے بدل گئی ہے۔ نظم کا جو نمونہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ ان کی رائے کی تصدیق نہیں کرتا۔

کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہونے کے یہ معنے نہیں کہ اس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیا جائے۔ «اردو شاعری پر ایک نظر» ہمارے تنقیدی ادب میں بڑی قابل قدر کتاب ہے۔ اس کے مطالعے سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی، بہت سی پرانی باتوں کی یاد تازہ ہوجائے گی اور بعض ایسی رائیں بھی نظر آئیں گی جنھیں پرکھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ کتاب بہت بڑی اور بہت غلط چھپی ہے۔ کہیں کہیں لفظ غلط استعمال ہوئے ہیں ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ لیکن کتاب ہر حال میں مطالعے کے قابل ہے اس میں بہت سی باتیں اور رائیں غور و فکر کے لیے ملیں گی اور یہ بہت بڑی خوبی ہے۔

بیسک ورڈس (ڈکشنری)

جناب اڈیٹر صاحب رسالۂ اردو

رسالۂ اردو بابتہ ماہ اپریل سنہ ۴۱ع میں تبصرے کے عنوان کے تحت بیسک ورڈس (ڈکشنری) مرتبۂ آرتھولاجیکل انسٹیٹیوٹ پر جناب م ۔ ا ۔ خ صاحب نے تقریباً ۲۰ صفحات میں جو «تنقید» ضیافت طبع کے لیے فرمائی ہے اس کی نوعیت ان تمام تنقیدوں سے بالکل جداگانہ ہے جو عموماً رسالۂ اردو اور دوسرے معیاری رسالوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ تنقید کا مسلّمہ مقصد حسن و قبح پر ایمانداری اور ذمہ‌داری کے ساتھ روشنی ڈالنا ہوتا ہے تاکہ ناظرین کو صحیح رائے قایم کرنے میں مدد ملے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا کہ فاضل نقاد نے اس سے دیدہ و دانستہ گریز کیا ذاتیات پر حملہ کیا اور غلط بیانیاں کیں اور ہندستان کا ایک مؤقر رسالہ سہواً ان کا آلۂ کار بن گیا۔ اگر اس قسم کی افسوس ناک «تنقید» اردو کے کسی اور رسالے میں شایع ہوتی تو شاید «جواب جاہلاں باشد خموشی» پر عمل کیا جاتا لیکن محض رسالۂ

اردو کی اہمیت کی خاطر یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ناظرین کو حقیقت سے آگاہ کرکے ان کو گمراہ کن کوشش سے بچایا جائے۔

جناب م - ا - خ صاحب کے ذاتی اور ادبی اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے:

۱ - مسٹر مائرس (نگرانِ کار) ہندستانی زبان سے "قطعی بے بہرہ" ہیں اور ان کے کارکن جو غالباً دکھنی ہیں اردو ہندی سے ناواقف ہیں۔

۲ - بیسک ورڈس ڈکشنری کی زبان جس کو ہندستانی بتلایا گیا ہے وہ دراصل ہندستان میں "کہیں بولی نہیں جاتی"۔

۳ - اس میں مسلسل یہ کوشش ہے کہ ہندستانی زبان کے روزمرہ اور رایج لفظوں کو ترک کیا جائے اور ایسے سنسکرت لفظ لائے جائیں جو خود بنارسی ہندی تصنیف کرنے والے بھی نہیں بولنا چاہتے۔

۴ - "جہاں تک ہندستانی محاورات کا تعلق ہے وہ بھی عجیب و غریب ہیں" اور بالکل غلط استعمال کیے گئے ہیں۔

۵ - لسانیات اور "بیسک" کے متعلق اپنا انوکھا نظریہ واضح فرماتے ہوئے مطبوعہ ترجمے کے ایک جزو کے محاذی خود کا "صحیح" ترجمہ دیا گیا ہے۔

۱ - مسٹر مائرس نے اردو دانی کا کوئی دعوٰ نہیں کیا ہے اور جب خود فاضل نقاد یہ فرماتے ہیں کہ "لکھنے والے کوئی دکھنی صاحب ہیں جو پیشے کے وکیل معلوم ہوتے ہیں" تو پھر مسٹر مائرس پر چوٹیں کیوں؟ کیا اس سے یہ شبہہ نہیں ہوتا کہ فاضل نقاد مسٹر مائرس پر خار کھائے بیٹھے ہیں! یہ شبہہ اور قوی ہوجاتا ہے جب کہ نفس مضمون سے ہٹ کر "بیسک ہندستانی" کے متعلق خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔

اس موقع پر یہ بتلادینا مناسب ہے کہ "بیسک" کا کام ایک سے زیادہ افراد کے سپرد کیا جاتا ہے چناں چہ "بیسک ہندستانی" کے کارکنوں میں شمالی ہند اور دکن دونوں کے ذی علم اصحاب شامل ہیں جو اردو عربی داں اور ہندی سنسکرت داں ہیں اور ان میں سے کسی کا پیشۂ وکالت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ ان

کی اردو یا ہندی دانی کا پتہ آگے چل کر ثابت ہوگا۔

۲۔ "ہندستانی" کا لفظ چاہے اب معرض بحث میں آ گیا ہو لیکن یہ اس زبان کے لیے جسے غالباً فاضل نقاد اردو کہنا پسند کرتے ہیں کئی صدیوں سے استعمال ہورہا ہے۔ ہندستان کی عام اور مشترکہ زبان کا یہ نام اہل یوروپ نے دیا ہے۔ بقول جناب معتمد صاحب انجمن ترقی اردو، اردو کے انگریز محسن گلکرسٹ نے اردو اور ہندستانی کو ایک معنی ہی میں استعمال کیا ہے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب نے بھی متعدد مواقع پر تقریر اور تحریر میں ہندستان کی عام اور مشترکہ زبان کے لیے "ہندستانی" کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"یہ جو اعتراض ہے کہ ہندستانی کی دوڑ صرف معمولی بول چال اور کاروبار تک ہے اور ادب میں اس کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔ . . . اس زبان کی ریڈریں تیار کرائیے . . . لڑکے ابتدا سے ایسی زبان . . . کے عادی ہو جائیں گے جو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس طرح ہندستانی کے رواج کا سب سے بڑا ذریعہ مدارس ہوسکتے ہیں۔"

"ہماری زبان" کے پرچوں میں اب بھی ہندستان کی عام اور مشترکہ زبان کے لیے "ہندستانی" کا لفظ برابر لکھا جاتا ہے۔

یہ ان چند اقتباسات سے واضح ہوگا جو گریرسن کی مشہور کتاب سے لیے گئے ہیں:

۱۔ لکھنؤ	ایک شخص کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے چھوٹا باپ سے کہنے لگا۔ ابا جان جایداد میں ہمارا جو کچھ حصہ ہے ہم کو دے دیجیے چناں چہ اس نے اپنا اثاثہ دونوں کو تقسیم کردیا۔
۲۔ دہلی	ایک شخص کے دو بیٹے تھے ان میں سے چھوٹے نے باپ سے کہا کہ اے باپ! جو حصہ مجھ کو پہنچتا ہے مجھے دے۔ اس نے اپنا مال و متاع انھیں بانٹ دی؟
۳۔ بنارسی	کسی منشیا کے دو پترا تھے ان میں سے چھٹکے نے پتا سے کہا کہ ہے پتا اپنی سمپتی میں سے جو میرا امس ہو سو مجھے دیجیے تب اس

نے ان کو اپنی سمپتی بانٹ دی ۔

۴ ۔ بمبئی	ایک آدمی کے دو بیٹے تھے ان میں سے چھوٹے چھوکرے نے بولا بابا میرے بھاگ کا مال ماجے دیو ۔ ھور اس نے اون میں بھاگ پاڑ دیا ۔
۵ ۔ مدراس	ایک آدمی کے دو بیٹے تھے ۔ ان میں کا چھوٹا باپ کو بولیا اوبا ! لو منجے پونچتیا سو مال کا حصہ منجے دے ڈال اس پو باپ اپنی آستی کے

حصے بھاکو دونو کو بانٹ ڈالیا ۔

آرتھولاجیکل انسٹیٹیوٹ (کیمبرج) نے اس زبان کے لیے ہندستانی اصطلاح اختیار کرکے کونسا ایسا گناہ کیا ھے کہ وہ قابل گردن زدنی ھو ۔ اگر یہ "ہندستانی" ہندستان میں کہیں نہیں بولی جاتی تو آخر وہ کونسی زبان ھے جو ہندستان کے شمال اور جنوب مشرق اور مغرب میں بولی اور سمجھی جاتی ھے ۔

۳ ۔ بیسک ہندستانی کا مقصد یہ ھے کہ اس کے سیکھنے والے بعد میں چاھیں تو اردو یا ہندی یعنی فارسی عربی آمیز ہندستانی یا سنسکرت آمیز ہندستانی سیکھ سکیں اور اگر یہ خواھش نہ ھو تو ان کا ذخیرۂ الفاظ دلی کے مولوی یا بنارس کے پنڈت، بمبئی کے شہری یا مدراس کے بیوپاری سے تبادلۂ خیالات کے لیے کافی و وافی ھو ۔ فاضل نقاد کا یہ اعتراض کہ بیسک ہندستانی میں ایسے الفاظ شامل کیے گئے ھیں جو بنارسی ہندی بولنے والے بھی استعمال نہیں کرتے سراسر غلط فہمی یا ناواقفیت پر مبنی ھے اور اس اعتراض کو قوی کرنے کے لیے افسوس ھے کہ انھوں نے بڑی بددیانتی سے کام لیا ھے مثلاً بیسک ورڈس ڈکشنری میں

advertisement. کے ساتھ اشتہار اور قوسین میں (وگیا پن)

attempt. کے ساتھ کوشش اور قوسین میں (پریتن)

against. کے ساتھ خلاف اور قوسین میں (وردھ)

دیا گیا ھے لیکن انھوں نے اردو کے ان مسلمہ الفاظ کو چھوڑکر صرف ہندی الفاظ لے لیے ھیں تاکہ ناظرین کے جذبات کو بھڑکاکر اور ان کو ورغلاکر اپنا ھم‌خیال بنالیں ۔

فاضل نقاد اگر ناگری پرچارنی سبھا اور انڈین پریس الہ آباد کی مطبوعات کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو ثابت ہوجائے گا کہ ہندی کے پرستار مندرجۂ بالا الفاظ استعمال کررہے ہیں اور وہ اخبارات اور رسالوں مثلاً سرسوتی، ارجن وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں - بعض الفاظ ایسے غیر مانوس ہوتے ہیں کہ ان کا سراغ ہندی کی سب سے بڑی فرہنگ شبد ساگر میں بھی نہیں لگتا -

قوسین کے الفاظ بطور مترادف کے دیے گئے ہیں - تاکہ بیسک ہندستانی کے متذکرہ مقاصد کی پوری طرح تکمیل ہوسکے -

وگیاپن بمعنی اشتہار دیا گیا ہے - ہندی جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ جس معنی میں وگیاپن استعمال کیا گیا ہے اس معنی میں اس سے زیادہ مروّج اور موزوں دوسرا لفظ نہیں ہے -

پرچار تبلیغ کے معنوں میں آتا ہے اور ہندی اردو دونوں میں مستعمل ہے - جہاں اردو میں اشتہار استعمال ہوتا ہے وہاں ہندی میں وگیاپن آتا ہے - علیٰ ھذاالقیاس -

۴ - فاضل نقاد کے نزدیک اردو محاورے "عجیب و غریب ہیں" چنانچہ مثال کے طور پر لفظ کھنچنا بمعنی کشش غلط بتایا گیا ہے - در اصل کھنچنا کشش ہی کے معنے دیتا ہے - فرہنگ آصفیہ جس کو سب مانتے ہیں اس میں یہ لکھا ہے :

کھنچنا - کشش ہونا - جیسے ان کی طرف دل کھنچا جاتا ہے -

کھنچاؤ - کشش - کھینچ -

کھنچاوٹ - کشش - جذب - صفحہ ۶۱۷

چنانچہ آتش نے اسی معنی میں لکھا ہے :

کون ہے جو اس کی جانب کو کھنچا جاتا نہیں حسن کی دولت سے وہ گل مرجع کل ہوگیا

اور ناسخ نے لکھا ہے :

کھنچا جاتا ہے عالم ہر طرف سے تیری جانب کو بہ جائے مرکز عالم ترے رخسار کا تل ہے

تو پھر کسی نے یہ کیوں لکھا ہے :

میں جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

بات یہ ہے کہ اردو جاننے والے اس کو کئی اور معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں :

۱ ۔ کشیدہ ہونا ۔ دور ہونا ۔

۲ ۔ کشید کرنا ۔ جیسے عرق کھنچنا ۔

۳ ۔ طول پکڑنا ۔ عرصہ لگنا ۔ دراز ہونا ۔ جیسے مقدمہ بہت کھنچ گیا ۔

حال بیمار روئے و زلف نہ پوچھ　　صبح کر کھنچ گئی تو شام نہیں

احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں　　شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے گا میر

۴ ۔ نکلنا ۔ جیسے روح کھنچ گئی :

روح کھنچ آئی تھی گویا میری　　آخری سانس الہی توبہ

۵ ۔ اترنا ۔ نقل ہونا ۔ جیسے نقشے کھنچنا ۔

مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب کھنچنا دوری کے معنوں میں آتا ہے تب بھی اس میں کشش کا تضمن باقی رہتا ہے ۔ البتہ کشش معکوس ہوتی ہے ان دونوں معنوں کی مثال ظفر شاہ دہلی کے اس شعر میں ہے :

یارب کشش دل میں اثر ہوئے تو یوں ہو　　جیسے ہیں کھنچے ویسے ہی یاں آئیں وہ کھنچ کر

فاضل نقاد کے دوسرے اعتراضات بھی اسی قسم کے ہیں ۔ طوالت کے خوف سے آنکھ ڈالنا اور آنکھ مارنا کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ بیسک والوں نے جو معنی لیے ہیں اس کی تائید اساتذہ کے کلام سے ہوتی ہے :

(بہ‌معنی نظر کرنا)　　اے سیہ بختی تری تاثیر کے قایل ہیں ہم
آنکھ ڈالی جس دوشالے پر وہ کمبل ہوگیا　　(امانت)

(بہ‌معنی محبت کرنا)　　پھیری ہر اک نے عین ملاقات میں نگاہ
صدمے اٹھائے آنکھ حسینوں پہ ڈال کے　　(امانت)

(بہ‌معنی محبت کرنا)　　اب تو اس شوخ چشم قاتل پر
آنکھ ڈالی ہے دیکھیے کیا ہو　　(امیر)

(بہ‌معنی اشارہ کرنا) ہے کونسی یہ وضع بھلا سوچیے تو آپ
باتیں ادھر کو کیجیے ادھر آنکھ ماریے (انشاء)

(محبت کی نظر کرنا) غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے
نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے (سودا)

۵ - غالباً "تنقید" کو تعمیری صورت دینے کے بہانے فن لسانیات کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے جو بے موقع اور ناقابل التفات ہے -

فاضل نقاد نے اپنا نام مخفی رکھا ہے اور اپنے نظریے کی تائید میں کوئی سند بھی نہیں پیش کی ہے - آپ کی رائے ہے کہ مختلف زبانوں کے ہم‌آواز لفظ، ہم‌شکل اور ہم‌اصل ہوتے ہیں مثلاً :

لوبھہ	love
ہردے	heart
ڈر	danger

متعدد ایسے الفاظ بھی ہیں جن کی مناسبت واضح نہیں کی گئی ہے - جیسے :

پر	full	
مرزا	mister	
لکھنا	look	
یخ	ice	وغیرہ

اور آپ اپنی بیسک اسی نظریے کے تحت ترتیب دینا چاہتے ہیں یہ آپ ہی کو مبارک -

کچھ عرصہ ہوا زبان اردو کے ایک شیدائی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انگریزی زبان اردو سے نکلی ہے - مثلاً "وہ کا بولا ری" انگریزی میں Vo-ca-bu-la-ry ہے ممکن ہے فاضل نقاد اپنی بیسک سے اس دعوے کی تائید میں مزید مواد فراہم کردیں - لیکن ہم ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ فن لسانیات ایک سائنس کا درجہ حاصل کرچکا ہے - تحقیق کے میدان میں ذاتی جذبات صحیح رہبری نہیں

کیا کرتے - غیر زبانیں تو رہیں ایک طرف ایک ہی لفظ جو ہندستان کی دو زبانوں میں موجود ہے - ہم‌شکل - ہم‌اصل - اور ہم‌آواز ہونے کے باوجود بالکل مختلف معنی دیتا ہے مثلاً :

مرہٹی بھالو (گیدڑ) ہندستانی بھالو (ریچھ)

" بھوندو (بیوقوف بنانے والا) " بھوندو (بےوقوف)

باڑی بنگالی میں مکان کے معنی دیتا ہے - اردو میں کھیت کے ساتھ آتا ہے - باڑا ہندی میں گھر کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر اردو میں صرف ترکیبوں میں آتا ہے جیسے امام باڑہ وغیرہ -

ہر ترجمے میں ذاتی پسندیدگی یا نا پسندیدگی کو بہت زیادہ دخل ہوا کرتا ہے - اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقدس کتابوں یا غیر زبانوں کے شاہ کاروں کے بیسیوں ترجمے نہ ہوتے رہتے 'بیسک ورڈس ڈکشنری' کے دیباچے میں یہ صراحت ہے کہ بیسک انگریزی کا ترجمہ محدود الفاظ میں ہے - اور نوآموز کی ضروریات کے لیے کیا گیا ہے - ہر مدرس جانتا ہے کہ لفظی ترجمہ ہمیشہ غیر زبان سیکھنے والے کی سہولت کا باعث ہوتا ہے - کیوں‌کہ الفاظ کے معنی ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ مفید کوئی طریقہ نہیں - خصوصاً کتب لغات میں اس بات کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا ہے کہ لفظ کے معنی آسان‌ترین لفظ کے ذریعے واضح کیے جائیں - چنان‌چہ ہتھیلی کے معنی کف دست دینا مفید نہیں - اسی لیے مؤلف فرہنگ آصفیہ اور صاحب نوراللغات لکھتے ہیں :-

ہتھیلی = ہاتھ کا گڑھا

اسی طرح 'پیچھا کرنا' مستعار معنوں میں آتا ہے - اس کے معنی دیے ہیں 'تعاقب کرنا' لیکن تعاقب کرنا خود مشکل ہے اس لیے یوں سمجھایا گیا ہے - تعاقب کرنا = پیچھا کرنا - کسی کے پیچھے جانا -

فاضل نقاد نے فصیح اردو میں بلالحاظ تعداد الفاظ ترجمہ کیا ہے جو بعض جگہ یقینی بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے نظریے کی توجیہہ کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ

وہ اپنے مجوزہ الفاظ میں ترجمہ کرتے جس کی غالباً صورت یہ ہوتی:

مجوزہ بیسک م۔ا۔خ	بیسک ہندستانی	
پیالہ پر ہے	پیالہ بھرا ہوا ہے	The cup is full
اس کے ساتھ لابھ کرو	اس سے محبت (پریم) کرو	Love him
مجھے کچھ یخ دو	مجھے کچھ برف دو	Give me some ice
ایک کتاب، لکھو	کوئی کتاب دیکھو۔	Look at a book

فاضل نقاد نے بڑی نوازش سے مطبوعہ ترجمے کی صحت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے مصححہ تراجم غلط ہیں جو غالباً انگریزی زبان سے کم واقفیت کا نتیجہ ہیں مثلاً:

تازہ معلومات	Knowledge at first hand
بلانے کی گھنٹی سن کر ملازم کا جواب دینا	Answering a bell
اسے کوئی تجربہ حاصل نہ ہوا!	He is not any wiser

افسوس کہ ہم بہ قول فاضل نقاد کے اس سے زیادہ تفصیلی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے صرف چند صفحوں پر سرسری نظر میں جو کچھ مل گیا ہے۔ وہ ضیافت طبع کے لیے نہیں بلکہ بھانڈا پھوڑنے کے لیے حاضر ہے۔

کارکنان دی آرتھولاجیکل انسٹیٹیوٹ (بمبئی)

بیسک انگلش از سید خیرات علی زیدی (آئی - ٹی - سی) - مددگار مدرسۂ فوقانیہ - میدک - حیدرآباد - دکن - ۸۲ صفحات - قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

بیسک یا بنیادی انگریزی ایسے (۸۵۰) انگریزی لفظوں کا انتخاب ہے جن سے روزمرّہ کی زندگی میں ۲۰ ہزار انگریزی لفظوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کے دو خاص مقصد ہیں: اول یہ کہ انگریزی زبان کو بین المللی مددگار زبان کے طور پر رایج کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عام انگریزی سیکھنے والوں کو آسان اور ابتدائی زبان آجائے۔

انگریزی زبان کو آسان بنانے کا خیال کوئی نیا خیال نہیں ہے - انیسویں صدی کے اواخر سے یہ کوشش ہورہی ہے کہ اینگلو سیکسن یک بولے لفظ (One syllabled) زیادہ استعمال ہوں اور کلیسیائی تعلیم نے جو لاطینی اثر انگریزی زبان پر قایم کردیا ہے وہ زایل ہوجائے - حقیقت یہ ہے یورپ میں سائنٹفک ایجادات کے زمانے سے پہلے تمام علمی ادارے کلیسا کے مرہون منت تھے ' لاطینی زبان نہ صرف مذہب پر بلکہ ادبیات پر بھی چھائی ہوئی تھی - سنسکرت کی طرح اس کے سیکھنے کے لیے بچوں کی زندگی کے آٹھ بے بہا سال گرامر اسکولوں میں ضایع کیے جاتے تھے - اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مادری زبان سے بچوں کو نفرت ہونے لگتی تھی - اور زندہ لفظوں اور محاوروں کی جگہ مردہ زبان کے الفاظ اور جملے ' موقع بے موقع بازار ' مجالس ' و ادبیات میں اصلی زبانوں کا خون کرتے ہوئے نظر آتے تھے - شکر ہے کہ یورپ اس غلطی سے تایب ہوگیا ہے -

جنگ عظیم کے بعد جب بین‌الملیت اور جمہوریت نئے لباس میں نمایاں ہوئی ' تو ابن خلدون کا نظریۂ لسان پھر عملی طور پر دنیا کے سامنے آیا - قوموں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ملک و مذہب سے بالاتر یا کم از کم مساوی ایک اور چیز ہے جو نہ صرف افراد کو بلکہ مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرسکتی ہے - یعنی ہم‌زبانی - اسی نقطۂ نظر سے سید رشید رضا مرحوم نے مصر سے یہ صدا بلند کی کہ قرآن کا کسی غیر زبان میں ترجمہ کرنا نہایت ہی مکروہ ہے - انگلینڈ اور امریکہ نے انگریزی زبان کو بین‌الملّی زبان بنانے کی ابتدا کی - ترکوں نے غیر ترکی زبانوں سے نفرت کا اظہار کیا - ایران نے خالص پہلوی لفظوں کی تلاش شروع کی اور ہندستان نے ملکی زبانوں کو ترقی دے کر انگریزی کو ثانوی درجہ دینے کا اعلان کردیا -

یورپ والے بین‌الملیت میں صرف یورپ و امریکہ کی مسیحی اقوام و ملل کو داخل سمجھتے ہیں ' حتی کہ ٹرکی کو یہ فخر کبھی حاصل نہ ہوا کہ وہ باوجود یوڑپین ہونے کے یورپ کے انٹرنیشنل دائرے میں داخل سمجھی جاتی - ہندستان اور چین کا تو کیا ذکر - لیکن محققین و مبصرین السنہ کا خیال ہے کہ یورپ میں نہیں تو ایشیا و

افریقہ میں تو ضرور صرف هندستانی زبان کی اس ترقی یافتہ صورت کو جسے اردو کہتے هیں بین الملّی زبان بن جانے کا موقع حاصل هے - اور بنیادی انگریزی یا کوئی یوروپین زبان اردو کا مقابلہ نہیں کرسکتی -

بہر حال زیر نظر رسالے کا مقصد یہ هے کہ یہ بتائے کہ بیسک انگلش کے لفظوں کا انتخاب کافی غور و خوض کے بعد کیا گیا هے ، اس لیے بیسک کی کتابوں کی مدد سے ، کم سے کم مدت میں ، انگریزی زبان سکھائی جا سکتی هے - قابل مؤلف نے بیسک یا بنیادی لفظوں کی فہرست درج کردی هوتی تو اس کتاب کی افادیت بڑھ جاتی - اس رسالے میں بعض مضامین اڈولف مائرز کی کتاب Basic and the teaching of English in India (The times of India press Bombay. 1938) سے ماخوذ معلوم هوتے هیں - اردو داں حضرات کے لیے مذکورہ کتاب کا پورا ترجمہ بہت مفید هوسکتا هے -

---

اصطلاحات

جغرافیہ - ارتھمیٹک - جیومیٹری - الجبرا

(مرتبہ هندستانی کمیٹی - صوبہ بہار)

۱ - جغرافیہ کی اصطلاحات کی فہرست میں بہت سے ایسے روزمرّہ کے متداول الفاظ بھی لکھ دیے گئے هیں جو اصطلاح نہیں بلکہ معمولی لفظ هیں -

۲ - حساب وغیرہ میں عجیب و غریب اصطلاحیں وضع کی گئی هیں -

۳ - معلوم هوتا هے کہ وضع اصطلاحات سے پہلے واضعین کو کوئی هدایات نہیں دی گئیں کہ وہ کن اصولوں پر یہ کام کریں -

۴ - اصطلاحات کے دیکھنے سے یہ معلوم هوتا هے کہ واضعین اصطلاحات نہ هندی جانتے هیں نہ اردو - (هندی سے میری مراد اودھی - پوربی یا برج هے - میں بہاری - بھوجپوری - چھتیس گڑھی وغیرہ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان سے وضع اصطلاحات میں مدد لی جائے -)

۵ - میری تجویز یہ ہے کہ اردو میں جو اصطلاحات وضع ہوچکی ہیں وہ بالفعل رایج کردی جائیں - اور جب تک ماہرین فن (جو صرف بہاری اسکولوں کے مدرس نہ ہوں) ہر اصطلاح پر بحث نہ کرلیں، کوئی نئی اصطلاح کم از کم "اردوئے ہندستانی" میں نہ لی جائے -

---

منتخب داغ (مرتبہ احسن مارہروی مرحوم)

مجلد قیمت پانچ روپے - بڑی تقطیع صفحات ۴۷۷

احسن مرحوم مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - بڑے پختہ کار اور خوش‌گو شاعر تھے - انھوں نے داغ کے کلام کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا - ایک زمانے میں فصیح‌اللغات لکھنی شروع کی تھی اور ایک بڑا حصہ شایع بھی ہوا تھا، اس میں ان محاورات سے بحث کی تھی جو مرزا داغ نے اپنے کلام میں استعمال کیے تھے - داغ کے کلام کے ایک اچھے انتخاب کی بہت ضرورت تھی - اس کام کے دوران میں انھوں نے مجھے لکھا کہ میں داغ کے کلام کے ان اشعار کا انتخاب کررہا ہوں جن میں اضافت اور حرف عطف نہیں آیا اور کلام کا یہ حصہ بھی معتدبہ ہے - میں نے انھیں لکھا کہ "آپ کس خبط میں مبتلا ہیں - اضافت اور حرف عطف سے آپ کو کیوں چڑ ہے - اضافت اور حرف عطف کو اگر موقع محل سے اور سلیقے سے استعمال کیا جائے تو اس سے بیان میں حسن پیدا ہوجاتا ہے اور اضافت اور حرف عطف کا ترک کوئی کمال نہیں - آپ اگر داغ کے کلام کا ایک اچھا انتخاب کردیں تو بڑے کام کی چیز ہوگی اور مقبول بھی ہوگا اور اس کی ضرورت بھی ہے" -

میرا لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے حصہ دوم کا اضافہ کیا - پہلے حصے میں صرف وہ اشعار ہیں جن میں کہیں اضافت اور حرف عطف نہیں آیا اور اس میں رطب و یابس سب کچھ آگیا ہے - دوسرے حصے میں صرف وہ اشعار ہیں جن میں اضافت اور حرف عطف موجود ہے اور جو ان کے بہترین اشعار ہیں - میرا جو منشا تھا وہ پورا نہ ہوا - میں چاہتا تھا کہ مرزا کا بہترین کلام ایک جا ہوجائے - اب یہ ہوا کہ پہلے حصے میں پڑھنے والے کو خود انتخاب کرنا پڑےگا - ایک ہی غزل

کے دو ٹکڑے ہوگئے ہیں - کچھ پہلے حصے میں اور کچھ دوسرے میں - تاہم مرحوم نے اس میں بڑی جدت کی ہے اور مرزا داغ کے اچھے سے اچھے شعر اس میں آگئے ہیں اور ظاہر ہے کہ احسن مرحوم سے بہتر کون انتخاب کرسکتا تھا -

شروع میں احسن مرحوم کے حالات ہیں - اس کے بعد مرحوم کا ایک مقدمہ ہے جس میں مرزا داغ کے حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے -

امید ہے کہ داغ کے کلام کے قدردان اس انتخاب کی قدر کریں گے -

ساز و آہنگ جناب سیماب اکبرآبادی کی نظموں کا مجموعہ - تقطیع بڑی - صفحات ۳۰۴ قیمت مجلّد تین روپے - ملنے کا پتہ - مکتبہ قصرالادب - دفتر شاعر - آگرہ -

یہ سیماب صاحب کی تازہ نظموں کا مجموعہ ہے - ایک ایسا ہی دیوان کار امروز کے نام سے پہلے شایع ہوچکا ہے - سیماب صاحب کی ادبی مصروفیتیں گوناگوں ہیں - ان کے دم سے ان کا محلہ نائی منڈی کیا ادبی منڈی بنا ہوا ہے - حضرت سیماب نے ہمہ گیر طبیعت پائی ہے - جبھی تو دیکھا جاتا ہے کہ عہد حاضر سے متعلق شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر اس دیوان میں نظم نہ ملے - سیماب صاحب ان چند بزرگوں میں سے ہیں جو باوجود کہنہ سالی اور کہنہ مشق ہونے کے جوں توں زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں -

آج کل ادب میں خارجیت کا زور ہے - اسی سے نوجوان مذاق مرتب ہونے ہیں - چناںچہ سیماب صاحب اس راز کو سمجھے اور اس کے مطابق لایحۂ عمل قرار دیا -

ان نظموں کو موضوع کی رعایت سے پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے (۱) نوائے عصر (۲) صلائے تہذیب (۳) شعر و حکم (۴) معتقدات (۵) نغمۂ معصوم -

نہایت غور کے قابل یہ دلچسپ بات ہے کہ معتقدات والے باب میں جہاں ایک نظم معراج النبی پر ہے وہاں ایک نظم "وہ بانسری کہاں ہے؟" بھی موجود ہے ایسی چیزیں اردو اور اردو والوں کی رواداری اور فراخ دلی کے زندہ ثبوت ہیں -

نغمۂ معصوم یعنی بچوں کی نظمیں بھی خوب ہیں اور جناب اسمعیل میرٹھی مرحوم کی یاد دلاتی ہیں -